رجسٹرڈ نمبر ال ۵۲۰ ہ جولائی ۱۹۸۲ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

قیمت بیس روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

کاتب سید اقبال احمد

مجلس ادارت

۱- مولانا سید ابوالحسن علی ندوی   ۲- ڈاکٹر نذیر احمد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۳- مولانا ضیاء الدین اصلاحی   ۴- سید صباح الدین عبدالرحمن

(دارالمصنفین کی دو نئی کتابیں)

سیرۃ النبی جلد ہفتم

سیرۃ النبی جلد ششم کے بعد سید صاحب سیرۃ جلد ہفتم بھی جو معاملات سے متعلق تھی لکھنی شروع کر دی تھی، اور اسی پر یہ مقدس سلسلہ ختم بھی ہو جاتا لیکن ابھی اس موضوع پر چند ہی مضامین لکھے تھے کہ آپ کا انتقال ہو گیا، اور یہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکی، یہ ان ہی متفرق مضامین و مباحث کا مجموعہ ہے، جن کے عنوانات یہ ہیں، اسلام میں حکومت کی حیثیت، عہد نبوی میں نظام حکومت، سلطنت اور دین کا تعلق وغیرہ، شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی کے قلم سے پیش لفظ

قیمت :- ۱۲ روپیہ

مؤلفہ مولانا سید سلیمان ندوی

صوفی امیر خسرو

اس میں ہندوستان کے شہرۂ آفاق محب وطن فارسی شاعر، نہ سپہر، شیریں خسرو، لیلیٰ مجنوں، دولرانی خضر خاں، اور وسط الحیوٰۃ جیسی شاہکار مثنویوں کے مصنف، اور حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء کے جان نثار مرید حضرت امیر خسرو کو، معاصر تذکرہ و تاریخ کی کتابوں اور خود ان کے کلام کے مجموعوں اور مثنویوں کی روشنی میں ایک صاحب دل صوفی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، بزم صوفیہ کے بعد سلوک و عرفان کے مباحث و مسائل پر دوسری اہم کتاب

قیمت :- ۸

مؤلفہ سید صباح الدین عبدالرحمن

جلد ۱۳۰ ماہ رمضان المبارک ۱۴۰۲ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۸۲ء عدد ۱

مضامین

شذرات

ان سطروں کو سپرد قلم کرتے وقت اسرائیل کے صیہونیوں نے لبنان کے پناہ گزین فلسطینی مسلمانوں پر اپنی ہلاکت آفرین بمباری سے جو انتہائی خوں ریز مظالم ڈھائے ہیں اس سے انسانیت کی گردن شرم وندامت سے جھکی ہوئی ہے۔

یہودیت اپنے ازلی خبث نفس کے ساتھ پھر ایک بار نمودار ہوگئی ہے، انھوں نے فلسطینی مسلمانوں کو ان کے قدیم وطن فلسطین سے نکالا تو وہ مشرق وسطیٰ کے مختلف ملکوں میں تقسیم ہوگئے، ان کی ایک بڑی تعداد لبنان میں پناہ گیر ہوئی ان ہی پر اسرائیلی امریکہ کے مہلک اسلحہ سے حملے کررہے ہیں جن میں اب تک بی بی سی کے بیان کے مطابق تیس ہزار فلسطینی شہید ہوچکے ہیں، ان کو دفن کرنے کے لیے جگہیں نہیں مل رہی ہیں، ایک ایک قبر میں پچیس پچیس لاشیں دفن کی جارہی ہیں، جو زندہ ہیں وہ اپنی جائے پناہ کو چھوڑکر ادھر ادھر بھاگتے پھر رہے ہیں، ان کے کھانے پینے کے سامان پہونچنے کے راستے مسدود کردیے گئے ہیں، بچے یتیم، عورتیں بیوہ، بوڑھے بےکس اور نوجوان بےسہارا بن کر اس مشہد اکبر کا منظر دیکھ رہے ہیں، عربوں کی غیرت، مسلمانوں کی ایمانی حرارت اور عام انسانوں کی حمیت اس خونخواری اور درندگی کے خلاف بروئے کار آنی چاہیے تھی، مگر وہ صرف دور کے تماشائی بنے ہوئے ہیں کہ یہ بہادر فلسطینی خون میں نہا رہے ہیں، آگ میں جل رہے ہیں اور موت سے کھیل رہے ہیں۔

یہودی اور عیسائی مستشرقین مسلمانوں کی تاریخ کو قصائی کی دوکان کہنے میں نہیں شرماتے، لبنان مشرق ہی میں ہے، یہ اس وقت مذبح بنا ہوا ہے، امریکہ کے عیسائی صدر ریگن اور اسرائیل کے یہودی وزیر اعظم بیگن کی وجہ سے یہ خوں ریزی ہورہی ہے، دور کے تماشائی ان دونوں کو بوچر کہہ رہے ہیں، اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دو بوچروں کی تاریخ ہمارے مستشرقین اپنے قلم کے حسن کرشمہ سازے کس رنگ میں پیش کرتے ہیں، اس کو توریت اور انجیل کی عین تعلیم اور اس سفاکی کو غیر معمولی فتحمندی اور کامرانی قرار دیتے ہیں، یا بہیمیت اور حیوانیت کی ایک انتہائی شرمناک مثال۔

اسرائیلی امریکہ کے سہارے عربوں کا خون جتنا چاہیں بہائیں ان کو بار بار شکست کیوں نہ دیدیں اور وہ بالکل تباہ و برباد کیوں نہ ہو جائیں مگر وہ وہیں رہیں گے جہاں چودہ سو سال سے رہتے چلے آئے ہیں لیکن تاریخ کہتی ہے کہ کبھی کوئی فاتح قوم ہمیشہ فاتح بن کر نہیں رہی سکندر اعظم سیزر، ہنیبال، نپولین، مسولینی، ہٹلر کے سب فاتحانہ کارنامے بھلا دیے گئے، ہر فاتح کو ایک دن شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اسرائیل کو بھی ایک دن شکست ہوگی جب یہ دور دور ملکوں سے آکر ریت کے ٹیلوں پر گھر بنانے والے یہودی ریگ صحرا کی طرح اڑتے نظر آئیں گے۔ اس وقت ان کا سہارا صرف امریکی اسلحہ ہے، جب کبھی بھی یہ روک دیے گئے تو ان کا وجود ختم ہے

امریکہ اور لبنان کے عیسائی اس وقت یہودیوں کے طرفدار ہو گئے ہیں لیکن ان کو مقدس پر کچھ بھی اعتقاد ہے تو اسی میں یہودیوں کو خطا کار گروہ، بدکرداری سے لدی ہوئی کی نسل، باغی، جھوٹے فرزند، خدا کی شریعت کو سننے سے انکار کرنے والا کہا گیا ہے (باب آیت ۴-۵، باب ۳۰ آیت ۹-۱۴) انجیل ہی میں ہے کہ یہودیوں نے حضرت سلیمانؑ کو شرک، بت پرستی، جادوگری اور زنا کے بدترین الزامات سے متہم کیا، انھوں نے حضرت داؤد پر اوریاہ کی بیوی سے زنا کرنے کا بھی الزام لگایا، یہی یہودی اپنی فطری سرشت سے فلسطینیوں پر جو چاہیں الزام رکھ کر ان پر قہر و ستم کا پہاڑ توڑ ڈالیں۔

مگر وہ مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان نہیں جو یہ یقین کامل نہ رکھتا ہو کہ یہ یہودی ایک دن پہلے ہی کی طرح ذلیل و خوار ہو کر رہیں گے، وہ اپنی بدکرداری، خطاکاری اور جھوٹ کی وجہ سے ہزاروں برس سے خوار ہیں، ان کی خواری ان کی خونخواری سے دور نہیں ہو سکتی، اللہ تعالیٰ نے ان کے مغضوب ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے، قرآن حکیم میں ہے کہ یہ یہودی جہاں بھی پائے گئے ان پر ذلت کی مار پڑی، لیکن اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں ان کو کبھی پناہ مل گئی تو یہ اور بات ہے (آل عمران ۱۲) اس وقت ان کو امریکہ کے اسلحہ کی وقتی پناہ ضرور مل گئی ہے لیکن قرآن حکیم ہی میں ہے کہ یہ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں ان پر محتاجی اور بے چارگی مسلط کر دی گئی ہے، اور یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوا ہے کہ یہ اللہ کی آیات سے کفر

کرتے رہے، انھوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا، یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا انجام ہے۔ (آل عمران ۱۲) قرآن حکیم میں یہ بھی پیشین گوئی ہے کہ تمھارے رب نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ قیامت تک برابر ایسے لوگ ان پر یعنی یہودیوں پر مسلط کرتا رہیگا جو ان کو بدترین عذاب دیں گے، یقیناً تمھارا رب سزا دینے میں تیز دست ہے (الاعراف ۲۰) مسلمانوں کو اسی پر یقین کامل رکھنا ہے، اس میں شک نہیں کہ اس وقت یہودی خود فلسطینی مسلمانوں کو بدترین عذاب دے رہے ہیں، اس کو فلسطینی مسلمان اپنی بداعمالیوں کی سزا سمجھیں، ایسی سزا صلیبی جنگ میں بھی مسلمان پا چکے ہیں، بیت المقدس کی فتح کے بعد عیسائیوں نے اسی اندھے تعصب کا ثبوت دیا جو آج یہودی دے رہے ہیں، تاریخ یورپ کا مصنف اے۔ جی گرانٹ رقمطراز ہے کہ صلیبیوں کے نزدیک دشمن کو قتل کرنا خدا کی عبادت کے مساوی تھا، اسی لیے انھوں نے اپنے پوپ کو لکھ بھیجا کہ اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ہم نے اپنے دشمنوں کے ساتھ کیا سلوک کیا تو اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ جب ہمارے سپاہی حضرت سلیمانؑ کے معبد میں داخل ہوئے تو ان کے گھوڑوں کے گھٹنوں تک مسلمانوں کا خون تھا۔

صلیبیوں کی فتح اور مسلمانوں کی ناکامی کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک انگریز مصنف لین پول نے لکھا تھا کہ اس وقت مسلمانوں میں ہر شخص ٹوٹے ہوئے تاج کے ٹکڑوں کے لیے دست و گریباں تھا، ایک ہمسایہ دوسرے ہمسایہ سے رشک رکھتا تھا، کوئی صاحب ہمت ان میں ایسا نہ تھا جو سب کا سردار اور ہادی بن کر دشمن سے لڑنے کو تیار ہو جاتا، یہی اسباب اس وقت یہودیوں کی کامرانی اور فلسطینیوں کی ناکامی کے ہیں، مگر جب مسلمانوں میں ان کی اصلی ایمانی حرارت اور ملی یکجہتی لوٹ آئی تو پھر عیسائیوں کی ساری متحدہ قوتیں بیکار ثابت ہوگئیں، بیت المقدس پر چار سو سال تک مسلمانوں کا قبضہ رہا، اب اس پر یہودیوں کا تسلط ہے، یہودی اپنی عارضی کامیابی پر چاہے جتنا خوش ہو لیں یہ صیہونی لڑائی صلیبی جنگ کی طرح برسوں جاری رہے گی، مسلمانوں میں جب کبھی ان کی ایمانی غیرت اور اخوی یگانگت اصلی معنوں میں عود کر آئے گی تو کوئی نورالدین زنگی اور کوئی صلاح الدین ایوبی پھر پیدا ہو کر رہے گا اور قرآن حکیم کی بشارت کے مطابق اللہ تعالیٰ ان یہودیوں پر ایسے لوگ ضرور مسلط کر دے گا جو ان کو بدترین عذاب دیں گے۔

مقالات

روسی استشراق

از

جناب محمد اسد شہاب صاحب جدہ، سعودی عرب

مترجمہ مولوی عمیر الصدیق دریابادی ندوی۔ رفیق دار المصنفین

جب استشراق اور مستشرق کے الفاظ کو مطلقاً بولا جاتا ہے تو ذہن مغربی یورپ اور امریکہ کے مستشرقین کی جانب منتقل ہوجاتا ہے۔ حالانکہ استشراق پر کسی قوم یا حکومت کی اجارہ داری نہیں ہے، مشرقی یورپ کی کمیونسٹ حکومتوں اور روس کا بھی اس میں نمایاں حصہ ہے۔ یہاں کے لوگوں نے اسلامی امور و مسائل کی جانب جس قدر اعتنا کیا ہے، وہ کسی طرح مغربی یورپ اور امریکہ کے مستشرقین سے کم نہیں ہے۔

بہت سے عرب اور مسلمان مصنفین نے یورپی استشراق و مستشرقین کے بارہ میں کتابیں لکھی ہیں، مگر روس یا مشرقی یورپ کے استشراق اور مستشرقین کے بارے میں بہت کم لکھا گیا ہے، اس مضمون میں روسی استشراق کی ابتدا اور نشو ونما کا ذکر کیا جائے گا۔

استشراق کا دائرۂ کار اور طریقۂ عمل جدا جدا ہوتا ہے، مگر اس کا خاص رخ اور مطمح نظر مخصوص مصالح و مقاصد پر مبنی ہوتا ہے، اس لیے اس کا معاملہ کبھی انفرادی اور کبھی اجتماعی ہوتا ہے۔ نیز کبھی

ہ کسی حکومت کے زیر سایہ اپنے فرائض انجام دیتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کے لیے مخصوص بجٹ
ایا جاتا ہے اور وہ کبھی اپنی حکومت کی ملکی و سیاسی مصلحتوں سے بے تعلق نہیں رہتا۔

پہلے زار روس اور اب کمیونسٹ روس کی وسط ایشیا میں کئی نو آبادیاں ہیں جیسے ازبکستان،
بکستان، قزاقستان، ترکستان، آرمینیا وغیرہ۔ یہ سب مسلم ریاستیں ہیں جن کی مجموعی آبادی ایک سو بیس
ن سے کم نہ ہوگی۔ یہ تمام ریاستیں معدنی ذخائر، پٹرول اور زرعی پیداوار سے مالامال ہیں، موجودہ
ی سامراج کی اہمیت ان ہی زرخیز ریاستوں سے وابستہ ہے۔ اگر یہ اس کے قبضہ سے نکل جائیں تو
روس کا کوئی سیاسی وزن باقی نہیں رہ جائے گا۔

روس ایک سامراجی حکومت کی طرح ان ریاستوں پر حکومت کر رہا ہے، اس نے اپنی داخلی
ارجی سیاست کے استحکام کے لیے ان ریاستوں کو زیادہ اہمیت دینے کی پالیسی وضع کی ہے، اس لیے
ان ریاستوں کے مسلمانوں کی جانب خاص توجہ مبذول کیے ہوئے ہے، اور ان کے عقائد و افکار،
ریب و ثقافت اور جذبات و میلانات کا بھی برابر مطالعہ کرتا رہتا ہے تاکہ اس کی استعماری
سیاست بھی مضبوط و مستحکم رہے اور کسی بیرونی یا اندرونی مسلم مداخلت کا بھی اندیشہ نہ رہے۔

روسی استشراق میں سیاسی مصالح کے تحت تغیر و تبدل بھی ہوتا رہتا ہے تاکہ وہ اپنی ان وسیع
یض اور شاداب و زرخیز نو آبادیوں سے بیش از بیش فائدہ اٹھاتا رہے، در اصل روس
راق کے معاملہ میں وہی طریقہ اختیار کیے ہوئے ہے جس پر ہالینڈ گامزن رہ چکا ہے، اس بنا پر
پنی تحقیق و مطالعہ اور علمی اداروں کو ایسے ناموں سے موسوم کرتا ہے جن سے اس کے اصل مقاصد
ر دہ پڑا رہتا ہے اور کہیں سے یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ ان علمی و تحقیقی کاموں کے پس پشت کچھ
مرے اغراض بھی ہیں، ہالینڈ نے تو استشراق کا لفظ بھی باقی نہ رکھا اور اس کے بجائے "اسلامی امو
نسل کا دفتر" نام رکھ کر اپنی استشراقی سرگرمیاں جاری رکھیں، ناموں کے انتخاب میں روس نے بھی

اسی اصول کو اپنایا ہے، اس کے مختلف اداروں کے کچھ نام ملاحظہ ہوں:

(۱) معہد فنون شرقیہ (انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل آرٹس) (۲) مکتب شئون اسلامیۃ (آفس آف اسلامک افیرز) (۳) دارالافتاء (۴) مشرقی علوم کے ادارے (۵) جمعیۃ اتحاد العلوم (۶) روس عرب فرینڈشپ سوسائٹی (۷) معہد الدراسات العلیا للشئون الاسلامیۃ (انسٹی ٹیوٹ آف ہائر اسٹڈیز فار اسلامک افیرز) (۸) ادارۂ دینیہ برائے امور اسلامی۔

اسی طرح کے خوبصورت اور جاذب نظر ناموں کے پردے میں مستشرقین اور اسلامی امور کے ماہرین اپنے کارنامے انجام دینے میں مصروف ہیں۔

سنہ ۱۸۵۲ء میں زار روس نے روسی مستشرقین اور عربی زبان کے ماہرین کی ایک کمیٹی جس کے بیشتر اراکین یہودی تھے، اس کمیٹی کا بنیادی اور اولین مقصد ان ضروری معلومات کی فراہمی تھا جن کے ذریعہ بیت المقدس کو آزاد کرایا جاسکے اور فلسطین میں یہودی مہاجرین کو آباد کراکے روسی وفد کے زیر انتظام ان کے مریضوں کے لیے شفاخانے قائم کیے جائیں، روسی نمایندوں نے بیت المقدس کو اپنا مرکز یہ کہہ کر بنایا کہ وہ وہاں روسی گرجاگھروں کی دیکھ بھال کریں گے۔ کیونکہ وہاں ایسے مسیحی بھی تھے جو روسی آرتھوڈوکس مسلک کے پیرو تھے، نیز ان کے زیر نگرانی مختلف انسٹی ٹیوشن تھے۔

سنہ ۱۸۶۴ء میں روس نے اس کمیٹی کے ممبروں کا ایک وفد خفیہ طور پر فلسطین بھیجا تاکہ یہ لوگ وہاں کے یتیم خانوں (آشرم) دواخانوں اور ان یہودی زائرین کی رہایش گاہوں کا جائزہ لیں جو دیوار گریہ کی زیارت کے لیے پوری دنیا سے وہاں آتے ہیں۔

سنہ ۱۸۸۲ء میں یہ کمیٹی ایک خودمختار سوسائٹی میں تبدیل ہوگئی، اس کا ایک بنیادی ضابطہ اصول بھی مرتب ہوا، اس طرح ارتقاء کا ایک مرحلہ طے ہوا۔ یہ تبدیلی محض نام کی تبدیلی نہیں تھی، بلکہ

اب دائرہ کار بھی وسیع تر ہوا، اور ایک معینہ مدت میں اس سوسائٹی نے فلسطین اور بعض دوسرے عربی ممالک میں سو سے زیادہ اسکول قائم کرلیے، ان کے دروازے گو سب نو واردوں کے لیے کھلے تھے، لیکن اکثریت یہودیوں ہی کی تھی، ان اسکولوں کے نام قومی و وطنی ناموں پر تھے، ان میں زیرِ تعلیم طلبہ کی تعداد اس وقت دس ہزار سے بھی تجاوز کرگئی تھی۔

۱۸۸۳ء میں اس سوسائٹی نے سوسائٹی آف اسلامک اسٹڈیز کی حیثیت اختیار کرلی اور اپنا تعلق ماسکو یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامیات (اسلامک اسٹڈیز) سے قائم کرلیا، سوسائٹی نے اس مقصد کے لیے ایک خاص علمی باڈی کی تشکیل کی، جس میں اسلامی تحقیق و مطالعہ سے شغف رکھنے اور عربی و اسلامی تاریخ و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو شامل کیا گیا۔

۱۸۹۱ء میں اس سوسائٹی نے ارکیولوجک مشن (بعثت اثریہ) کے نام سے عرب ملکوں کی زیارت کے لیے ایک وفد بھیجا تاکہ یہ فلسطین میں قیام کرکے وہاں کے آثار قدیمہ کا جائزہ لے۔

اس وفد نے دمشق، بیروت، حمص، حلب، حماۃ، مشرقی طرابلس، بیت المقدس اور خلیل کا دورہ کیا، اور ایک لمبی مدت تک بیت المقدس میں ان آثارِ علمیہ کی تحقیق و مطالعہ میں مصروف رہا جن کا تعلق یہودیوں سے تھا، یہ یہودیوں کے قومی وطن کو منصۂ شہود پر لانے اور اسے تاریخی دلائل سے ثابت کرنے کی تمہید تھی، وفد اس موضوع پر اپنی مکمل رپورٹ اور دستاویزات کے ساتھ ماسکو واپس آیا اور آنے کے ساتھ ہی اس نے اسلامیات کے فضلاء و ماہرین کا ایک اجتماع کیا، اس میں روسی مستشرقین کی ایک سوسائٹی کی تجویز منظور کی گئی، اس سوسائٹی کو روس کی اکاڈمی آف سائنسز کا تعاون بھی حاصل ہوا، اس سوسائٹی میں مندرجۂ ذیل روسی مستشرق شریک ہوئے،

(۱) ایف. ایس سیکوروف (۲) جے. جے کراسکوفسکی (۳) اے. این بوتستیف (۴) ایس. پی ماسلوف (۵) ایف. بیلیفونیسکایا موخر الذکر دونوں حضرات اکاڈمی آف سائنسز کے بھی ممبر تھے۔

روسی مستشرقین کی یہ پہلی سوسائٹی تھی جو سرکاری طور پر اکاڈمی آف سائنسز کے تابع تھی، اس سوسائٹی کا پہلا خاص مقصد عرب ممالک اور عرب قوموں سے متعلق ہر ہر چیز کا مطالعہ تھا، اس کے بعد پھر مسلمانوں کا دینی، معاشرتی، ثقافتی، تاریخی اور اقتصادی جائزہ لینا تھا۔

اکاڈمی آف سائنسز کے اہم فرائض میں یہ بھی تھا کہ وہ علوم اسلامیہ کے خصوصی ماہرین کو تیار کرے تاکہ وہ آیندہ روسی مستشرقین کی سوسائٹی میں داخل ہوسکیں اور ان کے اغراض و مقاصد میں ان کا ہاتھ بٹا سکیں۔

ان امور و مسائل پر روس نے جن مختلف اسباب و عوامل کی بنا پر اس قدر ا
بعض یہ ہیں:

(۱) روس اور استنبول کی خلافت اسلامیہ کے درمیان پیشینی عداوت اور دیرینہ آویزش جس کی وجہ سے ترکی و روس میں مسلسل جنگ برپا تھی۔

(۲) روس کی اپنی مقبوضہ مسلم ریاستوں کی جانب سے بغاوت کا خطرہ۔

(۳) روس کے توسیع پسندانہ عزائم جس نے اسے پڑوس کے دولت مند علاقوں کا حریص بنا دیا تھا، اور وہ بحر ابیض متوسط، خلیج عرب اور بحر عرب تک پہونچ جانے اور عالمی بحری گذرگاہوں پر قابو پانے کی فکر میں لگ گیا تھا۔

(۴) وسط ایشیا میں مسلمانوں کو دبائے رکھنا تاکہ وہ بغاوت نہ کر بیٹھیں۔

(۵) روسی سیاست کی طرف عالم اسلام کو متوجہ کر کے اس کے لیے ہمدردی اور تائید حاصل کرنا۔

ان اغراض کے پیش نظر روس نے عرب اور مسلمانوں سے متعلق ایک ایک چیز کی جانب اپنی توجہ مرکوز کی ہے۔

یہ سوسائٹی ۱۸۲۸ء میں قائم ہوئی تھی اس لیے اس نے ۱۹۱۸ء میں اپنے قیام کے نوے برس گذر جانے کا جشن منایا

یہ جشن انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز کے مرکز میں یکم مئی کو منایا گیا، یکم مئی کو روسی مزدوروں کی عید کے دن کی حیثیت حاصل ہے، اس موقع پر مستشرق ایس۔ ایل۔ تیتنفکی نے جو سوسائٹی کے صدر بھی تھے ایک جامع رپورٹ پیش کی جس میں اس سوسائٹی کی نوے سالہ کارکردگی کا جائزہ لیا گیا تھا، اس رپورٹ میں جو چیز نہایت اہم ہے وہ اس بات کا اقرار ہے کہ اس سوسائٹی نے فلسطین میں یہودیوں کے تاریخی آثار کی حفاظت اور مرمت میں نمایاں خدمات انجام دیں، سوویٹ روس نے روسی مفاد کے پیش نظر معاشی ترقی میں عربوں کے ساتھ قربت اور ہم آہنگی میں جو پیش رفت کی، اس میں اس سوسائٹی کے کردار کو بھی اہمیت حاصل رہی، اس تقریب میں مستشرق کے۔ بی۔ اسٹارکوذا نے عالم اسلام کو اپنا موضوع بنایا، مستشرق ایم۔ اے کورسٹوفنتیسف نے مصر میں قدیم فرعونی مذاہب اور توریت وزبور سے ان کا تعلق کے موضوع پر مقالہ پڑھا، مستشرق ایل۔ وائی۔ ناری رادزی نے "عرب و روس تعلقات تاریخ اور واقعات کی روشنی میں" کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔

یہ سوسائٹی مختلف اوقات میں سیمناروں، کانفرنسوں اور کانگریسوں کا اہتمام کرتی رہتی ہے ان موقعوں پر پڑھے جانے والے تمام مقالات کی طباعت و اشاعت کا انتظام بھی اسی سوسائٹی کے ذریعہ ہوتا ہے۔

چند روسی مستشرقین کے نام اور عہدے

(۱) یوبوجان غوروف، ہیڈ آف دی انسٹیٹیوٹ ماسکو (۲) بوغولوف ماہر فقہ اسلامی (۳) یو۔ بی۔ کایا، ماہر ادب عربی (۴) کریز بیفنیچ، ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ آف لینن گراڈ اور ماہر ادب عربی و تاریخ اسلامی (۵) خالیدوف، ماہر ادب عربی (۶) غرد نفسٹ ماہر بلاغت و نحو (۷) میخائیلوف ماہر ادب عربی (۸) بیوتوفسکی، ماہر تاریخ یمن (۹) یوشاکوف، ماہر سیاست و معاشیات (۱۰) سیفستلا فا ماہر ادب عربی و مذاہب (۱۱) بردوودوف ماہر ادب عربی، مذاہب اسلامیہ و سیاسی تحریکات (۱۲) شوموسکی، ماہر جغرافیہ و علم البحار (۱۳) کلیموویش

ماہر فقہ و تاریخ اسلامی (۱۴) نشانوف، ماہر فقہ اسلامی (۱۵) کلیمونیتش سوسائٹی کے ترجمان کے مدیر اعلیٰ (۱۶) سیلیاییف، اسی ترجمان کے علمی مدیر (۱۷) اسلی نیفیا (۱۸) پایروسکایا (۱۹) نالیری ٹاریس، ادیب و نقاد (۲۰) الیکزنڈر سٹین و ولیس فلسفی اور شاعر (۲۱) یوری نشین (۲۲) یوری غلاسوف عربی زبان کے ادیب و انشاپرداز (۲۳) یوری لسوف (۲۴) فلادیمیر میکسی موف، عربی زبان کے انشاپرداز (۲۵) اغناز یوسیلوف (۲۶) ایلینا عرکسا (۲۷) انیا نکار یونیوتو رلی (۲۸) تحقیقی صدر سوسائٹی (۲۹) کوروسیغنتسیف، ماہر تاریخ عربی (۳۰) نادرا دیزی، علوم و تاریخ اسلامی کے پروفیسر (۳۱) ساناروف (۳۲) اسارکووا (۳۳) میخائیل بیڈروف (۳۴) گریگوری

یہاں یہ ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مستشرق میخائیل بیڈروف جو ایک یہودی صیہونی العقیدہ مستشرق ہیں، اصل میں کون ہیں؟ یہ دوسری جنگ عظیم میں روسی فوج میں کیپٹن تھے، بعد میں یہ چیکوسلواکیہ میں فوج کی تربیت دینے چلے گئے، دوسری جنگ عظیم کے بعد روس نے ان کو ایک عرب ملک میں اپنا سفیر مقرر کیا، یہ انتہائی متعصب صیہونی مستشرق ہیں، روسی یہودیوں کو فلسطین کی جانب منتقل کرنے کے پیچھے اصل دماغ انہی کا تھا، ۱۹۳۵ء میں انھوں نے 'ارقون زدای لومی' نامی ایک جماعت قائم کی جو بعد میں اسرائیلی فوج کا ایک حصہ بنی۔

ادارہ اقوام ایشیا اس ادارہ کا مقصد بھی وہی ہے جو سوسائٹی کا ہے، البتہ یہ ادارہ ان تمام مقالات کو جو مستشرقین روس کا حاصل مطالعہ اور نتیجہ تحقیق ہوتے ہیں، جانچنے اور پرکھنے کے بعد کمیونسٹ پارٹی کی مجلس اعلیٰ کے سامنے پیش کرتا ہے، اور ان ہی مقالات کی روشنی میں عرب اور اسلامی ممالک کے بارے میں روس کی خارجہ پالیسی اپنا طریقۂ کار اختیار کرتی ہے، اس ادارہ کو نامور روسی مستشرقین کے تحت رکھا جاتا ہے، مثلاً انی بلیلیف، فلاڈمیر بوشکی، گریگوری سرباتوف، بورس دانسینغ، فلاڈمیر تس بویسکی، فرو بنکا فو روڈیسا، اس ادارہ نے عرب ممالک سے متعلق چند کتابیں بھی شایع کی ہیں،

مثلاً سوریا و لبنان (۱۹۶۳ء)، جزیرۂ عرب و خلیج (۱۹۶۵ء)، لیبیا (۱۹۶۵ء)، عراق (۱۹۶۶ء)، مصر (۱۹۶۷ء)، ان کتابوں میں مذکورہ ممالک کا انتہائی تفصیل اور تحقیق سے جائزہ لیا گیا، اس جائزہ کی ابتداء ان ممالک میں اسلام کے داخلہ کے وقت سے ہی شروع ہوتی ہے، ان کتابوں میں مذہبی رجحانات، فقہی مسالک، عام عقائد، مذہبی اختلافات، لوگوں پر ان کے اثرات، حکومت اور سیاسی تعلقات پر ان مذہبی اختلافات کا اثر، حکومتوں کی خوبیاں اور خامیاں وغیرہ مباحث پر گفتگو کی گئی ہے، اسلامی حکومتوں کے کمزور پہلوؤں پر روس اپنی سیاست کو مرکوز کر دیتا ہے، مذہبی اختلافات کے پردہ میں روس کا یہ طرز عمل رہا ہے کہ وہ مذہبی جذبات اور دینی احساسات کو برانگیختہ کرنے والے پروگرام اس طرح مرتب کرتا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان اختلافات کی آگ شدید ہو، یہ سب اس خوش اسلوبی سے انجام دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو اس کی خبر تک نہیں ہو پاتی، باہمی اختلافات اور دشمنی بڑھنے کی وجہ سے روس کے لیے یہ آسان ہو جاتا ہے کہ وہ ایسے حلقوں میں اپنا اثر و رسوخ بڑھائے اور بزعم خود نئے انقلاب پسند طبقہ اور رجعت پسندوں کے مخالف افکار کو ان حلقوں کے فکر و عمل کی زینت بنائے۔

لینن گراڈ کا کتب خانہ روس میں جتنے کتب خانے ہیں وہ سب استشراقی سوسائٹی سے تعاون کرتے ہیں، مشہور کتب خانوں میں لینن گراڈ کا کتب خانہ ہے یہ اسلامیات کے بارہ[۱۲] ہزار مخطوطات پر مشتمل ہے، خوش قسمتی سے یہ کتب خانہ کمیونسٹوں کے قبضہ کے وقت ان کے دست برد سے محفوظ رہا، اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جب بربادی کے بعد اتنی بڑی تعداد محفوظ رہی تو وہ کس قدر نایاب اور وافر ذخیرۂ کتب رہا ہوگا جسے سپرد آتش کر دیا گیا، مخطوطات کے علاوہ مطبوعات کی بھی ایک بڑی تعداد اس کتب خانہ میں ہے، جن میں عالم اسلام اور غیر عالم اسلام میں ہر زبان میں چھپنے والی کتابیں شامل ہیں، روسی قوم کو ان کتابوں کے مطالعہ کی اجازت نہیں ہے لیکن

مستشرقین کو ان کتابوں سے مراجعت اور استفادہ کا حق حاصل ہے۔

مستشرق گریگوری سرباٹوف کے بیان کے مطابق تاشقند کے کتب خانہ میں اس وقت اسی ہزار اسلامی کتابیں ہیں جن میں مخطوطات اور مطبوعات دونوں شامل ہیں، یہ کتابیں عربی، فارسی اور ترکی زبانوں میں ہیں، صرف عربی کتابوں کی تعداد پندرہ ہزار سے کم نہیں ہے، روسی مستشرقین کی محنت اور اسلامیات سے ان کے گہرے شغف کے نتیجہ میں سوسائٹی کی ازبکستان شاخ نے کئی اسلامی کتابوں کو ۱۹۴۵ء سے ۱۹۶۱ء تک روسی زبان میں منتقل کیا اور یہ عمل اب بھی جاری ہے،

مسلمانوں کے بارے میں روس کی پالیسی دوہری ہے، اندرون ملک مقبوضہ کے بارہ میں اس کا طرز عمل اس طرز عمل سے قطعی مختلف ہے جو وہ دوسرے مسلم ممالک سے روا رکھتا ہے، اپنی مقبوضہ مسلم ریاستوں میں وہ تشدد اور بیخ کنی کا رویہ اپناتا ہے۔

اسلامی ممالک میں جہاں اس کا نفوذ اور غلبہ نہیں، وہ حکومت وقت کے خلاف ہر تحریک کی تائید کرتا ہے، تخریبی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے وہ ان تحریکوں کو مادی فلسفہ سے نہ صرف روشناس کراتا ہے بلکہ گرویدہ بھی بنا دیتا ہے، مذہبی اختلافی مسائل کو نمایاں کر کے وہ نئی نسل کو جو ان اختلافات کی سطحیت سے تنگ آچکی ہوتی ہے، یہ باور کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ اس قوم کے پرانے نظریات، قومی و وطنی مصلحتوں کے لیے ضرر رساں ہیں، اسلامی نظریات کو جامد اور بے جان ثابت کرنے کی کوشش کے بعد نئی نسل کے سامنے اشتراکیت اور سعادت کی ضامن قومیت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، سوویت روس کی ایسی آماجگاہیں ایشیا اور افریقہ دونوں جگہ ہیں، روس کو یقین ہے کہ اپنے سارے امکانات اور وسائل کے ساتھ وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگا۔ ان سارے منصوبوں کی بنیاد دراصل انہی جائزوں پر ہوتی ہے جن کو روسی مستشرق پیش کرتے ہیں۔

خوبصورت اور شہد آگیں ناموں کے لیبل کے ساتھ سوسائٹی اپنے ان کاموں کو پیش کرتی ہے مثلاً کلمۃ البحث العلمی، الدراسات التطبیقیۃ وغیرہ، علمی تحقیقات اور معروضی مطالعات کے یہ لیبل محض فریب کے لیے ہوتے ہیں، حقیقت میں یہ اسلامی قوموں کے لیے زہریلے اور خطرناک مواد سے پُر ہوتے ہیں، مثلاً مستشرق کلیمووِش کی کتاب جس کا نام "الاسلام نشوۂ ومستقبلہ" ہے اس میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

"قرآن کی وہ رائیں جو کائنات، زمین اور انسان کے بارہ میں ہیں، بالکل ابتدائی ہیں، اور سائنس کے منافی ہیں"

اس قسم کے بے بنیاد دعووں سے لبریز ان تحقیقات میں صرف الفاظ کی کھتونی ہوتی ہے، علمی متانت سے بے نیاز، استہزا، تحقیر، آسمانی مذاہب پر بہتان اور عیب جوئی اور خردہ گیری کی کثرت ہوتی ہے، اور اسلامی شخصیتوں کے لیے صرف حقارت آمیز الفاظ ہوتے ہیں۔

روس کی اکاڈمی آف سائنسز نے مشرقی ادب کے مطالعہ میں تخصیص کے لیے بھی ایک ادارہ قائم کیا ہے، اس ادارہ میں مشرق کے قصوں، کہانیوں، افسانوں، دیومالائی واقعات، قومی روایات اور فنون لطیفہ کا جائزہ لیا جاتا ہے، اس ادارہ کے ذمہ دار بھی مستشرق ہوتے ہیں، یہ ادارہ روسی مستشرقین کی تالیفات کو روسی مفاد کے مطابق ترکی، عربی، فارسی، ہندی، اردو اور چینی اور دوسری زبانوں میں شایع کرتا ہے، کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی خاص ملک کے حالات کے مطابق صرف اسی ملک کی زبان میں، وہ کتاب شایع کی جاتی ہے، دوسری زبانیں اس کتاب کی قدر و قیمت سے محروم رکھی جاتی ہیں، کلیمووچ کی کتاب جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، اسی ادارہ نے شایع کی ہے۔

روسی استشراق کی سیاست منزل بمنزل

روسی استشراق نے اپنے محدود منصوبوں میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اپنی سرگرمیوں کو تیز تر کرنے کا پروگرام بنایا اور مختلف سیمیناروں، کانفرنسوں کے

ذریعہ انھوں نے اپنی اشاعت کے نئے طریقے اپنائے، یہ سمینار وغیرہ وسط ایشیا کے شہروں میں خاص طور سے منعقد کرائے گئے کہ وہاں اسلام کا نام اب بھی باقی ہے۔

صدی کی ستروں دہائی میں ماسکو میں ایک عالمی مذاہب کانفرنس ہوئی، جس میں تمام مذاہب کی ممتاز شخصیتوں کو مدعو کیا گیا، مقصد یہی تھا کہ دنیا والوں کے سامنے خصوصاً ان لوگوں کے سامنے جو یہ کہتے ہیں کہ روس آسمانی مذاہب سے برسرپیکار رہے، یہ ثابت کیا جائے کہ روس مذاہب سے جنگ نہیں کرتا بلکہ وہ آسمانی مذہبوں کی حمایت کرتا ہے، جس کی دلیل یہ کانفرنس ہے، اس کانفرنس کے بعد تاشقند میں ایک اسلامی کانفرنس منعقد ہوئی۔ [illegible] میں ازبکستان میں مشہور مسلمان فلسفی ... کی یاد میں ایک بڑا جشن منایا گیا، ایک جشن ابن سینا کی یاد میں بھی منایا گیا، ترکستان میں کے مسلمانوں کے دینی ادارہ کی تاسیس کے تیس ۳۰ سال گذر جانے پر بھی ایک جشن کا اہتمام کی یاد میں بھی محفل جشن منعقد ہوئی، ان تمام جلسوں، کانفرنسوں اور سمیناروں میں روس کی دعوت عالم اسلام کی ممتاز اور مایۂ ناز شخصیتیں شریک ہوتی رہیں، سوسائٹی کی ہدایات پر عمل پیرا روس نے بعض مسلمانوں کا اعتبار بھی حاصل کر لیا تھا کہ اسلام، کمیونسٹ نظام حکومت کے سایۂ عاطفت میں خیر و عافیت سے ہے، اور یہ کہ مسلمان روس میں آزاد و خودمختار ہیں، کانفرنسوں میں شریک ہونے والے مندوبوں سے بھی اس کی شہادت دلائی گئی، روس ان موقعوں پر یہ بھی اعلان کرتا رہا کہ وہ اسلامی آثار و باقیات کی نگہبانی و حفاظت کر کے روس میں اسلام کا نام زندہ کیے ہوئے ہے، نیز وہ مساجد و مقابر کی مرمت میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرتا، چنانچہ امام بخاری اور امام ترمذی کی قبروں کی دیکھ بھال بھی اس نے کرائی ہے۔

انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی طرف سے ایک ماہوار رسالہ 'سائنس اور مذہب' کے نام سے شائع ہوتا ہے، اسے روسی مستشرقین کی اکثریت کا قلمی تعاون حاصل ہے، اس رسالہ کے پہلے شمارہ میں

س اسلامی انسٹیٹیوٹ کے دستور واغراض ومقاصد تحریر کیے گئے ہیں: (۱) مسلمانوں کے درمیان سے روحانی معنویت کو کمزور کرنا، ان کو ان کے عقائد سے دور کرنا اور ایسے افکار ونظریات کو نشوونما دینا جو ان کے دین میں شک وشبہہ پیدا کر دیں۔ (۲) مسلمانوں میں دلکش مادی چیزوں کو خوبصورت اور جاذب اسلوب میں پیش کر کے فساد پیدا کرنا اور ایسی صورت حال پیدا کر دینا کہ وہ اشتراکیت کے حلقہ بگوش ہونے کے لیے خود بخود آمادہ ہو جائیں۔ ان دونوں مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اس نے جو اسباب ووسائل اختیار کیے وہ مندرجہ ذیل ہیں: اسلامی تعلیمات ونظریات کو قدیم، فرسودہ اور بوسیدہ ثابت کیا جائے، اور اس طرح یہ تسلیم کیا جائے کہ سائنس کے دور میں ان نظریات کا زمانہ کے قدم بہ قدم چلنا ممکن نہیں رہا، اشتراکی نظریہ اور اس کے مادی فلسفہ کی تائید میں خود مسلمان علماء وزعماء کے اقوال پیش کیے جائیں کہ تنہا یہی فلسفہ انسان کی خوشحالی کا ضامن ہے اور ان مذہبی اختلافات سے بچاتا ہے جو انسانیت کے لیے مضر اور مسلمانوں کو پسماندگی کی جانب لے جانے والے ہیں، اسلام سے پہلے کے تہذیبی ورثہ کا احیاء اس طرح کیا جائے کہ اس تہذیب پر فخر کیا جا سکے اور ہر اس شخص کی تائید کی جائے جو اسلام سے پہلے کے تہذیبی ورثہ کے احیاء کا کام کرتا ہو، ایسے مصنفین کی کتابیں خرید کر انھیں تقسیم کے لیے دوسری جگہوں میں بھیج دیا جائے۔

ان مقاصد اور ان وسائل کے ذریعہ مسلمانوں کی نئی نسلوں پر اپنا اثر ورسوخ قائم کرنے کی یہ روسی کوششیں کسی مزید تشریح کی محتاج نہیں، ایک روسی صحافی شارلوٹ سالکوسی کا بیان ہے کہ سوویٹ یونین نے سوسائٹی کی تجویز کے مطابق بیرون ملک کے اسلام پر کام کرنے والے غیر مسلم ریسرچ اسکالروں میں مفت تقسیم کرنے کے لیے تو قرآن مجید کے نسخے شایع کیے مگر خود روس کے اندر انھیں تقسیم نہیں کیا گیا، استاذ یوسف فراج لکھتے ہیں:

"اسلام کے بارے میں سوویٹ روس کی پالیسی دورخی ہے، اندرون ملک مکمل دشمنی اور بیرون ملک

دقتی و وستی، مثلاً تاشقند کے ایک اسلامی ادارہ نے ایک عمدہ کتاب شایع کی جو روس میں اسلام کی زندۂ جاوید یادگاروں کی رنگین تصویروں سے مزین تھی، یہ کتاب بیرون ملک کے ممتاز مسلمانوں میں تقسیم کی گئی، اس میں ایک مسجد اور مشہور مسلمان احمد یاسفی اور باشلیغان محمد کی قبروں کی تصویریں بھی شامل تھیں لیکن روس نے یہ ذکر نہیں کیا کہ یہ دونوں شاندار عمارتیں اب کمیونسٹوں کے لیے بطور ڈاک بنگلہ استعمال ہو رہی ہیں، روس میں پروپیگنڈہ کے لیے جو لٹریچر شایع کیا جاتا ہے وہ بجز چند استثنائی صورتوں کے اکثر روس میں ناپید ہوتا ہے، چنانچہ قرآن مجید کا ایک نہایت عمدہ اڈیشن شایع کیا گیا جو غیر ملکوں کے مسلمان فضلاء کے پاس تو بھیجا گیا مگر وہ خود روس میں عنقا ہی رہا[1]"

قرآن مجید کا یہ نسخہ باوجود تلاش بسیار کے ماسکو میں نہیں مل سکا، قرآن مجید کی طباعت ماسکو کے پروپیگنڈے کا محض ایک جزو تھا، قرآن مجید کے بارے میں روسی مستشرقین کے خیالات کا اندازہ اس قول سے لگایا جا سکتا ہے:

"قرآن اپنی ترکیب کے لحاظ سے ایک پیچیدہ کتاب ہے، جس میں عربوں، یہودیوں، عیسائیوں اور زرتشتیوں کے قصے اور دیومالائی کہانیاں بڑی تعداد میں بیان کی گئی ہیں، چنانچہ حضرت موسیٰ حضرت یوسف، یونس اور عیسیٰ مسیح وغیرہم کے قصے ہی اس کتاب کا بڑا جزو ہیں۔"

دارالفنون تاشقند یہ ادارہ مطالعات آداب شرقیہ کے شعبہ کے ماتحت ہے، یہاں بھی ایشیا کے قصے کہانیوں اساطیری روایات اور کلاسیکی ادب پر داد تحقیق دی جاتی ہے، اور عربی و اسلامی ادب پر ہی خاص طور پر عنایت کی نظر مرکوز کی گئی ہے، لینن گراڈ کے مستشرقین اس ادارہ کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔

---

[1] انتصار الاسلام ص ۴۹.

سنہ ۶۴ء کے بعد سے اس ادارہ نے کئی عربی و فارسی کتابوں کو روسی زبان میں منتقل کیا ہے، تونس، الجزائر، مصر، عراق بلکہ تمام عرب ممالک اور ہندوستان، افغانستان اور ایران کے اہل قلم کی نئی کتابوں کو جن کا تعلق افسانہ، کہانی اور شاعری سے ہو یہ ادارہ روسی زبان میں منتقل کرتا ہے، عرب مصنفوں میں احسان عبدالقدوس اور توفیق الحکیم کی کتابیں خاص طور سے روسی زبان میں منتقل ہوئی ہیں ان کتابوں سے روسی مستشرقین اور استشراق نو آموز طلبہ نے بڑی رغبت کا اظہار کیا ہے، یہاں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ محض ان کتابوں کی علمی و فنی قدر و قیمت ہی ان کی مقبولیت کا سبب نہیں ہوتی، بلکہ ان کتابوں کے صفحات کے دریچوں سے جس معاشرہ کی جھلک نظر آتی ہے، افراد کے جو خط و خال سامنے آتے ہیں اور قوموں میں ان قصوں، کہانیوں اور اشعار کا جو ناگزیر اثر ہوتا ہے، وہ ان مستشرقین کے لیے خام مواد فراہم کرتا ہے، اسی پر روسی مطالعہ اور تجزیہ کا دارومدار ہوتا ہے

بیرونی کتابوں کی حوصلہ افزائی

یہ ادارہ بیرون ملک کے مصنفین کی ان کتابوں کو بہت اہمیت دیتا ہے جن میں اشتراکیت کی روح جلوہ گر ہو، مثال کے طور پر انڈونیشیا کے مارکسی ادیب پرامودیا اننتا تور کی کتابیں شایع ہوتے ہی مکتبوں سے چند مہینوں میں غائب ہو جاتی ہیں، اخباروں اور رسالوں میں ان کتابوں کی مقبولیت پر مضامین لکھے جاتے ہیں، ایک جائزہ کے مطابق یہ معلوم ہوا کہ روسی دائرۂ اثر کے تحت کام کرنے والا ایک ادارہ مکتبوں سے تمام کتابیں خرید لیتا ہے، پھر مؤلف و ناشر کے علم کے بغیر جسے مناسب سمجھتا ہے ان کتابوں کو بطور ہدیہ پیش کرتا ہے، ظاہر ہے مؤلف کو اپنی کتابوں کی اس قدر مقبولیت پر فخر ہوتا ہے اور ناشر کو مزید اڈیشن شایع کرنے کا حوصلہ ملتا ہے اور اس طرح ماسکو کو ادبی و سیاسی فائدہ حاصل ہوتا ہے، اس قسم کی مثالیں دوسری زبانوں کی مطبوعات مثلاً سریانی، کردی، آرمینی، ترکی، عربی وغیرہ میں بھی ملتی ہیں۔

مسلم ممالک کے موجودہ اور مسلسل بحران پر اگر نظر ڈالی جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ ہر واقعہ اپنے

پیش رو واقعہ سے جڑا ہوا ہے، اور واقعات کے اس تسلسل میں متعلقہ زبانوں کے رسائل اور اخبارات کا بڑا ہاتھ نظر آتا ہے جو قومیت، مقامی تہذیب اور قدیم تمدن کے تازہ خداؤں کی حمد و ثنا کی دعوت دیتے ہیں، پاکستان میں بنگالی قومیت اور بنگلہ زبان پر حد سے زیادہ فخر کیا جاتا تھا، بالآخر بنگلہ تحریک کے زیر اثر بغاوت پھیلی اور ایک ملک دو نیم ہو گیا، عرب دنیا میں ہر عرب ملک اپنے محدود و مختصر خطہ زمین کے گن گا رہا ہے اور ایک زبان، ایک ثقافت اور ایک تمدن ہونے کے باوجود ایک مکمل عربی اکائی کا وجود دشوار نظر آتا ہے۔

جب مسلمانوں میں کوئی رخنہ پیدا ہو یا کسی ترقی پذیر قوم میں کوئی دراڑ پڑ جائے اور یہ عقائد و مسائل سے متعلق ہوں تو روسی مستشرقین کی نگاہ ان موقعوں کو منتخب کر لیتی ہے اور دکھانے لگتی ہے۔

۱۹۵۶ء میں روسی مستشرقین کی ایک کانفرنس میں مستشرق سرکوف نے کہا تھا کہ ہماری حکومت چاہیے کہ وہ تیسری دنیا یعنی غیر وابستہ ممالک کے ساتھ اپنے تعلقات کو زیادہ اہمیت دے، ظاہر ہے تیسری دنیا کے اکثر ممالک اسلامی ہی ہیں، اور ہوا بھی یہی کہ روس نے اپنی ریشہ دوانیوں کے لیے سازگار ماحول اسی تیسری دنیا کا پایا۔

۱۹۶۹ء کی ایک کانفرنس | جنوری ۱۹۶۹ء میں اکاڈمی آف سائنسز کے زیر اہتمام روسی مستشرقین کی ایک اہم کانفرنس ماسکو میں منعقد ہوئی، اس کا موضوع "دینی نفسیات" تھا، اس میں عالم نفسیات مستشرق بلاٹونوف نے کہا:

"تدین (مذہب پرستی) کے نفسیاتی مظاہر یا کسی بھی منظر کی کوئی بنیاد نہیں ہے، یہ فردی ذاتیات جا ہی کے حتمی نتیجہ کی صورت میں نمو پاتا ہے، مذہب کا وجود انسانوں میں خوف کا شعور پرورش کرتا ہے اور بیکاری یا فرصت واقعیت سے بعید خیالات کی تخلیق کرتی ہے، حالانکہ خیالات کو پاک

کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، اس شعور سے لاشعور پیدا ہوتا ہے، یہ نہایت اہم ہے کہ ان عناصر کا سائنسی تجزیہ کیا جائے، تاکہ انسان میں مذہبی شعور کی موجوں کا کامیابی سے مقابلہ کیا جا سکے۔"

انسان کی طبیعت میں بنیادی مذہبی جذبات کے بارے میں ایک اور ماہر نفسیات مستشرق فویجیل کہتے ہیں:

"مذہبی اعتقادات کو ایک ضروری حاجت بنانے میں مذہبی احساسات کا کردار نہایت اہم ہوتا ہے۔"

لینن گراڈ کے ماہر نفسیات باؤڈیجین کا قول ہے کہ:

"مذہب پرستی کا منظر انتہائی جذباتیت اور ذہنی فساد کے نتیجہ میں صادر ہوتا ہے۔"

کیف کے مستشرق پی۔ اے۔ لوبوہنیک کا خیال ہے:

"مذہبی ذہنیت کا انسان دنیا کو ۲ دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ ایک تو عالم طبیعی، دوسرا عالم مافوق الطبیعی، ایسے انسان کی مدد یوں کی جا سکتی ہے کہ اس کے طبیعیاتی تصورات کو تقویت دی جائے اور خیالات کی اصلاح کی جائے۔"

لینن گراڈ کے ایک اور مستشرق ڈی ڈی ابتکمان کہتے ہیں:

"بنیادی طور پر ایک غیر مذہبی شخص ماحول کے اثرات سے مذہبی ہو سکتا ہے۔"

آر۔ بوکین کا اعتقاد ہے کہ

"مذہبی احساسات اگرچہ شاذ ہیں، لیکن اصل بنیاد یہی ہیں اور انہی پر مذہبی تصورات کی بنیادیں استوار ہیں۔ جو محض وہم اور فریب ہیں، چونکہ دینی احساسات کا مقابلہ احساسات ہی سے کیا جا سکتا ہے اس لیے یہ ممکن ہے کہ اس مذہبی شعور کی جگہ دوسرے احساسات کو ترغیب و ترہیب کے ذریعہ بدل دیا جائے۔"

مسلمانوں کے بارہ میں مستشرق بجاکونسکی کے مبلغ علم کا اندازہ اس قول سے ہو سکتا ہے:

"اس دنیا میں لوگ ہمیشہ خدا کے وجود کے معتقد رہے، گو اس اعتقاد میں مذہبی روایات و خرافات کا اثر کارفرما رہا، مسلمان بھی انہی لکیروں پر چل رہے ہیں جن کو قرآن نے ابھارا ہے، ان روایات میں سے یہ بھی ہے کہ وہ ہمیشہ جسے وہ رمضان کہتے ہیں کھانے پینے سے باز رہتے ہیں"

مشہور مستشرق کلیمو فیتش جن کا ذکر اوپر بھی آچکا ہے کہتے ہیں:

"کسی بھی مذہب پرست قوم کی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک وہ اپنے مذہبی عقائد کو بالکلیہ نہ ختم کر دے اور انسانیت کو گمراہ کرنے والے اپنے بوسیدہ افکار کو یکسر ترک نہ کر دے، مذہب کا خاتمہ ترقی کا تقاضا ہے اور اس کے لیے یہ کار واجب ہے۔"

جمال الدین افغانی کی پان اسلامزم تحریک کے بارہ میں کلیمو فیتش کا خیال ہے کہ:

"انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں پان اسلامزم تحریک کی فکر مشرق میں ظاہر ہوئی، یہ رجعت پسندانہ سیاسی تحریک تھی۔"

اسلام کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ:

"اسلام کی اپنی خاص تاریخ ہے، اس کے عقائد، روایات اور خاص رسم و رواج ہیں، اسلام کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان تاریخی حالات کا مطالعہ کیا جائے جن میں اسلام کی نشو و نما ہوئی۔

عرب سے باہر اسلام کے پھیلنے کی وجہ مسلمانوں کے فوجی حملے اور ان کی فتوحات ہیں، ایشیا و افریقہ کے تہذیب یافتہ ممالک کے باشندوں کو غلام بنا لیا جانا بھی اسلام کے پھیلنے کی ایک وجہ ہے، عربی فوجوں کے لشکر جب شہروں اور بستیوں پر قبضہ کرتے تو بربادی و پامالی کی جانب جلدی کرتے، لوٹ کھسوٹ، مقبوضہ علاقوں کے باشندوں کو غلام بنالیتے اور ان باشندوں کی اکثریت کو برباد کر دینا ان کا شیوہ تھا، مسلمانوں کا خلیفہ جو ایک بڑی حکومت کا صدر ہوتا تھا

کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، اس شعور سے لاشعور پیدا ہوتا ہے، یہ نہایت اہم ہے کہ اس عنصر کا سائنسی تجزیہ کیا جائے، تاکہ انسان میں مذہبی شعور کی موجوں کا کامیابی سے مقابلہ کیا جاسکے۔"

انسان کی طبیعت میں بنیادی مذہبی جذبات کے بارے میں ایک اور ماہر نفسیات مستشرق فویجیل کہتے ہیں:

"مذہبی اعتقادات کو ایک ضروری حاجت بنانے میں مذہبی احساسات کا کردار نہایت اہم ہوتا ہے۔"

لینن گراڈ کے ماہر نفسیات باوڈیچین کا قول ہے کہ:

"مذہب پرستی کا مظہر انتہائی جذباتیت اور ذہنی فساد کے نتیجہ میں صادر ہوتا ہے۔"

کیف کے مستشرق بی۔ اے۔ لوبوچیک کا خیال ہے:

"مذہبی ذہنیت کا انسان دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ ایک تو عالم طبعی، دوسرا عالم مافوق الطبعی، ایسے انسان کی مدد یوں کی جاسکتی ہے کہ اس کے طبیعیاتی تصورات کو تقویت دی جائے اور خیالات کی اصلاح کی جائے۔"

لینن گراڈ کے ایک اور مستشرق ڈی۔ ڈی۔ ایتسکمان کہتے ہیں:

"بنیادی طور پر ایک غیر مذہبی شخص ماحول کے اثرات سے مذہبی ہو سکتا ہے۔"

آر۔ یوکین کا اعتقاد ہے کہ

"مذہبی احساسات گرچہ شاذ ہیں، لیکن اصل بنیاد یہی ہیں اور انہی پر مذہبی تصورات کی بنیادیں استوار ہیں جو محض وہم اور فریب ہیں، چونکہ دینی احساسات کا مقابلہ احساسات ہی سے کیا جاسکتا ہے اس لیے یہ ممکن ہے کہ اس مذہبی شعور کی جگہ دوسرے احساسات کو ترغیب وتربیت کے ذریعہ بدل دیا جائے۔"

مسلمانوں کے بارہ میں مستشرق جاکوبنسکی کے مبلغ علم کا اندازہ اس قول سے ہو سکتا ہے:

"اسے یقین ہے کہ لوگ ہمیشہ خدا کے وجود کے معتقد رہے، مگر اس اعتقاد میں مذہبی روایات و خرافات کا اثر کارفرما ہے، مسلمان بھی انہی لکیروں پر چل رہے ہیں جن کو قرآن نے ابھارا ہے، ان روایات میں سے یہ بھی ہے کہ وہ مہینہ بھر جسے وہ رمضان کہتے ہیں کھانے پینے سے باز رہتے ہیں"

مشہور مستشرق کلیمو فنیش جن کا ذکر اوپر بھی آچکا ہے کہتے ہیں:

"کسی بھی مذہب پرست قوم کی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک وہ اپنے مذہبی عقائد کو بالکلیہ نہ ختم کر دے اور انسانیت کو گمراہ کرنے والے اپنے بوسیدہ افکار کو یکسر ترک نہ کر دے، مذہب کا خاتمہ ترقی کا تقاضا ہے اور اس کے لیے یہ کار واجب ہے۔"

جمال الدین افغانی کی پان اسلامزم تحریک کے بارہ میں کلیمو فنیش کا خیال ہے کہ:

"انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں پان اسلامزم تحریک کی فکر مشرق میں ظاہر ہوئی، یہ تحریک رجعت پسندانہ سیاسی تحریک تھی۔"

اسلام کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ:

"اسلام کی اپنی خاص تاریخ ہے، اس کے عقائد، روایات اور خاص رسم و رواج ہیں، اسلام کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان تاریخی حالات کا مطالعہ کیا جائے جن میں اسلام کی نشوونما ہوئی۔

عرب سے باہر اسلام کے پھیلنے کی وجہ مسلمانوں کے فوجی حملے اور ان کی فتوحات ہیں، ایشیا و افریقہ کے تہذیب یافتہ ممالک کے باشندوں کو غلام بنالیا جانا بھی اسلام کے پھیلنے کی ایک وجہ ہے، عربی فوجوں کے لشکر جب شہروں اور بستیوں پر قبضہ کرتے تو بربادی و پامالی کی جانب جلدی کرتے، لوٹ کھسوٹ، مقبوضہ علاقوں کے باشندوں کو غلام بنالینا اور ان باشندوں کی اکثریت کو برباد کر دینا ان کا شیوہ تھا، مسلمانوں کا خلیفہ جو ایک بڑی حکومت کا صاحب ہوتا تھا

اس کی ذات میں دینی، فوجی اور شہری اقتدار اعلیٰ بیک وقت جمع ہو جاتا۔

اسلام کے کاہنوں (علماء) کا فرض سب سے پہلے یہ ہوتا کہ وہ لوگوں کو خلیفہ کی اطاعت پر آمادہ کریں اور اس طرح وہ کھلے مالی استحصال کے لیے وجہ جواز قائم کرتے، جو اس دور میں عام تھا۔

چونکہ خلافت کے عہد میں اسلام، حکومت کا سرکاری مذہب ہوتا تھا۔ اس لیے حالات خود بخود ان کاہنوں (علماء) کو ممتاز مقام دینے میں معاون ہوتے"۔

کلیمو فینتش نے اپنی کتاب "اسلام، ماضی اور مستقبل" کو جس کے اقتباسات اوپر پیش کیے گئے اس مشہور فقرہ پر ختم کیا ہے، یہ جملہ کتاب "مارکس و اینجلز" سے نقل کیا گیا ہے:

"مذہب ایک ذہنی سعادت ہے اور حقیقی سعادت کے حصول کے لیے اس کا خاتمہ بہت ضروری ہے۔ مارکس کا قول ہے کہ مذہب ایک تاریخی مظہر ہے جس کی جڑیں طبقاتی معاشرہ میں پیوست ہیں اور پنپتی ہیں"۔

اس جائزہ کے بعد اس حقیقت میں کوئی شبہہ باقی نہیں رہتا کہ روسی استشراق اپنے حقیقی رجحانات و مقاصد میں اسلام کے خلاف علانیہ اور پیہم برسرپیکار ہے۔

امام ابوحفص ابن شاہین بغدادیؒ

از مولانا قاضی اطہر مبارک پوری، اڈیٹر البلاغ، بمبئی،

چوتھی صدی کے ائمۂ حدیث و تفسیر میں حافظ ابوحفص ابن شاہین بغدادی متوفی ۳۸۵ھ رحمۃ اللہ علیہ صاحبِ تصانیف کثیرہ و عجیبہ محدث ہیں، اس مقالہ میں ان کے حالات اور ان کی تصانیف خصوصاً ایک اہم اور نادر کتاب تاریخ اسماء الثقات کا تذکرہ و تعارف مقصود ہے۔

اس سلسلہ میں ماخذ کے طور پر حسب ذیل کتابیں میرے پیش نظر ہیں۔ (۱) تاریخ بغداد خطیب بغدادیؒ، (۲) تذکرۃ الحفاظ ذہبیؒ، (۳) العبر فی خبر من غبر ذہبیؒ، (۴) لسان المیزان ابن حجرؒ، (۵) المنتظم ابن جوزیؒ، (۶) مرآۃ الجنان یافعیؒ، (۷) شذرات الذہب ابن عمادؒ، (۸) طبقات المفسرین داؤدی مصریؒ، (۹) الرسالۃ المستطرفہ کتانیؒ، ان کتابوں کے علاوہ النجوم الزاہرہ ابن تغری بردیؒ اور غایۃ النہایہ فی طبقات القراء ابن الجزریؒ میں امام ابن شاہین کے حالات ہیں، مگر افسوس کہ فی الحال یہ کتابیں سامنے نہیں ہیں، مدت ہوئی غایۃ النہایہ سے استفادہ کیا تھا۔

خطیب بغدادی صرف ایک واسطے سے ابن شاہین کے شاگرد ہیں اس لئے تاریخ بغداد میں ان کے حالات نسبۃً تفصیل سے ہیں بعد کے تذکرہ نگاروں نے اس پر بہت کم اضافہ کیا ہے، وہ تقریباً سب کا ماخذ تاریخ بغداد ہے۔

ہمارے علم میں اردو زبان میں سب سے پہلے مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارک پوریؒ نے

کتاب الجنائز کے مقدمہ میں حافظ ابن شاہین کا مستقل تذکرہ کر کے ان کی کتاب الجنائز کی نشاندہی کی ہے، یہ تذکرہ گو مختصر ہے مگر طبقات المفسرین اور الرسالۃ المستطرفہ کے تذکرہ کی طرح اختصار کے باوجود اہمیت رکھتا ہے، یہ اتفاق علم وتحقیق کے لئے "حسن اتفاق" ہے کہ ان کا تذکرہ ایک مبارکپوری نے مختصر طور پر اور دوسرے مبارک پوری نے مفصل طور پر لکھا۔

نام ونسب، وطن اور ولادت، خطیب نے اپنے استاد ابو الفتح عبدالکریم بن محمد محاملی کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ ہم سے ہمارے استاد ابن شاہین نے بیان کیا ہے کہ میرا نام ابوحفص عمر بن احمد بن عثمان بن احمد بن محمد بن ایوب بن ازداذ بن سراج بن عبدالرحمٰن ہے۔ میں نے اپنا نسب نامہ اسی طرح اپنے والد کی کتابوں میں پایا ہے، ہماری اصل علاقہ خراسان کے شہر مَرو روذ سے ہے، میرے نانا کا نام احمد بن علی بن یوسف ابن شاہین شیبانی ہے، میں نے اپنی تاریخ ولادت اپنے والد کی ایک کتاب کی پشت پر یوں دیکھی ہے: "میرا لڑکا عمر صفر ۲۹۷ھ میں پیدا ہوا"[1]

بعد کے عام تذکرہ نگاروں نے حافظ ابن شاہین کی تاریخ ولادت صفر ۲۹۷ھ ہی لکھی ہے مگر شمس الدین محمد بن علی داؤدی مصری متوفی ۹۴۵ھ کی کتاب طبقات المفسرین میں ۲۷۷ھ لکھی ہے، ولد سنۃ سبع وسبعین ومأتین[2] غالباً نسخ یا طبع کی غلطی سے اس میں تسعین (نوے) کے بجائے سبعین (ستر) ہو گیا ہے، اور مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارکپوری صاحب تحفۃ الاحوذی نے کتاب الجنائز کے مقدمہ میں ان کا سن ولادت ۳۰۳ھ لکھا ہے[3] جو درحقیقت ابن شاہین کی کتابت حدیث کی ابتداء کا سن ہے، جیسا کہ خود ان کا بیان آگے آئے گا، لسان المیزان میں سلسلۂ نسب میں اوپر کا نام ازداذ کے بجائے یزداد ہے،[4] یزداد نام کے دو محدث کا تذکرہ تاریخ بغداد میں ہے، ایک یزداد بن موسیٰ بن جمیل بن سیّال، اور دوسرے یزداد بن عبدالرحمٰن بن محمد بن

ص ۲۹۳

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۱، ص ۲۶۵ [2] طبقات المفسرین ج ۲ ص ۲ [3] کتاب الجنائز ص ۳ [4] لسان المیزان ج ۴

...داد مروزی، نیز یمن میں یزداد نام کے ایک آدمی تھے جن کے بیٹے عیسیٰ بن یزداد ہیں، عیسیٰ کی صحابیت میں اختلاف ہے، [۱]

ہمارے خیال میں ازداذ، یزداد ایک ہی نام کے دو تلفظ ہیں، اور یہ عجمی نام ہے،

طبقۂ محدثین میں ابوحفص ابن شاہین یا صرف ابن شاہین کی کنیت سے مشہور ہیں، بعض دوسرے محدثین اور اہل علم بھی اس نام کے ہیں مگر ان کو یہ شہرت حاصل نہیں ہے، ابن شاہین کی کنیت ان کے نانا کے پردادا کے نام پر ہے، ان کا بیان ہے۔

وجدی لامی اسمه احمد بن محمد بن یوسف ابن شاهین الشیبانی	میرے نانا احمد بن محمد بن یوسف بن شاہین شیبانی ہیں،

سلسلۂ پدری سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن شاہین کا نسلی تعلق عجم سے ہے البتہ سلسلۂ مادری کے اعتبار سے وہ عرب کے مشہور قبیلہ بنو شیبان سے تعلق رکھتے ہیں، مگر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ تعلق نسبی ہے، یا ولاء اور اسلام کا تعلق ہے۔

ابن شاہین کی ولادت بغداد میں ہوئی، ان کا مکان مشرقی جانب ایک میدان کے کنارے ہیزم فروشوں کے عقب میں واقع تھا، ان کا خاندان خراسان کے شہر مرو روذ سے تعلق رکھتا تھا، یہ معلوم نہ ہوسکا کہ کس زمانہ میں وہاں سے بغداد آیا، ابن شاہین کا بیان ہے۔

واصلنا من مرو الروذ من کورة خراسان	ہمارا خاندان علاقہ خراسان کے شہر مرو روذ کا ہے۔

خراسان میں مرو الروذ اور مرو الشاہجان دو بڑے شہر تھے، ان کے درمیان پانچ دن کی

---

[۱] الاستیعاب ج ۲ ص ۳۰۰،

مسافت تھی، مَرْو سفید پتھر کو کہتے ہیں جس سے آگ پیدا ہوتی ہے یعنی چقماق اور رودندی یا دریا کو کہتے ہیں، شہر مرو رود ایک بہت بڑے دریا کے کنارے پر آباد تھا۔ اور مرو شاہجان سے چھوٹا تھا، اس شہر سے بہت سے اہل علم و فضل پیدا ہوئے ہیں، جو مرو رودی اور مروذی کی نسبت سے مشہور ہیں، اس کے مقابلہ میں مرو شاہجان کی طرف نسبت مروزی ہے۔[1]

ابن شاہین کا گھرانا پہلے سے علم و فضل اور مال و دولت میں شہرت رکھتا تھا، ان کے والد ابوالطیب احمد بن عثمان بغداد کے مشہور محدث اور عالم اور پیشہ کے اعتبار سے کسا یعنی تاجر تھے، انھوں نے فضل بن موسیٰ ہاشمی، محمد بن احمد بن جنید دقاق، عبداللہ بن روح مدائنی، اور اس طبقہ کے دیگر مشہور رجال حدیث سے روایت کی تھی، اور ان سے ان کے صاحبزادے ابوحفص ابن شاہین کے علاوہ ابوالحسین بن سمعون اور عبداللہ بن محمد بن قیس بزاز وغیرہ نے روایت کی تھی، بقول خطیب ثقہ محدث تھے، ابن شاہین کا بیان ہے کہ میرے والد رجب ۳۲۰ھ میں فوت ہوئے، اور بغداد کے محلہ باب التین میں دفن کئے گئے،[2] اس وقت ابن شاہین تیس سال کے طالب علم تھے۔

تحصیل و تکمیل امام ابن شاہین نے ایسے ماحول اور مقام میں آنکھ کھولی جس میں دین اور دنیا دونوں کے حسنات و برکات موجود تھے، بغداد دین و دنیا کا مجمع البحرین تھا۔ اس کا ہر گھر دار العلم اور ہر مکان دارالمذاکرہ تھا، خود ابن شاہین کے والد ثقہ محدث اور کامیاب تاجر تھے، انھوں نے اپنے بچے کی تعلیم و تربیت پر پوری توجہ دی جس کے نتیجہ میں گیارہ سال کی عمر میں مکتب سے نکل کر محدثین کے حلقۂ درس میں بیٹھنے کے قابل ہو گئے، خود ان کا بیان ہے۔

واول ماکتبتُ الحدیثَ مما	سب سے پہلے بحالت عقل و شعور
عقلتہ وکتبتُ بیدی فی سنۃ	میں نے ۳۰۸ھ میں اپنے ہاتھ سے

---

[1] معجم البلدان ج ۸ ص ۳۰ [2] تاریخ بغداد ج ۴ ص ۲۹۸

ثمان وثلث مائة وکان لی	حدیث سنکر لکھی، اس وقت میری عمر
احدی عشر سنة وکذا	گیارہ سال کی تھی، اور اسی طرح اسی
کتب ثلاثة من شیوخنا فی	عمر میں میرے تین اساتذہ نے بھی حدیث
هذا السن فتبرکت بهم،	کی کتابت شروع کی تھی اور اس حسن
	اتفاق سے میں نے خیر و برکت پائی ۔

ایک روایت میں ابن شاہین کا بیان یوں ہے ۔

واول سماعی فی سنة ثمان	سب سے پہلے میرا حدیث کا سماع ۳۰۸ھ
وثلث مائة فتفاءلت	میں ہوا اس بارے میں میں نے اپنے جلیل
فی ذلک بشیوخی النبلاء و	القدر شیوخ سے نیک فال لی، اور امید
رجوت ان اکون مثلهم[1]	کی کہ میں بھی ان کے مانند ہو جاؤں گا،

ان کے یہ تین شیوخ، امام ابوالقاسم عبداللہ بن محمد بن عبدالعزیز بغویؒ، امام ابومحمد یحیٰ بن محمد بن صاعدؒ، اور امام ابوبکر عبداللہ بن سلیمان بن اشعث سجستانیؒ ہیں، جو گیارہ سال کی عمر میں حدیث کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے، اور آفتاب و ماہتاب بنکر نکلے،

ابن شاہین کی ذہانت و محنت اور ذوق و شوق کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ گیارہ سال کی عمر میں اس دور کی مکتبی تعلیم سے فارغ ہو گئے، اور ان میں اتنی سمجھ بوجھ پیدا ہو گئی تھی جو صغر سنی میں حدیث کی کتابت و سماعت کے لیے معتبر ہے، انھوں نے اپنے بیان میں خاص طور سے اپنی عقل و ذہانت کا ذکر اسی لئے کیا ہے، کم سنی میں سماع و کتابت حدیث کے صحیح و معتبر ہونے میں محدثین کے مختلف آراء و اقوال ہیں، اہل کوفہ کے نزدیک بیس سال کی عمر میں

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۲۶۶

ہونی چاہئے جب کہ اہل شام تیس[۳۰] سال کہتے ہیں، اس کے برخلاف اہل بصرہ صرف دس سال کے قائل ہیں، نیز کسی نے پندرہ[۱۵] سال اور کسی نے تیرہ سال کہا ہے، مگر جمہور محدثین کے نزدیک عقل وشعور کی حالت میں قبل بلوغ بھی سماع وکتابت صحیح ہے۔ خطیب نے کفایہ میں لکھا ہے۔

قال جمهور العلماء يصح السماع	جمہور محدثین کا قول ہے کہ جس کی عمر
لمن سنه دون ذلك وهذا	اس سے کم ہو اس کا سماع بھی صحیح ہے
هو عندنا الصواب[۱]	اور ہمارے نزدیک یہی قول درست ہے

ابن شاہین کے اس بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بچپن ہی سے ان میں عزم و حوصلہ، قوت اقدام اور علمی میدان میں اپنے اساتذہ کی طرح بلند مرتبہ ہونے کا احساس بدرجۂ اتم موجود تھا، اور اس کے لئے وہ زمانۂ طالب علمی سے کوشاں رہے۔ چنانچہ ان کے بلند پایہ نہیں اساتذہ میں سے ایک ابوالقاسم بغوی سے حسب روایت ازہری اس قدر زیادہ احادیث کا سماع کیا کہ ان کے پاس بغوی کی مسموعات و مرویات کے سات سو یا آٹھ سو اجزاء تھے،[۲]

امام ابوبکر عبداللہ سجستانی امام ابوداؤد سجستانی کے صاحبزادے اور ابن شاہین کے شیوخ میں سے ہیں، ان کے حلقۂ درس کی کیفیت ابن شاہین نے یوں بیان کی ہے کہ ابن ابی داؤد آنکھوں سے معذور ہونے کے بعد ہم لوگوں کو اپنے حافظہ سے حدیث کا املاء کراتے تھے، وہ منبر پر بیٹھتے تھے، اور ان کے بعد والی سیڑھی پر ان کے صاحبزادے ابو معمر بیٹھتے تھے اور ان کے ہاتھ میں کتاب ہوتی تھی وہ اپنے والد سے کہتے تھے کہ فلاں حدیث، اس پر ابن ابی داؤد پوری حدیث زبانی پڑھتے تھے اور پوری مجلس سنکر لکھ لیتی تھی، (العبر ج ۲ ص ۱۲۳)

محراب و منبر پر درس حدیث کی یہ کیفیت ابن شاہین نے لذت لیکر سنائی، اسی طرح انھوں نے

۱؎ الکفایہ فی علم الروایہ ص ۶۵ ۲؎ تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۲۶۸،

[illegible] مشہور و شہرۂ اسلام ابن ذہبی الدوری کے حلقۂ درس کی حالت یوں بیان کی ہے کہ جب ہم طلبۂ حدیث ان کے یہاں حاضر ہوتے تو یہ دیکھ کر شرم و حیا سے سر جھکا لیتے کہ نوّے سال عمر ہو جانے کے بعد بھی ان کے یہاں خالص شراب اور آلات سرود و نغمہ پڑے ہوئے ہیں۔
(المنتظم ج ۶ ص ۲۶۲)

اس وقت بغداد کے گلی کوچے قال اللہ و قال الرسول کی صدا سے گونج رہے تھے، ہر مکان دار الحدیث اور ہر محلہ دار العلم تھا جوامع و مساجد اور ائمہ حدیث کی مجالس اور حلقے طالبان علم و فضل سے معمور تھے، ابن شاہین نے اپنے گھر کے شیوخ و اساتذہ سے نہایت حوصلہ مندی سے اکتساب علم کیا، اس کے بعد اس دور کے رواج و مزاج کے مطابق دینی و علمی سفر پر کمر ہمت باندھی،

رحلت و سفر | تیسری اور چوتھی صدی میں پورا عالم اسلام گویا دار العلوم تھا، عالمی شاہراہوں پر طلبہ حدیث کے قافلے رواں دواں تھے، جن کے گھسے ہوئے جوتے، پھٹے ہوئے کپڑے گرد و غبار میں اٹے ہوئے چہرے، بکھرے بال، بھوک پیاس کے مارے ہوئے جسم تحصیل علم میں وارفتگی و دیوانگی کی خبر دے رہے تھے، قرب و جوار کے علمی مراکز ہی ان کا منتہائے سفر نہیں تھے، بلکہ چین سے لیکر اندلس تک کی مسافت ان کے زیر قدم تھی، محدثین کرام کے اسی مقدس کاروان علم میں ابن شاہین بھی شامل تھے، انھوں نے بغداد سے نکل کر بصرہ، دمشق، شام، مصر اور فارس کا سفر کیا، ذہبی نے العبر میں اور ابن عماد نے شذرات الذہب میں لکھا ہے،

ورحل الى الشام والبصرة	ابن شاہین نے شام، بصرہ اور فارس
وفارس[1]	کا سفر کیا۔

نیز ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کے سفر دمشق کے بارے میں لکھا ہے،

---

[1] العبر ج ۳ ص ۲۹، شذرات الذہب ج ۳ ص ۱۱۷،

ولہ رحلۃ الی دمشق لقی فیھا ابا اسحاق بن ابی ثابت طبقتہ[1]

ابن شاہین کا سفر دمشق کی طرف ہوا، جس میں انھوں نے ابو اسحاق بن ابو ثابت اور ان کے معاصرین سے مل کر استفادہ کیا،

اور داؤدی نے طبقات المفسرین میں تصریح کی ہے۔

وروی الحروف عن ...... واحمد بن مسعود الزھری بمصر،[2]

انھوں نے تجوید و قراءت کی روایت ...... اور احمد بن مسعود زہری کو مصر میں کی

اس دور میں طلب علم میں روئے زمین کی خاک چھاننا اور اس کی وسعتوں کو قدموں سے ناپنا محدثین کا محبوب ترین مشغلہ تھا، اس راہ میں مقامات و منازل کا شمار کم ہمتی تھا، ابن شاہین کے تعلیمی رحلات و اسفار کے یہ چند بلاد و امصار منتہائے سفر نہیں ہیں، بلکہ انھوں نے ۳۰۰ھ سے ۳۲۵ھ تک تقریباً پچیس سالہ تعلیمی دور میں بہت سے ملکوں اور شہروں کا سفر کر کے وہاں کے شیوخ و اساتذہ سے کسب فیض کیا ہوگا، اس کا اندازہ ان کے ان اساتذہ کی فہرست سے ہوگا جن کا وطنی تعلق مختلف شہروں اور ملکوں سے ہے،

شیوخ و اساتذہ امام ابن شاہین کے شیوخ و اساتذہ میں بہت بڑی تعداد ائمہ حدیث و فقہ کی ہے ان کے علاوہ مفسرین، قرآء و مجودین، عباد و زہاد، واعظین و مذکرین، علمائے لغت و ادب اور دیگر علوم و فنون کے ماہرین شامل ہیں، ان کے سوانح نگاروں نے ان میں سے چند کے نام درج کئے ہیں، ذیل میں کچھ حضرات کے نام لکھے جاتے ہیں

(۱) شعیب بن محمد، ابو الحسن ذارع متوفی شوال ۳۰۴ھ (۲) عباس بن احمد بن محمد، قاضی ابو خبیب برتی متوفی شوال ۳۰۳ھ (یہ دونوں حضرات ابن شاہین کے بالکل ابتدائی شیوخ حدیث ہیں، ۳۰۸ھ میں ابن شاہین نے گیارہ برس کی عمر میں پہلے پہل حدیث کی کتابت و سماعت کی

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۰۳، [2] طبقات المفسرین ج ۲ ص ۲۔

اور اسی سال ان حضرات کا وصال ہوا؛ (۳) عمر بن عبداللہ بن عمر بن عثمان ابو القاسم المعروف
با بن ابی حسان زیادی متوفی سنہ ۳۱۲ھ۔ (۴) محمد بن محمد بن سلیمان بن حارث بن عبد الرحمٰن
ابوبکر ازدی واسطی المعروف بالباغندی متوفی سنہ ۳۱۲ھ (۵) حسن بن محمد بن عبداللہ بن شعبہ
ابو علی انصاری، متوفی ذی قعدہ سنہ ۳۱۳ھ۔ (۶) محمد بن احمد بن ہشام، ابو نصر طالقانی متوفی سنہ ۳۱۳ھ
ان کا نام احمد بن ہشام بھی بتایا گیا ہے، (۷) اسحاق بن ابراہیم بن خلیل، ابو یعقوب الجلاب،
متوفی شعبان سنہ ۳۱۳ھ۔ (۸) عباس بن یوسف، ابو الفضل شکلی زاہد، متوفی رجب سنہ ۳۱۴ھ
(۹) محمد بن جعفر بن بکر بن ابراہیم، ابو الحسین بزاز، المعروف بابن الخوارزمی متوفی سنہ ۳۱۴ھ۔
(۱۰) ایوب بن یوسف بن ایوب بن سلیمان، ابو القاسم بزاز مقری متوفی سنہ ۳۱۵ھ۔ (۱۱) حسن بن
محمد بن حسن بن صالح، ابو الحسین اسدی، متوفی سنہ ۳۱۵ھ۔ (۱۲) سلیمان بن داؤد بن کثیر بن
وہدان، ابو محمد طوسی البغدادی، متوفی سنہ ۳۱۵ھ۔ (۱۳) زبیر بن محمد بن احمد بن سعید، ابو عبداللہ
متوفی سنہ ۳۱۶ھ۔ (۱۴) عبداللہ بن سلیمان بن اشعث ابوبکر بن ابی داؤد سجستانی متوفی سنہ ۳۱۶ھ
(۱۵) عبداللہ بن محمد بن عبد العزیز بن مرزبان، ابو القاسم ابن بنت احمد بن منیع بغوی، بغدادی
متوفی سنہ ۳۱۷ھ۔ (۱۶) عبد الملک بن احمد بن نصر بن سعد، ابو الحسین خیاط، متوفی سنہ ۳۱۷ھ
(۱۷) عبد الواحد بن محمد بن مہتدی باللہ، ابو احمد ہاشمی، راہب بنی ہاشم، متوفی ذی الحجہ سنہ ۳۱۷ھ
(۱۸) یحییٰ بن محمد بن صاعد، ابو محمد مولیٰ ابو جعفر منصور، متوفی سنہ ۳۱۸ھ۔ (۱۹) جعفر بن محمد بن
مغلس، ابو القاسم متوفی سنہ ۳۱۹ھ۔ (۲۰) حسین بن حسین بن عبد الرحمٰن، ابو عبداللہ انطاکی،
المعروف بابن الصابونی متوفی سنہ ۳۱۹ھ۔ (۲۱) محمد بن ابراہیم بن محمد بن ابی الجحیم، ابو کثیر
شیبانی البصری متوفی سنہ ۳۱۹ھ۔ (۲۲) عباس بن بشر بن عیسیٰ بن اشعث، ابو الفضل المعروف
بالرقی البغدادی متوفی سنہ ۳۲۰ھ۔ (۲۳) سعید بن محمد بن احمد بن سعید ابو عثمان بیع، برادر

حافظ زبیر بن محمد، متوفی جمادی الآخرہ ۳۲۱ھ۔ (۲۴) محمد بن حسن بن درید، ابوبکر ازدی، علم الشعر
واشعار العرب والمعروف بابن درید متوفی ۳۲۱ھ۔ (۲۵) محمد بن احمد بن محمد بن عبداللہ بن ابی الثلج
ابوبکر الکاتب متوفی ۳۲۲ھ۔ (۲۶) عبیداللہ بن عبدالرحمن بن محمد بن عیسیٰ، ابومحمد سکری متوفی
۳۲۳ھ۔ (۲۷) عبدالحمید بن سلیمان، ابوعبدالرحمن وراق واسطی بغدادی متوفی ۳۲۳ھ
(۲۸) رضوان بن احمد بن احمد بن اسحاق بن عطیہ، ابوالحسن تمیمی رضوان جالینوس متوفی ۳۲۴ھ
(۲۹) عبدالرحمن بن سعید بن ہارون، ابوصالح اصبہانی بغدادی متوفی ۳۲۵ھ (۳۰) ابراہیم
بن عبدالصمد بن موسیٰ، ابواسحاق ہاشمی متوفی ۳۲۵ھ۔ (۳۱) موسیٰ بن عبیداللہ بن یحییٰ بن
خاقان ابومزاحم، وزیر خلیفہ متوکل، متوفی ۳۲۵ھ۔ (۳۲) محمد بن جعفر بن محمد بن حسن بن مستفاض ابوالحسن
ابی بکر فریابی متوفی ۳۲۷ھ۔ (۳۳) حسن بن احمد بن یزید قاضی قم زاہد المعروف بالاصطخری،
متوفی ۳۲۸ھ۔ (۳۴) حسن بن سعید بن حسن بن یوسف، ابوالقاسم وراق، ابن الہرشی
مروزی متوفی ۳۲۸ھ۔ (۳۵) حسین بن محمد بن سعید، ابوعبداللہ بزاز، ابن المطبقی متوفی ۳۲۸ھ
(۳۶) حامد بن بلال بن حسن ابواحمد بخاری متوفی رجب ۳۲۸ھ۔ (۳۷) حمزہ بن حسین بن عمر بن
ابوعیسیٰ سمسار متوفی ۳۲۸ھ۔ (۳۸) عبداللہ بن سلیمان بن عیسیٰ بن ہیثم وراق، ابومحمد فامی
متوفی شوال ۳۲۸ھ۔ (۳۹) یوسف بن یعقوب بن اسحاق بن بہلول، ابوبکر الازرق تنوخی
الکاتب متوفی ذی الحجہ ۳۲۹ھ۔ (۴۰) عبدالغافر بن سلامہ بن احمد بن عبدا بن سلامہ
حضرمی حمصی متوفی ۳۳۰ھ۔ (۴۱) حبشون بن موسیٰ بن ایوب، ابونصر خلال متوفی شعبان
۳۳۱ھ۔ (۴۲) احمد بن محمد بن سعید بن عبدالرحمن ابوالعباس کوفی، ابن عقدہ متوفی
ذیقعدہ ۳۳۲ھ۔ (۴۳) عبداللہ بن احمد بن اسحاق ابومحمد جوہری مصری متوفی ربیع الاول ۳۳۲ھ
(۴۴) حمزہ بن قاسم بن عبدالعزیز، ابوعمر ہاشمی متوفی شعبان ۳۳۵ھ۔ (۴۵) محمد بن جعفر بن احمد

ابوبکر صیرفی مطیری متوفی صفر ۳۳۵ھ۔ (۴۳) عبدالرحمٰن بن محمد بن عبید اللہ بن سعد، ابو محمد
زہری متوفی ربیع الآخر ۳۳۵ھ۔ (۴۴) ابراہیم بن محمد بن احمد بن ابی ثابت، ابو اسحاق عطار
متوفی ۳۳۵ھ۔ (۴۸) محمد بن عبداللہ بن دینار، ابو عبداللہ معدل زاہد حنفی نیشاپوری متوفی
۳۳۸ھ۔ (۴۹) محمد بن احمد بن عمرو بن عبدالخالق بن خلاد، ابو العباس عتکی بزار متوفی شعبان
۳۳۹ھ۔ (۵۰) عبید اللہ بن حسین بن دلال بن دلہم، ابو الحسن حنفی کرخی ذکر ع حدان متوفی
۳۴۰ھ۔ (۵۱) عثمان بن احمد بن عبداللہ بن یزید، ابو عمرو دقاق، ابن السماک متوفی ۳۴۴ھ
(۵۲) یحییٰ بن محمد بن یحییٰ، ابو القاسم قصباتی متوفی صفر ۳۴۴ھ۔ (۵۳) عبداللہ بن جعفر بن
درستویہ بن مرزبان، ابو محمد فارسی نحوی، متوفی صفر ۳۴۷ھ۔ (۵۴) جعفر بن محمد بن نصیر بن
قاسم، ابو محمد خواص خلدی، متوفی رمضان ۳۴۸ھ۔ (۵۵) اسمٰعیل بن علی بن اسمٰعیل،
ابو محمد خطبی متوفی ۳۵۰ھ۔ (۵۶) محمد بن حسن بن محمد، ابوبکر مقری نقاش موصلی متوفی ۳۵۱ھ
(۵۷) محمد بن عبداللہ بن ابراہیم، ابوبکر شافعی بغدادی متوفی ۳۵۴ھ۔ (۵۸) محمد بن عمر بن
مسلم ابوبکر، ابن الجعابی، قاضی موصلی متوفی ۳۵۵ھ۔ (۵۹) حبیب بن حسن بن داؤد ابو القاسم
قزاز متوفی ۳۵۹ھ۔ (۶۰) محمد بن ثابت بن احمد ابوبکر داسلی متوفی ۳۶۳ھ۔ (۶۱) احمد بن
جعفر بن حمدان ابوبکر قطیعی متوفی ۳۶۸ھ (۶۲) محمد بن مظفر بن موسیٰ ابو الحسین بزاز، متوفی
۳۷۹ھ۔ (۶۳) حسین بن احمد بن عبداللہ، ابو عبداللہ صیرفی ۳۸۱ھ۔ (۶۴) احمد بن
مسعود بن عمرو، ابوبکر زبیری متوفی ۳۶۳ھ۔ (۶۵) احمد بن موسیٰ بن عباس بن مجاہد
مقری ابوبکر، شیخ القراء فی وقتہ متوفی ۳۲۴ھ۔ (۶۶) حسن بن حبیب بن عبدالملک،
ابو علی حصائری دمشقی متوفی ۳۳۹ھ۔ (۶۷) عبداللہ بن محمد بن زیاد، ابوبکر نیشاپوری
متوفی ۳۲۴ھ۔

ابن شاہین کے شیوخ واساتذہ کی یہ فہرست ان کے ہزاروں شیوخ کے مقابلہ میں بہت مختصر ہے، تحقیق وتلاش کے بعد اس میں بہت کچھ اضافہ ہوسکتا ہے[۱]

جامعیت امام ابن شاہین نے سنہ ۳۰۸ھ سے سنہ ۳۳۲ھ تک تقریباً پچیس[۲۵] سال بغداد، بصرہ، شام، دمشق، مصر اور فارس وغیرہ میں ہزاروں اساتذہ سے مروجہ دینی علوم حاصل کئے اور اپنے دور کے جامع الحیثیات محدثین میں شمار ہوئے، خاص طور سے محدث، مفسر، مقری، واعظ، ادیب اور مصنف کی حیثیت سے اپنے اقران ومعاصرین میں ممتاز مقام کے مالک ہیں۔

حدیث وفقہ امام ابن شاہین سب سے پہلے حافظ الحدیث ہیں، تمام محدثین نے ان کی ثقاہت وامانت کا اعتراف کیا ہے۔ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کو الحافظ، المفید، المکثر محدث العراق لکھا ہے[۲]، داؤدی نے طبقات المفسرین میں الامام، الحافظ، المفید، محدث العراق بتایا ہے[۳]، نیز ذہبی نے العبر میں اور ابن عماد نے شذرات الذہب میں الحافظ واحد اوعیۃ العلم کے الفاظ سے یاد کیا ہے[۴]، یافعی نے مرآۃ الجنان میں الحافظ اور شیخ کتانی نے الرسالۃ المستطرفہ میں الحافظ الکبیر کے لقب سے یاد کیا ہے[۵]، محمد بن ابی الفوارس نے کہا ہے

کان ابن شاہین ثقۃ مامونا	ابن شاہین ثقہ ومامون محدث تھے،
قد جمع وصنف مالم یصنف	انھوں نے جس قدر جمع وتصنیف کا
احد.	کام کیا ہے کسی نے نہیں کیا ہے۔

قاضی ابوبکر محمد بن عمر داؤدی، ازہری، ابن ماکولا اور ابن شاہین کے معاصر وحریف

---

۱ ان کے حالات کے لیے ملاحظہ ہو المنتظم، تاریخ بغداد، العبر، شذرات الذہب، طبقات الشافعیۃ الکبریٰ اور طبقات ورجال کی دیگر کتب ۲ تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۰۳ ۳ طبقات المفسرین ج ۲ ص ۲،
۴ العبر ج ۳ ص ۱۰۲ شذرات الذہب ج ۳ ص ۱۱۷ ۵ مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۴۲۴ الرسالۃ المستطرفہ ص ۳۴۔

امام ابوالحسن دارقطنی نے ان کو ثقہ بتایا ہے[1]۔ ازہری کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میں نے ابومسعود دمشقی[2] سے کہا کہ ابن شاہین ہم کو حدیث کا درس دیتے ہیں، تو ہمارے سامنے اصول یعنی اپنی مسموعات و مرویات کا اصل نسخہ نہیں رکھتے ہیں بلکہ فروع یعنی منقول نسخہ رکھتے ہیں اس پر ابومسعود دمشقی نے کہا۔

ان اخرج الیک ابن شاھین	اگر ابن شاہین تمہارے سامنے ٹھیکری
حدیثا مکتوبا علی خزفة	پر لکھی ہوئی کوئی حدیث پیش کریں تو
فاکتبه۔	تم اس کو بھی لکھ لو۔

یہ تاریخ بغداد کی روایت کے الفاظ ہیں، لسان المیزان میں یہ روایت یوں منقول ہے

ان اخرج الیک ابن شاھین	اگر ابن شاہین تمہارے سامنے کپڑے
خرقة علیها حدیث مکتوب	کے ٹکڑے پر لکھی ہوئی کوئی حدیث لائیں
فاکتبه[3]	تو تم اس کو بھی لکھ لو۔

اللہ تعالیٰ نے طبقۂ محدثین کو قوت حفظ کے خاص انعام سے نوازا ہے، حافظہ اور یادداشت میں ابن شاہین بھی ممتاز تھے، ابن بقال کا بیان ہے کہ ابن شاہین نے بتایا کہ ایک مرتبہ میں سفر سے واپس آیا دیکھا کہ میری کتابیں ضائع ہوگئی ہیں، تو اپنی یادداشت سے ان کو جمع کیا جن کی تعداد بتیس ہزار یا تینتیس ہزار تھی۔[4]

ایک مرتبہ ابن شاہین کے ایک شاگرد ابو عمرو عثمان بن محمد بن احمد مخرمی قاری کوفی نے انکی سند سے ایک حدیث اس طرح بیان کی حدثنا عمر بن احمد النقاش یعنی ہم سے عمر بن احمد نقاش نے یہ حدیث بیان کی ہے، جب ابن شاہین کو معلوم ہوا کہ ان کی حدیث میں تدلیس فی الشیوخ

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۲۶۶، [2] تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۲۶۸، لسان المیزان ج ۴ ص ۲۸۴ [3] ایضاً

کا مطلب ایک شاگرد نے کیا ہے، تو ان سے فرمایا کہ انا نقاش یعنی کیا میں نقاش ہوں، اور اس وصف سے کیا میری شہرت ہے؟ شاگرد نے جواب دیا۔

السنت تنقش الکتاب بالخط؟ کیا آپ خط کے ذریعہ کتاب کو منقش نہیں کرتے ہیں؟[1]

ابن شاہین کے اس استفہام انکاری کی وجہ یہ ہے کہ تدلیس محدثین کے نزدیک سخت عیب ہے۔ اس کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ راوی اپنے شیخ سے روایت کی ہوئی حدیث میں کسی مصلحت سے اس کے مشہور نام ولقب کے بجائے ایسی کنیت، یا نسبت یا صفت استعمال کرے جس سے وہ مشہور نہ ہو، یہاں یہی صورت تھی اور ابن شاہین کی مشہور کنیت کے بجائے نقاش کی صفت بیان کی گئی جس کا مطلب اپنی طرف سے بیان کیا گیا۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن شاہین احادیث کے بارے میں شدت احتیاط برتتے تھے، وجہ یہ ہے کہ ان کے ایک شیخ اور استاد ابوبکر المقری النقاش (محمد بن حسن بن محمد بن زیاد موصلی متوفی ۳۵۱ھ) مشہور محدث اور قرارت کے امام ہونے کے ساتھ ہی نہایت عابد و زاہد بزرگ تھے، مگر منکر احادیث کی روایت کی وجہ سے متروک اور غیر ثقہ قرار پائے، وہ مشہور سندوں سے منکر احادیث بیان کرتے تھے، ذہبی نے لکھا ہے کہ ابوبکر نقاش اپنی جلالت شان اور علوئے مقام کے باوجود متروک وغیر ثقہ ہیں، اسی لئے ابن شاہین نے اپنے متعلق لفظ نقاش سنکر تدلیس کو دفع کیا۔

ابن شاہین اپنے حفظ اور ضبط و اتقان پر اعتماد کی وجہ سے معارضہ و مقابلہ نہیں کرتے تھے یعنی اپنی مسموعات و مرویات کے اصل ذخیرے سے جو ابواب و تراجم اور کتابیں مرتب کرتے تھے ان فروع کو اصول سے ملا کر تصحیح نہیں کرتے تھے، حالانکہ اصل اور نقل میں معارضہ و مقابلہ کے

---

[1] المنتظم ج، ص ۱۵۱

بغیر منقول کی صحت مشتبہ رہ جاتی ہے، اسی لیے محدثین اس کا بے حد اہتمام کرتے تھے، حضرت عروہ بن الزبیرؒ اپنے صاحبزادے ہشام بن عروہؒ سے دریافت کرتے تھے کہ تم نے احادیث لکھ لیں، وہ ان کے بعد دریافت کرتے تھے کہ اصل سے نقل کو ملا لیا ہے؟ وہ نفی پر فرماتے تھے کہ تب تم نے نہیں لکھا۔[1] ابو ابراہیم اسمٰعیل بن یحییٰ مزنی کا قول ہے کہ اگر کسی کتاب کی تصحیح ستر بار مطالعہ و معارضہ کر کے کی گئی ہو تب بھی اس میں کوئی نہ کوئی غلطی پائی جائے گی، امام احمد بن حنبلؒ کے صاحبزادے عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے والد کی ایک کتاب کا معارضہ و مقابلہ تیرہ بار کیا، اور چودھویں بار اس میں ایک غلطی نکل آئی تو والد نے کتاب ہاتھ سے رکھدی اور کہا کہ میں کتاب اللہ کے علاوہ کسی اور کتاب کو صحیح نہیں کہہ سکتا۔[2]

الغرض اصل اور نقل میں مقابلہ نہایت ضروری ہے، مگر ابن شاہین خود اعتمادی اور کثرت کار کی وجہ سے یہ کام نہیں کرتے تھے، اور ساتھ ہی برملا اس کا اعلان کیا کرتے تھے تاکہ ان سے حدیث کا سماع کرنے والے واقف رہیں، اور کہیں کوئی بات نظر آئے تو اس کو عدم مقابلہ پر محمول کریں، محمد بن عمر داؤدی کا بیان ہے۔

سمعت ابن شاہین یقول انا اکتب و لا اعارض۔	میں نے ابن شاہین کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں لکھتا ہوں معارضہ و مقابلہ نہیں کرتا۔

اور برقانی کا بیان ہے۔

قال ابن شاہین جمیع ما خرجتہ و صنفتہ من حدیثی	ابن شاہین کا قول ہے کہ میں نے اپنی حدیث سے جو کچھ تخریج یا تصنیف کیا

---

[1] الکفایہ ص ۲۴۰، [2] الموضح بین الجمع والتفریق خطیب ج ۱ ص ۹

لم يعلم ضبطه بالاصول يعني ثقة بنفسه انها ينقله قال البرقاني فلذلك لما استكثر منه مع هذا فيه[1]

ان سب کو اصول سے نہیں ملایا ہے یعنی اصل سے نقل کرنے میں اپنے اوپر اعتماد کی وجہ سے ایسا نہیں کیا ہے، راوی برقانی کہتے ہیں کہ اسی وجہ سے میں نے ابن شاہین سے زیادہ احادیث کی روایت نہیں کی۔

ابن شاہین اس بارے میں ان محدثین کا مسلک اختیار کئے ہوئے تھے جو معارضہ و مقابلہ کئے بغیر اس شرط پر فروع سے روایت کو جائز سمجھتے تھے کہ وہ اصول سے نقل کئے گئے ہوں اور اسی کے ساتھ یہ واضح اور بیان کر دیا جائے کہ ان کا معارضہ و مقابلہ نہیں ہوا ہے، فقیہ احمد بن محمد بن غالب نے ایک مرتبہ امام ابوبکر اسمٰعیلیؒ سے دریافت کیا کہ کیا کسی شخص کیلئے جائز ہے کہ ایسی کتاب سے روایت کرے جس کا اس نے اپنے شیخ کے اصل سے مقابلہ نہیں کیا ہے؟ تو امام ابوبکر اسمٰعیلی نے جواب دیا،

نعم ولكن لابد ان يبين انه لم يعارض لما عسى يقع من زلة او سقوط۔

ہاں یہ جائز ہے، مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ ظاہر کر دے کہ اس نے مقابلہ نہیں کیا ہے کیونکہ ہو سکتا ہے کہ کہیں کوئی لغزش یا کمی ہو گئی ہو۔

اس کو نقل کر کے خطیب نے لکھا ہے۔

قلت: وهذا مذهب ابي بكر البرقاني، فانه روى لنا احاديث

میں کہتا ہوں کہ امام ابو بکر برقانی کا یہی مسلک ہے، وہ ہم سے بہت سی

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۲۶۸۔

کثیرۃ، وقال فیہا انا فلان، ولم یعارض بالاصل۔

(ملتقطاً ص ۲۴۹)

حدیثیں روایت کرکے کہتے تھے ان کو فلاں محدث نے ہم سے روایت کیا جاوڈ اصل سے ملایا نہیں ہے۔

ابن شاہین ثقہ، ثبت، مامون اور قوی الحافظہ محدث تھے، اور تحدیث در روایت کے ساتھ اس قدر زیادہ کتابیں تصنیف کیں کہ اقران و معاصرین میں اس کی مثال مشکل ہے نیز وہ خود اعتمادی و خود شناسی کا مزاج رکھتے تھے، اس لئے انھوں نے اپنے شیوخ کی مسموعات و مرویات سے جو کچھ لکھا اس کا اصل سے مقابلہ و معارضہ نہیں کیا جس کا اعتراف وہ اعلان کیا کرتے تھے، اسی بنا پر محدثین نے ان پر اعتماد کیا، چنانچہ ان کے حلقۂ درس کے بعض طلبہ نے جب ابومسعود دمشقی کے سامنے اس بارے میں اپنا خلجان پیش کیا اور کہا کہ ابن شاہین درس حدیث کے وقت اپنے اصل کے بجائے اس کے فرع کو ہمارے سامنے رکھتے ہیں، تو انھوں نے اطمینان دلایا اور کہا کہ اگر ابن شاہین کسی ٹھیکری یا پیوند پر لکھی ہوئی حدیث بیان کریں تو تم اس کا سماع کرو مگر اسکے باوجود معارضہ و مقابلہ نہ کرنا۔ اعلانا کو دعوت دینا ہے، چنانچہ ابن شاہین پر لحان یعنی بہت زیادہ اعرابی کرنے کا الزام لگ گیا۔

(باقی)

سرسید کے خطوط ـــــ ایک مطالعہ

از
جناب حامدہ مسعود صاحبہ، لکچرر شعبہ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

خطوط میں روایات کے صد رنگ دھاگے پلتے اور کھلتے ہیں۔ مکتوب نگار خط کے ذریعہ باتیں کرتا ہے تو اس میں وہ تمام احوال سمٹ آتے ہیں جو اس کی ذہنی کیفیت اور روزمرہ زندگی میں رونما ہونے والے حالات کی مخصوص جہت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ غالب نے اپنے خطوط کو بزم آرائی کا نعم البدل قرار دیا جس کے نتیجے میں ان کے مشہور و معروف مکالماتی انداز نے نجی اور عصری روداد پیش کرکے شہرت دوام حاصل کی۔ غالب کے بعد سرسید ایک دوسری اہم شخصیت ہیں جن کے خطوط کا تفصیلی مطالعہ ہمیں نئے خیالات اور واقعات سے روشناس کراتا ہے اس میں مکتوب نگار کے ان افکار و خیالات کا بے محابا اظہار ہے جو انیسویں صدی کے بدلتے ہوئے ذہن کی ترجمانی کرتا ہے۔ ملک کے حالات کی تبدیلی کا اندازہ سرسید کی زندگی کے اس اہم فیصلہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے عزیزوں کی مخالفت کے باوجود بائیس سال کی عمر میں انگریزوں کی ملازمت کو قلعہ معلی سے وابستگی پر ترجیح دی تھی۔ اس عمر میں حقائق کا صحیح تجزیہ کرنا سرسید کے کھلے ہوئے ذہن کا ثبوت ہے۔ وہ واضح طور پر سمجھتے تھے کہ مستقبل قریب میں حالات کا رخ کیا ہونے والا ہے۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد ۱۸۵۷ء کے تاریخی واقعہ نے ملک میں ایک نئے سیاسی نظام کو مستحکم کر دیا۔ اس پر آشوب دور میں سرسید نے فرض شناسی کا ثبوت دیتے ہوئے اس طبقے کی وفاداری کو اپنا شعار بنایا جس کے وہ

لازم تھے لیکن یہ انکی شخصیت کا صرف ایک پہلو تھا۔ ان دوسرے پہلوؤں کو اس کے بعد روشنی میں آنا تھا جو ملکی اور قومی اعتبار سے گراں قدر اہمیت کی حامل ہیں۔ غدر ۱۸۵۷ء کے فرو ہونے کے بعد قدرتی طور پر انگریز حاکموں نے مسلمانوں پر سرکشی کا الزام عاید کر کے ان کے وجود کو مشتبہ قرار دیا۔ دلی سیاسی طور پر تباہ و بال ہو چکی تھی جس کے نتیجہ میں اس کی شاندار تہذیبی قدریں اور شہرہ آفاق شخصیتیں بھی پامال ہو کر اپنا نام و نشان کھو رہی تھیں[1]۔ برگزیدہ ہستیوں کو جس طرح سرسری تحقیق کے بعد سر دار چڑھایا گیا، اور صاحبان جاہ و حشم جس طرح خاک میں ملائے گئے یہ تمام واقعات اس دور کی تاریخ میں ہمیشہ کے لئے اَن مٹ ہو گئے۔ ان حالات نے انگریزوں کی وفاداری کا دم بھرنے کے باوجود سرسید کے ذہن کو جس صورت حال سے دوچار کیا وہ ان کی شخصیت کے ایک دوسرے پہلو کو ہمارے سامنے لاتا ہے۔ آگے چل کر انھوں نے اپنے ایک لکچر[2] میں تباہی کے اس دور کا تذکرہ کیا۔

"غدر میں جو حال انگریزوں اور ان کے بچوں اور عورتوں پر گذرا اور جو حال ہماری قوم کا ہوا اور نامی نامی خاندان برباد و تباہ ہوئے ان دونوں واقعات کا ذکر دل کو شق کرنے والا ہے۔ غدر کے بعد ...... مسٹر شیکسپیئر نے جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک تھے ...... جہاں آباد کا تعلقہ ...... جو ایک لاکھ سے زیادہ مالیت کا تھا مجھکو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہونچا۔"

قوم کی بے عزتی کے غم نے سرسید کے بال سفید کر دیئے۔ مرادآباد میں رئیسوں کی بربادی نے جہاں انھیں متوحش کیا وہاں صبر و ضبط نے انھیں ایک نئی طاقت کا احساس بھی دلایا۔

"مگر اسوقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم

---

[1] غالب کے خطوط میں غم و اندوہ کے یہ مرقعے جابجا ملتے ہیں۔ [2] یہ لکچر ۲۰ دسمبر ۱۸۸۹ء کو ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسہ میں دیا گیا تھا۔ حیات جاوید۔ ص ۸۶

کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں نہیں! اسکی مصیبت میں شریک رہنا چاہئے۔ اور جو مصیبت پڑے اس کے دور کرنے میں ہمت باندھنی قومی فرض ہے۔ میں نے ارادۂ ہجرت موقوف اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔"

اس لحاظ سے غدر ۵۷ء مسلمان قوم کی تاریخ میں ایک اہم نقطہ ہے جو ایک طرف
بادی کا مکمل اعلان ہے تو دوسری طرف اس تباہی کے خاکستر سے نئی زندگی کی امید بھی جنم لیتی ہو۔
ید کی قومی دردمندی کا منظم منصوبہ اس پس منظر میں ابھرتا ہے۔

دنیا کی تاریخ میں قوموں کی زندگی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بالعموم ہر زوال عروج کا
خیمہ رہا ہے جس کی مثال یورپ کا نشاۃ ثانیہ ہے۔ اس کا آغاز اٹلی میں ہوا لیکن رفتہ
اس سے تمام یورپ متاثر ہوا۔ اس سے فکر کو آزادی ملی جس نے مذہبی اصلاح، تجدید
م اور انسان دوستی کے تصورات کو فروغ دیا۔ انفرادیت نے اپنے اظہار کے لیے جو نئے راستے
ل کیے ان میں عقلیت اور سائنس کے انکشافات انسانی ذہن کی حیرت انگیز جست ہیں۔
پی تجارتی کمپنیوں کے ذریعہ ہندوستان میں یہ اثرات نسبتاً مدھم انداز سے پہونچنے شروع ہوئے
بے جیسے انگریزوں کی سیاسی حکمت عملی نے یہاں اپنے اقتدار کا دائرہ وسیع کیا اسی لحاظ سے انکی
قدروں کا پرتو بھی منعکس ہوا۔ بنگال میں سب سے پہلے نشاۃ الثانیہ کے نقوش ملتے ہیں۔ راجہ رام موہن
نے مغربی نظریات سے متاثر ہو کر اپنے معاشرے کی اصلاح اور ترقی کے لیے سرگرم عمل ہوئے گیشب
رسین، رویندر ناتھ ٹیگور اور بنکم چندر چٹرجی نے قومی، مذہبی، سماجی اور ادبی بیداری کی مہم میں نمایاں
دار ادا کیا۔ انیسویں صدی کے عصری حالات سرسید کے ذہن پر اثر انداز ہوئے۔ انگریزی عملداری
م ہو جانے کے بعد نئی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ سرسید کو اپنی پسماندہ قوم کے ذہن کو نئے حالات
مطابقت پیدا کرانے کے لئے جو موثر طریقہ نظر آیا وہ یہ تھا کہ انگریزوں سے مفاہمت کی راہ

ہموار کی جائے اور ان سے وہ چیزیں سیکھی جائیں جنھوں نے انہیں مشرق پر برتری عطا کی ہے وہ ان ذہنی قدروں کا بچشم خود مشاہدہ کرنا چاہتے تھے جنھوں نے مغرب کو مغرب بنایا تھا[۵]۔ دروں پردہ ایک دوسری تڑپ نے انھیں بیقرار کر رکھا تھا اپنی سر ولیم میور کی تصنیف لائف آف محمد میں مذہب اسلام پر عاید کردہ حملوں کا دنداں شکن جواب اس کی مکمل تیاری کے لیے جن کتابوں کی ضرورت تھی وہ ہندوستان میں نہیں مل رہی تھیں چنانچہ انگلستان پہونچکر ہی وہ مذہب اسلام کی صحیح تصویر پیش کر سکتے تھے۔ ان مختلف النوع مقاصد کی تکمیل کی پوری تفصیل ہمیں ان خطوط میں ملتی ہے جو انھوں نے لندن سے بھیجے تھے۔ قومی درمندی اور مذہبی شغف ان سترہ مہینوں میں انھیں غور و فکر کی جن ریاضتوں سے گذارتا ہے اس جانکاہ عمل کی روئداد اس لحاظ سے بھی لائق مطالعہ ہے کہ مکتوب نگار کی قومی اور مذہبی طرز فکر میں روایت سے انحراف کے اثرات پختہ تر نظر آتے ہیں۔

انگلستان پہونچکر سرسید راجہ جے کشن داس[۶] کو ایک طویل خط تحریر کرتے ہیں جو دیار مغرب سے

---

[۵] رخصت کی درخواست میں سرسید نے اپنے سفر انگلستان کی غرض وغایت میں اہل یورپ اور ہندوستان کے درمیان ربط وضبط کو ترقی دینے کی کوشش قرار دی ہے۔ "پس اس مقصود کی تکمیل کے واسطے ہندوستانیوں کو میری رائے میں یورپ کے سفر کی ترغیب دینی چاہئے۔ تاکہ وہ مغربی ملکوں کی شائستگی کے عجیب وغریب نتیجوں اور اس کی ترقی کو بچشم خود مشاہدہ کر سکیں اور اس بات کا اندازہ کر سکیں کہ انگلستان کے لوگ کیسے دولت مند، طاقتور اور دانا ہیں۔ اور ان مفید اور عمدہ باتوں کو ہندوستان کی بھلائی کیلئے سیکھیں جن کو سیکھ چکے ہیں کہ تجارت کے باب میں ہندوستان کے باشندے کیسے مستعد ہیں اور کارخانوں اور کاشتکاری اور شفاخانوں اور خیرات اور اس کے شہروں کی صفائی اور اسکی دولت اور علم سے روز بروز زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ حیات جاوید۔ صفحہ ۱۳۱۔

[۶] راجہ جے کشن داس علی گڈھ کے ڈپٹی کلکٹر۔ اگست ۱۸۶۴ء میں جب سرسید کا تبادلہ بنارس کا ہو گیا تو انھوں نے ان راجہ صاحب کو سائنٹیفک سوسائٹی کا سکریٹری بنایا تھا۔ راجہ جے کشن داس نے سوسائٹی کے کاموں میں بہت دلچسپی لی اور اخبار کی اشاعت میں تاخیر نہ ہونے دی۔

متعلق ان کے ذاتی تجربات اور تاثرات پر مبنی ہے۔ خط کے آغاز میں وہ اپنے سفرنامہ[۵۱] کی اگلی قسطیں نہ بھیجنے کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ جب اہل وطن حقیقت کی تاب نہیں لا سکتے تو ان کی خوشنودی کی خاطر حقائق پر مصلحت کا پردہ ڈالنے کے لئے اپنی رائے محفوظ رکھنی مناسب ہے۔

"مجھ سے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ جو کیفیت میرے دل پر گذرتی ہے۔ اور جو سچائی کہ میرے دل میں آتی ہے اس کو سوسائٹی کے ممبروں کے ڈر سے چھپاؤں اور جھوٹ کا الزام میں اپنے ہموطن ہندوستانیوں پر دیتا ہوں۔ خود بھی اس گناہ کا مرتکب ہوں اس لیے میں نے بہتر سمجھا کہ اس کا لکھنا موقوف ہی کر دیا جائے۔ اگر آپ میری آزادانہ رایوں اور باتوں کے چھپنے سے اپنی سوسائٹی کا کچھ نقصان نہیں سمجھتے۔ اور کچھ ممبروں کی بلکہ سوائے خدا کے اور کسی کی ناراضگی کا اندیشہ نہیں کرتے تو مجھ کو عام حالات کے بھیجتے رہنے اور یہاں کے عجائبات کے لکھنے اور نصیحت آمیز اور عبرت خیز باتوں کے بیان کرنے میں کوئی عذر نہیں ہے"[۵۲]

ان سطور سے اندازہ ہوتا ہے کہ مکتوب نگار جس ذہن کا مالک ہے، وہ مقاصد ان کے پیش نظر ہیں، جن کے تحت وہ انگلستان پہنچا ہے، وہ مغرب کی ان ذہنی قدروں کا بچشم خود مشاہدہ کرنا چاہتا تھا، جن سے اس کے ملک میں اہل بنگال نے سب سے پہلے فائدہ اٹھایا لیکن ہندوستان کا مسلمان...

---

[۵۱] بنارس سے لندن تک کے حالات سرسید نے تفصیل سے تحریر کیے، مگر جب اس کے کچھ حصے ہندوستان میں شائع ہوئے، تو مسلمانوں کی طرف سے اس پر اعتراضات کی بوچھار پڑنی شروع ہوئی۔ سرسید کو بھی لندن ہی میں مخالفت کا حال معلوم ہو گیا، اس لئے انھوں نے ناراض ہو کر سفرنامہ لکھنا موقوف کر دیا۔ حیات جاوید ص ۱۵۱

[۵۲] مکاتیب سرسید احمد خان۔ مرتبہ (مشتاق حسین) ص ۱۵

مسلمان نئے حالات کی ضرورت سے بے نیازانہ اب تک تو بہ تقدیر جی رہے ہیں، اس لئے جب تک ان کے سامنے زندہ اور فاتح قوم کی ترقی کا راز پوری طرح نہ کھولا جائے، اور انھیں اپنی پسماندگی اور ذلت کے اسباب غیر جانبدارانہ انداز میں نہ بتائے جائیں، اس وقت تک اصلاح یا صحت کیونکر ممکن ہے۔ انگلستان کی سرزمین پر وہ جابجا علوم و فنون کے خزانے بکھرے ہوئے دیکھتا، مغرب کی صنعت و حرفت اور سائنٹفک ایجادات جہاں اسے متحیر کرتی ہیں، وہاں اپنے ملک کی بے مائگی کے اسباب روشن تر ہوتے ہیں، جب وہ یہاں کے معاشرے کے ادنیٰ سے لے کر امرا کے طبقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی مخصوص تہذیب و شائستگی کے نمونوں کو دیکھتا ہے تو اپنوں کی کمزوریوں پر اس طرح حرف زن ہوتا ہے :-

"ہم جو ہندوستان میں انگریزوں کو بداخلاقی کا مجرم ٹھہرا کر (اگرچہ اب بھی ان کو اس الزام سے بری نہیں کرتا،) یہ کہتے تھے کہ انگریز ہندوستانیوں کو بالکل جاہل سمجھتے ہیں، اور نہایت حقیر جانتے ہیں، یہ ہماری غلطی نہیں تھی، وہ ہم کو سمجھتے ہی نہیں تھے، بلکہ درحقیقت ہم ایسے ہیں، میں بلا مبالغہ نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ تمام ہندوستانیوں کو، اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک، امیر سے لے کر غریب تک، سوداگر سے لے کر اہل حرفہ تک، عالم فاضل سے لے کر جاہل تک انگریزوں کی تعلیم و تربیت اور شائستگی کے مقابلے میں درحقیقت ایسی ہی نسبت ہے، جیسے نہایت لائق اور خوبصورت آدمی کے سامنے نہایت میلے کچیلے اور وحشی جانور کو، پس تم کسی جانور کو قابل تعظیم یا لائق ادب سمجھتے ہو، کچھ اس کے ساتھ اخلاق یا بداخلاقی کا خیال کرتے ہو، ہرگز نہیں کرتے پس ہمارا کچھ حق نہیں (اگرچہ وجہ ہے) کہ انگریز ہم ہندوستانیوں کو ہندوستان میں کیوں نہ وحشی جانور سمجھیں۔" (مکاتیب سرسید احمد خاں، مرتبہ مشتاق حسین ص [illegible])

اپنے خط میں سرسید ایک کتاب کا تذکرہ کرتے ہیں، جو انڈیا آفس میں موجود ہے، اور انگریز نوجوان (جو سول سروس کا امتحان پاس کرنے کے بعد عنقریب ہندوستان جانے والے ہیں) ہندوستانی لوگوں اور ان کے رسم و رواج سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے اس کا مطالعہ کرتے ہیں، لیکن یہ کتاب غیرت مند ہندوستانیوں کے لئے تازیانۂ عبرت ہے، مکتوب نگار اس ضمن میں ایک واقعہ پیش کرتا ہے، جو سید محمود کو پیش آیا،

"ایک دن میں اور حامد اور محمود انڈیا آفس میں گئے، محمود نے اس کتاب کو دیکھنا شروع کیا، اتنے میں ایک جوان انگریز شاید کوئی سول سروس پاس کئے ہوئے تھا، آن کھڑا ہوا، تھوڑی دیر بعد اس نے محمود سے پوچھا کہ تم بھی ہندوستانی ہو، محمود نے اسی وقت بلا خیال کہا (یس) مگر یہ کہتے ہوئے اس کو ایسی شرمندگی ہوئی اور اس کا رنگ متغیر ہو گیا، اور اس نے کہا۔ I am

A foreign national and not an Indian.

میں ہندوستان کی قوم کا آدمی نہیں ہوں، بلکہ پردیسی قوم کا ہندوستان میں آیا ہوں"[۵۸]

اس میں شک نہیں کہ اچھے رسم و رواج قوم کی بیدار مغزی کی دلیل ہوتے ہیں جس سے پورے معاشرے کے انداز فکر پر روشنی پڑتی ہے، اس وقت مکتوب نگار کے ذہن میں اپنے بنگالی اور پارسی بھائیوں کی تصویر ابھرتی ہے جنھوں نے ہوشمندی سے کام لے کر عصری حقائق کو سمجھنے کی کوشش کی، اور نئے حالات کے مطابق اپنے اندر تبدیلی پیدا کی لیکن مسلمان ابھی تک پدرم سلطان بود کے مصداق ماضی کی داستان کو سینہ سے لگائے بیٹھے ہیں، اور حال کے تقاضوں سے

---

۵۸ مکاتیب سرسید احمد خاں مولفہ مشتاق حسین ص ۲۶،

علی نظر آتے ہیں،

"مگر ہمارے ہموطن ہندو اور کمبخت مسلمان بھائی اب تک کوئے جہالت میں پڑے ہوئے ہیں، .... اور شاید مسلمان تو تہ دونوں تک پڑے رہیں، گو پھر وقت اور زمانہ اُن کی ترقی کا اور شائستگی کا باقی نہ رہے، کیونکہ اُن کو یعنی مسلمانوں کو جہل مرکب نے گھیرا ہے، اپنے باپ دادا کے قصے یاد کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم سے بہتر کون ہے، اور حال میں جو باغ ان کے سامنے ہے، اور گل و پھول کھل رہے ہیں، اسی جہل مرکب نے اُن کی آنکھوں کو ان کے دیکھنے سے اندھا کر دیا ہے۔"[1]

رومانیت کے بجائے حقیقت پسندی اور مشاہدہ نوازی کا احساس ہوتا ہے، سانحہ ...کشن واس کو اپنی "پرائیوٹ لائف" کا جو حال سمجھتے ہیں، وہ کافی دلچسپ ہے، جس ...جنگٹ ...وہ فروکش ہیں وہاں انھیں اپنے میزبان گھرانے کے طور طریقوں کو قریب سے دیکھنے کا ...قع ملتا ہے، حسن اتفاق سے یہاں ان کا سابقہ خواتین سے زیادہ پڑتا ہے، مسز لڈلم خاتون خانہ اور ان کی بہن مس السن وسٹ ہیں، ان کے علاوہ دو لڑکیاں این اسمتھ اور ...یمی ...فیوز ہیں، جو مہمانوں کی خدمت کی انجام دہی پر مامور ہیں، واحد مرد صاحب خانہ مسٹر ...لم ہیں، جو علمی مشاغل میں ہمہ تن غرق رہتے ہیں، انھیں آفس جانے اور علمی جلسوں میں ...رکت کرنے کے علاوہ کسی چیز سے سروکار نہیں ہے، بس (مسز) لڈلم نے انھیں گھریلو ذمہ داریوں ...آزاد کر رکھا ہے، مکتوب نگار خاتون خانہ کو "تہذیب اور اخلاق اور ادب اور انسانیت ...ز کی مجسم قرار دیتے ہیں، جس نے اپنے وجود سے گھریلو زندگی کو حد درجہ منظم اور پرسکون بنایا ہے ...س السن وسٹ کا ذوق کتب بینی مکتوب نگار کے لئے ایک حیرت ناک تجربہ ہے، ہماری لڑکے

---

[1] مکاتیب سرسید احمد خاں، مرتبہ مشتاق حسین ص ۲۷۰،

عالم میں وہ مکتوب نگار سے کوئی کتاب پڑھنے کے لئے منگا بھیجتی ہے، مذہبی کتاب (اور وہ بھی بدو قدیم اور جھگڑے والی کتاب) کو وہ نہایت شوق سے پڑھتی ہے، وہ ملاقات ہونے پر وہ کتاب کے نفس مضمون سے متعلق ایسی مدلل گفتگو کرتی ہے، کہ مکتوب نگار بے اختیار ہو کر لکھتے ہیں

"کیا یہ تعجب خیز بات نہیں کہ ایک عورت حالت بیماری میں کتاب پڑھنے سے دل بہلاوے آپ نے ہندوستان میں کسی امیر کسی نواب کسی راجہ کسی مرد اشراف کو ایسی خصلت کا دیکھا ہے!"[۱]

این اسمتھ اور الیزبتھ ماتھیو جن کو معمولی خادمائیں ہیں لیکن جس احساس ذمہ داری کے ساتھ وہ ہندوستانی مہمانوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں، اسے دیکھ کر مکتوب نگار کا دل انجذاب اور حیرت کے ملے جلے جذبات سے مغلوب ہونے لگتا ہے، ان کی پابندی اوقات صفائی ستھرائی اور حسن انتظام قابل داد ہے، الیزبتھ ماتھیو اخبار بینی کی شوقین ہے قلیل آمدنی کے باوجود وہ ایک پینی والا اخبار "ایکو" خریدتی ہے اور فرصت میں اس کا مطالعہ کرتی ہے کبھی پنچ کا کوئی پرچہ لے کر اس میں عورتوں کی جو تصویریں مسخرا و رکشم پر ہوتی ہیں، انہیں دیکھتی اور ان پر کے کنایوں اور اشاروں کو سمجھ کر ان سے لطف اندوز ہوتی ہے، مکتوب نگار الیزبتھ کے ان اوصاف سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں

"آپ یقین جانئے کہ اگر یہ عورت جو نہایت غریب اور اصل گری کی نوکری کی محتاج ہے، اور دن رات ہماری خدمت میں حاضر رہتی ہے، اگر ہندوستان میں جاوے اور اچھے سے اچھے امیر آدمی کی عورتوں سے ملے تو اُن کو محض جانور سمجھے، اور نہایت حقارت سے اُن سے نفرت کرے۔ (مکاتیب سرسید احمد خاں، مرتبہ مشتاق حسین، ص ۴۳)

لندن کے عوام میں مطالعہ کا ذوق اس قدر عام ہو گیا ہے اور کوچوان بھی اپنی گدی کے نیچے کوئی کتاب یا اخبار دبائے رکھتے ہیں جہاں سواری پہنچائی اور کیب (یا جو سواری ہو وہ) کھڑی کی، اور پڑھنا شروع کر دیا، تہذیب شائستگی کے یہ نقوش اسے متاثر کرتے ہیں،

---

[۱] مکاتیب سرسید احمد خاں مرتبہ مشتاق حسین ص ۴۴

سرسید کے مشاہدات اور غور و فکر کا پورا عکس ہمیں ان خطوط میں نظر آتا ہے، جو انھوں نے لندن سے نواب محسن الملک کو بھیجے تھے، مخاطب سے مکتوب نگار کے قلبی لگاؤ کا اندازہ گرمجوشی میں ڈوبے ہوئے القاب و آداب سے لگایا جا سکتا ہے، وہ محسن الملک کو کبھی محبوب اور محب کہکر مخاطب کرتے ہیں، اور کہیں لحمک لحمی اور دمک دمی کے لقب سے سرفراز کرتے ہیں محسن الملک سرسید سے بہت قریب اور معاملات سرزمین وطن میں اُن کے دست راست ہیں، پہلے خط میں ہم دیکھتے ہیں کہ مکتوب نگار مخاطب سے کیا توقعات رکھتے ہیں،

"مجھ کو علاوہ مفارقت احباب کے یہ رنج بڑا ہے کہ میرے پیچھے لوگ عقل کے دشمن سینٹیفک سوسائٹی کو باقی نہیں رکھیں گے، پس میں چاہتا ہوں کہ آپ سوسائٹی کی طرف زیادہ متوجہ ہوں اور اس کو سنبھالنے اور ممبروں کو بڑھانے میں زیادہ کوشش فرمادیں[1]"

لندن میں مکتوب الیہ (محسن الملک) کا خط مکتوب نگار کے لئے باعث مسرت ہوتا ہے تو وہ (سرسید) اس کا اظہار والہانہ انداز میں کرتے ہیں، :-

"آپ کا عنایت نامہ مورخہ بلا تاریخ پایا، "اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی" جس قدر دل کو مسرت آپ کے خط سے ہوئی ہو، بیان نہیں کر سکتا، اگر یوسف زلیخا کو یا لیلی مجنوں کو ملتی، تو شاید اسی قدر خوشی ہوتی، جس محبت سے لکھا تھا، وہ اثر ان لفظوں میں موجود تھا، جس محبت سے آپ نے شعر لکھے تھے، ان کو پڑھ کر میں ایسا محو محبت ہوا، کہ گویا یہ سمجھنا دشوار تھا کہ وہ شعر میں نے آپ کے حق میں لکھے ہیں، اور اس کیفیت سے وحدۃ الوجود کے مسئلے کا عقدہ حل ہوتا تھا،

---

[1] خطوط سرسید مرتبہ سرراس مسعود ص ۴

ملیں ما حمد و عدی نہ پیچ ہاست حجاب   تو خود حجاب خودی حالی از میاں برخیز

اس میں مزاح کے طور پر محسن الملک کی شکستہ تحریر پر چوٹ کرتے ہیں:۔

"یہ بے تصنع آپ سے کہتا ہوں کہ آپ کی شکستہ رقمی نے اور بھی زیادہ لطف دیا، دو تین دفعہ پڑھنا پڑا، ایک دفعہ کے پڑھنے میں جو لفظ رہ گیا تھا، دوسری دفعہ میں نکلا، اور بہت زیادہ مزہ دیا، اسی وقت میرے دل میں مرزا مرحوم کا یہ شعر گذرا،

زکلک می تپد نبض رگِ لعل گہر بارش   شہید انتظارِ جلوۂ خویش است گفتارش[۱]

مکتوب نگار کو محسن الملک کے اس ارادے کا پتہ چلتا ہے، کہ وہ لندن آنا چاہتے ہیں اس کا جواب ان کی محبت اور فرط اشتیاق کا آئینہ بن جاتا ہے، خلوص کا جذبہ والہانہ رازمیں ڈھلتا ہے، تو تحریر میں جاذبیت ابھرتی ہے، اس خط میں آغاز کا حسن دیکھئے،

قبلہ گویم یا خدا یا کعبہ یا پیغمبرش   اصطلاح عشق بسیار است ومن دیوانہ ام

قبلہ میرے، مخدوم میرے، محبوب میرے محب میرے، (اب تو صاف لکھ دوں جو ہو سو ہو)

"سلامت! آپ کا عنایت نامہ پایا، اور عجیب کیفیت میں مبتلا کیا، کبھی اپنے آپ کو دیوانہ سمجھتا ہوں، کبھی تم کو دیوانہ جانتا ہوں، جو کچھ آپ نے لکھا ہے کبھی اس پر ترددِ یقین لاتا ہوں، پھر شک میں پڑ جاتا ہوں، اگر آپ لندن میں آویں تو مجھ کو اور بالخصوص محمود کو جو خوشی ہو اس کا اندازہ غیر ممکن ہے"[۲]

ایسے صادق دوست سے دل کا حال کھل کر بیان کرنا قدرتی بات ہے، چنانچہ لندن پہنچ

---

۵۱ خطوط سرسید: مرتبہ سر راس مسعود ص ۱۲۔ ۵۲ ایضاً ص ۲۸۔

حکایت دراز تر گفتم" کے انداز میں سرسید محسن الملک کو اپنی انفرادی حکایت کا راز داں بتاتے ہیں :-

سرسید انگلستان کی سرزمین پر بسنے والی قوم سے ترقی، بلند خیالی اور حریت فکر کے مفید سبق لینے کے خواہاں تھے لیکن یہاں ان کی حیثیت محض تماشائی کی نہیں تھی، مختلف النوع علمی، ملکی، اور قومی خدمات کی بنا پر خود ان کی شخصیت میں جو وزن اور وقار پیدا ہو چکا تھا[۱۲] اس کی شہرت اُن کی آمد سے قبل یہاں پہنچ چکی تھی، اور وہ انگلستان کے اہل علم ودانش کے لئے اجنبی نہیں ہو تھے چنانچہ یہاں ان کا جس انداز سے خیر مقدم ہوا، وہ مکتوب نگار کی غیر معمولی شخصیت کا کھلا ہوا اعتراف ہے، تعریف وتوصیف سے بے نیازی کے باوجود ان کے لئے یہ ایک خوشگوار تجربہ ہے، جسے وہ مکتوب الیہ کو بے اختیارانہ طور پر سناتے ہیں،

" لندن کے احباب وعلماء واشخاص نامی جس محبت واخلاق وعنایت سے مجھ سے ملے اور صرف اپنے اخلاق سے مجھ غریب نالائق کی جس قدر خاطر کی، اس کا میں نے کبھی ذکر

---

[۱۲] اس وقت تک ان کی علمی دلچسپیوں کا دائرہ وسیع ہو چکا تھا، آثار قدیمہ، تاریخ سیاسیات، مذہبی موضوعات سے متعلق کتابیں شائع ہو چکی تھیں، ۱۸۴۷ء میں سرسید نے آثار الصنادید کے صفحات میں دلی کے آثار قدیمہ کو محفوظ کر دیا، .... تبیین الکلام میں انجیل اور توراۃ کی اصولی وحدت ثابت کی، غدر ۱۸۵۷ء کے حالات پر اسباب بغاوت ہند لکھی جس میں سیاسی مذہبی، معاشی، اور عسکری نقطہ نظر سے واقعات پر روشنی ڈالی، بقول ہارون خاں شروانی "یہ رسالہ سیاسی طرز کا پہلا رسالہ ہی نہیں، بلکہ یہ پہلا سیاسی رسالہ ہے جو کسی ہندوستانی نے لکھا ہے" دی لائل محمڈنز آف انڈیا کے نام سے انھوں نے ایک رسالے کا اجراء کیا، جس میں ان مسلمانوں کے حالات درج ہوتے تھے جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی حمایت کی تھی،

نہیں ملی، اگر وہ لکھا جاتا، تو مبالغہ پر محمول ہوتا۔"[1]

ملکہ معظمہ کی طرف سے ان کو سی ایس آئی کا خطاب اور اسٹار آف انڈیا کا تمغہ عطا ہوا۔ فلورنس، لارڈ اسٹینلے، ڈیوک آف ارگل، مارکوئیس آف لورن، اور ان کے علاوہ متعدد مشہور شخصیتوں سے ملاقاتیں رہیں، چارلس ڈکنس نے جب اپنی تصنیف کی آخری یا بلند خوانی کی، تو حسن اتفاق سے مکتوب نگار اس جلسے میں موجود تھے، کارلائل سے اس کی تصنیف ہیرو اور ہیرو ورشپ کے بارے میں تبادلۂ خیال کیا، غرضیکہ انگلستان کے علمی، ادبی اور سیاسی حلقوں میں جہاں جہاں ان کا گذر ہوا، انھوں نے اپنے وسیع خیالات کا مفید اور خوشگوار اثر چھوڑا۔ مغربی ملکوں کی شائستگی اور ترقی کے مشاہدے کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن مکتوب نگار انگریزی حکومت کا وفادار ہونے کے باوجود آزادیٔ رائے کے زبردست حامی ہیں چنانچہ اس کا اظہار وہ ان تمام موقعوں پر کرتے ہیں، جو وطن اور اہل وطن کے مسائل سے متعلق ہیں، ان کا رسالہ اسباب بغاوت ہند صاحبان ذی اقتدار کے مطالعہ سے گذر چکا ہے، جس میں ان حقائق کی نشاندہی کی تھی، جو اُن کی رائے میں غدر کے اصل اسباب تھے، اس کوشش کو کامیاب دیکھ کر ان کو خوشی ہوتی ہے، ایک ہندوستانی کی حیثیت سے وہ انڈیا کونسل کے ممبران سے اپنے ملک کے مسائل پر تبادلۂ خیال بھی کرتے ہیں، چنانچہ محسن الملک کو ان امور کے بارے میں اطلاع دیتا ہے

"میں انڈیا آفس میں صاحب سکریٹری وزیر ہند کے پاس گیا تھا، انھوں نے مجھے کونسل کے کاغذات میں میری کتاب "اسباب بغاوت" مع تمام و کمال انگریزی ترجمے کے دکھلائی، اسے دیکھ کر دل بہت خوش ہوا، جو کچھ رائیں اس کی بدولت قرار پائیں اس کا بیان بے فائدہ ہے، اہل ہند نا قدرداں

---

[1] خطوط سرسید ص ۱۲۔

دوست کش، اور اپنے خیر خواہ کے دشمن ہیں، مگر میں خوش ہوں کہ میرے دوستوں کی بھلائی ہوئی ہے، اب ایک اور کتاب انتظام گورنمنٹ انڈیا پر لکھ رہا ہوں، انڈیا کونسل کے بعض ممبروں نے فرمایا کہ ہم ایک دن فرصت کا مقرر کرکے ہندوستان کے بارے میں گفتگو کریں گے، کچھ تھوڑی سی گفتگو نسبت انتظام پنجاب اور فائدہ میونسپل پر ہوئی اگر وہ کتاب میری چھپی اور مجھ اس کے چھاپنے اور انگریزی عبارت کی اصلاح میں جو خرچ ہوگا، اس کا مقدور ہوا تو آپ دیکھیں گے کہ میں کیا لکھ رہا ہوں، اور اس کتاب سے کس قدر فائدہ ہوگا اور کیسا صاف صاف لکھ رہا ہوں[1]" (باقی)

---

[1] خطوط سرسید ص ۲۹

مکاتیب شبلی

حصہ اول و دوم

مولانا شبلی مرحوم نے اپنے عزیزوں دوستوں اور شاگردوں کو جو خطوط لکھے تھے، دار المصنفین نے ان کا مجموعہ دو جلدوں میں شائع کیا ہے، اس سے اُن کے قومی خیالات اور علمی و تعلیمی نظریات کے علاوہ ان کے عہد کے مسلمانوں کی تاریخ بھی سامنے آجاتی ہے، یہ خطوط دلچسپ ادبی نکات اور مولانا کے قلم کی رعنائیوں سے بھی معمور ہیں،

قیمت حصہ اول ۰ ۔ ۱۴ حصہ دوم ۰ ۰ ۱۱

"منیجر"

اسلام اور مستشرقین

پر

دار المصنفین کا بین الاقوامی سیمنار

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۵)

سیمنار کی تیسری نشست جناب سید حامد وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی صدارت میں شروع ہوئی اور اس کی کارروائی کو آگے بڑھانے کی ذمہ داری اس خاکسار نے لی، یہ نشست صرف پاکستان کے مقالہ نگاروں کے لیے مخصوص کردی گئی تھی۔

خاکسار نے عرض کیا کہ یہ نشست صرف پاکستانی وفد کے مقالہ نگاروں کے لیے مخصوص کردی گئی ہے ہم پاکستانی وفد کے اراکین کے شکر گذار ہیں کہ انھوں نے دور دراز سفر کی تکلیفیں برداشت کرکے اس سیمنار میں شرکت کی اور ہم کو اپنے لطف و کرم سے نوازا، پاکستان سے جو حضرات تشریف لائے ہیں ان میں سب سے زیادہ نمایاں شخصیت جناب حکیم محمد سعید دہلوی کی ہے جو کسی تعارف کے محتاج نہیں، ان کا نام اس وقت پوری دنیا میں پھیلا ہوا ہے، البتہ بعض حیثیتوں سے میں ان کا ذاتی طور پر بے حد ممنون ہوں کہ ان کے ایسے احسانات ہیں جو میرے دل کے اندر رہ کر میری قبر میں ساتھ ہی جائیں گے، ان کے ساتھ کراچی سے ڈاکٹر فرید الدین بقائی، حکیم نعیم الدین زبیری صاحب

بھی آئے ہیں، مفتی سیاح الدین کاکاخیل رکن اسلامی نظریاتی کونسل بھی تشریف لائے ہیں، لیکن وفد کی صورت میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اسلام آباد کے معززین آئے ہوئے ہیں، ان کے سربراہ ڈاکٹر عبدالواحد ہالی پوتا ہیں جو اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے بڑے محبوب ڈائرکٹر ہیں ان کے جلو میں جناب عبدالقدوس ہاشمی ہیں جو اسی انسٹی ٹیوٹ میں پروفیسر ہیں، ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی بھی ہیں جو اسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے رسالہ فکر و نظر کے بڑے قابل ایڈیٹر ہیں اور جناب محمود احمد غازی ریڈر اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ڈاکٹر محمد طفیل اور اسی انسٹیٹیوٹ کے لائبریرین ڈاکٹر احمد خان بھی ہیں، ان حضرات کی تشریف آوری سے مجھ کو ذاتی طور پر انتہائی خوشی ہے اور میں دارالمصنفین کی طرف سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے استاذ مولانا سید سلیمان ندوی فرمایا کرتے تھے کہ جو دارالمصنفین کا مہمان بن کر یہاں آتا ہے اس کو میں اخلاص کا پیکر سمجھتا ہوں، اس لیے کہ اس دور افتادہ مقام تک سفر کرنا آسان نہیں ہوتا، دلی اور لکھنؤ پہونچنا تو آسان ہوتا ہے اور وہاں پہونچ کر کسی سے ملنے جانے میں یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اپنا ذاتی کام بھی کر لیا جاتا ہے اور کسی سے مل کر یہ احسان جتا دینے میں آسانی ہوتی ہے کہ صرف ان سے ملنے کی خاطر یہ سفر کیا ہے، لیکن دارالمصنفین میں وہی لوگ آتے ہیں جو صرف دارالمصنفین دیکھنے کا شوق رکھتے ہیں، کیونکہ یہاں کسی اور تفریح کا سامان نہیں ہے، اس لیے پاکستان کے لوگوں نے سفر کی جو صعوبتیں برداشت کر کے یہاں آنے کی زحمت گوارا کی، ان کو دارالمصنفین کے لوگ اخلاص کا پیکر سمجھ رہے ہیں، مجھ کو یہ بھی معلوم ہوا کہ جب میری طرف سے ڈاکٹر ہالی پوتا صاحب کو دعوت نامہ پہونچا تو اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا پورا اسٹاف یہاں آنے کے لیے خواہشمند اور تیار ہوا، جب اس کی خبر انسٹی ٹیوٹ کے صدر ڈاکٹر نبی بخش بلوچ وائس چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی اسلام آباد کو ہوئی تو انھوں نے کہلا بھیجا کہ

اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو تو پھر بند کرنا پڑے گا، یہ کسی لحاظ سے مناسب نہیں، میرا دعوت نامہ ان کی خدمت میں بھی پہونچا تھا، لیکن انھوں نے ایک خط میں اپنی مشغولیتوں اور مجبوریوں کا ذکر کر کے لکھا ہے کہ ان کی زندگی کی بڑی آرزو یہ تھی کہ وہ دارالمصنفین کو دیکھیں، اس موقع پر حاضر ہوتا تو یہ آرزو پوری ہو جاتی، معلوم نہیں آیندہ زندگی میں یہ آرزو پوری ہو سکے بھی یا نہیں، سمینار کے لیے اپنی نیک خواہشات کا اظہار صدق دل سے کیا ہے۔

اب میں سب سے پہلے جناب ڈاکٹر ہالی پوتا صاحب سے گذارش کروں گا کہ وہ یہاں تشریف لا کر اپنے تاثرات کا اظہار کریں، اس موقع کے لیے جو باتیں ان کے ذہن میں آئی ہوں ان سے ہم لوگوں کو محظوظ کر کے شکر گذار کریں، اس خاکسار کو دارالمصنفین کے کاموں کے سلسلہ میں اسلام آباد میں بہت دنوں تک قیام کرنا پڑا، مولانا کوثر نیازی وزیر امور مذہبی حکومت پاکستان کے ایماء پر اسلام آباد کلب میں جناب ہالی پوتا کی نگرانی میں اس خاکسار کی جو پذیرائی کی گئی اس کی یاد دل کی شمع اب تک روشن ہے، اس کی ایک شاندار افطار پارٹی میں پاکستان ریڈیو والوں اور اخبار نویسوں نے دارالمصنفین سے جو دلچسپی ظاہر کی، اس کے لیے یہ خاکسار ان کا بہت ممنون ہوا، اسلام آباد میں میرا زیادہ تر وقت انسٹی ٹیوٹ ہی میں گذرا، جہاں پہونچ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دارالمصنفین میں ہی بیٹھا ہوں، ڈاکٹر ہالی پوتا صاحب نے ہر قسم کی مادی، علمی اور اجازت دیجیے تو یہ بھی کہوں کہ روحانی نوازشوں سے نوازا، ان کے متعلق بغیر کسی شک و شبہہ کے یہ کہہ سکتا ہوں کہ پاکستان کے اچھے لوگوں کی ایک فہرست تیار کی جائے تو اس میں ان کا نام نامی ضرور ہوگا، کیونکہ میرا ذاتی خیال ہے کہ ان کے دل کو چیر کر دیکھا جائے تو اس میں حسین اور خوشبودار گلاب کی پنکھڑیاں رکھی ہوئی نظر آئیں گی۔

جناب عبدالواحد ہالی پوتا | جناب صدر! میں جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن کا بہت شکر گذار ہوں

کہ انھوں نے میرے متعلق یہ سب کچھ کہا ہے، یہ خود ان کے ذاتی خلق کی دلیل ہے، وہ صرف اچھی چیزوں کے دیکھنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ہم لوگوں کو دارالمصنفین سے بہت ہی گہرا تعلق ہے کیونکہ اس مرکز سے جو انوار ظاہر ہوئے ہیں ان کو کوئی کیونکر نظر انداز کر سکتا ہے، میں اپنی طالب علمی کے زمانے سے دل میں یہ خواہش رکھتا تھا کہ اس مرکز کی زیارت کروں اور جب جناب سید صباح الدین کا خط آیا تو میرے لیے یہ دعوت نامہ نہ تھا گویا یہ حکم تھا۔ اس کی تعمیل میرے لیے ضروری ہو گئی، اسی تعمیل کی خاطر میں یہاں حاضر ہو گیا ہوں، آپ اگر اجازت دیں تو میں اپنے خیالات کا اظہار انگریزی زبان میں کروں۔

اس کے بعد وہ انگریزی میں بولے جس کا خلاصہ یہ ہے: میں کچھ بول کر آپ لوگوں کے معلومات میں اضافہ نہ کر سکوں گا، لیکن مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں کچھ بولوں تو کچھ باتیں سماعت کرنے کی تکلیف گوارا کریں، اس سے مجھ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہو جائے گا کہ اس عظیم اور مقدس تقریب میں میری شرکت بھی ہو گئی، میں زیادہ تر اپنے ذاتی تجربات کو بیان کرنا چاہتا ہوں جو مجھ کو مستشرقین کے سلسلہ میں حاصل ہوئے ہیں، میں یہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ میں ۱۹۳۰ء سے ان مستشرقین کا مطالعہ کر رہا ہوں، ان کی طرف میری توجہ ڈاکٹر داؤد پوتا نے دلائی، جو اسماعیل کالج جوگیشوری بمبئی میں تھے، میں نے اسلامی علوم مدرسہ کی تعلیم میں بھی حاصل کیے ہیں، میں جب ہائی اسکول میں تھا تو میرے ساتھ ہندو طلبہ بھی تھے اور ہندو اساتذہ بھی، جن سے اسلام کے متعلق باتیں ہوتی رہتی تھیں، لیکن جب مجھ کو مولانا عبید اللہ سندھی کی صحبت کا شرف حاصل ہوا تو انھوں نے مجھ کو شاہ ولی اللہؒ کا مطالعہ کرنے کی ترغیب دی اور پھر ان ہی کی خواہش کے مطابق حجۃ اللہ البالغہ پڑھنا شروع کیا، اور جب میں انگلستان گیا تو پروفیسر نکلسن اور پروفیسر میکڈانلڈ سے ملنے کی عزت حاصل ہوتی رہی، ان کی کتابیں اور تحریریں پڑھ کر ان سے بہت سے معلومات

ضرور حاصل کرتا، لیکن یہ بنیادی بات سمجھ کر ایسے لوگوں کی تحریریں پڑھنی چاہئیں کہ یہ لوگ مسلمانوں کے ان کے مذہب اور مذہبی عقائد کو سمجھانے کے لیے کتابیں نہیں لکھا کرتے بلکہ وہ اپنے عیسائی مبلغین کے لیے لکھا کرتے ہیں، وہ ہمارے مذہب، ہماری تاریخ کے کمزور پہلوؤں کو اس لیے پیش کرتے ہیں کہ عیسائی مبلغ ان ہی کو اچھال کر اسلام کے خلاف زہر چکانی کریں اور ان کو اپنے مذہب کی تبلیغ میں مدد حاصل ہو، وہ بعض ایسی باتیں بھی لکھ جاتے ہیں جن کا تعلق نہ ہمارے مذہب سے ہے، نہ ہمارے مذہبی عقائد سے، لیکن وہ اپنے عیسائی مبلغین کے لیے کچھ مواد فراہم کردیتے ہیں، اور یہ مبلغین ان کو روشن ضمیر اور راسخ العقیدہ مسلمانوں کی تصنیفات بناکر لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں، مجھ کو پروفیسر گب کی شاگردی کی بھی عزت حاصل ہوئی، وہ مجھ پر بے حد مہربان تھے اور مجھ کو زیادہ سے زیادہ وقت دیا کرتے، انھوں نے مجھ کو وہاں کا اہم وظیفہ دلایا تاکہ میں رہنے سہنے، پڑھنے لکھنے، حتیٰ کہ اپنے مسودات ٹائپ کرانے میں زیادہ سے زیادہ سہولت حاصل کرسکوں، ان کو شاہ ولی اللہ سے بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی اور ان کی نگرانی ہی میں میں نے اپنے مقررہ وقت سے پہلے ہی مقالہ ختم کرلیا، جس کی تعریف پروفیسر گب نے کی، لیکن اس کو دو بڑے مستشرقین نے منظور کرنا پسند نہیں کیا، ان میں ایک مستشرق پاکستان بھی آئے اور ان کو یہاں اعزازی ڈگری دی گئی، وہ اپنے مذہبی تعصب کی بنا پر شاہ ولی اللہ کو پسند نہیں کرتے تھے، مجھ سے یہ بھی کہا گیا کہ یہ مقالہ اگر منظور بھی کیا گیا تو اس کو یورپ میں نہیں چھپنا چاہیے، اس سے ان مستشرقین کے مذہبی اور ذہنی تعصب کا بھی اظہار ہوتا ہے، پروفیسر گب نے محمڈن ازم پر کتاب لکھی اور جب میں نے ان سے اس کتاب پر گفتگو کی تو انھوں نے اس کا اعتراف کیا کہ محمڈن ازم کی اصطلاح صحیح نہیں ہے لیکن یہ کتاب مارگولیتھ کی محمڈن ازم کی جگہ پر لکھی گئی ہے، اس لیے اس کا نام بھی نہیں بدلا گیا، اس میں مارگولیتھ کی طرح چونکا دینے والی باتیں نہیں ہیں، اس کتاب کو پڑھ کر دل کو وہ صدمہ نہیں پہونچتا، جو

مارگولیتھ کی کتاب کے مطالعہ سے پہونچا ہے، گو ان کی بعض باتوں سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، لیکن یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ انھوں نے اور پادری اسکالرس کی طرح یہ کتاب نہیں لکھی، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ وہ مسلمان نہیں تھے۔ میں ایک مستشرق بینٹ سے بھی ملا، جن کو صوفی ازم سے بڑی دلچسپی تھی، اور صوفی ازم پر نصاب میں کچھ کتابیں بھی رکھوائیں، جن میں کشف المحجوب بھی تھی میں نے ان سے کہا کہ وہ اپنے کو مسلمان تو نہیں کہتے، لیکن وہ مسلمانوں کی روایت کا احترام کرتے ہیں، یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مستشرقین میں کچھ اسکالر ایسے ہوتے ہیں جو یا تو خود پادری ہوتے ہیں، یا خاندانی حیثیت سے پادری بنے رہتے ہیں، ہمارے مقالہ کو جس مستشرق نے پسند نہیں کیا وہ پادری ہی تھا، ان پادریوں سے ہم کو کسی قسم کی ہمدردی کی توقع کرنا صحیح نہیں، ہم کو خود اپنے لٹریچر پر بھروسہ رکھنا چاہیے اور ہم خود اپنے یہاں اسے قابل قدر اور وزنی لٹریچر پیدا کرلیں کہ ہمارا اور ہمارے نوجوانوں کا ذہن ان مستشرقین کی کتابوں سے متاثر نہ ہو، لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ ماڈرن اسلام پر کوئی کتاب لکھی گئی، میں کہتا ہوں کہ یہ ماڈرن اسلام کیا ہے، اگر خرافات کا نام ماڈرن اسلام ہے تو پھر ایسی چیزوں پر کوئی کتاب لکھنے کی ضرورت نہیں، مسلمان جو کچھ آج کل کرتے ہیں یا کہتے ہیں، اس کو اسلام سمجھنا اسی طرح صحیح نہیں ہوگا جس طرح نازی ازم یا اسی طرح کے اور ازم کو کوئی کرسچینٹی یا عیسائیت کہے۔

اس تقریر کے بعد خاکسار نے مولانا عبد القدوس ہاشمی کی خدمت میں عرض کیا وہ تشریف لائیں اور اپنے خیالات کا اظہار کریں، مولانا عبد القدوس صاحب کے بارے میں صرف اتنا کہنا ہے کہ اگر فقہی، مذہبی، تاریخی، سیاسی اور دنیا بھر کے معلومات کو نچوڑ کر ایک پیکر بنایا جائے تو وہ مولانا عبد القدوس ہاشمی کی ذات ہوگی، انھوں نے اسلام اور مستشرقین پر ایک کتاب لکھی ہے جس کے ترجمے مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں، وہ اب تشریف لا رہے ہیں۔

مولانا عبدالقدوس ہاشمی: اعوذ باللہ، بسم اللہ، الحمد للہ الذی لا الٰہ الّا وحدہٗ، والصلوٰۃ والسلام علی النبی الذی لا نبی بعدہٗ. حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ہم بوڑھے ہو چکے ہیں، اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا. ایک لطیفہ سنا کر چلا جاؤں گا، میں مقالہ وقالہ لکھ کر نہیں لایا ہوں، مقالہ میرا کئی زبانوں میں شایع ہو چکا اور کئی رسالوں میں ابھی اور بڑی گالیاں کھائی ہیں مغرب والوں کی، پروفیسر اسمتھ کا ذکر ہو رہا تھا،...... میں نے ان کو بڑا قابل، بڑا معقول، اور بہت عمدہ آدمی پایا، میری ان سے بہت سی ملاقاتیں رہیں، وہ کہنے لگے کہ کیا اسلام ہمیشہ سے تھا؟ میں نے کہا بالکل، وہ تھا. کہنے لگے کہ اسلام کے لفظی معنیٰ ہیں اطاعت کے لیے سر جھکا دینا. میں نے کہا بالکل ٹھیک معنیٰ! کس کی اطاعت کے لیے؟ انھوں نے کہا: اللہ کی اطاعت کے لیے، میں نے کہا: اور یہ بتا دو کہ اس کا علم کیسے ہوگا؟ ٹیلیفون پر تو اللہ میاں بولتے نہیں ہیں، ٹیلی گرام دو تو جواب نہیں دیں گے، خط لکھو تو جواب نہیں دیں گے تو یہ معلوم کیسے ہوگا کہ ان کی اطاعت کیسے ہو؟ میں نے کہا سنو! ایک لڑکا تھا، وہ کہتا تھا کہ یہ آدمی جو کھڑا ہے میرا ماموں ہے، میں نے کہا کہ واقعی تم کو معلوم ہے کہ یہ تمھارا ماموں ہے؟ تم اپنی ماں کو سچی سمجھتے ہو یہ اس کا بھائی ہے؟ کہنے لگے نہیں! ماں کی صداقت پر مجھے شبہہ ہے، میں نے کہا تو ماموں کیسے ہوئے؟ یہ بیان کر کے میں نے کہا بھائی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قرآن مجید کو خدا کی کتاب کہتے ہیں...... میں نے کہا اچھا بھائی وہ جو خدا کی مرضی تھی، وہ مرضی معلوم کیسے ہوں گے اور خدا کی اطاعت کیسے کریں گے؟ کوئی ذریعہ نہیں. اس لیے سیدھی بات کا اقرار کیجیے اگر رسول اللہؐ کی صداقت کا یقین ہے تو سمجھ میں آئے گا کہ یہ کیا ہے، ورنہ اس کے علاوہ بکواس ہوگی، سرے سے یہ عقل کی بات ہی نہیں کہ جب خدا کی مرضی ہی نہیں معلوم تو خدا کی رضا کوشش کیسے ہوگی. کہنے لگے کہ یہ تو سب کہتے ہیں، میں نے کہا: اچھا عیسیٰ مسیح کی زبان سے

نکلا ہوا کوئی ایک ٹکڑا اسناد جس میں وہ خدا کی مرضی بیان کرتے ہوں وہ کہنے لگے کہ یہ تو نہیں ہے ، میں نے کہا پھر کس افسانہ کی بات کرتے ہو، اس اسلام کی جو حضرت آدمؑ سے لے کر رسول اللہؐ تک تھا اس کی تعبیر صرف ایک ہی کر سکتے ہیں کہ جو رسول اللہؐ نے کر کے بتلایا اور کہہ کے بتلایا، حضرت موسیٰؑ نے بھی یہ بتایا ہوگا، حضرت ابراہیمؑ نے بھی یہی بتایا ہوگا، حضرت نوحؑ نے بھی یہی بتایا ہوگا لیکن بابا میں کہاں ان کے الفاظ، تم کہتے ہو کہ ترجمے کے ترجمے کا ترجمہ، اور اس کے ترجمہ کرنے والے کا نام نہیں بتلاتے ہو، اس لیے یہ مہمل سی بات ہے، ایک لطیفہ تو یہ سنا دیا آپ کو کہ اماں کو تو سچا ہی سا کہیں گے لیکن ابا کو ابا کہیں گے، اچھا کیسے کہیں گے، ایسا اچھا مواد مانع ہے، معمولی مسائل میں، اور معلوم ہوگا بات کہہ دی بڑی عالمانہ، حالانکہ انتہائی مہمل بات ہے، خبر کی کوئی قیمت نہیں ہوتی ہے جب تک مخبر کی صداقت پر ایمان نہ ہو، خبر ہمیشہ محل صدق و کذب ہے، جب تک کہ مخبر کو صادق نہ مان لیا جائے، دنیا کا سارا انٹرنیشنل لا ختم ہو جائے گا، دنیا کا نظام ختم ہو جائے گا اگر اس قسم کی کوئی ترتیب نہ ہو تو رسول اللہؐ مخبر ہیں اور ان کے علاوہ کسی اور مخبر کے الفاظ ہمارے پاس نہیں، پھر اس کے بعد اللہ کی اطاعت کے اور کون سے طریقے ہیں، اتنا غلط منطقی دعویٰ ہے یہ کہ اس کا جواب نہیں ہو سکتا، جب میں نے یہ سمجھایا تو خیر اد مزدور کی بات کرنے لگے، بس قضیہ ختم۔

ایسے ہی ایک اور لطیفہ سنایا اور اب تین منٹ میں دوسرا لطیفہ سنا دوں، جب میں چین گیا تو وہاں ڈاکٹر آف نیچرل گاڈ فس بتلایا کرتے تھے کہ مرنے کے بعد کچھ نہیں ہوگا، سب غلط ہے، یہ ہوتا ہے، وہ ہوتا ہے، انھوں نے مجھ سے وقت لیا کہ ملنے آ رہا ہوں، میں نے کہا ضرور آئیے، آئے انھوں نے ایک گھنٹہ تقریر کی اور کہنے لگے کہ کوئی بات ہے پوچھنے کی؟ میں نے کہا پوچھنے کی کیا بات رہی، زندگی بھر پریشان رہے کہ اس کے بعد جزا ہوگی سزا ہوگی آج تم نے چھٹکارا دیا، اب جو جی چاہے سو کرو، شکریہ بھائی! اب کیا سوال کروں۔ انھوں نے کہا نہیں نہیں کچھ سوال کرو!

میں نے کہا: اچھا بھائی تو صرف یہ بتلا دیجیے کہ مرنے کے بعد کچھ نہیں ہوتا ہے، اس کی خبر آپ کو کیسے ہوگئی؟ کہنے لگے کیا سوال ہوا؟ میں نے کہا سامنے ایک درخت ہے، اس کے پیچھے ایک مکان ہے، اس مکان میں کوئی عورت بیٹھی ہے کہ نہیں بیٹھی ہے، جواب دے سکتے ہو؟ اگر تم اس کا جواب ایجابی دیتے ہو کہ ہاں ہے تو تمھیں اس کا علم ہونا چاہیے، سلبی دیتے ہو تو اس کا علم ہونا چاہیے، اگر میں تم سے پوچھوں کہ تم نے اس کو وہاں جاکر دیکھا؟ اور جواب میں تم کہدو کہ کبھی نہیں دیکھا، اچھا اگر کسی دیکھنے والے نے تم کو جواب دیا تب تم کیا کہہ سکوگے کوئی دیکھنے والا ہے نہیں، اچھا اب تمھارے جواب کی قیمت کتنی رہ گئی، حساب لگا کر بتاؤ، تو صفر، سرے سے بے معنی ہوکر رہ گئی، سارا جواب تمھارا صفر ہوکر رہ جاتا ہے، اس لیے کہ تمھارے پاس علم ہی نہیں، اس لیے کہ نہ تم نے خود دیکھا، نہ کسی دیکھنے والے کو دیکھا، تو میں کہتا ہوں کہ مرنے کے بعد کچھ نہیں ہوتا سوال جواب اس کا تجربہ آپ کو کتنی بار ہوا، کتنی مرتبہ مرکر دیکھا؟ کہنے لگے کبھی نہیں، میں نے کہا کسی مرنے والے نے آکے جواب دیا؟ کہنے لگے وہ بھی نہیں، تو میں نے کہا اچھا مکمل جہالت پہ یقین رکھتے ہو، کیا قیمت ہوگی، مکمل جہالت، بے معنی، سرے سے غیر منطقی بات، میں نے کہا تمھارے پاس کوئی ذریعہ نہیں، تو غصہ میں کہنے لگا تو تمھارے پاس کیا ذریعہ ہے؟ میرے پاس باون (۵۲) برس کا بوڑھا نہایت نیک آدمی چلا آتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ میں نے معراج میں جاکر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، چشم دید شاہد ہوں، اب دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں یا وہ جھوٹا ہے یا سچا ہے، میں نے تلاش کرنا شروع کیا تو عتبہ کو پکڑا، حلیمہ کو پکڑا جس نے پہلا قطرہ دودھ پلایا تھا اس بوڑھے آدمی کو، اس نے کہا کہ نہیں کبھی جھوٹ نہیں بولا، حلیمہ سے پوچھا کہ تیری گود میں تتلا کر بولنا سیکھا تھا، اس نے کہا کہ کبھی جھوٹ نہیں بولا۔

عقبہ بن ابی معیط پھر ابولہب سے پوچھا، ابوجہل سے پوچھا اور بی بی سودہ بنت ابی زمعہ سے، نے کہا کہ نہیں صاحب یہ جھوٹ نہیں بولا، تو میں سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہوں کہ آخر یہ شخص اپنے فائدہ کیلیے

جھوٹ نہیں بولتا ہے، اپنی مخالفت کے لیے جھوٹ کاہے کو بولے گا، تب ہم نے اس کو سچا تسلیم کیا، اس کی بات مان لی، ہم بھلے آدمی ہیں اور تم بے وقوف ہو، میں نے کہا سیدھی سی بات ہے، میں ایک ڈاکٹر کے پاس پہونچا، اس نے میری نبض پکڑی اور کہا تم کو مرض ہیضہ ہے اور اس نے شیشی نکال کر دی، اس کے اوپر لکھا ہوا تھا 'پوائزن' اور اس شیشی سے نکال کر ایک ٹکیہ دی کہ اس کو کھا جاؤ، تب میں نے نہ ڈاکٹر کی رجسٹریشن دیکھی نہ سرٹیفکٹ دیکھا، بس دوا کھا گیا، انھوں نے کہا ہاں یہی ہوتا ہے، میں نے کہا میرے دوست! تم نے ڈاکٹر کا بورڈ دیکھ کر اپنی جان اس کے حوالہ کر دی تو تم بہت عقلمند ہو اور ہم نے باون برس ٹھونک بجا کر اس کو دیکھا اور اپنا ایمان اس کے حوالہ کر دیا تو ہم بے وقوف ہیں، دیکھیے اصل بات یہ ہے۔ ان لوگوں کے سوچنے کا انداز علمی طور سے غلط ہے ان کا انداز فکر ہی اتنا غلط ہے کہ وہ غلط نتائج تک پہونچتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ تم کو یہ نظر آتا ہے کہ دنیا میں جتنی تحریکیں پیدا ہوتی ہیں، وہ کسی ایک رخ کو متاثر کرتی ہیں، کوئی اقتصادی ہوتی ہے، کوئی سیاسی ہوتی ہے، مگر ایک تحریک ایسی پیدا ہوئی جس نے انسانی زندگی کے ہر رخ کو متاثر کیا، نکاح و طلاق کے قواعد بدل دیے، کھانے پینے کے اصول بدل دیے، سوچنے کے طرز بدل دیے، یہ بدل دیے، وہ بدل دیے، ایسی عظیم الشان تحریک جو انسانی زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کرتی چلی گئی اور اس تحریک کو برپا کرنے والا وہ بے بس و بے کس انسان ہے جس کے پیچھے نہ کسی شہزادگی کی روایت ہے نہ وہ کسی کالج کا سند یافتہ ہے، لیکن اس کے باوجود اس کی تحریک کامیاب ہوئی اور اتنی کامیاب ہوئی کہ اپنی زندگی ہی میں کمال تک پہونچتے دیکھا، نو لاکھ ستائیس ہزار چھ سو مربع میل پر اس کی حکومت قائم ہوگئی، دس برس کے اندر، جو دیکھتا ہے گھبرا جاتا ہے، ایسا بے کس آدمی کہ طائف کے بازار میں ڈھیلے پھینک رہے ہوں لوگ اور کوئی ایک گلاس پانی تک دینے والا نہیں، اور صرف دس برس کے عرصہ میں اتنے بڑے رقبہ پر اس کی حکومت قائم ہو جاتی ہے، ایسی کامیابی کس نے دیکھی،

میں نے کہا: اچھا بھائی، تو صرف یہ بتلا دیجیے کہ مرنے کے بعد کچھ نہیں ہوتا ہے، اس کی خبر آپ کو کیسے ہوگئی؟ کہنے لگے کیا سوال ہوا؟ میں نے کہا سامنے ایک درخت ہے، اس کے پیچھے ایک مکان ہے، اس مکان میں کوئی عورت بیٹھی ہے کہ نہیں بیٹھی ہے؟ جواب دے سکتے ہو؟ اگر تم اس کا جواب ایجابی دیتے ہو کہ ہاں ہے تو تمھیں اس کا علم ہونا چاہیے۔ سلبی دیتے ہو تو اس کا علم ہونا چاہیے۔ اگر میں تم سے پوچھوں کہ تم نے اس کو وہاں جاکر دیکھا؟ اور جواب میں تم کہہ دو کہ کبھی نہیں دیکھا، اچھا اگر کسی دیکھنے والے نے تم کو جواب دیا تب تم کیا کہو گے کوئی دیکھنے والا بھی نہیں، اچھا اب تمھارے جواب کی قیمت کتنی رہ گئی، حساب لگا کر بتاؤ، تو صفر، سرے سے بے معنی ہو کر رہ گئی، سارا جواب تمھارا صفر ہو کر رہ جاتا ہے، اس لیے کہ تمھارے پاس علم ہی نہیں، اس لیے کہ نہ تم نے خود دیکھا، نہ کسی دیکھنے والے کو دیکھا، تو میں کہتا ہوں کہ مرنے کے بعد کچھ نہیں ہوتا سوال جواب اس کا تجربہ آپ کو کتنی بار ہوا، کتنی مرتبہ مر کر دیکھا؟ کہنے لگے کبھی نہیں، میں نے کہا کسی مرنے والے نے آکے جواب دیا؟ کہنے لگے وہ بھی نہیں، تو میں نے کہا اچھا مکمل جہالت پہ یقین رکھتے ہو، کیا قیمت ہوگی، مکمل جہالت، بے معنی، سرے سے غیر منطقی بات، میں نے کہا تمھارے پاس کوئی ذریعہ نہیں، تو غصہ میں کہنے لگا تو تمھارے پاس کیا ذریعہ ہے؟ میرے پاس باون[52] برس کا بوڑھا نہایت نیک آدمی چلا آتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ میں نے معراج میں جاکر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، چشم دید شاہد ہوں، اب دو ہی صورتیں ہوسکتی ہیں، یا وہ جھوٹا ہے یا سچا ہے، میں نے تلاش کرنا شروع کیا تو بوبہ کو پکڑا، حلیمہ کو پکڑا جس نے پہلا قطرہ دودھ پلایا تھا اس بڑے آدمی کو، اس نے کہا کہ نہیں کبھی جھوٹ نہیں بولا، حلیمہ سے پوچھا کہ تیری گود میں تتلا کر بولنا سیکھا تھا، اس نے کہا کہ کبھی جھوٹ نہیں بولا۔

عقبہ بن ابی معیط، پھر ابولہب سے پوچھا، ابوجہل سے پوچھا اور بی بی سودہ بنت ابی زمعہ سب نے کہا کہ نہیں صاحب یہ جھوٹ نہیں بولا، تو میں سر پکڑ کر بیٹھ جاتا ہوں کہ آخر یہ شخص اپنے فائدہ کیلیے

جھوٹ نہیں بولتا ہے، اپنی مخالفت کے لیے جھوٹ کاہے کو بولے گا، تب ہم نے اس کو سچا تسلیم کیا، اس کی بات مان لی، ہم بھلے آدمی ہیں اور تم بے وقوف ہو، میں نے کہا سیدھی سی بات ہے، میں ایک ڈاکٹر کے پاس پہونچا، اس نے میری نبض پکڑی اور کہا تم کو مرض ہیضہ ہے اور اس نے شیشی نکال کر دی، اس کے اوپر لکھا ہوا تھا "پوائزن" اور اس شیشی سے نکال کر ایک ٹکیہ دی کہ اس کو کھا جاؤ، تب میں نے نہ ڈاکٹر کی رجسٹریشن دیکھی نہ سرٹیفکٹ دیکھا، بس دوا کھا گیا، انھوں نے کہا ہاں یہی ہوتا ہے، میں نے کہا میرے دوست! تم نے ڈاکٹر کا بورڈ دیکھ کر اپنی جان اس کے حوالہ کر دی تو تم بہت عقلمند ہو اور ہم نے باون برس ٹھونک بجا کر اس کو دیکھا اور اپنا ایمان اس کے حوالہ کر دیا تو ہم بے وقوف ہیں، دیکھیے اصل بات یہ ہے، ان لوگوں کے سوچنے کا انداز علمی طور سے غلط ہے، ان کا انداز فکر ہی اتنا غلط ہے کہ وہ غلط نتائج تک پہونچتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ تم کو یہ نظر آتا ہے کہ دنیا میں جتنی تحریکیں پیدا ہوتی ہیں، وہ کسی ایک رخ کو متاثر کرتی ہیں، کوئی اقتصادی ہوتی ہے، کوئی سیاسی ہوتی ہے، مگر ایک تحریک ایسی پیدا ہوئی جس نے انسانی زندگی کے ہر رخ کو متاثر کیا، نکاح وطلاق کے قواعد بدل دیے، کھانے پینے کے اصول بدل دیے، سوچنے کے طرز بدل دیے، یہ بدل دینے، وہ بدل دیے، ایسی عظیم الشان تحریک جو انسانی زندگی کے ہر پہلو کو متاثر کرتی چلی گئی اور اس تحریک کو برپا کرنے والا وہ بے بس و بے کس انسان ہے جس کے پیچھے نہ کسی شہزادگی کی روایت ہے نہ وہ کسی کالج کا سند یافتہ ہے، لیکن اس کے باوجود اس کی تحریک کامیاب ہوئی اور اتنی کامیاب ہوئی کہ اپنی زندگی ہی میں کمال تک پہونچتے دیکھا، نو لاکھ ستائیس ہزار چھ سو مربع میل پر اس کی حکومت قائم ہوگئی، دس برس کے اندر، جو دیکھتا ہے گھبرا جاتا ہے، ایسا بے کس آدمی کہ طائف کے بازار میں ڈھیلے پھینک رہے ہوں لوگ اور کوئی ایک گلاس پانی تک دینے والا نہیں، اور صرف دس برس کے عرصہ میں اتنے بڑے رقبہ پر اس کی حکومت قائم ہو جاتی ہے، ایسی کامیابی کس نے دیکھی

جب کہ تاریخ انسانی کی سات ہزار معلوم تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ دنیا میں کسی تحریک چلانے والے نے اپنی زندگی میں اس کو کامیاب ہوتے نہیں دیکھا، یاد رکھیے کہ انسانی زندگی اتنی چھوٹی ہے کہ کوئی تحریک کبھی کامیاب نہیں ہوتی کسی انسان کی زندگی میں۔ ایک واقعہ ہے انسانی تاریخ میں، صرف ایک واقعہ ہے کہ محمد رسول اللہ نے تحریک چلائی اور اپنی زندگی میں کامیابی سے اس کو دیکھ لیا جب ایسا واقعہ ان کی سمجھ میں آتا ہے انگریز بے چارے پڑھنے والے کے تو پھر وہ طرح طرح کی باتیں نکالتا ہے، کچھ جہالت سے، کچھ اپنے تعصب سے، اس کو اتنی موٹی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کو محبت ایمان ہونے کی بنا پر رسول اللہ پر ایمان کامل ہو گیا، یہ بات غیر مسلم کو سمجھ میں نہیں آتی ...... اصل سوال یہ ہے کہ کائنات میں کچھ مقدس صداقتیں ہیں ان پر سب متفق ہیں کہ انسان کو ایسا ہونا چاہیے، جھوٹ نہیں بولنا چاہیے، بد دیانت نہیں ہونا چاہیے، وغیرہ۔ یہ عالمگیر صداقت ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں، اس میں کسی مذہب اور ملت کا بھی فرق نہیں ہے بس اس صداقت والا آدمی دنیا سے گم ہو گیا تھا، انسان کو نظر نہیں آرہا تھا، رسول اللہ کی جب بعثت ہوئی تو دنیا نے دیکھا کہ اچھا بھلا آدمی کسے کہتے ہیں، جب پہلی بار رسول اللہ ایک بھلے آدمی نظر آگئے تو بھلے آدمی کا پیمانہ انسانیت نے آدم سے لے کر اب تک قائم کر رکھا تھا، اس پر ایک آدمی صحیح اترا، اس کے بعد سب کے سب جھک گئے، یہی تو ایک آئیڈیل تھا جس کو دنیا تلاش کر رہی تھی، تو مستشرقین کے مطالعہ کے لیے چاہیے کہ ہم ایک باقاعدہ لٹریچر پیش کریں۔

، دنیا کو سمجھائیں کہ تم ایمان سے نہیں سمجھتے تو آنا تو سمجھتے ہو کہ آئیڈیل انسان تھا، بھلا آدمی جو تھا وہ دنیا میں سات ہزار برس سے نہیں مل رہا تھا، مختلف وقتوں میں پیغمبر کوشش کرتے رہے، لیکن ایسا آئیڈیل نہیں مل رہا تھا اور جب رسول اللہ کی ذات میں انسانیت نے ایسا آئیڈیل دیکھا تو ..... یہ اتنی موٹی سی بات ہے جو تم کو سمجھ میں نہیں آرہی، تم دیکھو

اس نو لاکھ مربع میل میں کتنا حصہ ملٹری آپریشن کے ذریعہ آیا، صرف چار ہزار مربع میل، تو مستشرقین صاحبان میں غلطی یہ ہے کہ یہ صحیح طریقے سے منطقی طور پر سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، اب رہی دشمنی تو مفتوحہ قوم کو فاتح قوم سے ہمیشہ دشمنی رہی ہے، ہم کو چاہیے کہ ہم مربوط طریقے سے صرف ان کی تردید میں نہیں بلکہ صحیح ترین نقشہ پیش کریں، بھلا دیکھیے اس میں کیا منطقی مغالطہ ہے سیدھی بات ہے کہ رسول اللہؐ کی ذات میں ایک مکمل انسان نظر آ گیا، نہ سمجھ میں آنے والی کیا بات ہے، میں نے پروفیسر اسمتھ سے کہا کہ بڑا غیر منطقی انداز ہے آپ لوگوں کا، منطقی انداز یہ ہے کہ معلومات جمع کرو، اس طرح کہ اصل حقیقت خود سامنے آ جائے۔

<u>مولانا علی میاں:</u> حضرات! قبل اس کے کہ دوسرے فاضل مقالہ نگار حضرات تشریف لائیں میں نے عابد رضا بیدار صاحب کے ایک سوال کے جواب میں جو کچھ کہا تھا اس سلسلہ میں کچھ وضاحت کر دوں کہ اہل علم کا مجمع ہے اور طالب علم کو اپنی غلطی یا کمزوری کا سب سے پہلے اعتراف کرنا چاہیے میں نے دو حدیثوں کا حوالہ دیا تھا جس میں پہلی حدیث جو تھی کہ ماشاء اللہ وشئت اس تو مجھے اعتماد ہے کہ اس کے الفاظ یہی ہیں، لیکن من یطع اللہ ورسولہٗ اس کے الفاظ پر اعتماد نہیں، شاید میرے حافظے نے کوتاہی کی ہے، اس لیے ان الفاظ کی صحت کی میں ذمہ داری نہیں لیتا، اور یہ بھی وضاحت کر دوں کہ ایسے مظاہر سے احتیاط جن سے شرک پیدا ہوتا ہو، اس کے علاوہ باقی جو کچھ ہے اس کی حقیقت یہی ہے کہ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر، اور سچی بات یہ کہ ہمیں اس وقت جو دولت اللہ نے نصیب فرمائی ہے اسلام اور ایمان کی شکل میں، بلکہ انسانیت اور عقل سلیم کی شکل میں، وہ سب محمد رسول اللہ کا صدقہ ہے، میں ان الفاظ کا اظہار ضروری سمجھتا کہ کوئی اور غلط فہمی نہ ہو کہ ..... صرف شرک سے بچنے کی ضرورت، ورنہ اس کے بعد تو واقعہ یہ ہے علمی، عملی، واقعاتی اور تاریخی طور سے دنیا میں جو صداقتیں موجود ہیں اور جن کا حصہ انقدر

ہم کو عطا فرمایا وہ سب محمد رسول اللہ ؐ کی لائی ہوئی ہے، اور انہی کی ذات اقدس پر اس کا خاتمہ ہے، اور قیامت تک رہے گا، اور اب نجات، ترقی، درجات میں سے کسی چیز کا کوئی امکان آپ کی رسالت کے بغیر نہیں ہے۔

اس کے بعد خاکسار نے کہا اب جناب ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی اپنا مقالہ پڑھیں گے، مولانا حمیدالدین فراہی پر ان کا ایک مبسوط مقالہ شائع ہونے والا ہے اور اس میں ہر قسم کی تحقیقات انھوں نے اکٹھا کی ہیں۔

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی | میرے مقالہ کا عنوان ہے "مستشرقین اور اسلام" یہ سیمینار کے مرکزی موضوع اسلام اور مستشرقین سے ذرا ہٹ کر ہے، سیمینار کے موضوع کا مطلب جہاں تک میں نے سمجھا ہے، یہ ہے کہ مستشرقین اسلام کو کس نظر سے دیکھتے ہیں، اور اسلام کے ساتھ ان کا رویہ کیسا ہے، جب کہ میں نے اپنے مقالہ میں اس مسئلہ سے بحث کی ہے کہ اسلام مستشرقین کو کس نظر سے دیکھتا ہے،

سب سے پہلے میں موضوع میں شامل الفاظ کی مختصر لغوی اور معنوی تشریح پیش کرتا ہوں، اس سے آئندہ مباحث کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

مستشرق مشتق ہے استشراق سے، جس کا مادہ "شرق" ہے، جو ضد متصور ہوتا ہے غرب کا، میں نے "متصور ہوتا ہے" کہا، اس لیے کہ میرے نزدیک یہ تقسیم و تفریق حقیقی نہیں اعتباری ہے، اور غیر صحتمند رجحانات کی پیداوار ہے، شرق و غرب کے دو باہم متضاد اور الگ الگ معنی میں مستعمل مترادفات مشرق و مغرب ہیں، عربی میں مستشرق ہی نہیں خود اس کا اسم یا مصدر استشراق بھی مولدیعنی نیا اور بعد کی پیداوار ہے، چنانچہ قدیم عربی لغات میں اس مادہ کا باب استفعال سرے سے مفقود ہے، جدید لغات میں یا قدیم لغات کے جدید ایڈیشنوں میں البتہ مستشرق اور استشراق کے الفاظ بطور اسم فاعل اور اسم مصدر کے ملتے ہیں، جن کا استعمال مخصوص

بھی ہے اور محدود بھی، استشراق بطور فعل کے ان لغات میں بھی مذکور نہیں ہے، عربی یا اردو لٹریچر میں بھی یہ لفظ زیادہ پرانا نہیں ہے، اور الفاظ پہلے استعمال میں آتے ہیں، اس کے بعد ہی لغات میں جگہ پاتے ہیں، درحقیقت یہ الفاظ ترجمہ یا چربہ ہیں اورینٹلسٹ اور اورینٹلزم کا جو اورینٹ سے ماخوذ ہیں، انگریزی میں اورینٹ، ایسٹ کا ہم معنی ہے، اہل مغرب نے یہ نام اپنے ان نام نہاد اسکالروں کو دیا جنھوں نے بزعم ان کے مشرقی علوم و فنون، زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت کو جس میں مذہب بھی آجاتا ہے اپنی دلچسپی کا موضوع بنایا اور ان کا خصوصی مطالعہ کرکے براہ راست ان سے واقفیت حاصل کی، عربی میں اس کے لیے کوئی لفظ پہلے سے موجود نہیں تھا، اس لیے جب اس کی ضرورت پیش آئی تو انگریزی ہی کی طرز پر الفاظ وضع کر لیے گئے۔

ثلاثی مزید کے ابواب میں سے باب استفعال جس کے وزن پر استشراق بنایا گیا ہے، اس کی ایک خاصیت صیرورۃ اور اتخاذ ہے، جس میں بن جانا، اپنانا، یا حاصل کرنا مفہوم ہوتا ہے، مثلاً استحجر الطین، مٹی پتھر بن گئی، استوطن القریۃ، بستی کو اپنا وطن بنالیا، استفاد، فائدہ حاصل کرنا، اسی اصول اور قاعدہ کے تحت جب کسی زمانہ میں کچھ لوگوں نے باہر سے آکر جزیرۃ العرب میں بود و باش اختیار کی اور وقت گذرنے کے ساتھ وہ بھی عرب ہوگئے تو ان کو عرب کے قدیم اور اصلی باشندوں سے ممیز کرنے کے لیے اسی باب استفعال سے کام لے کر ایک لفظ بنایا گیا، استعرب، عرب بن گیا، چنانچہ عرب کی قدیم تاریخ میں عرب عاربہ اور عرب مستعربہ کی اصطلاحیں ملتی ہیں، اردو میں ہم اسے اصلی عرب اور نقلی عرب بھی کہہ سکتے ہیں، نئے اور پرانے، سچے اور جھوٹے سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں، اس مسئلہ کی میں نے تحقیق نہیں کی کہ عربی میں مستشرق اور استشراق کا لفظ پہلے پہل کس نے وضع کیا، اس کے واضع خود مستشرقین ہیں، یا ان کے غیر، اگر خود مستشرقین ہیں تو ان سے چوک ہوئی اور اگر غیر ہیں تو ان کا تیر نشانہ پر لگا، استشراق کا

حقیقت اور اس کی تاریخ جن کی نظر میں ہے وہ تسلیم کریں گے کہ یہ نام ان کے لئے انتہائی موزوں ہے، خود یہ نام ان کا راز فاش کرتا ہے، ان کے چہرے سے نقاب ہٹا کر ان کی اصلیت کو ظاہر کرتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ از روئے عربی زبان استشراق کے معنی ہوئے، بہ تکلف مشرقی بننا اور مستشرق معنی وہ شخص جس نے بہ تکلف مشرقیت اختیار کی، یا مشرقی بنا، اور ظاہر ہے کہ اس فعل کی نسبت کسی مغربی ہی کی طرف ہو سکتی ہے، خود کسی مشرقی کا مشرقی بننا مہمل سی بات ہے،،

مستشرقین کے نام میں بظاہر بڑی معصومیت ہے اور نام ہی پر کیا موقوف ہے ان کے کام کو بھی دیکھیں تو بادی النظر میں اس میں برائی کی بات نظر نہیں آئے گی، آخر اس میں برائی کی کیا بات ہے اگر بیچارے مغربی اسکالر اور مفکرین مشرقی علوم و فنون کی تحصیل و تحقیق میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں، وقت ہی نہیں، سرمایہ اور ذہنی صلاحیتیں بھی، وہ کام جو ہمیں کرنا چاہئے بیچارے وہ کر رہے ہیں، کیا یہ ان کا احسان نہیں ہے، اہل مشرق پر سادہ لوح اہل مشرق، سادہ لوح مسلمان ان کا احسان مانتے ہیں لیکن ساتھ ہی ان کو گلہ بھی ہے کہ ع

مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا

اس لئے کہ ع ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

استشراق کی ابتدا کب اور کن حالات میں ہوئی، اور اس کے پیچھے کیا مقاصد تھے، کس قسم کے اسکالرز نے اس کی طرف توجہ کی، ان کے اپنے حالات و کوائف کیا تھے، اس زمرہ سے تعلق رکھنے والے مختلف اسکالروں کا رویہ اور طرز عمل مشرق بالخصوص اسلام کے ساتھ کیا رہا ہے، ہمدردانہ یا غیر ہمدردانہ حقیقت پسندانہ یا متعصبانہ، جانبدارانہ یا غیر جانبدارانہ یا جارحانہ اور معاندانہ، یہ ایسے سوالات ہیں جن کے متعلق کافی بحث ہو چکی ہے، اور اب بھی کوئی شخص ان کا تاریخی جائزہ لینا چاہے تو اس کی ضرورت یا افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، مگر مجھے بالفعل ان سوالات سے

تعرض نہیں کرنا ہے، یہ طول طویل بحثیں ہیں جن سے صرف نظر کرکے اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوتا ہوں
اسلام حق کا پیغام لے کر آیا تو اس کے راستہ میں جو لوگ حائل ہوئے ان میں کفار قریش کے علاوہ یہود و نصاریٰ بھی تھے، یہود و نصاریٰ کی نفسیات بوجوہ اس باب میں کفار قریش سے مختلف تھیں، ان میں نسلی تعصب کے علاوہ مذہبی عصبیت بھی تھی، نسلاً ان کا تعلق حضرت ابراہیمؑ کی دوسری شاخ حضرت اسحاقؑ سے تھا، جبکہ داعیٔ اسلام کا تعلق اس خاندان سے تھا جو حضرت اسمٰعیلؑ سے چلا، مذہبی اعتبار سے یہود و نصاریٰ پہلے سے حامل کتاب تھے اور اس بات کے منتظر تھے کہ آخری نبی کی بعثت بھی انہی میں ہوگی، خاندانی رقابت کا یہ احساس ان میں اس حد تک غالب تھا کہ انھوں نے قبلہ اور ذبح عظیم کے واقعہ کی اصلیت کو چھپانے کے لیے خود اپنی کتابوں میں تحریفیں کیں، اسلام جب انھیں ایک غالب قوت کی حیثیت سے ابھرتا نظر آیا تو انھوں نے اس کا راستہ روکنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور حالات کے تحت ادل بدل کر وہ تمام تدبیریں اختیار کیں جو وہ کر سکتے تھے، انہی تدابیر میں سے ایک تدبیر وہ بھی تھی جسے آج کی زبان اور اصطلاح میں استشراق کا نام دیا جاتا ہے، ظاہر ہے اس کی نسبت اسلام کا رویہ مذمت اور اظہار نکیر ہی ہو سکتا ہے۔

قرآن مجید نے اس زمانہ میں موجود استشراق کی پردہ دری ان الفاظ میں کی ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا	اس قرآن کی باتیں نہ سنو اور اس میں
لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ	گڑبڑ پیدا کرو، شاید تم غالب
لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ.	آجاؤ۔

آج اسرائیل اور بعض باطل پرست فرقے قرآن مجید کے غلط نسخے چھاپ کر پھیلانے کی جو ناپاک کوششیں کر رہے ہیں کیا وہ اس سلسلہ کی کڑی نہیں جس کا ذکر مذکورۂ بالا آیت میں کیا گیا ہے۔

اہل کتاب کے ایک گروہ نے یہ حربہ اختیار کیا کہ ان کے آدمی صبح اسلام لاتے اور شام کو دائرہ اسلام سے نکل جاتے کہ اس طرح لوگ اسلام سے برگشتہ ہوں جس کا ذکر آل عمران کی آیت ۷۲ میں کیا گیا ہے: وَقَالَتْ طَّائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ۔

باطل پرستوں کی ایک چال یہ بھی ہوتی ہے کہ کچھ دو اور کچھ لو کا معاملہ کر کے بیچ کا راستہ اختیار کریں، لیکن حق کے لیے یہ قابل قبول نہیں ہے، آنحضرتؐ کے زمانہ میں بھی یہ حکمت عملی موجود تھی جس کی نشان دہی قرآن مجید نے سورہ نون کی آیت ۹ میں کی ہے:

وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ — وہ چاہتے ہیں کہ کچھ تم اپنے موقف سے ہٹو تو وہ بھی ہٹیں۔

یہ رجحان اس زمانہ میں ہی نہیں تھا بلکہ آج کے استشراق میں بھی موجود ہے، مسلم کرسچین ڈائیلاگ کے عنوان سے آج جو کوششیں ہو رہی ہیں ان کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہے کہ بیچ کی راہ نکال کر درفع الوقتی کی جائے، جبکہ اسلام اس کو پسند نہیں کرتا، وہ صاف صاف کہتا ہے کہ اُدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً۔ اس کے نزدیک دو ہی راستے ہیں، اسلام یا کفر، أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ کی حکمت عملی اس کے نزدیک کفر ہی کی ایک صورت ہے، سورہ بقرہ کی آیت میں اس طرز عمل کی نشاندہی کر کے صرف دنیوی ذلت اور عذاب آخرت کی دھمکی دی گئی ہے، سورہ نساء کی آیت ۱۵۰ میں اس روش کو حقیقی کفر سے تعبیر کیا گیا ہے:

وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ	اور وہ کہتے ہیں بعض باتوں کو ہم مانیں گے
بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَن يَتَّخِذُوا	اور بعض کا انکار کریں گے، اور وہ چاہتے ہیں کہ اس کے درمیان کا راستہ اختیار کریں
بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا۔ أُولَٰئِكَ	

هُمُ الْكَافِرُوْنَ حَقًّا۔ یہی لوگ حقیقی معنوں میں کافر ہیں۔

قرآن مجید کی یہ چند آیات جو اوپر بیان کی گئیں ان کے آئینہ میں ہم آج کے مستشرقین اور استشراق کا چہرہ بے نقاب دیکھ سکتے ہیں اور اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اسلام ان کے بارہ میں کیا رائے رکھتا ہے، قرآن واشگاف الفاظ میں یہود و نصاریٰ کے ساتھ ربط و تعلق قائم کرنے سے منع کرتا ہے۔ اور ایسے لوگوں کو جو ان کے ساتھ دوستی رکھتے ہیں ان کو ان ہی میں شمار کرتا ہے سورۂ مائدہ کی آیت ۵۱ میں کس قدر دو ٹوک انداز میں اس کی صراحت ہے: يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰىٓ أَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَإِنَّهٗ مِنْهُمْ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۔

عصر حاضر کے مستشرقین یہود و نصاریٰ نہیں تو اور کون ہیں؟ لیکن یا للعجب کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ آج مسلمانوں نے انہی یہود و نصاریٰ کے ساتھ مساویانہ حیثیت سے رسم و راہ رکھنا نہ ایک طرف، ان کو استاد کا درجہ دے کر اپنے دل و دماغ کی زمام کار ان کے ہاتھ میں دے رکھی ہے، اسلام اور مسلمانوں سے مستشرقین اور استشراق کے تعلق کے مختلف ادوار ہیں، ایک زمانہ میں انھوں نے مسلمانوں سے مختلف دنیوی علوم سیکھے، اس میں استادی کا درجہ حاصل کرنے کے بعد انھوں نے عربی اور اسلامی علوم کی طرف توجہ کی اور بڑی ہوشیاری سے آہستہ آہستہ ان کے بھی امام بن گئے اور نوبت بایں جارسید کہ آج کسی کو طبیعی اور سائنسی علوم میں ہی نہیں عربی اور اسلامیات میں سند فضیلت لینی ہوتی ہے تو وہ یورپ اور امریکہ کی ان جامعات کا رخ کرتا ہے، جہاں نام نہاد اسکالر دام تزویر بچھائے دانہ ڈال کر شکار کی گھات میں بیٹھے ہیں، کیا ان کا مقصد واقعی مسلمان نوجوانوں کو عربی اور اسلامیات پڑھا کر اسلام اور ملت اسلامیہ کی خدمت کرنا ہے؟ پورے پورے شعبے انھوں نے اس لیے کھول رکھے ہیں کہ مسلمان ذہن تیار ہوں، اسکالرشپ میں بڑی بڑی رقمیں

اس لیے خرچ کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْل پیدا ہوں؟
ئی ہوشمند ایماندار آدمی اس کا جواب اثبات میں نہیں دے سکتا۔

استشراق کی تاریخ یہاں پہونچ کر ایک نیا موڑ مڑ چکی ہے، وہ کام جو ایک صدی پہلے
سائی مبلغین اور مستشرقین کر رہے تھے، اب اس کام کے لیے انھوں نے مسلمانوں میں سے
ی تیار کر دیے ہیں، اقبال کا مصرع یاد آتا ہے، انھوں نے ہمارے شاندار ماضی کے لیے
ا تھا کہ پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے۔

آج صنم خانہ، کعبہ سے پاسبان حاصل کر رہا ہے، پہلے اس طرح کی اکا دکا مثالیں تھیں
ستہ آہستہ ان میں اضافہ ہوتے ہوتے ان کی تعداد اتنی ہوگئی ہے کہ ہم اسے استشراق کے
علیحدہ دورسے تعبیر کر سکتے ہیں، میں نے بہت سوچا کہ استشراق کے ان علمبرداروں کو کیا نام
ا جائے؟ مستشرقین اور استشراق کی جو صحیح تعریف ہم نے آغاز کلام میں متعین کی تھی وہ تو ان پر
صادق نہیں آتی، بعض لکھنے والوں نے ان کے لیے مستغربین لکھا ہے، مگر اس کی موزونیت میں
ھے کلام ہے، میں لفظیات اور اصطلاحات کے ماہرین کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اس کے لیے
ئی مناسب لفظ تجویز کریں۔

شیطان اس دنیا میں انسان کو گمراہ کرنے کا مشن لے کر آیا تھا، اس کو جب انسانوں میں
ی ایسے شاگرد مل گئے جو اس کے مشن کی اس سے زیادہ مستعدی کے ساتھ تکمیل کرنے لگے تو
ہ فارغ ہوگیا، اسی طرح ہمارے مستشرقین بھی اب فارغ ہو چکے ہیں، کچھ وقت گذرنے کے
بعد ان کا نام صرف تاریخ میں باقی رہ جائے گا، لیکن اسلام رہے گا اور اسے مستشرقین کی جگہ
س نئی مخلوق سے واسطہ ہوگا جو کام انہی کا کرے گی، لیکن اس کا نام کچھ اور ہوگا، اور مشیت الٰہی
ہے، جو لوگ اسلام کے نام لیوا ہیں، دل سے اسلام کی حقانیت کے قائل ہیں وہ خبردار ہو جائیں

وما علینا الا البلاغ۔

اس مقالہ کے ختم ہونے کے بعد خاکسار نے جناب سید سیاح الدین کاکاخیل کو یہ کہہ کر اپنا مقالہ پڑھنے کی زحمت دی کہ وہ مدرسہ اشاعت العلوم جامع مسجد فیصل آباد کے مہتمم اور صدر مدرس ہیں اور اسی کے ساتھ پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل کے ایک اہم رکن ہیں۔ جس موثر انداز میں وہ اپنا مقالہ پڑھیں گے اس سے سامعین ضرور متاثر ہوں گے۔

جناب مولانا سید سیاح الدین کاکاخیل صاحب:

حمد رب العالمین اور صلوٰۃ و سلام بر سید المرسلین کے بعد عرض ہے کہ فرانسیسی ڈاکٹر گستاؤلی بان کی کتاب "تمدن عرب" ایک مشہور کتاب ہے، میں نے اکثر علمی مقالات و مضامین میں اس کے حوالے پڑھے تو ذہن پر یہ اثر تھا کہ یہ ایک نہایت عمدہ تحقیقی تصنیف ہوگی جس میں مصنف نے پوری فراخ دلی کے ساتھ اور کسی قسم کے تعصب کے بغیر تاریخی حقایق بیان کیے ہوں گے۔ اس لیے عرصہ سے شوق تھا کہ میں اس کتاب کا مطالعہ کر کے علمی استفادہ کروں، چنانچہ میں نے اس کا اردو ترجمہ حاصل کیا جو شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی نے کیا ہے اور جو بارہا شایع ہوا ہے، اور پاکستان میں اس کو مقبول اکیڈمی لاہور نے اشرف پریس لاہور سے ۱۹۶۱ء میں طبع کر کے شایع کیا ہے۔ اس کا مطالعہ شروع کیا، صفحہ ۷۷ سے جہاں اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی تحریر کیے ہیں اور ان پر تبصرہ کیا ہے پڑھ کر دل کو انتہائی صدمہ ہوا، اور احساس یہ ہوا کہ شاید یہ ساری کتاب اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے کہ تاریخی اور علمی تحقیق و تدقیق کے عنوان سے پوری تفصیل کے ساتھ دلچسپ انداز میں مسلمانوں کی ترقیوں کا ذکر کر کے لوگوں کے اذہان کو مسحور کیا جائے اور ان کو یہ تاثر دیا جائے کہ مصنف ایک بہت بڑا فراخ دل اور غیر متعصب محقق ہے، اور وہ جو کچھ لکھتا ہے پوری تحقیق کے بعد عالمانہ انداز میں ہر قسم کی تنگ دلی اور تعصب سے مبرا ہو کر لکھتا ہے

اور یہ تاثر دیتے اور قلوب واذہان کو معتقد بنا دینے کے بعد جو زہر افشانی اور خبث نفس کا مظاہرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس کے بارے میں کر سکتا ہے وہ ایک خاص انداز سے رہے گا اور مطالعہ کرنے والے کے دماغ کو مسموم کر کے اس میں ایسے خیالات بھر دے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں عقیدت باقی نہیں رہ سکے گی، اور جب مسلمانوں کو اس ذات اقدس کے بارے میں بدگمان کر دیا جائے تو پھر ان کا دین و ایمان کہاں باقی رہے گا، اور پھر آگے جا کر مسلمانوں کے تہذیب و تمدن کی ترقیوں کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ سب سنوں دبے کا ہوگی۔

اس مطالعہ کے بعد دل کو جو صدمہ پہونچا میں نے بعض احباب سے اس کا ذکر کیا تو مجھے بتایا گیا کہ علامہ شبلیؒ نے ان ساری باتوں کی تردید کی ہے، مگر میں نے ابھی تک اس کا مطالعہ نہیں کیا، میں کوشش کرتا ہوں کہ وہ حاصل کر دوں۔

بہرحال لی بان نے جو کچھ لکھا ہے یا دوسرے مستشرقین جو کچھ اپنی کتابوں میں اس قسم کے خرافات اور زہریلے مضامین لکھتے ہیں ان سے تو ہمیں کوئی شکایت اس لیے نہیں کہ ان سے کسی خیر کی توقع رکھنا ہی فضول ہے اور یہ تصور کرنا کہ وہ واقعۃً غیر متعصب اور حقیقت شناس و حقیقت پسند بن کر صحیح واقعات پیش کریں گے اور صحیح نتائج اخذ کر کے بیان کریں گے ناممکن ہے، یہ عقرب نیش زنی تو ان کی طبیعتوں کا تقاضا ہے اور وہ کبھی بھی اور کہیں بھی اس سے رکیں گے نہیں، لیکن مجھے بار بار حیرانی اس پر ہوتی ہے کہ سید علی بلگرامی نے اس کا اردو ترجمہ بڑے اہتمام اور دیدہ ریزی سے کیا، جیسا کہ وہ مقدمہ میں اس کا تفصیلی ذکر کرتا ہے، ٹائٹل ہی پر کتاب کے نام کے ساتھ یہ بھی تصریح ہے "مع توضیحات اور حواشی اردو میں ترجمہ کیا" اور واقعۃً کتاب میں مترجم نے جگہ جگہ توضیحات بھی کی ہیں، طویل حاشیے بھی لکھے ہیں، مگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے بارے میں ان خرافات اور لغویات کا ترجمہ کر کے اس کو یہ خیال نہیں آیا کہ حاشیہ پر

اپنی طرف سے ان کی مفصل و مدلل تردید کی جائے، اور لی بان کے ان گستاخانہ کلمات کے جواب میں تحقیقی طور پر اس قدر لکھا جائے کہ لی بان کی ایسی واہیات عبارتیں پڑھنے والے مسلمان کا دل اگر ان کو پڑھ کر زخمی ہوا ہے تو مترجم کا وہ جواب اس زخم کے اندمال کے لیے مرہم بن سکے اور جو صدمہ اس کو پہونچا ہو اس کی تلافی اور تسکین کا سامان تو ہو جائے اور اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیح حالات زندگی اور آپ کی سیرت طیبہ کے واقعات سے کوئی ناواقف عام مسلمان یا کوئی غیر مسلم اس کو پڑھ کر شکوک و شبہات میں مبتلا ہو اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک کے بارے میں غلط تصور قائم ہو تو تردیدی حواشی پڑھنے کے بعد اس کے شک و شبہہ کا پورا پورا ازالہ ہو اور غلط تصورات کے بجائے وہ حقیقت حال کو سمجھ کر صحیح تصور قائم کرے، لیبان نے جو کچھ لکھا ہے وہ نری جہالت اور استشراقی تعصب کا بدترین مظاہرہ ہے، ان غیر تاریخی اور حقیقت سے کوسوں دور خرافات کو لکھ کر وہ جو مقصد حاصل کرنا چاہتا تھا' نہ صرف ایک مسلمان محقق کی حیثیت سے جس کے عقیدوں کے خلاف باتیں لکھی گئی تھیں ایک عام حقیقت شناس و حقیقت پسند منصف مزاج مورخ کی حیثیت سے بھی جناب سید علی بلگرامی کا یہ فریضہ تھا، مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انھوں نے اس قدر اہم فریضہ سے غفلت کیوں برتی اور اس قدر لغویات کا ترجمہ کرتے وقت ان کو بالکل خیال نہیں آیا کہ ان پر گرفت نہ کرنا اور خاموش گذرنا ایک علمی خیانت اور مطالعہ کرنے والے ناواقف لوگوں پر ظلم ہے، بارہا یہ کتاب مترجم کی وفات کے بعد بھی شایع ہوئی، لیکن کسی ناشر نے مسلمان ہونے کے باوجود اس طرف توجہ نہیں کی، اگر مترجم سے یہ فروگذاشت ہوئی تھی' وجہ اس کی جو کچھ بھی ہو تو بعد کے ناشرین کتاب کو تو چاہیے تھا کہ وہ اس کی تلافی کرتے اور کسی اچھے محقق عالم سے ان کی تردید لکھوا کر ساتھ ہی شائع کرتے۔ اہل علم کے اس عظیم مجمع میں پورے درد دل کے ساتھ اپنی یہ درخواست پیش کرتا ہوں کہ وہ اس حصہ کتاب کی تمام زہریلی اور گستاخانہ عبارتوں کی مدلل

تردید لکھ کر کتاب کے ناشرین کو مجبور کریں کہ اگر وہ کتاب میں سے اس حصہ کا نکالنا اپنے خیال میں خیانت سمجھتے ہوں تو اس کے ساتھ یہ تردید اور شکوک و شبہات کا ازالہ بھی ضرور شایع کریں، اور علمی رسائل میں وہ تردیدی مضمون بار بار شایع ہو تاکہ بدقسمتی سے جن لوگوں نے یہ کتاب پڑھی ہے اور اس حصہ کتاب کو پڑھ کر ان کے اذہان کچھ ماؤف ہوئے ہوں تو وہ اس تردیدی مضمون کے مطالعہ کے بعد اپنے اذہان کو صاف کرسکیں۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کا اردو ترجمہ دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے نام سے پنجاب یونیورسٹی لاہور میں عرصہ دراز سے ہو رہا ہے اور قسط وار شایع ہوتا رہتا ہے، اس میں بعض مقالات مستشرقین اور یہودی فضلاء کے لکھے ہوئے ہیں اور ان میں بھی وہ علمی خیانت سے کام لے کر اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ڈنک مارتے رہتے ہیں، اور اس انداز سے کہ بظاہر وہ ایک معمولی سا اشارہ کر جاتے ہیں کہ جو شخص بھی اس کو پڑھ کر اس کو ایک علمی حقیقت سمجھ کر جذب کرلے تو پھر آگے سوچتے ہوئے اس کا ذہن ایک غلط لائن پر پڑ جاتا ہے، اور بظاہر معمولی طور پر ذہن کا کانٹا بدل دینے کے بعد وہ مطالعہ کرنے والے کو ایک ایسی لائن پر لگا کر آگے چلاتے ہیں کہ وہ منزل مقصود سے بہت دور نکل جاتا ہے تو ضرورت تھی کہ ترجمہ کے ساتھ ساتھ ایسے زہریلے کانٹوں کی نشاندہی بھی کی جاتی اور اذہان سے ان کے اثرات نکالنے کی بھی علمی کوشش ہوتی، یہ بات دراصل لاہور میں کہنے کی تھی، مگر پہلی دفعہ منتخب اہل علم کا مجمع مجھے یہاں ملا ہے، اس لیے اگر اس ندوۂ علمیہ اور محفل فضلاء کی طرف سے کوئی ایسی قرارداد ہو جائے جو اس دارالترجمہ کے ذمہ داروں کو متوجہ کرسکے تو شاید وہ زیادہ موثر ہوگا، اور ان کو متوجہ کرسکے گا، اگرچہ میں کوشش کروں گا کہ اپنی آواز وہاں بھی پہونچا کر ترجمہ کرنے والے حضرات کو اس طرف متوجہ کرسکوں، یہ استشراق ایک بہت بڑا فتنہ ہے جس کے مضر اثرات سے ہر میدان میں نئی نسل کے مسلمان نوجوانوں کو بچانا ضروری ہے، الاستاذ یوسف القرضاوی نے بالکل درست

فرمایا ہے کہ مستشرقین سے کہیں زیادہ ان کے شاگرد مستغربین کا خطرہ ہے، جو مسلمانوں کے لباس میں ملبوس ہو کر ہمارے تعلیمی اداروں میں ان مستشرقین کے نظریات و خیالات اور تحریفات و خرافات پھیلاتے اور نوجوان طلبہ کے ذہن مسموم کرتے ہیں۔ اس زہر ہلاہل کا تریاق مہیا کرنا اس وقت علم دین اور دین اسلام کی بہت بڑی اور نہایت ضروری خدمت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے

(باقی)

تاریخ اسلام حصہ اول تا چہارم

از مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم

سلسلۂ سیرۃ النبی اور سلسلۂ سیر الصحابہ کی طرح دار المصنفین کا ایک اہم سلسلہ تاریخ اسلام بھی ہے جو سولہ جلدوں پر مشتمل ہے، اس سلسلہ کی مندرجہ بالا چار جلدوں کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور ان کے اب تک متعدد ایڈیشن چھپ چکے ہیں، ہندوستان و پاکستان کی مختلف یونیورسٹیوں نے ان کو اسلامی تاریخ، اسلامی تہذیب و ثقافت کے نصاب میں داخل کیا، بعض نے ان کو مطالعہ کی کتابوں میں رکھا، اور تاریخ اسلام کے عام طلبہ بھی سہولت کے خیال سے ان سے برابر فائدہ اٹھاتے ہیں،

ان چاروں جلدوں میں آغاز اسلام سے خلافت عباسیہ کے خاتمہ تک کئی صدیوں کے حالات بیان کئے گئے ہیں، اور پہلی تین جلدوں میں عہد رسالت، خلافت راشدہ اور اموی و عباسی حکومتوں کی مکمل اور جامع مذہبی، سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ ہے، اور چوتھی جلد میں جو خلافت عباسیہ کے زوال اور دوسری نئی نئی حکومتوں کے قیام اور بغداد پر ان کے تسلط و فتنہ کے حالات پر مشتمل ہے، اور یورپی حکومتوں کے جنگ یعنی صلیبی جہاد اور بیت المقدس کی فتح کی تفصیل پیش کی گئی ہے،

قیمت حصہ اول ۰۰-۱۸، حصہ دوم ۰۰-۱۵، حصہ سوم ۰۰-۱۸، حصہ چہارم ۰۰-۱۹

اسی سلسلہ میں شام کے مشہور فاضل محمد کرد علی کی تصنیف اسلام اور عربی تمدن بھی داخل ہے جس کا سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ بھی مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم ہی نے کیا ہے، اس میں اسلام اور اسلامی تمدن و تہذیب پر علمائے مغرب کے اعتراضات کا بہت مدلل جواب دیا گیا ہے، قیمت [illegible]

[illegible]

[illegible]

مطبوعات جدیدہ

مطالعۂ قرآن کے اصول و مبادی از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۱۹۰ مجلد مع گرد پوش قیمت بارہ روپیے۔ پتہ ۔ مکتبہ اسلام، گوئن روڈ لکھنؤ۔

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کو قرآن مجید کے مطالعہ سے بڑا شغف ہے وہ مدتوں دار العلوم ندوۃ العلما میں تفسیر و ادب کے استاذ رہ چکے ہیں، اس زمانہ میں انھوں نے درس کے مالوف اور عادی طریقہ کے علاوہ اپنے خاص ذوق کی بنا پر طلبہ کے لیے مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا تاکہ انھیں قرآن سے دلچسپی بھی ہو اور وہ اس کی عظمت و اہمیت کے علاوہ اس کی روح اور مقصود سے بھی آشنا ہوں مگر اس دور کے بعد مولانا نے گوناگوں علمی اشتغال اور تبلیغی مصروفیتوں میں ایسے منہمک رہے کہ ان مضامین کی جانب کماحقہ توجہ نہ کر سکے اور ان کا مبیضہ بھی غائب ہو گیا، اب کسی طرح [illegible] ایک تجربہ [illegible] ترجمان مضامین کا مجموعہ ہے، پہلے مضمون میں قرآن مجید کا [illegible] اس پر زور دیا ہے کہ اللہ کی جانب سے [illegible] قرآن [illegible] ایک مضمون میں قرآن مجید کی قدیم آسمانی صحیفوں پر فوقیت اور ان سے اس کا فرق دکھایا ہے، اسی ضمن میں حضرت یوسفؑ کے قصہ کو مثال پیش کر کے تورات کے مقابلہ میں قرآن کے بیان کا حسن اور اس کے اسلوب کی دلآویزی واضح کی ہے۔ مولانا نے قرآن کے اعجاز پر مختلف حیثیتوں سے بھی بحث کی ہے۔

ہیں۔ سلسلہ میں اس کی مختلف پیشین گوئیوں پر اجمالاً مگر غلبۂ روم کی پیشین گوئی پر تفصیلاً گفتگو کی ہے جو پر از معلومات ہے، قرآن کے معجزۂ ہدایت و انقلاب پر بھی اچھی بحث ہے، ایک مضمون میں قرآن مجید کی عظمت اس حیثیت سے دکھائی ہے کہ اس سے پہلے کے آسمانی صحیفے تحریف و تبدل کے علاوہ تلف اور برباد بھی ہوتے رہے ہیں، جب کہ قرآن مجید کا ایک ایک نقطہ اور شوشہ محفوظ ہے، اس سلسلہ میں تورات کی تین بار گمشدگی اور اناجیل کے غیر معتبر ہونے کا ذکر خود یہودی و عیسائی مصنفین کے حوالے سے کیا ہے، قرآن سے استفادہ میں جو چیزیں مانع یا معاون ہیں ان کا بھی دو مضامین میں ذکر ہے، آخر میں صحابہ کرام، ائمہ عظام اور صوفیائے کرام کی تلاوت، مطالعہ اور تدبر قرآن سے شغف کے موثر اور شوق انگیز حالات بیان کئے ہیں، یہ مضامین مولانا کے ابتدائی دور کی یادگار ہیں، ان میں ترمیم و اضافہ کا انھیں احساس تھا، مگر اس کے لیے ان جیسے مشغول شخص کے پاس وقت نہ تھا، تاہم یہ علمی تبرک طلبہ قرآن کے لئے نعمت غیر مترقبہ ہے،

سید نجیب اشرف ندوی شخصیت اور کارنامے مرتبہ جناب ریاست علی، تاج تقطیع متوسط، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۰۰، قیمت تیس روپے

پتہ: انگمن ریاض نیو روڈ، (۲) مسعود پبلی کیشنز، کوٹھی شیخ حکیم، نگر حیدرآباد ۵۰۰۰۰۵

جناب سید نجیب اشرف ندوی مرحوم دار المصنفین کے ابتدائی دور کے لائق رفیق تھے، ان میں علمی و ادبی صلاحیتیں تھیں، اس لیے کم سنی ہی میں مقدمہ رقعات عالمگیر، رقعات عالمگیر جیسی بلند پایہ کتابیں لکھیں جن کو دیکھ کر ارباب علم ان کی جانب متوجہ ہوگئے تھے، بمبئی جانے کے بعد درس و تدریس کے مشغلے اور انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے انتظامی امور کی وجہ سے تصنیف و تالیف کا کام خاطر خواہ طور پر نہیں کرسکے، یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں نجیب صاحب کے حالات اور ملک کی تحریکوں سے وابستہ ہونے کا ذکر ہے، دوسرے باب میں ان کے خاندانی

حالات تعلیم [illegible] کی ابتدا [illegible] اور وفات کا ذکر ہے اور ان کے متعلق اہل علم کے تاثرات اور شعر کے باقی اشعار درج ہیں۔ تیسرے باب میں انکی سیرت و شخصیت کے مختلف جلوے دکھائے گئے ہیں [illegible] نجیب صاحب کی شرافت، مقبولیت [illegible] کا اندازہ ہوتا ہے [illegible] شگفتہ مزاج [illegible] شخص تھے مصنف نے اس کے کچھ دلچسپ نمونے دیے ہیں، چوتھے باب میں انکی تصنیفات، تراجم اور مضامین کی مکمل فہرست اور علمی و ادبی زندگی کے تین ادوار کا ذکر ہے، پہلے دور میں رفیق دارالمصنفین کی حیثیت سے ان کی کتابوں اور معارف میں شائع شدہ مضامین پر ریویو اور دوسری نوعیت کے مضامین پر سیر حاصل تبصرہ ہے، دوسرے میں اردو کے پروفیسر اور تیسرے میں ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے انکی تصنیف لسانیات گجری، نوائے ادب اور دوسرے رسائل میں چھپے مضامین پر بحث و تبصرہ ہے اور ضمناً انجمن اسلام کا تعارف اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے اغراض و مقاصد بیان کئے ہیں، پانچویں باب میں نجیب صاحب کے چند خطوط درج ہیں، چھٹے میں ان کے نظریۂ زبان و ادب پر بحث ہے اور ساتویں میں انکے اسلوب کی خصوصیات دکھائی ہیں اور طرز نگارش کے نمونے بھی نقل کئے ہیں۔ یہ کتاب وہ مقالہ ہے جو ایم۔ اے فائنل کیلئے لکھا گیا تھا، گو اس سے نجیب صاحب پر کام کرنے والوں کو امداد ملے گی لیکن جو لوگ انکو اچھی طرح جانتے ہیں انھیں اس کتاب کے پڑھنے کے بعد پوری طرح تشفی نہیں ہو سکتی ہے، ان کی نظر میں یہ کتاب انکی پوری زندگی پر حاوی نہیں ہے بلکہ یہ انکی زندگی کا ایک سرسری خاکہ ہے، نجیب صاحب کے مضمون "یہاں کی کہانی" کا کئی جگہ ذکر ہے، ص ۳۰ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف اس کے سن اشاعت کی تعیین سے قاصر ہیں لیکن ص ۱۰۱ پر اس کا سن اشاعت ۱۹۳۰ء اور ص ۵۵ پر ۱۹۲۰ء لکھا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں "پھر ندوہ، شبلی اکیڈمی اور دارالمصنفین سے بالآخر ......" (ص ۱۰۱) اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ شبلی اکیڈمی اور دارالمصنفین کو دو ادارے سمجھتے ہیں، ایک جگہ جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی جانب تاریخ ہند کو منسوب کیا ہے حالانکہ انکی کتاب تاریخ اسلام ہے جو جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب کی [illegible] مصنف لکھتے ہیں [illegible] ص ۵۵ پر [illegible] تقریباً پندرہ سال [illegible] کتابت کی غلطی [illegible] ص ۲۹ [illegible] عبد الرزاق قریشی مرحوم [illegible] شہزادہ دارا شکوہ کی کتاب کا نام سفینۃ الاولیاء بتایا ہے جبکہ [illegible] سفینۃ الاصفیاء [illegible] نجیب صاحب [illegible] دارا شکوہ کی سفینۃ الاصفیاء نام کی کوئی کتاب [illegible] مضمون [illegible] نجیب صاحب کے مضمون [illegible] کا مستحق قرار دیا [illegible]

۷۶ ... [illegible] کتابوں کے جدید ایڈیشن

نقوش سلیمانی

یہ سید صاحب کے ہندوستانی زبان اور اردو ادب سے متعلق مختلف ادبی و لغوی مضامین، خطبات، مقالات کی دوسری تقریروں تحریروں، تبصروں اور مقدموں کا مجموعہ جن کا انتخاب خود فاضل مصنف نے اپنی زندگی میں کیا تھا، اور نہایت اہتمام سے معارف پریس میں چھپوایا تھا، وہ اردو کو ہندوستانی کی نسبت سے ہندوستانی کا نام دے کر ملک کی مشترکہ زبان بنانا چاہتے تھے، افسوس کہ ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، اور ہندی ملک کی سرکاری زبان قرار پا گئی، طبع دوم عکسی،

قیمت :- ۲۵ روپیہ

خیام

خیام کو فارسی کے ایک باکمال رباعی گو شاعر کی حیثیت سے دنیا میں شہرت حاصل ہوئی اور اس کی رباعیات کا یورپ اور دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو گیا ہے، لیکن اس کے علاوہ وہ ایک بہت بڑا فلسفی تھا، منجم تھا، ریاضی داں تھا، ہیئت داں تھا، اور حکیم و طبیب تھا، [illegible] مولانا شبلی نے [illegible] اشارہ کیا ہے، اس کتاب میں پہلی مرتبہ [illegible] اس کی علمی حیثیت پر بہت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، نیز [illegible] مستند رباعیات بھی شامل کر دی گئی ہیں،

طبع دوم عکسی قیمت: ۵۰ روپیہ

عرب و ہند کے تعلقات

یہ سید صاحب [illegible] ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد [illegible] خطبات [illegible]

زیر طبع [illegible] طبع دوم عکسی، قیمت: ۳۰ روپیہ

بزم تیموریہ

[illegible] پہلی دفعہ [illegible] میں [illegible] ظہیر الدین بابر [illegible]
عالمگیر اور آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ [illegible] شہزادوں اور شاہزادیوں کے علمی ذو
ق و شوق اور علم پروری [illegible] ان کے دربار کے [illegible] ذوق امرا، علما فضلا اور شعرا کے
تذکرے، ان کے علمی ادبی و شعری کمالات اور ان کے نثر و نظم کے بہترین انتخابات پر مشتمل تھا، اس کے
دوسرے ایڈیشن میں تھوڑی اصلاح و ترمیم، تغیر و تبدیل اور اس کثرت سے اضافے ہوئے کہ اس کا حجم
بہت بڑھ گیا، اس لئے قارئین اور مستفیدین کی سہولت کے لئے اس کو تین جلدوں میں کر دیا گیا
اس میں بعض نئے ماخذوں کی رو سے ان سلاطین، شہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور [illegible]
کی تفصیلات بہت دلچسپ اور دل پذیر انداز میں جمع کی گئی ہیں کہ بانی سلطنت تیموریہ شہنشاہ بابر
سے لے کر آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر تک کے علم و ادب اور شعر و سخن کا پورا مرقع نظروں
کے سامنے آجاتا ہے، پہلی جلد میں پہلے مغل سلاطین یعنی بابر، ہمایوں اور اکبر کے علمی ذوق اور
ان کے دربار کے [illegible] کے تذکرہ کے ساتھ ان کے علمی کمالات اور کارناموں پر
روشنی ڈالی گئی ہے، دوسری جلد جہانگیر و شاہجہاں اور ان کے دربار کے [illegible]
اور ان کے دور کے شعرا و ادبا اور فضلا [illegible] کے تذکرے [illegible]
پر مشتمل ہے، تیسری جلد [illegible] عالمگیر [illegible] آخری دور کے مغل فرمانروا
بہادر شاہ ظفر وغیرہ اور تمام تیموری شاہزادوں اور شاہزادیوں مثلاً گلبدن بیگم [illegible]
جہاں آرا [illegible] اور زیب النسا بیگم وغیرہ اور ان کے علمی و ادبی کمال
کے حالات اور کارناموں پر مشتمل ہے، جلد اول قیمت [illegible] جلد دوم [illegible] روپے

مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن

[illegible]

رجسٹرڈ نمبر ال ۵۰۲۰ اگست ۱۹۸۲ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

قیمت بیس روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

کاتب سید اقبال احمد

(دارالمصنفین کی دو نئی کتابیں)

سیرۃ النبی جلد ہفتم

سیرۃ النبی جلد ششم کے بعد سید صاحب سیرۃ جلد ہفتم بھی جو معاملات سے متعلق تھی لکھنی شروع کر دی تھی، اور اسی پر یہ مقدس سلسلہ ختم بھی ہو جاتا لیکن ابھی اس موضوع پر چند ہی مضامین لکھے تھے کہ آپ کا انتقال ہو گیا اور یہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکی، یہ ان ہی متفرق مضامین و مباحث کا مجموعہ ہے، جن کے عنوانات یہ ہیں: اسلام میں حکومت کی حیثیت، عہد نبوی میں نظام حکومت، سلطنت اور دین کا تعلق وغیرہ، شروع میں مولانا سید ابو الحسن علی کے قلم سے پیش لفظ ہے۔

قیمت: ۱۲ روپیہ

مؤلفہ مولانا سید سلیمان ندوی

صوفی امیر خسرو

اس میں ہندوستان کے شہرۂ آفاق محب وطن فارسی شاعر، نہ سپہر، شیریں خسرو، لیلیٰ مجنوں، دولرانی خضر خان، اور دسا الحیٰوۃ جیسی شاہکار مثنویوں کے مصنف اور حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء کے جان نثار مرید حضرت امیر خسرو کو، معاصر تذکروں و تاریخ کی کتابوں اور خود ان کے کلام کے مجموعوں اور مثنویوں کی روشنی میں ایک صاحب دل صوفی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، بزم صوفیہ کے بعد سلوک و عرفان کے مباحث و مسائل پر دوسری اہم کتاب ہے۔

قیمت: [illegible]

مؤلفہ سید صباح الدین عبدالرحمن

جلد ۱۳۰ ماہ شوال المکرم ۱۴۰۲ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۸۲ء عدد ۲

مضامین

مقالات

شذرات

مغربی بیروت میں فلسطینیوں پر یہودیوں کی مسلسل سفاکانہ بمباری کو اب دو مہینے ہو رہے ہیں، اخباری خبروں کے مطابق وہاں تیس ہزار سے زیادہ افراد لقمۂ اجل ہو چکے ہیں، اس المیہ سے بے چین ہو کر ایک بار پھر قلم اضطراب میں یہ سطریں سپردِ قلم ہو رہی ہیں،

اس ذلیل ترین جارحیت اور خوں ریزی سے انسانیت چیخ اٹھی ہے، اقوامِ متحدہ کی حفاظتی کونسل اسرائیل کی اس درندگی کے خلاف تجویزوں پر تجویزیں منظور کر رہی ہے لیکن وہ کسی کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتا، جس کے بعد اس عالمی ادارہ کے لایعنی، بے مقصد اور بیکار ہونے کی رہی سہی کسر پوری ہو رہی ہے، اب یہ محض ایک سیاسی قہوہ خانہ، سیاست دانوں کا ایک شبستانِ عیش، بڑی طاقتوں کی ذہنی عیاشیوں کی ایک طرب گاہ اور ویٹو کے استعمال کی بازیگری کا ایک سرکس بن کر رہ گیا ہے، پیرک امریکہ کی اس داشتہ کا حشر کہیں وہی نہ ہو جو لیگ آف نیشنز کا ہو چکا ہے، یا شاید [illegible] ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے۔

یہودی یہ سمجھیں کہ ان کو اس علاقہ میں ان کی آرزوؤں کی جنت مل جائے گی، وہ اپنی ریاست کو امریکہ کے سیاسی مصالح کا ایک فوجی کیمپ تو ضرور تصور کریں جو اس کے سیاسی مفاد کے ماتحت آسانی سے ختم بھی ہو سکتا ہے، گذشتہ ڈھائی ہزار برس کی تاریخ میں یہودیوں کو یہاں دیوارِ گریہ کے پاس پہونچ کر رونے کے علاوہ کوئی اقتدار حاصل نہیں ہوا، حضرت عیسیٰؑ سے چھ سو سال پہلے بابل کے حکمراں بخت نصر نے یروشلم کے یہودیوں کو ان کی بدکرداری کی یہ سزا دی تھی کہ اس کو کھنڈر کر کے یہاں سے ایک لاکھ قیدی اپنے ساتھ بابل لے گیا، اس وقت سے ۱۹۴۸ء تک وہاں ایرانیوں، یونانیوں، رومیوں اور مسلمانوں کی حکومتیں یکے بعد دیگرے رہیں، لیکن یہودیوں کا یہ وطن نہیں رہا، اب اس کو اپنا وطن بنا لیا ہے تو اس کا کوئی جواز نہیں۔

ہے خاک فلسطیں پہ یہودی کا اگر حق
ہسپانیہ پہ حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا

رسول اللہ صلعم کی نبوت کے بعد سولہ مہینے تک بیت المقدس قبلۂ اول رہا، آپؐ کا سفر معراج بھی یہیں سے شروع ہوا، مسلمانوں کی نظروں میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے بعد سب سے مقدس شہر یہی ہے، حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ سے

گیارہویں صدی عیسوی تک [illegible] فاطمی اور سلجوقی فرماں رواؤں نے قبۃ الصخرہ اور مسجد اقصیٰ کی تعمیر کرکے اس شہر کی تزئین و آرائش میں بے شمار دولت صرف کی گیارہویں صدی میں یروشلم کے لیے صلیبی جنگ شروع ہوئی تو عیسائیوں اور مسلمانوں میں اسی طرح لڑائیاں ہوتی رہیں جس طرح آج یہودیوں سے ہو رہی ہیں تقریباً چار سال کی مسلسل لڑائیوں کے بعد عیسائی بیت المقدس میں داخل ہوئے۔

نوے برس کے بعد صلاح الدین ایوبی نے اپنی بے مثال شجاعت اور قابلِ فخر تدبر سے کام لے کر مسلمانوں کا پھر اس پر قبضہ کرا دیا، رفتہ رفتہ اس کا نصرانی کردار بالکل جاتا رہا، یہودی صرف دیوارِ گریہ کے پاس آکر رونے کے سوا یہاں کی ہر چیز سے محروم رہے، یہودیوں نے جب حضرت عیسیٰ روح اللہ کی نبوت سے انکار کیا اسی وقت سے ان کے مولد کا امین بننے کے مستحق نہیں رہے، اسی طرح جب عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت کے باوجود اللہ تعالیٰ کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی تکذیب کی تو یروشلم کی امانت ان فرزندانِ ابراہیم کا حصہ ہو گیا جو نسلِ ابراہیمؑ کے ہر پیغمبر کو برابر کی عقیدت اور احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

سولہویں صدی کی ابتدا سے فلسطین دولتِ عثمانیہ کے زیرِ نگیں رہا، عیسائی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کے باوجود عثمانیوں نے اپنی رواداری میں عیسائیوں کو یہاں گرجا، شفاخانے اور یتیم خانے وغیرہ بنانے کی اجازت دے دی تو یہ انکی سیاسی شر انگیزیوں کے اڈے بن گئے، سلطان عبدالحمید کے عہد میں یہودیوں نے یہ پیشکش کی کہ اگر ان کو فلسطین میں زمین خریدنے کی اجازت دیدی جائے تو وہ ترکی کے تمام قرضے ادا کر دیں گے، سلطان نے اس کو حقارت سے ٹھکرا دیا، پھر بھی یہودی چوری چھپے فلسطین میں داخل ہو کر اور بڑی بڑی قیمتیں دے کر عربوں کی زمین خریدنے میں کامیاب ہوتے گئے۔

پہلی جنگِ عظیم کا المناک پہلو یہ ہے کہ عربوں نے ترکوں کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا جس کے بعد انگریزوں نے غداری کرکے فلسطین کو عربوں کے حوالہ کرنے کے بجائے اپنے قبضہ میں کر لیا اور جس کے بعد یہودیوں کے لیے فلسطین کے دروازے کھول دیے گئے، پھر تو عربوں اور یہودیوں میں خونریز فسادات کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا برطانیہ نے گھبرا کر اس کو یہودیوں اور عربوں کے درمیان دو حصوں میں تقسیم کرکے صلیبی جنگ کی شکست کا بدلہ لے لیا

یہودیوں کی نئی ریاست اسرائیل کو اقوام متحدہ نے ۱۹۴۸ء میں تسلیم کر لیا تو وہ اپنی بدنفسی میں ایک بڑی مملکت کا خواب دیکھنے لگے، فلسطینی عربوں کو دھکیلنا شروع کیا تو وہ خانماں برباد ہو کر شام لبنان اور اردن کے کیمپوں میں بے بسی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں یہودیوں نے قدیم بیت المقدس اور اردن کے مغربی کنارے پر بھی قبضہ کر لیا۔ ۱۹۷۳ء کی جنگ میں عرب مقبوضہ فلسطین کو آزاد نہ کرا سکے۔

عیسائیوں نے یہودیوں کو ان کی بدکرداری' بداعمالی اور بدنفسی کی وجہ سے اپنے اپنے ملکوں سے دربدر کر دیا ہے، لیکن فلسطینی مسلمانوں کے مقابلہ میں انھوں نے ان کو ایسا عزیز بنا لیا ہے کہ ؎

شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولی

یہ ہیں ان اقوامِ شکست و ریخت کی کرشمہ سازی ہے کہ یہودی تو باہر سے آکر فلسطین میں بسیں لیکن جو چودہ سو سال سے اپنے گھروں میں آباد تھے ان کو بے گھر کیا جائے' اور جب وہ اپنا گھر واپس مانگیں تو ان پر بمباری کر کے ان کو تباہ کیا جائے، اس میں امریکہ اور لبنان کے عیسائی بھی ان کا ساتھ دیں۔

بے یار و مددگار فلسطینیوں نے مغربی بیروت میں جس ہمت' صبر' پامردی اور بے جگری سے درندہ صفت یہودیوں کی بمباری کا مقابلہ کیا ہے اس کو دیکھ کر ہر حساس انسان اپنی زبان حال سے ان کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے:

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ ✽ میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے

لبنان میں فلسطینی مسلمان یہودیوں سے نہیں بلکہ امریکہ کے مہلک اسلحہ اور ان طاغوتی طاقتوں سے پسپا ہوں گے، جن کا مقصد یہ رہا ہے کہ

اہل حرم سے ان کی روایات چھین لو ✽ آہو کو مرغزار ختن سے نکال دو

مگر یہ چراغ پھونکوں سے بجھایا نہ جائے گا' انبیاءؑ کے ان قاتلوں اور اللہ تعالیٰ کے ان مغضوب بندوں سے لڑائی کا ابھی آغاز ہے جو صلیبی جنگ کی طرح مدتوں لڑی جائے گی، مسلمان صحیح معنوں میں خیرالامت بن کر اٹھے تو دنیا جس کو ذلیل ترین قوم سمجھتی ہے وہ یہاں سے اسی طرح رو کر نکلے گی جس طرح ابھی حال ہی میں وادی سینا سے روتی ہوئی نکلی ہے۔

مقالات

پروفیسر اجناس گولڈزیہر

از

مولانا سعید احمد اکبرآبادی، علی گڈھ

ولادت ہنگری کے ایک شہر (Sz، Kesfehervar) میں ۲۲ جون ۱۸۵۰ء کو ہوئی، لکھنے پڑھنے اور مطالعہ کا ذوق فطری تھا، اس لئے ابھی عمر پانچ برس کی تھی کہ عہد عتیق کے عبرانی اڈیشن کا مطالعہ شروع کر دیا، آٹھ برس کی عمر میں پوری تلمود پڑھ لی، اسی کا نتیجہ تھا کہ بارہ برس کی عمر میں گولڈزیہر نے عبرانی زبان میں جو مناجاتیں ہیں ان کی اصل اور ان کے اقسام پر ایک مقالہ لکھا اور اسے شائع کرایا، ابھی عمر سولہ برس کی تھی اور وہ اسکول بوائے ہی کہلاتے تھے، کہ گولڈزیہر نے فلسفہ اور قدیم زبانوں مثلاً فارسی اور ترکی کی کلاسوں میں جو بوڈاپسٹ یونیورسٹی میں ہوتی تھیں، پابندی اور باقاعدگی سے شرکت شروع کر دی، اس کی تکمیل کر لینے کے بعد گولڈزیہر کو مزید اعلیٰ تعلیم اور ریسرچ کے لیے ہنگری گورنمنٹ کی وزارت تعلیم کی طرف سے ایک وظیفہ مل گیا، تو اب وہ جرمنی چلے آئے، اور لیپزگ اور برلن کی یونیورسٹیوں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، اس وقت ان کی عمر ۱۹ برس تھی، جرمنی سے وہ ہالینڈ گئے، اور لیڈن میں جو اس زمانہ میں اسلامیات کے درس و مطالعہ کا یورپ میں سب سے بڑا مرکز تھا، چھ مہینے قیام کیا، اس قیام کا نتیجہ یہ

کہ گولڈزیہر نے اب تک جو کام کیا تھا، اگرچہ اس کا دائرہ بڑا وسیع تھا لیکن اس کا تعلق زیادہ تر یہودی اور سامی زبانوں (جن میں عربی بھی شامل تھی) کے ادب و لٹریچر کے مطالعہ سے تھا، مگر اب یعنی لیڈن میں قیام اور اسلامیات کے درس و مطالعہ کے بعد، جیسا کہ گولڈزیہر نے خود اپنی ڈائری میں تحریر کیا ہے اسلام کا مطالعہ اور اس پر تحقیق اور ریسرچ ان کی علمی زندگی کا نہایت اہم مشن بن گیا۔

اس سلسلہ میں انھوں نے مشرق وسطیٰ کا سفر کیا اور ستمبر ۱۸۷۳ء سے اپریل ۱۸۷۴ء تک دمشق اور قاہرہ میں قیام کیا، جامع ازہر قاہرہ میں کسی غیر مسلم کا داخلہ قانوناً ممنوع تھا لیکن گولڈزیہر نے خصوصی اجازت حاصل کر کے اس میں داخلہ لیا اور بحیثیت طالب علم وہاں پڑھنا شروع کر دیا گولڈزیہر نے جو زمانہ یہاں گذارا اس کو انھوں نے اپنی زندگی کی خوشگوار ترین اور مفید ترین مدت بیان کیا ہے۔

اگرچہ اپنے والد کی سخت علالت کے باعث جو مرض الموت ثابت ہوئی وہ قاہرہ میں زیادہ قیام نہ کر سکے اور وطن لوٹ آئے پھر یہاں دیکھا کہ ان کے گھر کا تجارتی کاروبار بھی انحطاط پذیر ہے، علاوہ ازیں ہنگری گورنمنٹ کی وزارت تعلیم کا اب وہ پہلا سا ہمدردانہ اور حوصلہ افزا رویہ باقی نہ رہا تھا، اور ملک کی سیاسی صورت حال بھی بدل چکی تھی ان تمام مشکلات اور موانع کے باوجود گولڈزیہر نے باقاعدہ و باضابطہ اسلام کا تحقیقی مطالعہ انہماک اور کامل توجہ و یکسوئی کے ساتھ جاری رکھا چنانچہ ۱۸۷۶ء میں وی آنا کی امپیریل اکاڈمی کی روئداد میں گولڈزیہر کے علمی کارنامہ کی اشاعت ہوئی تو علوم شرقیہ اور خصوصاً اسلام اور اس کے متعلقات کے ایک جدید طرز کے محقق کی حیثیت سے لوگوں کی نگاہیں ان کی طرف اٹھنے لگیں، اور یہی وقت ان کی شہرت کا نقطۂ آغاز ہوا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہنگری میں سامیوں کے خلاف تحریک بڑے زور شور سے چل رہی تھی، اور اس بنا پر یہودیوں کو اکثر و بیشتر علمی اعزازات و تقررات سے محروم کر دیا گیا تھا، گولڈزیہر بھی اس کی زد سے نہ بچ سکے، چنانچہ وہ بلند پایہ علمی اور تحقیقی کارنامے جن کی دھوم ممالک غیر کے حلقوں میں

بھی ہوتی تھی، خود ان کے اپنے وطن میں ان کی کوئی قدر نہ تھی، یہ زمانہ گولڈزیہر کے لئے بڑا صبر آزما تھا، ۱۸۹۴ء میں بوڈاپسٹ یونیورسٹی نے گولڈزیہر کو پروفیسر مقرر کیا بھی تو محض آنرری یعنی پروفیسر کا لقب رکھنے کے باوجود گولڈزیہر کو نہ تنخواہ ملتی تھی اور نہ اور دوسری سہولتیں میسر تھیں جو باتنخواہ پروفیسر کو حاصل ہوتی ہیں، اور وطن میں ان کے ساتھ یہ معاملہ اس وقت تھا جب کہ ۱۸۸۹ء میں آٹھوین انٹرنیشنل کانگریس آف اورینٹلسٹس نے گولڈزیہر کو ان کے علمی اور تحقیقی کارنامون کی قدر افزائی کی غرض سے ایک تمغۂ طلائی دیا اور ۱۹۰۴ء مین کیمبرج یونیورسٹی نے گولڈزیہر کو ڈبلو رو برٹسن اسمتھ کی جانشینی کی غرض سے پروفیسر شپ کی پیش کش کی تھی جس کو خود گولڈزیہر نے منظور نہیں کیا تھا

آخر معاشی ضرورتوں سے مجبور ہو کر گولڈزیہر نے یہودی کمیونٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا، جس کو مسلسل تیس برس ۱۸۷۶ء سے ۱۹۰۴ء تک کرتے رہے، اس میں اگرچہ تنخواہ کافی تھی، لیکن یہ کام گولڈزیہر کی طبیعت اور مزاج و مذاق کے خلاف تھا لیکن اس میں مصروفیت کے باوجود شام کے اوقات، تعطیل کے ایام اور ہفتہ وار چھٹی کے دن جو وقت ملتا تھا گولڈزیہر اسے علمی اور تحقیقی کامون میں صرف کرتے اور انھیں شائع کرتے رہتے تھے، جس سے ان کی عظمت اور شہرت میں، روز بروز اضافہ ہو رہا تھا، انجام کار ۱۹۰۴ء میں عمر میں پہلی مرتبہ ان کا تقرر ایک باقاعدہ باضابطہ اور باتنخواہ پروفیسر کی حیثیت سے بوڈاپسٹ یونیورسٹی میں ہوا، پہلے یہ سامی زبانوں اور ان کے ادبیات کے پروفیسر رہے، ۱۹۱۴ء سے فیکلٹی آف لا کے ماتحت اسلامی فقہ کے صدر شعبہ ہو گئے، ۱۳ نومبر ۱۹۲۱ء کو ان کا انتقال ہوا،

پروفیسر گولڈزیہر کے بلند پایہ علمی اور تحقیقی کارنامون کی فہرست بہت طویل ہے لیکن چند کتابیں نہایت اہم اور بڑی معرکۃ الآرا ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔ (۱)، فرقۂ ظاہریہ، ان کا مذہب

---

[1] یہ معلومات ان کی کتاب اسلامک تھیولوجی اینڈ لا کے ترجمہ کے دیباچہ سے لئے گئے ہیں۔

اور ان کی تاریخ" ۱۸۸۴ء میں شائع ہوئی، (۲) "اسلامیات کا مطالعہ" یہ کتاب دو جلدوں میں ہے، اور طول الذکر کتاب کے چند برس بعد منظر عام پر آئی ہے۔ (۳) اس کے بعد ۱۹۰۸ء میں گولڈ زیہر کو امریکہ کی طرف سے اسلامی دینیات اور اسلامی فقہ کے عہد بعہد ارتقا پر چھ لکچر دینے کی دعوت موصول ہوئی، گولڈ زیہر نے یہ دعوت منظور کر کے ایک برس کی مدت میں لکچر تیار کر لئے لیکن کچھ صحت کی خرابی اور کمزوری اور چند اور اسباب کی بنا پر گولڈ زیہر کو امریکہ کے سفر کا ارادہ فسخ کرنا پڑا، اور انھوں نے یہ لکچر کتابی شکل میں "اسلامی دینیات اور قانون" کے نام سے چھپوا دیا (۴) اس سلسلہ میں چوتھی کتاب جو نہایت اہم ہے وہ "مذاہب التفسیر الاسلامی" کے نام سے ہے، جس میں تفسیر قرآن کے مختلف مناہج سے بڑی محققانہ بحث کی گئی ہے۔

یہاں تک ہم نے گولڈ زیہر کے ذاتی اور شخصی حالات و سوانح اور ان کے علمی کارناموں کا مختصراً ذکر کیا ہے، آیئے اب اسلامی نقطۂ نظر سے گولڈ زیہر کا بحیثیت ایک نامور مستشرق کے جائزہ لیں۔ جس زمانہ میں گولڈ زیہر بدر شعور کے ناخن لے رہے تھے، وہ زمانہ تھا جب کہ پیام مشرق کے مقدمہ میں علامہ اقبال کے بیان کے مطابق المانوی ادبیات کی تاریخ میں تحریک مشرقی پیدا ہو چکی تھی، گوئٹے کا دیوان اسی تحریک کا نتیجہ تھا، جس کی نسبت جرمنی کا اسرائیلی شاعر کہتا ہے: گوئٹے کا دیوان ایک گلدستۂ عقیدت ہے، جو مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے، اس دیوان سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد روحانیت سے بیزار ہو کر مشرق کے سینہ سے حرارت کا متلاشی ہے۔" یہ تحریک مشرقی جس کا آغاز اس وقت ہوا جب ۱۸۱۲ء میں فان ہیمر نے خواجہ حافظ شیراز کے دیوان کا مکمل ترجمہ شائع کیا، بعد کے شعرا پلاٹن، روکرٹ اور بوڈن اسٹاٹ نے اسے تکمیل کو پہنچایا، پلاٹن نے فارسی زبان سیکھی، قافیہ، ردیف اور ایرانی قواعد عروض کی پابندی سے غزلیں اور رباعیاں لکھیں اور نپولین کی مدح میں ایک قصیدہ بھی فارسی زبان

ین لکھا تر وکرٹ عربی، فارسی اور سنسکرت تینوں مشرقی زبانوں کا فاضل اور ماہر تھا، علامہ اقبال
لکھتے ہیں، رو کرٹ کی نگاہ میں مولانا جلال الدین رومی کے فلسفہ کی بڑی وقعت تھی اور اس کی
غزلیات زیادہ تر مولانا کی تقلید میں ہی لکھی گئی ہیں، مزید لکھتے ہیں چونکہ رکرٹ السنہ شرقیہ کا عالم تھا
اس لئے اس کی مشرقی نظم کے مآخذ بھی وسیع تھے، مخزن الاسرار نظامی، بہارستان جامی، کلیات
امیر خسرو، گلستان سعدی، مناقب العارفین، عیار دانش، منطق الطیر عطار اور ہفت قلزم وغیرہ
جہاں جہاں اسے حکمت کے موتی ملتے ہیں رول لیتا ہے، ...... اسلامی تاریخ کے بعض واقعات
بھی اس نے خوب نظم کئے ہیں، رہا بوڈن اسٹاٹ! اس کی نسبت علامہ اقبال رقم طراز ہیں گوئٹے
کے بعد مشرقی رنگ کا سب سے زیادہ مقبول شاعر بوڈن سٹاٹ ہے جس نے اپنی نظموں کا
مجموعہ مرزا شفیع کے فرضی نام سے شائع کیا، یہ چھوٹا سا مجموعہ اس قدر مقبول ہوا کہ تھوڑی ہی
مدت میں ایک سو چالیس دفعہ شائع ہوا، اس شاعر نے عجمی روح کو اس خوبی سے جذب کیا ہے
کہ جرمنی میں مرزا شفیع کے اشعار کو لوگ عرصہ تک فارسی نظم کا ترجمہ ہی تصور کرتے رہے، یہ جو کچھ
ہم نے لکھا ہے اس سے دو باتیں صاف طور پر معلوم ہوتی ہیں۔ (۱) ایک یہ کہ گولڈزیہر کی
پیدائش کے وقت تحریک مشرقی نے جرمنی کے ادبی حلقوں میں ایک ایسی فضا پیدا کر دی تھی
کہ عجمی گلشن علم و ادب کی بوئے جاں نواز سے اہل جرمنی کے دل و دماغ مہک رہے تھے، اور
وہ اس کے ذریعہ سرور باطن و روح کا سامان کرتے تھے اور (۲) دوسری بات یہ ہے کہ
تحریک مشرقی کا مقصد اور اس کی غرض و غایت خالص علمی اور ادبی تھی اور سیاست سے
ہرگز اس کا کوئی تعلق نہ تھا،

پروفیسر گولڈزیہر جو فطرۃً مذاق استشراق لیکر پیدا ہوئے تھے، اس فضا سے متاثر ہوئے
بغیر کس طرح رہ سکتے تھے، چنانچہ، جیسا کہ ہم شروع میں بتا آئے ہیں، گولڈزیہر کی عمر ابھی

سولہ برس کی تھی کہ یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں پر لکچر ہونے لگے جن میں فارسی اور ترکی زبانیں بھی شامل تھیں،
لکچروں میں شامل ہونے لگے، ساتھ ہی سامی زبانوں کی طرف توجہ ہوئی تو عربی زبان بھی سیکھ لی
لیڈن میں اسلامیات کا شوق پیدا ہوا تو اس کے درس و مطالعہ میں مصروف ہو گئے، یہاں تشنگی
نہ بجھی تو مشرق وسطیٰ کی راہ لی اور حد یہ ہے کہ جامع ازہر، قاہرہ میں داخل ہوئے، یہ گولڈزیہر
کی ایک ایسی خصوصیت ہے کہ غالباً کوئی اور مستشرق اس میں ان کا شریک و سہیم نہیں ہے،
جامع ازہر کے ارباب بست و کشاد نے یقیناً گولڈزیہر میں اسلامیات کے درس و مطالعہ
کے لیے غیر معمولی تڑپ اور لگن محسوس کی ہوگی، اور اب تک جو کچھ انھوں نے لکھا پڑھا تھا اس کی
انھوں نے قدر کی ہوگی، جب ہی تو انھوں نے جامع ازہر کی قدیم روایات اور اس کے قواعد و
ضوابط کے خلاف ایک یورپین غیر مسلم کو جامع ازہر میں داخلہ کی اجازت دی، پھر تکمیل تحصیل
کے بعد جب معاشی ضرورتوں سے مجبور ہو کر ایک دفتری ملازمت کرنے لگے تو اس عالم میں
بھی اسلامیات کا تحقیقی مطالعہ بڑی لگن کے ساتھ کرتے رہے، جس کا نتیجہ نہایت بلند پایہ مقالات
و تصنیفات کی شکل میں ظاہر ہوا، یہ سب کچھ اس امر کی روشن دلیل ہے کہ گولڈزیہر کو
اسلامیات کے ساتھ فطری اور حقیقی لگاؤ تھا، ان کا مقصد زندگی صرف علم کی خدمت تھا،
ان کو غرض نہ سیاست سے تھی اور نہ مشنریز کی طرح اسلام یا مسلمانوں کے خلاف پروپگنڈا
کرنے سے تھی، اور یہ اس لیے بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ مشنریز صلیبی لڑائیوں کے زخم خوردہ تھے،
اس لئے وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف رسوائے زمانہ کتابیں لکھ کر کھسیانی بلی کھمبا نوچے
کے مصداق اپنے دل کا بخار نکالنا چاہتے تھے، ان لوگوں کے برعکس گولڈزیہر یہودی تھے
اور ان کے زمانہ میں یہودی خود عیسائیوں کے ستم زدہ تھے، اور یوں بھی یہودی مذہبی
معاملات و مسائل میں اپنے آپ کو بہ نسبت عیسائیوں کے مسلمانوں سے زیادہ قریب سمجھتے تھے،

ان وجوہ کے باعث گولڈزیہر نے اسلامیات پر جو کچھ لکھا ———— اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا لکھا کہ اس میں عبقریت کی شان نظر آتی ہے ———— اس کے متعلق بدنیتی کا الزام نہیں دیا جاسکتا۔"

لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ گولڈزیہر نے غلطیاں نہیں کی ہیں؛ نہیں انھوں نے کی ہیں، اور ان کی غلطیاں دو قسم کی ہیں، (۱) مستشرقانہ غلطیاں اور (۲) علمی غلطیاں مستشرقانہ غلطیوں کے سلسلہ میں ہم کو بنیادی طور پر یہ باور کر لینا چاہئے کہ کوئی مستشرق خواہ کیسا ہی انصاف پسند اور اسلام کی رفعت و عظمت کا دل و جان سے قائل ہو، بہرحال وہ غیر مسلم ہے، اور اس بنا پر وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کا مطالعہ جس نقطۂ نظر سے کرتا ہے، وہ بے شبہ ایک مسلمان کا نقطۂ نظر ہرگز نہیں ہو سکتا، اور اس کا سبب یہ ہے کہ ایک شخص کے مسلمان ہونے کے لئے بعض جو بنیادی عقائد ناگزیر ہیں۔ اگر مستشرق بھی ان عقائد کا حامل ہو تو وہ غیر مسلم ہی کہاں رہے گا، مثلاً نبوت کا اسلام میں تصور اور اس تصور کے ماتحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مرسل من اللہ ہونا، علاوہ ازیں معراج نبوی اور قرآن کا کلام الٰہی ہونا۔ یہ اور اس طرح کی چند اور باتیں ہیں، جو مستشرقین میں عام ہیں، اور گولڈزیہر بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔

(۲) دوسری قسم کی غلطیاں جو گولڈزیہر سے ہوئی ہیں، وہ علمی غلطیاں ہیں یا تعبیر و بیان کی فروگذاشتیں ہیں، لیکن یہ غلطیاں نہ چنداں تعجب انگیز ہیں اور نہ ان سے گولڈزیہر کے بلند مرتبہ و مقام پر حرف آتا ہے، جو انھیں علم و تحقیق کی بارگاہ معلیٰ میں بجا طور پر حاصل ہے کیونکہ دنیا میں کسی علم و فن کا کوئی بڑا سے بڑا محقق اور دیدہ ور عالم بھی ایسا نہیں ہے جس سے غلطیاں نہ ہوئی ہوں اور جن کی نشاندہی خود اس کی زندگی میں یا اس کے بعد نہ کی گئی ہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی ارتقا پذیر ہے، اور اس کی نمو پذیری اور ارتقا کے ساتھ ساتھ انسان کی

معلومات اور ذرائع و وسائل معلومات میں بھی اضافہ اور تنوع پیدا ہوتا رہتا ہے۔

اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جہاں تک گولڈزیہر کی متشرقانہ غلطیوں اور فروگذاشتوں کا تعلق ہے مسلمان تو مسلمان، زمانہ حال کے بعض مستشرقین نے خود ان کا اعتراف کیا ہے اور گولڈزیہر کی طرف سے ان کی معذرت کی ہے، چنانچہ گولڈزیہر کی کتاب انٹروڈکشن ٹو اسلامک تھیولوجی اینڈ لا کے حالیہ انگریزی ترجمہ مطبوعہ ۱۹۸۱ء پر پروفیسر برنارڈ لیوس نے جو مقدمہ لکھا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں۔

"اس کتاب سے بوجوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گولڈزیہر کا زمانہ سیاسی اور عقلی حیثیت سے کس درجہ مختلف تھا، ہمارے زمانہ میں جو مغربی مصنفین اسلام پر یا کسی اور ایشیائی و افریقی موضوع پر کتابیں لکھ رہے ہیں، اُن کے برعکس گولڈزیہر اور ان کے ہم عصر مصنفین کو اس کا خیال ہی نہیں تھا کہ ان کی کتابوں کے قاری مسلمان بھی ہوں گے، اس لیے یہ لوگ اپنا مخاطب مغرب کے قارئین کو ہی بناتے تھے، چنانچہ اس عہد کے دوسرے مصنفین کی طرح گولڈزیہر بھی قرآن کو پیغمبر اسلام کی تصنیف کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، مسلمانوں کے نزدیک ایسا کہنا اسلام کی سخت تنقیص ہے، علاوہ ازیں اسلام پر لکھنے والے عام مغربی مصنفین کی طرح گولڈزیہر نے بھی قرآن و حدیث میں عہد جاہلیت کے اور بعض اور اجنبی اثرات پر بحث کی ہے، یہ موضوع بھی حساس مسلمانوں کے لیے سخت تکلیف دہ ہے، اس بحث میں گولڈزیہر نے جو زبان استعمال کی ہے وہ اب سے ایک سو برس پہلے تو استعمال ہوتی تھی، لیکن مستشرقین اب ایسی زبان استعمال نہیں کرتے جو مسلمانوں کے لئے آزردگی کا سبب ہو۔"

پروفیسر برنارڈ لیوس نے سطور بالا میں گولڈزیہر کی مستشرقانہ غلطیوں کی ہی نشان دہی

نہیں کی ہے بلکہ موصوف کی علمی فروگذاشتوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:"
محاضرات اسلام یعنی گولڈزیہر کی کتاب انٹروڈکشن ٹو اسلامک تھیولوجی اینڈ لا، بے شبہ اپنے زمانہ کی پیداوار ہے، چند مباحث ہیں، اور وہ بھی زیادہ تر تفصیلات وتشریحات کے معاملہ میں گولڈزیہر کی تحقیقات کو ان نئی معلومات اور دلائل کی روشنی میں رد وبدل کیا جاسکتا ہے۔ جو گولڈزیہر کے بعد سے اب تک حاصل ہو چکی ہیں، اور جن پر عصر حاضر کی تحقیقات نے مہر تصدیق ثبت کر دی ہے،

لیکن ان تمام غلطیوں اور فروگذاشتوں کے باوجود اس زمانہ میں اسلامیات پر لکھنے والے مغربی مصنفین کے درمیان گولڈزیہر کا انفرادی وصف اور امتیاز کیا ہے؟ پروفیسر برنارڈ لیوس نے اس پر بھی روشنی ڈالی ہے، لکھتے ہیں: ہم نے اوپر جن فروگذاشتوں کا ذکر کیا ہے، ان سے قطع نظر گولڈزیہر نے اسلامی عقائد اور مسلمانوں کے کارناموں کے ساتھ جس غیر معمولی ہمدردی کا جابجا اظہار کیا ہے وہ نہایت اہم ہے، اگر ایک طرف گولڈزیہر میں ہمارے زمانہ کے مصنفین کی محتاط روش کی کمی ہے تو دوسری طرف اس تنقیص وتوہین کی روش سے جس کا اظہار اس عہد کے یورپین مصنفین مسلمانوں اور ان کے مذہب، تہذیب وتمدن اور ان کی مقدس کتابوں کی نسبت کرتے تھے، گولڈزیہر کا قلم اس سے بالکل آزاد اور مبرا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ بہت اہم اور غیر معمولی بات ہے، اگرچہ گولڈزیہر اس عہد کی پیداوار ہے جس میں تبلیغ عیسائیت کا بڑا چرچا تھا، لیکن اس کے باوجود گولڈزیہر کی تحریروں میں اس کا کوئی اثر نظر نہیں آتا، اور صرف یہی نہیں، بلکہ گولڈزیہر کے معاصرین یا ان کے پیشرو مصنفین میں سے جن لوگوں نے اسلام کی تعلیمات کو مسخ کر کے اور ان میں رد وبدل کر کے اسلام پر اعتراضات کئے تھے، گولڈزیہر نے ان لوگوں کی پردہ دری کر کے اسلام کی حقانیت اور اصلیت اور

انکے استناد کو ثابت کیا، اس سلسلہ میں گولڈزیہر عیسائیت کے ان علما کے خلاف بھی سخت احتجاج کرتا ہے جو عیسائیت پر بحث کرتے ہیں تو اپنی یک طرفہ عقلیت پر بھروسہ کر لیتے ہیں لیکن جب وہ اسلام پر گفتگو کرتے ہیں تو اس کے لیے معیار تنقید بہت سخت کر لیتے ہیں۔

سطور بالا میں پروفیسر برنارڈلیوس نے گولڈزیہر کے اسلام سے متعلق علمی اور تحقیقی کارناموں کا بالغ نظری سے جو تحلیلی اور تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے، ہمارے نزدیک وہ بالکل صحیح، درست اور معروضی ہے، اور بڑی بات یہ ہے کہ عرب علمائے اسلام کا بھی نقطۂ نظر یہی ہے چنانچہ گولڈزیہر کی دو نہایت اہم کتابوں کا عربی ترجمہ جو ہماری نظر سے گذرا ہے، ہم ان کا تعارف کراتے ہیں، اس سے اندازہ ہوگا کہ علمائے عرب گولڈزیہر کے علمی اور تحقیقی کارناموں کے کس درجہ قدرداں تھے، اور انھوں نے کس طرح ان سے خاطر خواہ استفادہ کیا۔

(۱) ایک ضخیم کتاب جس میں قرآن مجید کی تفسیر کے مختلف مناہج اور اسالیب سے بحث کی گئی تھی، اس کا عربی ترجمہ" مذاہب التفسیر الاسلامی" کے نام سے قاہرہ یونیورسٹی کے استاذ ڈاکٹر عبدالحلیم النجار نے کیا ہے، جو چار سو کے قریب صفحات پر پھیلا ہوا ہے، یہ ترجمہ پہلی مرتبہ ۱۹۵۵ء میں مصر سے شائع ہو کر ارباب علم وادب میں بہت مقبول ہوا، اس ترجمہ کے پیش لفظ میں فاضل مترجم لکھتے ہیں" کتاب مذاہب التفسیر الاسلامی" منہج اور اسلوب بحث اور قرآن مجید کے درس ومطالعہ کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرنے کے اعتبار سے اسلامی ثقافتوں کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا واحد، منفرد اور ایک بالکل نئے طرز کا کارنامہ ہے" اس حیثیت سے یہ کتاب علمی بحث ونظر اور قرآن مجید کی تفاسیر میں جو تنوع ہے، اس کے مطالعہ کے لئے نئے میدان مہیا کرتی ہے، کتاب کی اہمیت اور افادیت کا اس طرح برملا اعتراف کرنے کے بعد فاضل مترجم لکھتے ہیں، گولڈزیہر نے اس کتاب میں تمام مذاہب تفسیر کا استیعاب

واستقصا نہیں کیا، علاوہ ازیں بعض دینی عواطف وجذبات کی تشریح میں دوسرے مستشرقین کی طرح مصنف سے بھی غلطیاں ہوئی ہیں، اور پھر کتاب اغلاط سے بھی خالی نہیں ہے، جن پر ہم نے اپنے حواشی میں تنبیہ کردی ہے، لیکن گولڈزیہر کو بحیثیت ایک عالم اور محقق کے جو مرتبہ بلند حاصل ہے ان چیزوں سے اسے کوئی نقصان نہیں پہونچتا۔

(۲) دوسری اہم کتاب جس کا عربی ترجمہ بڑے اہتمام اور کاوش سے کیا گیا ہے، وہ یہی ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے یعنی انٹروڈکشن ٹو اسلامک تھیولوجی اینڈ لا، اس ترجمہ کا نام ہے، "العقیدۃ والشریعۃ فی الاسلام، تاریخ التطور العقدی والتشریعی فی الدین الاسلامی"۔ اس کا ترجمہ جو حواشی کے ساتھ ۳۰۰ صفحات پر ہے، مصر کے تین افاضل علماء، ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ، ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر اور پروفیسر عبدالعزیز عبدالحق نے مل جلکر کیا ہے، اس ترجمہ کے مقدمہ میں ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ مستشرقین پر ایک عام گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں، یورپ کے جن علما نے اسلام اور مسلمانوں پر کسی حیثیت سے خامہ فرسائی کی ہے ان میں دو طبقے ہیں، ایک طبقہ تو ان لوگوں کا ہے جو اپنی خواہشات کے بندے تھے، اس لئے وہ خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا لیکن ان کے برخلاف ایک طبقہ ایسا بھی پیدا ہوا جو انصاف پسند تھا، ان لوگوں کو تحقیق وتدقیق کے بعد جو باتیں حق نظر آئی اسے برملا کہا، اس کے بعد طبقۂ ثانیہ کے چند نامور مستشرقین اور ان کے خاص خاص کارناموں کا ذکر کیا ہے، اور پھر پروفیسر گولڈزیہر کو بھی اس طبقہ میں شمار کیا ہے، پھر گولڈزیہر کی کتاب کا تعارف ان لفظوں میں کراتے ہیں، یہ کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، عقیدہ اور شریعت کا نشو ونما اور عہد بعہد اس کا ارتقاء، زہد اور تصوف، مختلف اسلامی فرقے، مذہبی تحریکات، اور ان کے اسباب وعلل، ان سب کا وسیع مطالعہ پیش کرتی ہے، مصنف نے اس کتاب کی تصنیف میں انھیں مراجع سے

کام لیا ہے جو اسلام کے معتبر مراجع ہیں، اور ان مراجع سے استفادہ میں مصنف کی غیر معمولی ذہانت اور گہری بصیرت اسکی معاون اور مددگار رہی ہیں لیکن ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کتاب میں غلطیاں بھی کم نہیں ہیں، اسکے وجوہ متعدد ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ غیر مسلم ہونے کے باعث وہ اسلام کے مبادی اور اصول کی اصل روح تک پہونچنے سے قاصر رہا۔

اس بنا پر فاضل مترجمین نے ایک طرف تو افادۂ عام کی غرض سے بڑی محنت اور کاوش سے گولڈزیہر کی اس اہم کتاب کو عربی جامہ پہنایا اور دوسری جانب اس کتاب پر محققانہ حواشی لکھ کر مصنف کی نوع بنوع غلطیوں اور فروگذاشتوں کی نشان دہی کر کے ان کی تصحیح بھی کی،

پروفیسر اربیری نے اپنی کتاب (Portraits of Persian Poets) کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ یورپ میں اسلام پر لکھنے والوں کے تین دور ہیں (۱) پہلا دور مشنریز کا ہے، یہ لوگ لکھتے ہی تھے اسلام کو رسوا اور بدنام کرنے کی غرض سے (۲) دوسرا دور استعمار کا ہے، اس دور میں مستشرقین جو کچھ لکھتے تھے، مثلاً براؤن، نکلسن اور ڈینی سن راس، وہ علمی ذوق تحقیق اور کاوش سے لکھتے تھے، لیکن استعماری طاقتیں ان سے یہ فائدہ اٹھاتی تھیں کہ ان کی کتابوں کے ذریعہ مسلمانوں کے مذہب، تہذیب وتمدن اور انکی تاریخ سے واقفیت ہوتی تھی، چنانچہ اس عہد کے مستشرقین برطانوی گورنمنٹ کے پولیٹکل ڈپارٹمنٹ سے بھی بحیثیت مشیر کار کے تعلق رکھتے تھے (۳) اس کے بعد جب استعمار کا دور ختم ہو گیا تو اب مستشرقین خالص علمی ذوق اور اسلامیات سے طبعی دلچسپی کی بنا پر لکھنے لگے، جہاں تک مشنریز کے کام کا تعلق ہے اسکی سخت مذمت خود پروفیسر اربیری نے کی ہے اور مسلمانوں سے اسکی معافی مانگی ہے۔

ہمارے نزدیک پروفیسر اربیری کی یہ تقسیم بالکل صحیح ہے، نمبر ۲ اور ۳ کے ماتحت جو مستشرقین آتے ہیں مسلمانوں کو انکے علمی اور تحقیقی کارناموں کی قدر کرنی چاہیئے اور جو روش علمائے عرب نے پروفیسر گولڈزیہر کی نسبت اختیار کی ہے وہی روش ہمیں گولڈزیہر جیسے دوسرے مستشرقین کے متعلق اختیار کرنی چاہیے۔

سرسید کے خطوط — ایک مطالعہ

جناب حامدہ مسعود صاحبہ لکچرر شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۲)

لندن میں ان کو موقع ملتا ہے کہ وہ ان ہندوستانی افسروں کے حق رخصت مع تنخواہ کے لئے آواز بلند کریں، جو ولایت آنا چاہتے تھے، ۹ر جولائی ۱۸۶۹ء کو وہ اپنے خط میں تذکرہ کرتے ہیں :-

"میں نے یہاں بڑی غل مچائی ہے، کہ ہندوستانی افسروں کو جو ولایت آنا چاہیں، اُن کو رخصت پوری تنخواہ پر ملنی چاہئے، اکثر ممبران انڈیا کونسل کا ان بھی میری فریاد پر رکھتے ہیں، چنانچہ میں نے اپنی درخواست پیش کی ہے نقل اس کی آپ کے ملاحظہ کے لئے روانہ کرتا ہوں، اگر یہ ہو گیا تو بلا شبہ آپ کو رخصت پوری تنخواہ پر مل سکے گی" (خطوط سرسید ص ۳۰-۳۱)

سرسید کے قیام انگلستان کے دوران ۱۸۶۹ء میں جب برطانوی پارلیمنٹ میں گورنر جنرل آف انڈیا کے اختیارات کی توسیع کے لئے بل پیش کیا گیا تو وہ محسن الملک کو اپنی بے لاگ رائے سے آگاہ کرتے ہیں، جو ان کے سیاسی شعور کی آئینہ دار ہے،

"یہاں کے اکثر امراء اور ممبران پارلیمنٹ ہندوستان کے خیرخواہ ہیں، مگر چونکہ حالات سے بخوبی واقف نہیں ہیں، اس لئے بعضے تو کچھ جانتے ہیں، اور بعضوں کی رائے نہایت غلط ہوتی ہے، حال کی پارلیمنٹ میں جو بل متضمن مزید طاقت گورنر جنرل ہندوستان

پاس ہوا ہے۔ حقیقت ممبران پارلیمنٹ نے نہایت نیک نیتی سے اور ہندوستان کا فائدہ سمجھ کر پاس کیا ہے۔ مگر ایسی غلط رائے کی ہے جس کا بیان نہیں ہو سکتا حقیقت میں ہندوستان غلام ہو گیا، اور یہ بل نہایت مضر ہندوستان کے ہے۔ اگر انگلستان میں یہ بل پاس ہوتا تو سب رعیت اس کی منسوخی کی درخواست کرتی ہے[۱]

ایک ہندوستانی نووارد کو لندن میں جو حیرتناک نظارے دیکھنے میں آتے ہیں ان میں ایک انڈیا آفس کا کتبخانہ بھی ہے جہاں اس کے علمی ذوق کی سیرابی کے لئے ہر طرح کی سہولتیں بہم ہیں۔ غدر کی لوٹ مار میں ہندوستان کے اسلامی کتبخانے برباد ہو چکے تھے جس کی وجہ سے سرسید کو اپنی ایک اہم تصنیف تیاری مطلوبہ کتابوں کے فراہم نہ ہونے کے باعث ملتوی کرنی پڑی، انڈیا آفس کے کتبخانے کو دیکھ کر انھیں اپنی علمی طلب پوری ہونے کے آثار دکھائی دیتے ہیں:۔

"کتب خانہ انڈیا آفس میں نے دیکھا، ہوش جاتے رہے، کتب خانہ نہیں ہے کتابوں کا شہر ہے مجھے وہاں جانے کی اور پڑھنے کی جو چاہوں اور نقل کی سب اجازت ہو گئی ابھی کتب خانہ برٹش میوزیم نہیں دیکھا ہے، سنا ہے وہ اس سے بھی بڑا ہے"[۲]

اگلے خط میں وہ برٹش میوزیم کے کتب خانہ کو ایک بہت بڑی جنگل سے تعبیر کرتے ہیں۔

سرسید نے اپنے خطوط میں مغربی تہذیب و تمدن اور طرز فکر کی اہمیت کو جس طرح باور کرایا ہے، اس کا جائزہ ہم اوپر لے چکے ہیں، انگلستان کی ترقی اور شائستگی کے نمونوں کی یہ تعریف و توصیف ہمیں صرف ایک دائرے میں محسوس ہوتی ہے لیکن دوسرے دائرے میں ہم مکتوب نگار کی اس شخصیت سے دوچار ہوتے ہیں، جو مذہب اسلام[۳] کی خدمت کو اپنی زندگی کا حاصل قرار دیتی ہے۔ غدر کے بعد عیسائی مشنری وسیع پیمانے پر اپنے مذہب کی تبلیغ کا کام کر رہے تھے جس

---

۱ خطوط سرسید ص ۳۰۰-۳۱ ۲ ایضاً ۵۲ ۳ انیسویں صدی کے مسلمان شرفا کے ذہنی ماحول کو

میں اسلام پر جو اعتراضات اور پیغمبر اسلام پر نکتہ چینی بھی شامل تھی، حکمراں طبقہ کی بالواسطہ حمایت اور اعانت کی وجہ سے عیسائی پادریوں کو خود بخود سہولتیں مہیا ہوگئی تھیں، تاہم مسلمانوں میں ان کی اسلام دشمنی کے جذبے کے خلاف مدافعت کی قوت پیدا ہوئی، علماء نے ان کی الزام تراشی کی تردید میں متعدد کتابیں لکھیں، اور مناظروں کے ذریعہ انھیں جواب دیا، جس کا عام مسلمانوں پر اچھا اثر پڑا، سرسید کے مذہبی جذبات آنے والے خطرات کو محسوس کرکے ان کے توڑ کی فکر میں تھے، اسی زمانے میں لائف آف محمد کی چار جلدیں چھپ کر آگئیں، جو مشہور عیسائی مبلغ ڈاکٹر فنڈر کے اصرار پر سر ولیم میور نے لکھی تھیں، میور کی شخصیت معمولی نہیں تھی، وہ صوبۂ متحدہ کے لفٹیننٹ گورنر تھے، اس کے ساتھ ساتھ عربی کے عالم بھی تھے، چنانچہ انھوں نے مشنریوں کے طریقۂ کار کے برخلاف عالمانہ سطح پر پیغمبر اسلام کے اخلاق و تعلیمات پر اعتراضات کئے تھے، اس تصنیف کا اثر عیسائی مبلغوں اور سرسید کی مذہبی حمیت پر کیا ہوا، اس کی تفصیل ہم حیات جاوید کے اوراق میں پاتے ہیں، کہ ادھر تو عیسائیوں میں مشہور تھا کہ اس کتاب سے اسلام کو شدید ضرب پہنچی ہے، دوسری طرف سرسید کی بے چینی اور اضطراب کا یہ عالم تھا کہ وہ اس کتاب کا

(بقیہ حاشیہ ص ۹۸) پیش نظر رکھئے، جہاں مذہب زندگی کی خاص قدر کی حیثیت رکھتا تھا، سرسید کا بچپن دلی کے دو مشہور خانوادوں کی بزرگ شخصیتوں کے درمیان گذرا، جو اسلام کی سچی تصویر مانی جاتی تھیں، مذہبی روشن خیالی انھوں نے اپنی مادر مہربان سے سیکھی، جو اوہام پرستی سے آزاد تھیں، سرسید نے تذکرہ کیا ہے، کہ آگے چل کر میں نے اپنی تحقیق و تفتیش سے اسلام کے بارے میں جو خیال قائم کئے، وہ میری والدہ کے خیال سے زیادہ مختلف نہیں تھے، بچپن میں سرسید نے مروجہ علوم کے اکتساب میں پوری توجہ صرف نہیں کی، لیکن ملازمت میں آنے کے بعد دلی کے دوران قیام انھوں نے اپنا زیادہ تر وقت مذہبی علوم کی دستگاہ بڑھانے میں صرف کیا، چنانچہ وہ عیسائی مشنریوں کے مقابلے کے

انگریز کہتے تھے کہ اسلام پر یہ حملے ہو رہے ہیں، اور مسلمانوں کو مطلق خبر نہیں ہے۔ انھوں نے ہندوستان میں اس کے جواب کی تیاری شروع کی، لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں دلی کے کتب خانوں کے برباد ہونے کی وجہ سے مطلوبہ کتابیں دستیاب نہیں ہو سکیں تو انھیں ولایت جانے کا خیال پیدا ہوا، دو ایک سال کے بعد انگلستان جانے کے اسباب پیدا ہو گئے۔ ان کے بعض دوستوں نے سر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنے سے باز رکھنا چاہا، لیکن انھوں نے ان کا کہنا نہیں مانا، اور ولایت پہونچتے ہی انڈیا آفس اور برٹش میوزیم کی لائبریریوں سے کتابیں اور ضروری معلومات حاصل کیں، سیرت کی عربی کتابیں مصر، فرانس اور جرمنی سے منگوائیں اور لیٹن اور انگریزی کی نایاب کتابیں لندن کے بازار سے گراں قیمت پر خریدیں۔ اپنے دوست نواب محسن الملک کو متعدد کئی خطوط میں ان مشکلات کی داستان سناتے ہیں، جو انھیں خطبات احمدیہ کے لکھنے کے دوران برداشت کرنی پڑیں،

"ان دنوں میں ذرا میرے دل کو سوزش ہے، ولیم میور صاحب نے جو کتاب آنحضرتؐ کے حال میں لکھی ہے، اس کو میں دیکھ رہا ہوں، اس نے مجھے جلا دیا، اور اُن کی ناانصافیوں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا، اور مصمم ارادہ کر لیا کہ آنحضرتؐ کی سیرت میں جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا کتاب لکھ دی جائے، اگر تمام

(بقیہ حاشیہ ص ۹۹) نتائج کو قبل از وقت محسوس کر رہے تھے، جن کی پوری کوشش یہ تھی کہ پیغمبر اسلامؐ کی سیرت پر حملے کر کے نئی تعلیم یافتہ نوجوان نسل کو ان کے مذہب سے برگشتہ کر دیا جائے، اور وہ، سے عقلیت، سائنس، تہذیب اور شائستگی کے منافی سمجھنے لگیں۔ سر ولیم میور کی کتاب لائف آف محمد اسی قسم کی ایک کوشش تھی، سر سید نے تحقیق و تفتیش کے ساتھ بارہ خطبات پر مشتمل بیشتر الزامات کا مدلل جواب لکھا، جو کتابی صورت میں خطبات احمدیہ کے نام سے انگلستان میں انگریزی زبان میں شائع ہوئی۔

روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے، قیامت میں تو یہ کہہ کر پکارا جاؤں گا کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد صلعم کے نام پر فقیر ہو کر مرگیا، حاضر کرو "ما را ہمیں تمغۂ شہنشاہی بس است" میں نے فرانس، جرمنی اور مصر سے کتب سیر منگانی شروع کر دیں، چٹھیات روانہ ہو گئیں، سیر ہشامی مطبوعہ اور چند کتابیں لیٹن کی خرید لیں، ایک آدمی مقرر کر لیا جو لیٹن کا ترجمہ کر کر مضمون بتلا سکے، تین مقدمات لکھنے شروع کر دیئے"۔[۱]

جب رسول کا والہانہ جذبہ عمل میں ڈھلتا ہے، اور مکتوب نگار کی پرجوش شخصیت ایک انگریز مصنف (سر ولیم میور) کے رسول اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ سے متعلق تعصبات اور ناانصافیوں کا محققانہ جواب دینے کی ہر ممکن سبیل نکالتی ہے، "اگر تمام روپیہ ختم ہو جائے اور میں بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے" "عشق مصطفےٰ" سے بریاں دل کسی قسم کی مزاحمت کو خاطر میں نہیں لاسکتا، تحقیقی کام محقق سے جس استغراق کا تقاضا کرتا ہے، وہی دھن مکتوب نگار پر طاری نظر آتی ہے، اس کے لکھنے میں جو ولولہ اور جوش سرسید کے دل میں تھا، اور جو مالی مشکلات اس دوران ان کو پیش آئی تھیں، ان کا اندازہ ان تحریروں سے ہوتا ہے،

"میں روز و شب تحریر کتاب سیرِ مصطفوی صلعم میں مصروف ہوں، سب کام چھوڑ دیا ہے، لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگتی ہے، ادھر فکر ترتیب مضامین کتاب اُدھر فکر جواب اعتراضات، ادھر فکر تنقیح و تصحیح روایات صحیح میں مبتلا رہتا ہوں اور کسی شخص کے مددگار نہ ہونے سے یہ کام اور بھی سخت ہو گیا ہے، اور دھر جب حساب دیکھتا ہوں تو جان نکل جاتی ہے، کہ ابھی لکھوانا اور چھپوانا تو شروع

---

[۱] خطوط سرسید ص ۴۸،

کردیا، روپیہ کہاں سے آئے گا مسلمان البتہ آستین چڑھا کر اس باب میں تو لڑنے کو تیار ہوں گے، کہ انگریزوں کے ساتھ کھانا مت کھاؤ، مگر جب کہو کہ مذہبی تائید میں کچھ روپیہ خرچ کرو تو جان بچاویں گے، اگر میری کتاب تیار ہو گئی جس میں دس باب ہیں، تو میں لندن میں آنا دس حج کی برابر اور باعث اپنی نجات کا سمجھوں گا[۱۵]" ذوق و شوق کے باوجود دقتیں مزاحم ہوتی ہیں، تو ایک خط میں یوں لکھتے ہیں:-

"میور صاحب کی کتاب کے جواب کا ساماں نہیں ہو سکا، ایک انگریزی خواں اور ایک طالب علم جو مقامات نشان دادہ کو کتب میں تلاش و نقل کر سکتا میرے ساتھ ہوتے، تو میں ایک برس میں اس کا جواب لکھ لاتا، اب نہیں ہو سکتا، مگر میں اس کے مختلف مقامات پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھ رہا ہوں، اور اسی کا نام مواعظ احمدیہ[۵۲] رکھا ہے، پہلا وعظ تیار ہو گیا، اس کا مضمون یہ ہے کہ مسلمانوں کی کتابوں میں معتبر و غیر معتبر اور صحیح و غلط روایتیں شامل ہیں، اور وہ اس قابل نہیں ہیں کہ انکی ہر ایک بات کو اصلی مذہب سمجھا جائے، پس جن لوگوں نے ہماری کتابوں کی روایتوں کو چن کر ہمارے مذہب پر یا ہمارے پیغمبر خدا صلعم کی نسبت الزام و اتہام دیا ہے وہ حماقت ہے، کیونکہ اول یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ روایت صحیح و معتبر بھی ہے یا نہیں[۵۳]"

اس کتاب کی تیاری میں وہ محنت شاقہ اور مالی مشکلات سے گذر رہے تھے اور دور دراز فاصلے کے باوجود مکتوب الیہ سے بڑے اعتماد کے ساتھ پوری امداد طلب کرتے ہیں اول انتخاب و تحریر مقامات کتب و تحقیق بعض مسائل کی" اور دوسرے مالی امداد کے لئے موثر ذرائع

---

[۵۱] خطوط سرسید ص ۲۴۲ ۔ [۵۲] خطبات احمدیہ کی طرف اشارہ ہے، پہلے اس کا نام مواعظ احمدیہ تجویز ہوا تھا، [۵۳] خطوط سرسید ص ۳۰۶،

اختیار کرنے میں ان کو اپنے مخاطب کی صلاحیت اور مستعدی کا اعتراف ہے ، اور ان سب سے بڑھ کر وہ دلی تعلق اور ذہنی قربت کا احساس ہے جس کی بدولت انگلستان اور ہندوستان کے درمیان فاصلہ سمٹ رہا ہے ، چنانچہ وہ اپنی ضرورت بیان کرتے ہیں ، ؎

" کم سے کم ڈھائی ہزار روپیہ صرف ہوگا ، آپ وہاں احباب مخلصین سے چندہ کیجیے ۔"

اسی طرح ایک دوسرے خط میں کتاب کی تیاری کے ضمن میں محسن الملک کو مشورہ دیتے ہیں کہ سو سو روپیہ احباب مخلصین سے چندہ لیا جائے ، بخیتہ تیس آدمی ہونے چاہئیں ، اس کے ساتھ ساتھ انھیں اپنے ہم قوموں کی تنگ دلی اور تنگ نظری کا خیال آتا ہے تو یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے ،

" مسلمان البتہ آستین چڑھا کر اس باب میں تو لڑنے کو تیار ہوں گے کہ انگریزوں کے ساتھ کھانا مت کھاؤ ، مگر جب کہو کہ مذہبی تائید میں کچھ روپیہ خرچ کرو تو جان بچا دیں گے ، اگر میری کتاب تیار ہوگئی جس میں دس باب ہیں ، تو میں لندن میں آنا دس حج کے برابر اور باعث اپنی نجات کے سمجھوں گا ، خدا قبول کرے ؎ (آمین)"

عصری زندگی کی دانش وبینش کے مطابق مکتوب نگار نے اسلامی عقائد کی توجیہ عقلیت کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے ، اور یہ ایک ہندوستانی مسلمان کی ایسی کامیاب کوشش ہے کہ جس پر اسے بجا طور پر اعتماد ہے ،

" اب میرا حال سنئے ، مواعظ احمدیہ لکھنے میں شب و روز مصروف ہوں ، اس کے سوا اور کچھ خیال نہیں ، جاناً آناً مناً جناب بند ہے ، آنحضرت صلعم کے بارہ برس

؎ خطوط سرسید ص ۴۲ ،

کی عمر تک کا حال لکھا تھا اور سر ولیم میور صاحب اور اور مصنفوں نے یہاں تک کے
حال پر جو کچھ لکھا ہے سب کے ایک ایک حرف کا جواب لکھا ہے، مگر ایسا جواب
نہیں ہے جیسا کہ تمہارے یہاں کے ملاں مشرکین فی صفۃ النبوۃ دیتے ہیں، نہایت
محققانہ جواب ہیں[۵۱] اور یہ شرط ہے کہ کسی شخص کے آگے ڈال دو، وہ کیسا ہی بےدین
کیوں نہ ہو، اگر وہ کہے کہ ہاں نہایت سچ اور انصاف کا جواب ہے تو میرا
نام، ورنہ میرا نام ہی نہیں، اپنی تحریر کو آپ ہی دیکھتا ہوں اور خوش ہوتا
ہوں کہ بیان سے باہر ہے"[۵۲]

سرسید کو اس کا احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے بعض مسائل میں جمہور سے اختلاف
کیا ہے جس کی بنا پر ان کے ہم قوم انھیں کافر کا خطاب عطا کریں گے لیکن انھیں اپنے خیالات
پر اعتماد ہے، چنانچہ وہ یہ اعلان ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلام کی صحیح اسپرٹ کو سمجھنے کے لئے
نظر میں کشادگی ضروری ہے، اور یہ نظر حریت فکر کے ذریعہ پیدا ہو سکتی ہے، چنانچہ وہ پھر
محسن الملک کے سامنے کھلے طور پر اپنا موقف بیان کرتے ہیں:

"بھائی جان سنو! اب وقت آ گیا ہے کہ میں اپنی مکنونات ضمیر کو مخفی
نہ رکھوں، میں صاف کہتا ہوں کہ اگر لوگ تقلید نہ چھوڑیں گے، اور خاص

---

[۵۱] خطبات احمدیہ ہندوستان سے باہر اسلامی دنیا میں کس طرح سر آنکھوں پر لئے گئے، وہ
مکتوب نگار کی شب و روز محنت کا صلہ بن جاتا ہے، جسے سرسید ان الفاظ میں بیان کرتے
ہیں "میری کتاب خطبات احمدیہ ایک مسلمان عالم مصر نے پڑھی، جو قسطنطنیہ سے یہاں آیا ہے'
وہ الفاظ کہ اس نے کہے اور مجھے لکھے، اور جس طرح میرے ہاتھ چومے، اس کی لذت میں جانتا
ہوں۔ [۵۲] خطوط سرسید ص ۴۶

اس روشنی سے جو قرآن اور احادیث صحیح سے حاصل ہوتی ہے تلاش نہ کریں گے اور حال کے علوم سے مذہب کا مقابلہ نہ کریں گے تو مذہب اسلام ہندوستان سے معدوم ہو جائیگا، اسی خیر خواہی نے مجھے برانگیختہ کیا ہے جو میں ہر قسم کی تحقیقات کرتا ہوں اور تقلید کی پرواہ نہیں کرتا،[۱] ورنہ آپ کو خوب معلوم ہے کہ میرے نزدیک مسلمان رہنے کیلئے اور بہشت میں داخل ہونے کیلئے ائمہ کبار تو درکنار مولوی جبو کی بھی تقلید کافی ہے۔"[۲]

سرسید اپنے اس خیال پر بار بار زور دیتے ہیں کہ حقیقت کی دریافت تقلید کے بجائے تحقیق کے ذریعہ ممکن ہے اس طرح وہ آزادانہ طور سے سوچنے اور سائنسی نقطۂ نظر کو اپنانے کی وکالت کرتے ہیں، انکا یہ تحقیقی ذوق روایت شکنی کا نتیجہ ہے، آگے چل کر اسی رجحان سے وہ انقلابی خیالات پیدا ہوئے جنھوں نے افراد قوم کو آزادی رائے کا عادی بنایا، محسن الملک کے نام ایک خط میں وہ اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کرتے نظر آتے ہیں،

آپ خفا ہوں یا نہ ہوں میں سچ اپنے دل کا حال کہتا ہوں کہ اگر خدا مجھے ہدایت نہ کرتا اور تقلید کی گمراہی سے نہ نکالتا اور میں خود تحقیقات حقیقت اسلام پر متوجہ نہ ہوتا تو یقینی مذہب کو چھوڑ دیتا، فرض کرو کہ تقلید چھوڑنے میں میں کسی مسئلہ یا عقیدے میں غلطی میں پڑوں چنداں نقصان نہ ہوگا، مسلمان تو رہونگا، کیا آپکے نزدیک امام اعظم علیہ الرحمہ نے کسی مسئلہ میں غلطی نہیں کی، قیامت کے دن جب خدا تعالیٰ مسلمان تیلی، جولاہوں، ناخواندہ یا کم علم مسلمانوں کو سزا دینے لگے گا تو بندہ سامنے ہو کر عرض کریگا کہ جناب باری انصاف فرمائیے ان بیچاروں کا کیا قصور ہے یہ تو حضور خود بدولت ہی کی تقصیر معلوم ہوتی ہے کہ ان کو ایسا مذہب دیا تھا کہ جسکے حل کرنے اور سمجھنے میں جناب قبلہ و کعبہ مولوی سید مہدی علی صاحب

۱؎ تقلید سے گریز کرکے عقل پسندی کا رجحان انیسویں صدی کے یورپ کی خاص آواز تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ حقیقت تک رسائی اور اسکے ادراک کا سب سے بڑا ذریعہ اور معیار عقل ہے، یورپ کے مفکرین اور ادیبوں کے انہماک اور دلچسپی کی بدولت یہ کچھ عرصہ کیلئے یورپ کے ذہن و فکر کی سب سے بڑی کلید بن گئی، اور جب یہ سوغات یورپ سے ہندوستان آئی تو یہاں بھی اسکا غیر معمولی اثر ہوا اور سرسید اور انکے رفقاء نے خاص طور سے اسکو اپنایا (ماخوذ از سرسید اور ان کے نامور رفقاء، ڈاکٹر سید عبداللہ ص ۵)

۲؎ خطوط سرسید ص ۵۶

جگہ گوشۂ رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی اپنے تئیں لائق نہیں سمجھتے تھے۔[1]

اس اثنا میں جب مکتوب الیہ کا پیغام پہونچتا ہے کہ وہ عقل اور نیچر کی ہمہ گیر اویت کے نظریے کے حامی ہیں تو آپ اس بحث کو ایک خوش آیند مستقبل کی امید میں ان الفاظ میں تمام کرتے ہیں

جناب قبلہ و کعبۂ من، جب آپ نے یہ قبول کر لیا کہ اسلام و عقل و نیچر میں مخالفت نہیں تو کام پورا ہو گیا۔ اب ہم آپ کی بہادری دیکھیں گے کہ کیونکر تقلید کو تھامے رہتے ہو اور اس کو لازم ٹھہراتے ہو۔[2]

نئے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قوم کی صحیح تعلیم و تربیت کا خیال مکتوب نگار کے ذہن میں موجود ہے لیکن انگریزی تعلیم کے فوائد اہل وطن پر اب تک واضح نہیں ہو سکے جس پر اسے جھنجھلاہٹ محسوس ہوتی ہے۔ محسن الملک جب مدرسۂ عربی مقرر کردہ جناب محمد سمیع اللہ خاں صاحب کے قیام کے لیے اخبار سوسائٹی میں اپیل نکالتے ہیں اور وہ سرسید کی نظر سے انگلستان میں گذرتی ہے تو وہ اسے تباہی کا پیش خیمہ قرار دیتے ہیں۔ انہیں رہ رہ کر اس چیز کا غم ہے کہ قوم اس نزاکت کو ادراک کرنے سے ابتک گریز کر رہی ہے کہ تعلیم و تربیت کے صرف پرانے نظام کو برقرار رکھنے اور اس پر اکتفا کرنے سے معاشرے کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا کیونکہ یہ نظام تربیت انکی زندگی کے موجودہ مسائل کو حل کرنے سے قاصر ہے۔

"ایسے ایسے مدرسوں سے کوئی فائدہ نہیں ہے، افسوس کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبے جاتے ہیں اور کوئی ان کو نکالنے والا نہیں ہے۔ ہائے افسوس امرت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں۔ ہائے افسوس ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں۔ اے بھائی مہدی! کچھ نہ کرو اور یقین جانو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آگیا ہے۔ اب

---

[1] خطوط سرسید ص ۶، [2] ایضاً ص ۶

ڈوبنے میں بہت ہی کم فاصلہ باقی ہے۔ اگر تم یہاں آتے تو دیکھتے کہ تربیت کس طرح ہوتی ہے۔ اور تعلیم اولاد کا کیا قاعدہ ہے اور علم کیونکر آتا ہے، اور کس طرح پر کوئی قوم عزت حاصل کرتی ہے۔[۱]"

غم اور مایوسی کے ان الفاظ کے پس پردہ وہی خواہش سر اٹھاتی محسوس ہوتی ہے کہ قوم کو زمانے کی تبدیلیوں کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے انداز نظر کو بدلنا ناگزیر ہے۔ سرسید علوم عربیہ اور مذہبی تعلیم کے مخالف نہیں تھے، یہ تنقید قدیم طرز کے عربی مدارس پر تھی۔ چنانچہ آگے چل کر وہ ۱۸۸۹ء میں عماد الملک کو لکھتے ہیں۔

"اسی کے ساتھ یہ تدبیر بھی چاہتا ہوں کہ علوم عربیہ اور درس کتب مذہبی جو معدوم ہوتا جا رہا ہے کسی طرح قائم رہے، اگر عربی و فارسی ہم میں سے معدوم ہو جاوے گی، تو اسی کے ساتھ ہماری قومیت بھی معدوم ہو جاوے گی۔[۲]"

ہندو قوم میں اپنی زبان اور کلچر کے تحفظ کا احساس چھپ رہا تھا۔ جو نئے عہد کی بیداری کا اعلان تھا لیکن ان حالات میں وقت اسوقت پیش آتی ہے جب ایک زبان کا مفاد دوسری زبانوں کے مفادات سے ٹکرانے لگے۔ ۲۹ اپریل ۱۸۷۰ء کو سرسید محسن الملک کو انگلستان سے ایک خط میں حال ہی میں رونما ہونے والے ایک واقعہ پر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں جو اردو کے رسم الخط سے متعلق ہے۔

ایک اور خبر ملی ہے جس کا مجھکو کمال رنج اور فکر ہے کہ بابو شیو پرشاد صاحب کی تحریک سے عموماً ہندوؤں کے دلوں میں جوش آیا ہے کہ زبان اردو و خط فارسی کو جو مسلمانوں کی نشانی ہے، مٹا دیا جائے۔ میں نے سنا ہے کہ انھوں نے سینٹیفک سوسائٹی کے ہندو ممبروں سے تحریک کی ہے کہ بجائے اخبار اردو کے ہندی میں ہو۔ یہ ایک ایسی ترکیب ہے کہ ہندو

---

[۱] خطوط سرسید ص ۵۰ [۲] سرسید احمد خان خلیق احمد نظامی سالار جنگ کے نام سرسید کا خط ص ۱۰۹

مسلمانوں میں کسی طرح اتفاق نہیں رہ سکتا۔ مسلمان ہرگز ہندی پر متفق نہ ہوں گے اور نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ ہندو علیحدہ اور مسلمان علیحدہ ہو جائیں گے۔[1]

آگے چل کر سرسید جو کچھ خط میں تحریر کرتے ہیں وہ ان کے مافی الضمیر کی وضاحت کرتا ہے، اول تو یہ کہ وہ ہندو اور مسلمان دونوں کی بھلائی کے خواہاں ہیں۔ دوسرے انھیں اپنے ہم مذہبوں کی ذہنی پستی اور بے حسی کا بھی پورا اندازہ ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں معاشی اور سماجی اعتبار سے بہت پیچھے ہیں۔ وہ جھوٹے اور لغو تعصب میں مبتلا ہیں۔ حسد، کینہ، جھوٹی شیخی اور مفلسی بربادی کے تمام سامان انکے سروں پر مسلط ہیں، چنانچہ وہ اپنی بھلائی کے لئے کوئی اقدام کرنے سے قاصر ہیں۔ ایسی صورت میں ان سے اپنے مفاد کے تحفظ کی کیا امید کی جا سکتی ہے۔ قومی دردمندی کا یہ جذبہ مکتوب نگار کو کسی کل چین نہیں لینے دیتا۔ وہ اپنی قوم کی ہر کمزوری کو تنقید کا نشانہ بناتا ہے، اور کمزوریوں کو چن چن کر ان کی آنکھوں کے سامنے لاتا ہے۔ خود وہ بھی گالیوں کا نشانہ بنتا ہے لیکن اصلاح کی خواہش اسے قوم کو بیداری کا پیغام دینے پر مجبور کرتی ہے۔ چنانچہ اگلے خط میں وہ مکتوب الیہ کے اس احتجاج پر کہ ایک ہم وطن (بابو شیو پرشاد) نے مسلمانوں کے بارے میں سخت کلمات ادا کیے ہیں۔ سرسید بظاہر اثر نہیں لیتے۔ بلکہ اسے اپنی قوم کی کمزوریوں کا نتیجہ گردانتے ہیں البتہ صورت حال کے مطابق وہ اصلاح کا ایک نیا نسخہ تجویز کر کے مکتوب الیہ کو متحیر اور مسرور بناتے ہیں۔ یہ ہے تہذیب الاخلاق جاری کرنے کا عزم جو ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء کو پہلی بار شائع ہوا اور انگلستان سے حاصل کیے ہوئے تجربوں یعنی شائستگی اور تہذیب اور تعلیم و تربیت کے قانون کو اپنے معاشرے میں عام کرنے کا ایک آرگن ہاتھ آیا۔ محسن الملک کو اطلاع دیتے ہیں۔

میرے خیال میں آپ بابو شیو پرشاد صاحب کا جواب جس کے چھاپنے سے راجہ

---

[1] خطوط سرسید ص ۶۶۔

پے کشن داس بہادر نے انکار کیا کسی اخبار میں چھپوا دیئے۔ اس باب میں میں نے بہت کچھ خیال کیا ہے اور آپ سے بہت کچھ کہنا اور اصلاح کرنی ہے۔ اس کے بعد جیسا مناسب ہوگا کیا جاوے گا، ایک اخبار خاص مسلمانوں کے لئے جاری کرنا میں نے تجویز کر لیا ہے۔ اور تہذیب الاخلاق اس کا نام فارسی اور اردو میں محمڈن سوشل ریفارمر رکھ لیا ہے۔ اس کا سرنامہ بہت خوبصورت یہاں کھدوا لیا ہے۔ کاغذ بھی ایک برس کے لائق یہاں خرید لیا ہے، اور یہ سب چیزیں یہاں سے بذریعہ بادبانی روانہ کر دیں کہ میرے وہاں پہونچنے تک پہونچ جاویں گی، خرچہ ماہواری اجراء اس اخبار کا سو روپیہ ہوگا۔ ہم بیس دوست پانچ پانچ روپے مہینے کر کر دیں گے۔ اور اخبار مفت میں بانٹیں گے اور یہ قیمت بھی بیچیں گے۔ اس اخبار میں بجز اسکے کہ خاص مسلمانوں کے دینی اور دنیاوی بھلائی کے آرٹیکل لکھنے والے ہونگے اور کچھ نہیں ہونے کا اس میں میں اور آپ دو شخص آرٹیکل لکھنے والے ہونگے اور اگر صلاح ہوئی تو منشی ذکاء اللہ صاحب اور منشی نجم الدین صاحب کو بھی آرٹیکل لکھنے میں شریک کریں گے“۔[1]

اسلام کی محبت اور حمایت میں سرسید کو جو جوش اور جذبہ انگلستان میں خطبات احمدیہ کی ترتیب وتنقیح اور تصحیح کی صبر آزما محنت سے گذارتا ہے اور جس کے اختتام پر انکے اندر مذہبی تحقیق کا ذوق پروان چڑھتا ہے۔ اسی قسم کی ذہنی اور روحانی مسرت کا احساس انھیں مشہور عالم پروفیسر آرنلڈ کی کتاب پریچنگ آف اسلام کی شاعت پر ہوتا ہے وہ اس کتاب کو کسقدر اہمیت دیتے ہیں اور قوم کی زیر تعلیم نئی نسل کیلئے اس کا مطالعہ کیوں ضروری قرار دیتے ہیں، اسکی بابت ۹ مئی ۱۸۹۶ء کے اس خط میں دیکھئے جو مولوی نیاز محمد خاں وکیل پنجاب کے نام ہے۔

---

[1] خطوط سرسید

"آپ کو معلوم ہوگا کہ مسٹر ٹی ڈبلیو آرنلڈ صاحب مدرسۃ العلوم علی گڈھ کے پروفیسر نے انگریزی زبان میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام پریچنگ آف اسلام ہے۔ اور اس کا مقصد یہ ہے کہ "اسلام بزور شمشیر نہیں شائع ہوا ہے، بلکہ وعظ و نصیحت سے زیادہ تر شائع ہوا ہے" عزیزی محمد عنایت اللہ بی اے نے اس کتاب کا ترجمہ اردو میں کیا ہے، اور میں خود اس ترجمے کا اصل کتاب سے مقابلہ کرتا ہوں۔ اور اس سبب سے مجھے اس کتاب پر زیادہ غور کرنے کا موقع ملا ہے، اور میں اس کتاب کو مسلمانوں کے لیے زیادہ مفید سمجھتا ہوں، میری اور میرے چند دوستوں کی یہ رائے ہے کہ مسلمان انگریزی خوان طالب علم جو گورنمنٹ کالجوں اور مشنری کالجوں میں پڑھتے ہیں، انکو یہ انگریزی کتاب بلا قیمت دی جاوے۔ یعنی مسلمان ہر ایک مقام کے چند کاپیاں اس کتاب کی خریدیں اور مسلمان طالب علموں کو جو کالج کلاسوں میں پڑھتے ہوں ان کو بلا قیمت تقسیم کر دیں، غرض یہ ہے کہ اس کتاب کا مسلمان انگریزی خوان طالب علموں میں شائع ہونا نہایت مفید ہے، اور بہت سے تاریخی حالات متعلق اسلام اور اشاعت اسلام اور نیز بہت سے مفید امور انکو معلوم ہونگے۔"[1]

ہم متعدد خطوط میں دیکھ چکے ہیں کہ مذہبی امور و مسائل پر بحث و مباحثہ سرسید کا مرغوب موضوع ہے، لیکن صرف اسوقت تک جب ان مسائل پر گفتگو کرنے سے کسی بہتر نتیجہ تک پہونچنے کی امید ہو۔ مرزا غلام احمد قادیانی کے مذہب کے خلاف پنجاب میں زبردست شورش ہو رہی تھی، سرسید اس قسم کے احتجاج اور اس سے پیدا شدہ فتنہ و فساد کو محض تضیع اوقات قرار دیتے ہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں مولوی میر حسن کے نام ایک خط میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

---

[1] خطوط سرسید ص ۲۳۹۔

"مرزا غلام احمد قادیانی صاحب کے لوگ کیوں پیچھے پڑے ہیں، اگر ان کے نزدیک ان کو الہام ہوتا ہے تو بہتر۔ ہم کو اس سے کیا فائدہ نہ ہمارے دین کے کام کا ہے، نہ دنیا کے۔ ان کا الہام ان کو مبارک رہے، اگر نہیں ہوتا اور صرف ان کے توہمات اور خلل دماغ کا نتیجہ ہے تو ہم کو اس سے کیا نقصان ہے، وہ جو ہوں سو ہوں اپنے لئے ہیں۔ میں سنتا ہوں کہ آدمی نیک بخت اور نمازی پرہیزگار ہیں یہی امر انکی بزرگداشت کو کافی ہے جھگڑا اور تکرار کس بات کا ہے۔ ان کی کتابیں میں نے دیکھیں۔ وہ ایسا ہے جیسے انکا الہام۔ نہ دین کے کام کی نہ دنیا کے کام کی۔ حکیم مولوی نورالدین احمد صاحب کی کوئی تحریر میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ دینیات میں کسی کا الہام جب تک اسے شارع تسلیم نہ کر لیا جائے کسی کام کا نہیں[۵۸]"

مذہبی، معاشرتی اور تعلیمی مسائل کو حل کرنے میں سرسید ایک وسیع نقطۂ نظر اپنانے کے حق میں ہیں، جو روایت پرستی کے خلاف ایک بڑا چیلنج بن جاتا ہے۔ انکا یہی اندازِ نظر اردو ادب کے دائرے میں نئے میلانات اور رجحانات کے لئے راہیں متعین کرتا ہے، اجتماعی اور افادی اہمیت کے پیشِ نظر وہ ادب کے پرانے تصور کو مسترد کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ادب بیکاروں کا مشغلہ نہیں تھا اس لئے لفظی بازیگری کے بجائے ادیب کو اس طرف توجہ دینی چاہئے کہ "جو لطف ہو وہ مضمون کے ادا میں ہو، جو اپنے دل میں ہو، وہی دوسروں کے دل میں پڑے۔ دل سے نکلے دل میں بیٹھے" اسی طرح ان کے نزدیک "فن شاعری بدجذبات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ضد حقیقی تہذیب الاخلاق کے ہیں۔" چنانچہ پرانی اردو شاعری کی بڑی کمزوری ان کی نظر میں یہی تھی کہ اس میں فطرتی جذبات کی کمی تھی، جب کہ اسے انسانی طبیعت اور نیچر کا قدرتی اظہار

---

[۵۸] خطوط سرسید احمد

بننا چاہیے۔ لاہور میں محمد حسین آزاد انجمن پنجاب[1] کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے جلسہ میں نیچرل شاعری کی اہمیت کو باور کراتے ہوئے اس امر پہ زور دیتے ہیں کہ قدیم رنگ کو ترک کرکے ایسی نظمیں کہی جائیں جو فطرت کے مطابق ہوں۔ آزاد نے انجمن کے جلسہ میں اپنی مثنوی خواب امن سنائی تھی۔ جس کی نقل انھوں نے سرسید کی خدمت میں روانہ کی۔ اس کی رسید دیتے ہوئے سرسید شاعری کے اس جدید رجحان پر اظہار مسرت کرتے ہوئے اپنے نقطۂ نظر کو مزید واضح کرتے ہیں:

> "میری نہایت قدیم تمنا اس مجلس مشاعرے سے بر آئی ہے۔ میں مدت سے چاہتا تھا کہ ہمارے شعرا نیچر کے حالات کے بیان پر متوجہ ہوں، آپ کی مثنوی "خواب امن" پہونچی۔ بہت دل خوش ہوا۔ اور حقیقت شاعری اور زور سخنوری کی داد دی ہے، اب بھی اس میں خیالی باتیں بہت ہیں۔ اپنے کلام کو اور زیادہ نیچر کی طرف مائل کرو جس قدر کلام نیچر کی طرف مائل ہوگا۔ اتنا ہی مزہ دے گا۔ اب لوگوں کے طعنوں سے مت ڈرو ضرور ہے کہ انگریزی شاعروں کے خیالات لے کر اردو زبان میں ادا کیے جاویں، یہ کام ہی ایسا مشکل ہے کہ کوئی کر تو دے۔ ابھی تک ہم میں خیالات نیچر کے ہیں ہی نہیں، ہم بیان کیا کر سکتے ہیں"[2]

مولانا حالی کی مشہور و معروف مسدس مد و جزر اسلام کو پہلی بار دیکھ کر بھی انھوں نے شعر کے اندر صفائی، خوبی، روانی کے ساتھ ساتھ تاثیر کی بھی شرط لگائی تھی، جو دل سے نکلتی ہے،

---

[1] ۹ اپریل ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان جلسہ منعقد ہوا جس میں انگریز افسران میں کرنل ہالرائڈ، مسٹر جسٹس بوبینو چیف کورٹ، مسٹر تھارنٹن سکریٹری پنجاب گورنمنٹ، کرنل ملاگن، مسٹر بیگ کمشنر فرہنگ اور بسنت ڈپٹی کمشنر لاہور تھے، ہندوستانی ادبی شخصیتوں میں پیارے لال آشوب، مولوی سید احمد دہلوی مصنف آصفیہ، مولوی کریم الدین، منشی درگا پرشاد نادر اور پنڈت من پھول تھے، اس میں محمد حسین آزاد نے اپنا مشہور خطبہ جدید شاعری کی حمایت میں دیا تھا۔ [2] خطوط سرسید احمد خان ص ،۔

اور دل میں بیٹھتی ہے، اور اس لحاظ سے مسدس حالی کو اردو شاعری کی تاریخ جدید قرار دیا تھا۔

عنایت نامجات مع پانچ جلد مسدس پہونچے جس وقت کتاب ہاتھ میں آئی جب تک ختم نہ ہولی ہاتھ سے نہ چھوٹی اور جب ختم ہو گئی تو افسوس ہوا کہ کیوں ختم ہو گئی، اگر اس مسدس کی بدولت فن شاعری کی تاریخ جدید قرار دی جائے تو بالکل بجا ہے۔ کس صفائی، خوبی اور روانی سے یہ نظم تحریر ہوئی ہو کہ بیان سے باہر ہے، تعجب ہوتا ہے کہ ایسا واقعی مضمون جو مبالغہ، جھوٹ، تشبیہات دور از کار سے جو مایۂ ناز شعرا و شاعری ہے بالکل مبرا ہے، کیونکر ایسی خوبی اور خوش بیانی اور موثر طریقے پر ادا ہے، متعدد بند اس میں ایسے ہیں جو بے چشم نم نہیں پڑھے جا سکتے، حق ہے جو دل سے نکلتی ہے دل میں بیٹھتی ہے،،

حالی کی اس مسدس کی اصل قدر و قیمت مکتوب نگار کی نظر میں کیا ہے اسی خط کے آخری حصہ سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔

"بیشک میں اس کا محرک ہوا اور اس کو میں اپنے ان اعمال حسنہ میں سے سمجھتا ہوں کہ جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا میں کہونگا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں۔"[1]

ان خطوط میں سرسید کی پر جوش، با ہمت اور جری شخصیت عکس ریز ہے، یہ افکار خطوط غالب کے متنوع تجربات سے مختلف ہیں کہ اس میں قوم کے دکھ درد اور اقتصادی و معاشرتی زبان کا احساس پورے طور سے چھایا ہوا ہے، یہاں ہمیں مذہبی حقائق کی تفتیش اور قوم کے غلط تعصبات کو دور کرنے کی سعی نظر آتی ہے، ان خطوط میں برطانیہ کی سرزمین، اس کی تہذیب و تمدن، اس کی تعلیم، صنعت و حرفت سے متعلق صدائے تحسین و آفرین بھی ملتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی اگر ہم غیر جانبداری کے ساتھ دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ مکتوب نگار اپنی بیمار قوم کی صحت یابی کیلئے

---

[1] خطوط سرسید۔ ص ۱۲۵-۱۲۶

معاشرے کے سامنے ایک ترقی یافتہ نظام حیات کو بطور مثال پیش کرکے اسے عمل اور جدوجہد کی تلقین کرتا ہے، اس کے مذہبی، معاشرتی اور تعلیمی افکار کی قوت کے ساتھ مخالفت ہوئی، لیکن اس کے باوجود ان خیالات کے پس پردہ جو اسپرٹ کارفرما تھی۔ اس کی صداقت کو تسلیم کیا گیا۔ سرسید کے ان خطوط میں اس ان تھک جدوجہد کی ہنگامہ خیزیوں کی روئداد ملتی ہے جو انھوں نے مصلح، مجدد اور قائد کی حیثیت سے جاری رکھی۔ ان کی جری اور مستعد شخصیت نے قومی بیداری کا جو منظم منصوبہ بنایا تھا اس کے لیے انھوں نے مغرب کی تہذیب و تمدن کی خوبیوں کو اپنانے کی وکالت ضرور کی تھی لیکن وہ مذہب اسلام اور رسول اکرمؐ سے والہانہ عشق رکھتے تھے، جس کے نتیجے میں انھوں نے انگلستان کی زندگی کی رنگینیوں اور عیش و طرب سے منہ موڑ کر "خطبات احمدیہ" جیسی تصنیف اسی سرزمین فرنگ پر مکمل کی۔ اس طرح انیسویں صدی کے ربع آخر میں تحریر کیے ہوئے یہ خطوط اپنے عصر کی ذہنی تبدیلیوں اور مسلمانوں کی تحریک تعلیم کے ابتدائی مرحلہ ہائے تب و تاب نیز مذہبی امور میں مکتوب نگار کی مجددانہ رایوں اور اردو ادب اور شاعری سے متعلق ان کے مطمح نظر کو قطعیت کے ساتھ واضح کرتے ہیں۔

الواح الصّنادید

از

پروفیسر ڈاکٹر محمد اسلم صاحب شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور

راقم الحروف نے ۱۹۵۳ء سے مشاہیر کی قبروں کے کتبے نقل کرنے شروع کئے تھے، اور اس دوران میں کئی بار یہ خیال آیا کہ انھیں قسط وار کسی علمی و ادبی مجلہ میں شائع کرا دوں لیکن جب بھی انھیں مضمون کی شکل میں ترتیب دینے کا ارادہ کیا، تو کوئی نہ کوئی رکاوٹ پیش آگئی، اب اس کو مکمل کرکے رسالہ معارف کی نذر کیا جا رہا ہے،

شادمان کالونی لاہور میں سرکاری ملازموں کی رہائشی کالونی[1] سے ملحق ایک چھوٹا سا قبرستان ہے جو ایک بزرگ شیر شاہ ولی کے نام سے منسوب ہے، اس قبرستان کے پاس سے رات دن ہزاروں انسان گذر جاتے ہیں لیکن ان میں سے شاید ہی کسی کو معلوم ہوگا کہ یہاں کیسی ایسی ہستیاں محو خواب ابدی ہیں جن کی زندگیاں بڑی ہنگامہ خیز گذری ہیں،

قبرستان کی شمالی دیوار کے ساتھ ہی ایک چھتری کے نیچے السنۃ الشرقیہ کے کے عالم بے بدل مولوی محمد شفیع، پرنسپل یونیورسٹی اورنٹیل کالج لاہور دفن ہیں، ان کی لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے :۔

---

[1] یہ کالونی .G.O.R. III کے نام سے مشہور ہے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یا ایتہا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ

آخری آرامگاہ

پروفیسر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم ومغفور

دہر دوراں کم آورد فرزند　　چو محمد شفیع دانش مند

آں بفضل و بہ معرفت مشہور　　وآں مبرا ز نخوت و غرور

خاک لاہور راز وفرزانہ شرف　　پدر فضل را بہینہ خلف

ادب از خامہ اش بجلوہ گری　　فرد و مغلق سبتازی و بدری

(از آقا بدیع الزمان فروزانفر، دانشمند شہر ایران)

تاریخ ولادت ۲ر اگست ۱۸۸۳ء مطابق ۲ر شوال سنہ ۱۳۰۰ھ،

تاریخ وفات ۱۴ر مارچ ۱۹۶۳ء مطابق ۱۸ر شوال ۱۳۸۲ھ

مولوی محمد شفیع کے مزار سے جانب غرب اندازاً پچاس میٹر کے فاصلہ پر نئے ڈیزائن کی ایک خوبصورت عمارت[1] کے نیچے ڈاکٹر تصدق حسین خالد آرام فرما ہیں، موصوف آزاد شاعری کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی رفیقہ حیات بیگم سلمیٰ تصدق نے تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، موصوفہ اپنے شوہر کی قبر سے قریب ایک مسجد تعمیر کرا رہی ہیں جو ام المومنین خدیجۃ الکبریٰؓ کے نام نامی سے منسوب ہے، مسجد سے ملحقہ عمارت میں عائشہ اکیڈمی اور مستقبق زینب کے نام سے ایک علمی ادارہ اور ایک فری ہسپتال قائم ہو چکے ہیں، ڈاکٹر صاحب کی لوح مزار پر یہ عبارت منقوش ہے۔

---

[1] یہ عمارت پانی پت میں خواجہ الطاف حسین حالی کے مقبرہ کی عمارت سے ملتی جلتی ہے۔

آخری آرامگاہ

الحاج ڈاکٹر میاں تصدق حسین خالد

ایم اے۔ پی ایچ ڈی، بارایٹ لا،

وطن مالوف :- بٹالہ

ولادت :- ۲ر فروری ۱۹۰۱ء (پشاور)

وفات :- ۱۳ر مارچ ۱۹۷۱ء (لاہور)

قبر کے تعویذ پر ان کی ایک آزاد نظم شب بخیر کندہ ہے، اس نظم کا آغاز یوں ہوتا ہے،

شب بخیر

تشنہ کامانِ سرود
ایک میٹھی نیند، میٹھے خواب
تم سب کے نصیب
ختم ہوتی ہے نوائے چنگ و نے
جو مجھے تھوڑا بہت کہنا تھا میں نے کہہ دیا،
شعلۂ خس دیدہ بھڑکا اور بھڑک کر رہ گیا،
ہاں مگر
وہ امر جوتی ۔ محبت کی ایک،
بجھ نہیں سکتی ہوائے دہر سے،
شب بخیر۔ خالد

تعویذ کے دائیں جانب یہ عبارت کندہ ہے:-

راز ہی راز ہے حیرت کدۂ بزمِ نمود یہ تماشا گہہِ عالم کیا ہے

(خالد)

تعویذ کے بائیں جانب یہ عبارت منقوش ہے،

بارگاہِ قدس میں آیا ہوں بے آشامِ ذوق

خالد

تعویذ کے پائنتی یہ مصرع لکھا ہوا ہے ع

زندگی سوئی ہے آرام کی نیند

خالد

اسی قبرستان کے جنوبی سرے پر شیر شاہ ولی کے گنبد کے قریب ایک مختصر سے احاطۂ قبور میں برعظیم[1] پاک و ہند کے نامور عالمِ دین مولانا محمد ادریس کاندھلوی[2] محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ مولانا کاندھلوی کے علمی پایہ کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے تلامذہ میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی، سید اسعد مدنی اور مولانا محمد یوسف بنوری جیسے اساطینِ علم کے نام آتے ہیں۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی لوحِ مزار پر یہ عبارت کندہ ہے

---

[1] Sub-Continet کا صحیح ترجمہ برعظیم ہے، نہ کہ برصغیر

[2] مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے فرزند محمد میاں صدیقی نے تذکرہ مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے عنوان سے ان کے سوانح حیات شائع کر دیئے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(قد) قال اللہ جل حکمہ وسلام علیہ (ابداً) یوم ولد ویوم یموت ویوم یبعث حیا

سنہ ۱۹۷۴ء

مرقد مبارک

استاذ العلماء حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ

تاریخ وصال یکشنبہ ۸ رجب ۱۳۹۴ھ مطابق ۲۸ جولائی ۱۹۷۴ء

وائے عارف بود ہنگام سحر عالم خراب
رفت آں مہتاب دیں قبل طلوع آفتاب

۴۸۰ - ۵۱ - ۴۲۸ - ۶۴ - ۱۳۲ - ۱۱۵ - ۴۸۴

۱۹۷۴ء

میانی صاحب[1] لاہور کا سب سے بڑا قبرستان ہے، اور یہ کئی خطوں میں منقسم ہے، اس کا ایک (خطہ) نظام شاہ کے نام کی رعایت سے احاطۂ نظام شاہ کہلاتا ہے، اس خطہ میں بڑے نامی (گ)رامی شاعر، ادیب، صحافی اور سیاستدان مدفون ہیں، ان مشاہیر کی قبروں کو دیکھ کر ذہن (فور)اً اس مصرع کی طرف مبذول ہوجاتا ہے، ع

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

احاطۂ نظام شاہ میں اقبال (ر)ومی کے شارح اور ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور کے (با)نی اور علی گڑھ کے پروفیسر ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم محو خواب ابدی ہیں، ان کی لوحِ مزار پر چاند تارا منقوش ہو

[1] اس قبرستان کے وسط میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خلیفہ اور ان کے صاحبزادوں کے استاد شیخ محمد طاہر لاہوری علام (متوفی ۱۰۴۰ھ/۱۶۳۰ء) دفن ہیں، انہی کی وجہ سے اس قبرستان کو شہرت ملی،

اور اس کے نیچے یہ عبارت کندہ ہے،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرحمٰن. علّم القرآن خلق الانسان علمہ البیان.

آرامگاہ

فیلسوف علامہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم غفرلہ اللہ

متوفی ۳۰ جنوری ۱۹۵۹ء مطابق ۲۰ رجب ۱۳۷۸ھ

الحکیم داخل خلد مغفور پروردگار

۱۳۷۸ھ ۱۹۵۹ء

تعویذ کے اوپر سورۃ الفجر کی یہ آخری چار آیتیں منقوش ہیں:۔

یٰایتھا النفس المطمئنۃ. ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ.

فادخلی فی عبادی. وادخلی جنتی.

تعویذ کے بائیں جانب حافظ شیرازی کا یہ شعر کندہ ہے،

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اور دائیں جانب یہ شعر منقوش ہے،

بر سر تربتِ ما چوں گذری ہمت خواہ کہ زیارتگہ رندانِ جہاں خواہد شد

تعویذ کے پائنتی یہ عبارت درج ہے،

موت اک زندگی کا وقفہ ہے یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

احاطۂ نظام شاہ ہی میں لاہور کے ایک نامی گرامی مورخ جج محمد لطیف دفن ہیں بھاٹی دروازے کے اندر ایک بازار ان کی نسبت سے بازار جج لطیف کے نام سے مشہور ہے

موجودہ صدی کے ربع اوّل میں لاہور کے بڑے بڑے ادیب اور شاعر بھاٹی دروازے کے اندر ہی رہتے تھے، حکیم احمد شجاع پاشا اس علاقے کو لاہور کی چیلسی کہا کرتے تھے، جج صاحب کی لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

مزار

خان بہادر شمس العلماء سید محمد لطیف غفرلہٗ

سیشن جج پنجاب

فیلو پنجاب یونیورسٹی، ممبر بنگال ایشیاٹک سوسائٹی

فیلو رائل ایشیاٹک سوسائٹی، فیلو رائل جیوگرافیکل سوسائٹی وغیرہ

مصنف تاریخ پنجاب، تاریخ لاہور، تاریخ آگرہ، تاریخ ملتان وغیرہ

تاریخ وفات

۹ فروری ۱۹۰۲ء مطابق ۲۹ شوال ۱۳۱۹ھ یوم یک شنبہ

عاقلے گفت زاحوال او با من ایں بیت — بر لب آورد و در آں لحظہ کہ کار آخر شد

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد — روئے گل سیر ندیدیم کہ بہار آخر شد

بہر تاریخ وصالش شنیدم کہ سروش — حیرتے خورد و بگفت آہ بہار آخر شد

(۱۳۱۹ھ)

جج صاحب کی قبر سے جانب شمال برلب سڑک مشہور ادیب اور مزاح نگار چراغ حسن حسرت محو خواب ابدی ہیں، اُن کی قبر پر یہ کتبہ نصب ہے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

آرام گاہ

مولانا چراغ حسن حسرت کاشمیری مرحوم

تاریخ وفات ۵ ذیقعدہ ۱۳۷۴ھ مطابق ۲۶ جون ۱۹۵۵ء عیسوی

قطعہ

آج حسرت داغِ حسرت دے کے رخصت ہوگیا | دل میں اب روشن رہے گا رخصتِ حسرت کا داغ
بجھ گئی بزمِ صحافت میں صفِ ماتم حفیظ | گل ہوا ہے آج اک بزمِ صحافت کا چراغ

۱۹۵۵ء

(حفیظ ہوشیارپوری)

مولانا حسرت سالہا سال تک روزنامہ امروز لاہور میں سندباد جہازی کے نام سے فکاہیہ کالم لکھتے رہے، اُن کی یہ غزل تو بار بار پڑھنے کے لائق ہے،

یارب غمِ ہجراں میں اتنا تو کیا ہوتا | جو ہاتھ جگر پر ہے وہ دستِ دعا ہوتا
اک عشق کا غم آفت اور اس پہ دل آفت | یا غم نہ دیا ہوتا یا دل نہ دیا ہوتا
ناکام تمنا دل اس سوچ میں رہتا ہے | یوں ہوتا تو کیا ہوتا یوں ہوتا تو کیا ہوتا
امید تو بندھ جاتی تسکین تو ہو جاتی | وعدہ نہ وفا کرتے، وعدہ تو کیا ہوتا
غیروں سے کہا تو نے غیروں سے سنا تو نے | کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سنا ہوتا

اسی احاطہ میں شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی کی قبر بھی موجود ہے، اس کے ارد گرد ونچی چار دیواری بنی ہوئی ہے، اور ان کا مزار ایک اونچے چبوترے پر ہے حکیم صاحب لاہور کی گلی

مجلسوں کے روحِ رواں تھے، ان کے ہمنشینوں میں آغا حشر کاشمیری، عبدالمجید سالکؔ، غلام رسول مہر جیسے ادیبوں اور صحافیوں کے نام آتے ہیں۔ حکیم صاحب جتنے بڑے طبیب تھے اتنے ہی عظیم خطاط بھی تھے، پنجاب کے مشہور خطاط تاج زریں رقم نے خط نستعلیق میں حروف کے دائرے بنانے ان ہی سے سیکھے تھے۔ حکیم صاحب کی قبر پر جو کتبہ نصب ہے، اس پر یہ عبارت کندہ ہے:

شفاء الملک حکیم فقیر محمد مرحوم

۱۳۵۶ھ

چشتی نظامی

آسودہ ہے اس خاک میں وہ حاذقِ یکتا
تھی جس کی مسیحا نفسی آیۂ یزداں

علم و ہنر و فضل میں سرتاجِ اماثل
لطف و کرم و فیض میں سرحلقۂ اقراں

تھی جس کی شفا زندگی کا پیغام
تھی جس کی دوا موجۂ سرچشمۂ حیواں

وہ بوعلیِ ہند کہ اعجاز سے جس کے
پھر زندہ و پائندہ ہوئی حکمتِ یوناں

وہ شمعِ دل افروز بجھی باد اجل سے
تھی جس کی ضیا رونقِ محفلِ دوراں

تھے جس سے دل و دیدۂ احباب منور
رخشندہ تھی انجم کی طرح بزم ندیماں

اس خاک پہ بخشش کے برستے رہیں انوار
اس خاک پہ رحمت کی گھٹا ہو گہر افشاں

کتبہ عبدالمجید پرویں رقم
غلام رسول مہر

مقامِ وفات شفا منزل لاہور

تاریخ وفات ۱۰ شعبان ۱۳۵۶ھ

مطابق ۱۶ اکتوبر ۱۹۳۷ء

بروز شنبہ پانچ بجے شام

حکیم فقیر محمد چشتی ضلع جگت اور پھبتی کہنے میں اپنی مثال آپ تھے، ان کا یہ دستور تھا کہ جو مریض اُن کے پاس آتا اسے نسخہ لکھ دیتے، اور فیس کا مطالبہ نہ کرتے، سالک صاحب نے ایک روز ان سے کہا کہ وہ نسخہ لکھنے کی فیس کیوں نہیں مانگتے، ؟ حکیم صاحب نے فرمایا "اجی مانگنے کی کیا ضرورت، فقیر کی صورت ہی سوال ہے" اب ایسی ہستیاں کہاں ملتی ہیں ؟

میانی صاحب کا ایک خطہ باغ گل بیگم کے نام سے موسوم ہے[۱۵] اس خطے میں مشہور شاعر و ادیب پروفیسر غلام مصطفےٰ تبسم کی قبر ہے، ان کی لوح مزار پر بڑے موٹے حروف میں یہ عبارت کندہ ہے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرقد

استاد شاعر ادیب

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم

تاریخ وفات

۷رفروری ۱۹۷۸ء

باغ گل بیگم ہی میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے کابل، ماسکو اور انقرہ کے ساتھی ڈاکٹر محمد اقبال شیدائی دفن ہیں، اُن کے سوانح حیات کافی دنوں تک روزنامہ امروز لاہور میں انقلابی کی سرگذشت کے عنوان سے طبع ہوتے رہے ہیں، ان کی قبر برلب سڑک ہے، اور اس کی

---

۱۵ گل بیگم یا گل بہار بیگم مہاراجہ رنجیت سنگھ کی مسلمان بیوی تھی، وہ مہاراجہ کی وفات (۱۸۳۹ء) کے بعد کافی مدت تک زندہ رہی، اس نے اپنا مزار اپنی حیات ہی میں بنوالیا تھا، یہ پورا خطہ گورستان اسی کی طرف منسوب ہے،

یہ عبارت منقوش ہے،

اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

نیست در بیشۂ من خشک و تر کوتاہی چوب ہر نخل کہ منبر نہ شود دار کنم

آخری آرامگاہ

انقلابی مجاہد ڈاکٹر محمد اقبال شیدائی

ولد

میاں غلام علی مرحوم

جائے ولادت پورہ ہیران۔ شہر سیالکوٹ

عمر تقریباً ۸۰ سال

بروز اتوار بتاریخ ۱۳ جنوری ۱۹۷۴ء مطابق ۱۸ ذوالحجہ ۱۳۹۳ھ

بمقام احمد بلاسمن آباد لاہور وفات پائی،

سر شوریدہ بر بالینِ آسایش رسید اینجا

اسی احاطہ قبور میں برلب سڑک باغیچہ جسٹس محمد رفیق میں داغ دہلوی کے ایک شاگرد منشی محمد الدین فوق محوِ خواب ابدی ہیں۔ ان کی لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کل من علیہا فان و یبقیٰ وجہ ربک ذوالجلال والاکرام

مرقد منور مجدد کشامرہ منشی محمد الدین فوق

کرد رحلت محمد الدین فوقؔ بود شاگرد داغ پاک ضمیر

شاعر و نکتہ دان مدیر و ادیب   خوش بیان خوش مزاج خوش تحریر
چاردہ از مہ ستمبر   روز جمعہ بسوئے ملک کبیر
گفت تاریخ رحلتش سیماب
انتزاع مورخ کشمیر

۱۹۴۵ء

تاریخ پیدائش ۲۵ر فروری ۱۸۷۸ء تاریخ وفات ۱۴ر ستمبر ۱۹۴۵ء
فوق صاحب نے کشمیر کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے، اس لئے انھیں مورخ کشمیر کہتے ہیں، ماہنامہ شیرازہ سرینگر نے ۱۹۷۱ء میں فوق نمبر شائع کرکے ان کی علمی ادبی کاوشوں کا اعتراف کیا ہے،

موجودہ صدی کے آغاز میں لاہور میں مشاعروں کا بڑا رواج تھا، ایک بار کسی نے یہ مصرع طرح دیا:

ع: فوق صاحب گلی میں رہتے ہیں

شاعروں نے اس پر طبع آزمائی شروع کردی اور گلی گلی میں رہتے ہیں، تیری جیب میں رہتے ہیں، جیسے مصرعے ہوگئے ہیں،

احاطہ طاہر بندگی کے شروع ہی میں پٹھا پہلوان کی قبر ہے، اس کی قبر پر جو کتبہ نصب ہے اس پر داغ کی کہی ہوئی تاریخ درج ہے، پوری عبارت یہ ہے:-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشہد ان لا الٰہ الا اللہ و اشہد ان محمداً عبدہٗ و رسولہٗ

وہ دلاور اور وہ شہزور دنیا سے گیا   جس کی شہزوری سے تھا شیرِ نیستاں منفعل

داغؔ نے یہ مصرعِ تاریخ برجستہ کہا — رستم زمان آہ بوٹا پہلوان دیودل
۱۳۲۲ھ

میاں محمد بوٹا پہلوان صاحب رستم ہند نے بعمر ساٹھ سال مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۴ء مطابق ۳۰ محرم ۱۳۲۲ھ کو انتقال کیا،

داغؔ کے تاریخ کہنے سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ بوٹا پہلوان کی شہزوری کا چرچا دُور دُور تک تھا، میں نے تحقیق نہیں کی، ہو سکتا ہے کہ یہ تاریخ داغ کے مطبوعہ کلام میں نہ ہو،

بوٹا پہلوان کی قبر سے دس بارہ قدم کے فاصلہ پر آغا حشر کی قبر ہے، آج سے ربع صدی پہلے اس پر جو کتبہ نصب تھا، اس پر "مزار اقدس فخر ملک و قوم آغا حشر" کندہ تھا، یہ کتبہ کوئی سنگ فروش اکھاڑ کرلے گیا، اب اس پر جو نیا کتبہ لگایا گیا ہے، اس پر یہ عبارت منقوش ہے،

مزار پُر انوار آغا سید محمد شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

المعروف (بہ) انڈین شیکسپیر حضرت آغا حشر کاشمیری

اظہار عقیدت مبنی بر حقیقت

ایک ایک تمثیل تیری وقت کا تھی شاہکار — پھر گئی تیری دہائی مچ گئی تیری پکار

تیری تصنیفات کے اوصاف اتنے بےشمار — لکھنے بیٹھوں میں تو صبح حشر بھی ہو نمودار

پھر بھی نظم و ضبط سے باہر ہو جولانی تیری

نبد سے باندھی گئی کب حشر طغیانی تیری

۲۸ ماہ اپریل ۱۹۳۵ء

عمارات خاک پاسے حشر ادیب العصر منشی دوآل لکھنوی

عقیدت کیشان و خادمین غلام حسین کتھک، اصغر نظامی، عاشق جٹ

آغا حشر کے مزار کے سرہانے برعظیم پاک و ہند کے نامور عالم دین، تحریک آزادی کے ایک مجاہد، مولانا خواجہ عبد الحیٰ فاروقی سابق شیخ التفسیر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ابدی نیند سو رہے ہیں، ان کی قبر کے سرہانے لوہے کی ایک تختی پر یہ عبارت لکھی ہوئی ہے

آرامگاہ

خواجہ عبد الحیٰ فاروقی رحمۃ اللہ علیہ

تاریخ پیدائش ۱۸۸۰ء تاریخ وفات ۸ رجنوری ۱۹۶۵ء

۴ ر رمضان المبارک ۱۳۸۴ھ

بوقت ایک بجے بروز جمعۃ المبارک

خواجہ عبد الحیٰ فاروقی مولانا عبید اللہ سندھی کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے، وہ قرآن حکیم کی تفسیر اپنے استاد ہی کے رنگ میں کیا کرتے تھے، ادارہ اصلاح و تبلیغ لاہور نے اُن کے افادات قرآن سات جلدوں میں شائع کئے ہیں، تحریک ریشمی رومال کے سلسلے میں جو گرفتاریاں عمل میں آئی تھیں، ان گرفتار شدگان میں خواجہ صاحب بھی تھے،

قبرستان میانی صاحب میں برلب بہاولپور روڈ ایک مختصر سے احاطۂ قبور میں جو زینت بیگم بیوہ خواجہ غلام حسین کی طرف منسوب ہے، شاعر رومان اختر شیرانی محو خواب ابدی ہیں، ان کی سادہ سی لوح مزار پر یہ عبارت منقوش ہے،

خوابگاہ حضرت ابو المعانی اختر شیرانی مرحوم

داماں بخسرا یہ زائرین ہے اک شاعر نوجوان کی تربت

۹ ر ستمبر ۱۹۴۸ء

اختر شیرانی کی قبر سے متصل دس گز کے فاصلہ پر سڑک کے پار لاہور کے ایک نامور صحافی
وعلامہ محمد عبداللہ منہاس کی قبر ہے، ان کی لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یایتہا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی
عبادی وادخلی جنتی

منہاس مردے بے مثال ہمدرد ملت، خوش خصال
بے باک نقاد و مدیر آن صاحب علم وکمال
چوں زیں جہاں بگذشت، یافت
اکرام قرب ذی الجلال

۱۳۶۸ھ

۱۵ رمضان المبارک ۱۳۶۸ھ ۱۲ جولائی ۱۹۴۹ء

قبرستان میانی میں سب سے اہم مزار حضرت شیخ محمد طاہر بندگی خلیفہ حضرت
مجدد الف ثانی کا ہے، حضرات القدس اور زبدۃ المقامات میں ان کا ذکر موجود ہے،
موصوف حضرت مجدد کے صاحبزادوں کے استاد بھی تھے، ان کے مزار پر جو کتبہ نصب ہوا
ہے اس پر یہ عبارت درج ہے،،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یطھرکم تطھیرا

ھبط انوار

قطب جہاں خوش زباں فرد دوراں شہباز لامکاں

برہان شریعت سلطان طریقت بحرِ حقیقت گنجِ معرفت
المشائخ حضرت شیخ محمد طاہر بندگی نقشبندی مجددی چشتی صابری
قدس سرہ العزیز

شاہ طاہر والا رتبت مظہر نورِ خدا
کاملاں را پیر کامل سالکان را راہنما

۸ محرم الحرام ۱۰۴۰ھ مطابق ۱۰ اگست ۱۶۳۰ء
بروز پنجشنبہ بوقت چاشت

احاطۂ طاہر بندگی میں ایک چبوترے پر مشہور افسانہ نویس اور ناول نگار ایم اسلم کے خاندان کے افراد دفن ہیں، اسی چبوترے پر ایک کونے میں مشہور شاعر اور ماہر تعلیم ایم ڈی تاثیر کی قبر ہے، ان کی لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے،

بسم اللہ الرحمن الرحیم
لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ
مرقد ڈاکٹر محمد دین تاثیر
تاریخ وفات ۳۰ نومبر ۱۹۵۰ء

آج میں دور بہت دور نکل آیا ہوں
شاہراہوں سے پرے دور گذرگاہوں سے
بے طلب بے تگ و دو
ہوسِ خام نہ سودائے تمام
یونہی چلتا ہوا چلتا ہوا آ پہنچا ہوں،

پے بہ پے گام بہ گام
کس قدر دور بہت دور نکل آیا ہوں،

(تاثیر)

یادگار محبت نصب کردہ بیگم تاثیر، سلمیٰ تاثیر، مریم تاثیر سلمان تاثیر[1]

یہ تاثیر کی ایک آزاد نظم کے اشعار ہیں جن کا انتخاب غالباً پروفیسر حمید احمد خاں مرحوم نے جو تاثیر کے رفیق کار اور اردو زبان کے بہت بڑے ادیب تھے، کیا تھا، اصل نظم تاثیر کے مجموعۂ کلام "آتشکدہ" میں بعنوان "راہرو" موجود ہے، اور وہ یوں ہے،

آپ سے آپ بہت دور بہت دور نکل آیا ہوں،
شاہراہوں سے پرے دور گذرگاہوں سے
بے طلب، بے تگ و دو
خانقاہوں سے الگ، دور صنم خانوں سے
ہوس خام نہ سودائے تمام
یونہی چلتا ہوا چلتا ہوا آپہنچا ہوں،
پے بہ پے، گام بہ گام
کس قدر دور بہت دور نکل آیا ہوں

اس سے بہتر لوحِ مزار راقم الحروف کی نظر سے نہیں گذری، قبرستان کے سنسان ماحول میں جب ان اشعار پر نظر پڑتی ہے، تو پھر یہ احساس ہوتا ہے کہ میں کس قدر دور

---

[1] یہ کتبہ کوئی سنگ تراش اکھاڑ کر لے جا رہا تھا، کہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا، اس لئے جب اسے دوبارہ نصب کیا گیا تو آخری سطر زیر زمین آگئی،

...ت دور نکل آیا ہوں،

تاثیر بڑے اچھے شاعر تھے، اُن کا یہ شعر تو اب ضرب المثل بن چکا ہے،

داورِ محشر مرا نامۂ اعمال نہ دیکھ — اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

ان کا یہ شعر بھی دل میں رکھ لینے کے لائق ہے،

...رہ شوق، رہ عشق ہے اے اہل ہوس — منزلیں آتی ہیں، اس میں نہ مقام آتے ہیں

...ور تاثیر کا یہ شعر بھی ملاحظہ فرمائیے،

دل نے آنکھوں سے کہی آنکھوں نے اُن سے کہہ دی — بات چل نکلی ہے، اب دیکھیں کہاں تک پہنچے

تاثیر مرحوم نے اپنی وفات سے پہلے اپنے احباب کو مخاطب کر کے کہا تھا:-

میری وفائیں یاد کرو گے — روؤ گے فریاد کرو گے

چھوڑو بھی تاثیر کی باتیں — کب تک اس کو یاد کرو گے

احاطۂ طاہر بندگی میں "پیسہ اخبار" لاہور کے مدیر منشی محبوب عالم ابدی نیند سو رہے ہیں، مجھے خوب یاد ہے کہ میرے بچپن میں ان کا اخبار جو پیلے رنگ کے کاغذ پر چھپتا تھا ایک پیسہ میں آتا تھا، ان کی لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:-

خواب گاہ خلد آشیاں خادم اسلام حاجی مولوی محبوب عالم مرحوم و مغفور

سحر گاہے بگورستاں رسیدم — در آں گورپُر انوار دیدم

معلیٰ تربت محبوب عالم — زہاتف "تا ابد بخشش" شنیدم

۱۳۵۲ھ

ایک طالب علم میری نگرانی میں امیر المجاہدین مولانا فضل الٰہی وزیرآبادی پر تحقیق کر رہا ہے، مورخہ ۲۵ر مارچ ۱۹۸۲ء کو ہم دونوں امیر المجاہدین کے فرزند مولوی محمد...

کا اکثر حصہ وزیر آباد گئے، وزیر آباد سے تین کلو میٹر کے فاصلہ پر موضع کرم آباد واقع ہے جسے مولانا ظفر علی خاں مدیر زمیندار لاہور کے مولد و مدفن ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اب کرم آباد کی آبادی وزیر آباد کی آبادی سے مل گئی ہے،

وزیر آباد سے سیالکوٹ جانے والی سڑک کے کنارے مولانا ظفر علی خاں کا شاندار بنگلہ آتا ہے، ان کی رہائش گاہ سے متصل ایک بڑی خوبصورت مسجد ہے، جو مولانا ظفر علی خاں نے بڑے اہتمام کے ساتھ تعمیر کرائی تھی۔ مسجد کے عقب میں آموں کے باغ میں ایک چبوترہ پر مولانا ظفر علی خاں، اُن کے برادر خورد غلام حیدر خاں، ان کی اہلیہ محترمہ اور فرزند اختر علی خاں ابدی نیند سو رہے ہیں، مولانا ظفر علی خاں کی لوح مزار پر یہ عبارت منقوش ہے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بابائے صحافت

ظفر الملت حضرت مولانا ظفر علی خاں رحمۃ اللہ علیہ

ولادت ۸ رجنوری ۱۸۷۳ء — وصال ۲۷ ر نومبر ۱۹۵۶ء

نہ کی روزی فرق اس نے میری سرکشی پر بھی — خداوندانِ لندن سے مرا پروردگار اچھا

(مولانا ظفر علی خاں)

جلتے ہیں جبرئیل کے پر جس مقام پر — اس کی حقیقتوں کے شناسا تم ہی تو ہو

(مولانا ظفر علی خاں)

دنیا میں ٹھکانے دو ہی تو ہیں آزاد منش انسانوں کے — یا تختہ جگہ آزادی کی یا تخت مقام آزادی کا

(مولانا ظفر علی خاں)

(کرم آباد اکتوبر ۱۹۳۶ء زمانہ نظر بندی)
(خاکپائے اسلاف مسعود علی خاں)

مولانا ظفر علی خان کی علالت اور بڑھاپے کے زمانے میں اُن کے اکلوتے فرزند اختر علی خان نے زمیندار کی ادارت سنبھالی، موصوف اپنے والد کے بعد دو سال سے بھی کم عرصہ زندہ رہے، ان کی لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجاہد ملت

حضرت مولانا اختر علی خان رحمۃ اللہ علیہ

ولادت ۲ر دسمبر ۱۹۰۸ء   وصال [illegible] اکتوبر ۱۹۵۸ء

رونق بزم جہاں وہ محفل آرا چل بسا   جس کی فرقت تھی دیاروں کو گوارا چل بسا

ہر غریب و بے نوا کی جو بجھا دیتا تھا پیاس   حیف دریائے سخاوت کا وہ دھارا چل بسا

وہ کرم آباد کے گلشن میں اس کی گھن گرج

اب نہ آئے گا دو[illegible] شیر [illegible] ہمارا چل بسا

خاکپائے اسلاف

مسعود علی خان،

روزنامہ زمیندار اور مولانا ظفر علی خان کا ذکر خیر مہر و سالک کے بغیر نامکمل رہیگا، یہ دونوں زندگی بھر کے ساتھی ایک ہی قبرستان میں دفن ہیں، پنجاب یونیورسٹی کے نیو کیمپس سے قریب مسلم ٹاؤن کے قبرستان میں ان کی قبریں ہیں۔ مہر صاحب کی قبر بغیر کتبے کے ہے اور سالک صاحب کی لوح مزار پر یہ عبارت کندہ ہے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی

ولادت ۱۳ دسمبر ۱۸۹۴ء — وفات ۲۷ ستمبر ۱۹۵۹ء

چراغِ زندگی ہوگا فروزاں ہم نہیں ہوں گے
چمن میں آئے گی فصلِ بہاراں ہم نہیں ہوں گے

ہمارے ڈوبنے کے بعد ابھریں گے نئے تارے
جبینِ دہر پر چھٹکے گی افشاں ہم نہیں ہوں گے

جوانو! اب تمہارے ہاتھ میں تقدیرِ عالم ہے
تمہیں ہوگے فروغِ بزمِ امکاں ہم نہیں ہوں گے

اگر ماضی منور تھا کبھی تو ہم نہ تھے حاضر
جو مستقبل کبھی ہوگا درخشاں ہم نہیں ہوں گے

ہمارے بعد ہی خونِ شہیداں رنگ لائے گا،
یہی سرخی بنے گی زیبِ عنواں ہم نہیں ہوں گے

(سالک)

بزمِ صوفیہ

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

یہ بزمِ صوفیہ کا تیسرا اڈیشن ہے جو بہ کثرت اضافوں کے ساتھ چھپا ہے، اس میں تیموری عہد سے پہلے کے اصحابِ تصانیف اکابرِ صوفیہ مثلاً حضرت شیخ ابو الحسن ہجویریؒ، خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ، خواجہ نظام الدین اولیاؒ، حضرت بو علی قلندرؒ، شیخ برہان الدین غریبؒ، حضرت سید جلال الدین بخاریؒ مخدوم جہانیاں جہاں گشت اور حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ وغیرہ کے حالات و سوانح، تعلیمات و ارشادات، اُن کے ملفوظات اور ان کی تصنیفات کی روشنی میں قلمبند کئے گئے ہیں، اس میں حضرت شیخ احمد عبد الحق توشہ رودولوی کے حالات و تعلیمات مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے قلم سے ہیں، جو حضرت توشہ کے خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے۔ قیمت:- ۲۵ روپے، "منیجر"

اسلام اور مستشرقین

پر
دار المصنفین کا بین الاقوامی سمینار

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن

(۶)

جناب مفتی سیاح الدین کاکاخیل کے مقالہ کے بعد جناب عابد رضا بیدار صاحب ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری نے ایک سوال کے ذریعہ یہ جاننا چاہا کہ اگر پاکستان میں مستشرقین کی رد میں کوئی کام ہو رہا ہو تو وہ اس مجلس میں سامنے آنا چاہیے، اس کا جواب جناب طفیل احمد صاحب نے یہ دیا:

مستشرقین اور قرآن کے موضوع پر ایک مبسوط مقالہ جناب مولانا عبد القدوس ہاشمی نے تحریر فرمایا جو پہلے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے رسالہ فکر و نظر میں طبع ہوا، اس کے بعد اس کے ترجمے کئی زبانوں میں ہوئے، اور جب ہمارے ادارہ تحقیقات اسلامی نے اپنے کام کو تقسیم کیا تو اس میں ایک خاص شعبہ اسلام اور اس کے در پیش مسائل کے نام سے قائم کیا گیا اس شعبہ کے ذریعہ اسلام سے متعلق جو غلط افکار و خیالات رائج ہو رہے ہیں، ان کی تردید اور ان کے جوابات لکھنے کا مناسب انتظام کیا جاتا ہے، پنجاب یونیورسٹی سے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی مختلف جلدیں شائع ہوئی ہیں، ان میں مستشرقین کے قسم کے مقالہ نگاروں کے مضامین میں جو غلط فہمیاں ہوتی ہیں ان کا ترجمہ کرتے وقت ان کی نشان دہی کی جاتی ہے اور ان کی نشان دہی اس طرح کی جاتی ہے کہ مسلمانوں کے سامنے یہ غلطیاں آئیں اور وہ ان کے جوابات دینے کے لیے آمادہ ہوں، ہمارا ادارہ بھی مستشرقین کی تحریروں کو پڑھتا ہے اور ان کے گمراہ کن دلائل کے جوابات دینے کی پوری کوشش کرتا ہے، اس سلسلہ میں ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن کی مجموعۂ قوانین اسلام کی مختلف جلدیں

ذکر کیا، جو ان کے ادارہ سے شایع ہوئی ہیں، ان کے خیال میں ان جلدوں سے اسلامی قوانین کے متعلق مستشرقین کی بہت سی غلطیاں اور غلط فہمیاں دور ہو سکتی ہیں۔

اس کے بعد خاکسار نے ڈاکٹر طفیل صاحب کو اپنا مقالہ پڑھنے کے لیے سامعین سے یہ کہہ زحمت دی کہ جس شوق سے وہ اس سیمنار میں دور دراز مقام سے سفر کر کے شریک ہوئے ہیں امید ہے کہ اسی شوق سے حاضرین ان کا مقالہ سماعت فرمائیں گے۔

ڈاکٹر محمد طفیل صاحب میرے مقالہ کا موضوع ہے' جوزف شاخت اور اصول فقہ' مقالہ کو میں نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے اور تیسرے حصہ میں سے تھوڑا سا اقتباس پڑھنے کی اجازت چاہوں گا' شاخت صاحب کا ایک اقتباس ہے جس میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ اسلامی قانون براہ راست قرآن حکیم سے اخذ نہیں کیا گیا، اسلامی قانون کا خمیر بنی امیہ کے انتظامی عمل سے اٹھایا گیا اور یہ کہ بعض اوقات بنی امیہ کا عمل قرآن حکیم کے الفاظ پر بھاری ہو جاتا ہے، میں اس کے جواب میں کچھ عرض کرتا جاؤں گا، مذکورہ بالا امور میں سب سے پہلا قرآن حکیم کے قانونی ماخذ ہونے کے بارے میں ہے کہ ابتدائی دور میں قرآن سے بحیثیت ماخذ قانونی استفادہ نہیں کیا گیا یہ کلیہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے، ہمیں شاخت کا یہ اصول اور یہ عندیہ محل نظر دکھائی دیتا ہے' نبی کریمؐ اور صحابہؓ کے عہد میں قرآن حکیم سے مکمل استفادہ کیا جاتا رہا، چوروں کے ہاتھ کاٹے گئے، زانیوں کو کوڑے لگائے گئے، شرابیوں پر تعزیر نافذ ہوئی، بہت سے لوگوں کو ملک بدر کیا گیا نکاح وطلاق، نیز وراثت کی تقسیم کے فیصلے قرآن حکیم کے احکام کے مطابق کیے گئے، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن حکیم کے یہ سارے احکام مسلمانوں میں ابتدائی دور سے ہی اپنا لیے گئے تھے اور ان پر عمل ہوتا رہا، اس کے علاوہ دوسری بات میں یہ کہنا چاہوں گا کہ قرآن حکیم یقینی طور پر تمام جزئیات کا احاطہ نہیں کرتا بلکہ وہ قانون اسلامی کے

اصولوں سے ہمیں روشناس کراتا ہے، شاخت صاحب نے نتائج اخذ کرتے وقت غالباً جزئیات کو پیش نظر رکھا ہوگا، اسی وجہ سے انھوں نے ٹھوکر کھائی ہے، دوسری بات یہ کہ اسلامی قانون کو بنی امیہ کے دور میں قانونی شکل اس وقت ملی جب بنی امیہ کا عمل اس میں داخل ہوا، یہ بھی ایک ایسی تاریخی غلطی ہے جو شاخت کے تعصب کی غماز ہے، دوسری بات یہ کہ حدیث شریف دوسری صدی تک موجود نہ تھی، اس کے علاوہ انھوں نے یہ بات بھی کہی کہ جب حدیث نبویؐ کو جمع کیا گیا اس وقت وہ اصلی حالت میں موجود نہ تھی، اس میں معاشرتی عمل بھی شامل ہوگیا تھا، گویا سنت نبویؐ جو ہمارے قانون کا دوسرا بڑا ماخذ ہے، وہ بھی صحیح معنوں میں ہم تک نہیں پہونچ سکا، بلکہ اسے تاخیر سے مرتب کیا گیا، اور جب مرتب کیا گیا تو اس میں معاشرتی عمل بھی شامل ہوگیا، اس حقیقت سے جوزف صاحب نے غالباً آنکھیں بند کرلیں کہ حدیث کو جمع کرنے کا عمل عہد صحابہؓ ہی میں شروع ہوگیا تھا اور بہت سے صحیفے، صحیفۂ صادقہ، صحیفۂ حضرت علی جو اب تک ہمارے سامنے آچکے ہیں وہ صحابۂ کرام کے دور میں ہی مرتب ہوچکے تھے، بعد میں حدیث کے ذخیرہ کو صحیح بخاری، صحیح مسلم اور دیگر حدیث کی کتابوں کی شکل میں جمع کردیا گیا، اور ان کا یہ کہنا کہ جب حدیث کو جمع کیا گیا تو بنی امیہ کے دور کا معاشرتی عمل شامل ہوگیا، ہماری سمجھ سے بالاتر ہے، جب کہ مسلمان کے لیے نبی اکرمؐ کا یہ ارشاد موجود ہے کہ:

من کذب علیّ متعمدا فلیتبوأ	جس نے میری طرف جھوٹ کی نسبت کی
مقعدہٗ من النّار۔	اس کو جہنم میں اپنا مقام بنا لینا چاہیے

اس حدیث کی موجودگی میں کوئی کیسے جرأت کرسکتا ہے کہ معاشرتی عمل کو حدیث کا درجہ دے، پھر ہمارے یہاں جرح وتعدیل کا جو اتنا وسیع ذخیرہ اور اتنا بڑا قانون موجود ہے، اس کے پیش نظر ہم کھرا کھوٹا الگ کرسکتے ہیں اور پرکھ سکتے ہیں، اور آج بھی ہمارے پاس یہ قاعدے اور کلیے

موجود ہیں تاکہ ہم یہ الگ کر کے دکھا دیں کہ یہ حدیث ہے، اور یہ حدیث کے علاوہ کوئی اور چیز ہے، چاہے وہ معاشرہ کا عمل ہو، یا کسی کی گھڑی ہوئی کوئی بات ہو، ان حقایق کی موجودگی میں جو مستشرقین نے ہمارے قانون کے ماخذ کا درجہ گھٹانے اور اس میں تشکیک و شبہہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، یہ ہمیں ان کے تعصب کی ایک سازش نظر آتی ہے، جس کو حقیقت اور تاریخی شواہد سے کوئی تعلق نہیں، ان الفاظ پر میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔

اس مضمون کے خاتمہ کے بعد خاکسار نے عرض کیا کہ وقت کی کمی کی وجہ سے شاید آپ سوال نہ کریں، اس لیے اب ہمارے صدر صاحب اپنے تاثرات بیان کریں گے۔

<u>سید حامد صاحب</u> حضرات! وقت کم ہے، میں تبصرہ میں وقت نہیں لوں گا، پاکستان کے علمائے کرام کا یہ زریں سلسلہ آپ کے سامنے آیا، انھوں نے اپنے خیالات، اپنے تجربات، اپنی بصیرت سے آپ کو آگاہ کیا، پہلے فاضل مقرر کے متعلق میں عرض کر چکا ہوں کہ مولانا عبدالقدوس ہاشمی نے جس سادگی کے ساتھ بہت سے مسائل کو طے کیا، اس میں ادب کی تنقیدی زبان کو اگر استعمال کیا جائے تو اسے سہل ممتنع کہا جائے گا، یہ بات صحیح ہے کہ مستشرقین نے جس عناد کا مظاہرہ وقتاً فوقتاً کیا، اس میں اس ذہنیت کو بھی دخل ہے جو ماضی میں کسی مفتوح کو فاتح سے رہتی ہے،

جناب شرف الدین صاحب نے مستشرقین، استشراق اور اسلام سے متعلق اپنا مقالہ پڑھا، اور استشراق سے متعلق انھوں نے جو کچھ فرمایا ہے وہ یقیناً قابل توجہ ہے، انھوں نے فرمایا کہ استشراق یعنی بہ تکلف مشرقی بننا، اب اگر کوئی شخص بہ تکلف مشرقی بنتا ہے تو ظاہر ہے اس میں بناوٹ آہی جاتی ہے، لیکن مستثنیات میں ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ کوئی شخص عقیدت کی بنا پر مشرقی بننا چاہتا ہے، مفتی سیاح الدین کاکاخیل نے بڑی فراست کے ساتھ اس طرز عمل کی نشاندہی کی ہے کہ مستشرقین کا ایک گروہ یہ کوشش کرتا رہا ہے کہ شروع میں قلوب و اذہان کو متأثر

لرے اور یہ تاثر قائم کرے کہ مصنف غیر جانبدار بلکہ ہمدرد ہے، اور پھر اس کے بعد دو چار باتیں ایسی کہہ دے جو ہمیشہ کے لیے جراحت کا سامان رکھتی ہوں، آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جن کتابوں کے ترجمے کیے جائیں ان کے حواشی میں اس کا التزام رکھا جائے کہ جن باتوں سے مترجم کو اختلاف ہے، اس کی تردید اور توجیہ ہو سکے، جناب محمد طفیل صاحب نے اپنے مقالہ میں جوزف صاحب کی دو باتوں کی تردید کی ہے، ایک تو یہ کہ قرآن کو فقہ و اسلامی قانون کا مصدر نہیں بنایا گیا، اور دوسری بات یہ کہ حدیث کا مجموعہ دوسری صدی تک نہ تھا، اور جب اس کو مدون کیا گیا تو اس میں بنی امیہ کا معاشرتی عمل بھی شامل ہو گیا، اس کی بہت مدلل تردید آپ نے کی، میرے خیال میں اب اس مجلس کو ختم کیا جائے۔

چوتھی نشست | چوتھی نشست کی صدارت جناب حکیم محمد سعید دہلوی ہمدرد فاونڈیشن پاکستان نے کی، اس کی کارروائی کو آگے بڑھانے کے فرائض جناب ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری نے انجام دیے آغاز جناب حکیم محمد سعید صاحب نے سورہ بقرہ کے آخری رکوع کی تلاوت سے کیا، مقالہ خوانی شروع ہونے سے پہلے ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری نے کہا کہ اس میں سب سے پہلا مقالہ جناب مولانا تقی الدین ندوی کا ہے جن کے مقالہ کا موضوع "السنۃ مع المستشرقین والمستغربین" ہے، اس کو جناب مقالہ نگار نے عربی میں لکھا ہے، میرے ذمہ جو ناخوشگوار فرض ہے اس کا اثر متعدد اصحاب پر پڑے گا، اور میں کانفرنسوں میں شریک ہوتا رہتا ہوں لہٰذا خود بھی اس کا شکار ہوتا ہوں، زیادہ سے زیادہ وقت جو ایک مقالہ نگار کو دیا جا سکتا ہے وہ پندرہ منٹ ہے، لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ مقالہ نگار حضرات پورا مقالہ پڑھنے کے بجائے اس کا خلاصہ پیش کریں، یا اس کے اہم اقتباسات کو پڑھیں، اس لیے کہ دس منٹ سوالات اور بحث و مباحثہ کے لیے بھی ہوں گے، مجھے یہ گذارش پہلے تو ڈاکٹر تقی الدین صاحب سے کرنی ہے، اور ان کے بعد

اور مقالہ نگار حضرات سے بھی ہے۔

مولانا تقی الدین ندوی مظاہری | مولانا نے پہلے عربی میں اپنے مقالہ کے اقتباسات پڑھے اور پھر اردو میں اس کا خلاصہ اس طرح بیان کیا کہ علامہ شبلی نعمانی اور مولانا سید سلیمان ندوی نے خاص طور سے سیرت اور سنت کے باب میں مستشرقین کے اقوال کا جو مواخذہ کیا ہے اور ہم کو جو راہ بتائی ہے اس کے متعلق ارادہ تھا کہ میں بھی کچھ لکھوں، ہندوستان میں جب انکار حدیث کا فتنہ پیدا ہوا تو سید صاحبؒ نے اس کے خلاف السنۃ وما الحاجۃ الیھا لکھی جو عربی میں بھی چھپی ہے، یہ مشہور و معروف کتاب ہے، میں نے اس کا بھی ذکر کیا ہے، میں نے یہ بھی بتلایا ہے کہ مستشرقین کے انکار حدیث سے نئے تعلیم یافتہ لوگ متاثر ہوئے ہیں جن میں بڑے اہل قلم، اہل زبان شامل ہیں، اور جن کا عالم عربی اور عالم اسلام میں بڑا اثر ہے، مثلاً احمد امین، انھوں نے جس طرح حدیث کے بارہ میں خیالات کا اظہار کیا ہے، اس کا کوئی تعلق اسلام اور اسلامی تعلیمات سے نہیں ہے، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ احمد امین نے علمی خطا کی ہے، یہ علمی غلطی نہیں تحریف ہے، وہ گولڈ زیہر اور اس قسم کے دوسرے مستشرقین سے اتنا متاثر ہیں کہ ان لوگوں نے جو کچھ کہا ہے اس کو آنکھ بند کر کے قبول کر لیا ہے، اسی طرح موجودہ علماء میں استاد فواد سزگین ہیں جن کی بڑی شہرت ہے، اور ان کی کتاب تاریخ التراث العربی بڑی اہم کتاب ہے، اس کتاب کی دوسری جلد میں انھوں نے تقریباً تیس ۳۰ صفحوں کا ایک مستقل باب قائم کیا ہے، جس میں انھوں نے علم حدیث کے تطورات تفصیلات اور کتابت کے بارہ میں مختلف رایوں کا اظہار کیا ہے، اس میں سے بعض اقتباسات میں نے اس مقالہ میں نقل کر دیے ہیں، امام بخاری کے متعلق انھوں نے سخت تنقید کی ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ امام بخاری کے زمانہ سے گویا اسناد میں انحطاط کا دور شروع ہوا بدأ الامام البخاری من الانحطاط فی الحدیث، یعنی امام بخاری کے زمانہ سے گویا اسناد کی اہمیت کم ہو گئی، کتاب الصحیح میں امام بخاری کا

جو مقصد ہے اس کو فواد سزگین سمجھے نہیں، امام بخاری نے تقریباً تیرہ سو[۱۳] معلق حدیثیں یعنی بغیر سند کے نقل کی ہیں لیکن ان میں اکثر احادیث کی اسانید امام بخاری نے کتاب کے اندر خود نقل کر دی ہیں سوائے ایک سو ستائیس حدیثوں کے اور ان حدیثوں کی اسناد کو حافظ ابن حجر نے اپنی کتاب تغلیق التعلیق میں بیان کر دیا ہے، اس کتاب کو ایک صاحب نے ایڈٹ کیا ہے اور وہ چھپ بھی گئی ہے، اس میں جال و رواۃ پر حافظ ابن حجر نے پوری گفتگو کی ہے، امام بخاری نے حدیث معلق کو ضمناً اور استشہاد کے طور پر نقل کیا ہے، وہ اصل کتاب کا موضوع نہیں، لیکن فواد سزگین نے مستشرقین سے متاثر ہو کر یہ کہہ دیا کہ گویا امام بخاری نے اسناد کی اہمیت کو کم کر دیا ہے، پھر جب فواد سزگین سے مناقشہ کیا گیا کہ یہ تو بڑی علمی غلطی ہے، حدیث معلق کے معنی وہ نہیں ہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں، تو وہ اپنی رائے سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ بس اسی پر اکتفا کرتا ہوں، وقت ختم ہو گیا ہے۔

مولانا تقی الدین ندوی کے بعد جناب مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندوی امیر جماعت اسلامی ہند نے عربی میں اپنا مقالہ پیش کیا، مقالہ کا موضوع تھا نظرۃ خاطفۃ علی موضوع الاسلام والمستشرقین، مولانا نے اردو میں بھی اس کا خلاصہ زبانی پیش کیا۔

مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندوی | مولانا نے فرمایا کہ میں کم سے کم وقت لوں گا' الاسلام والمستشرقین کے موضوع پر دارالمصنفین کے اندر اس اجتماع کا منعقد ہونا اور ہندوستان اور باہر کے بڑے بڑے لوگوں جن کا علمی مقام و درجہ ہے' حصہ لینا اس بات کی خوش خبری ہے کہ ان شاء اللہ اس موضوع کا حق پوری طرح سے ادا ہوگا، اسی کے ساتھ اس بیداری کا بھی پتہ چلتا ہے جو ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر اور عالم اسلام میں پائی جاتی ہے، اس قسم کا کوئی بھی اجتماع کسی بھی اسلامی ملک میں ہو سکتا تھا لیکن ہندوستان کا استحقاق کچھ کم نہیں ہے، اس سلسلہ میں دارالمصنفین کی نمایاں خدمات ہیں اور جس کی صدارت میرے رفیق و دوست مولانا ابوالحسن علی ندوی کے ذمہ ہے، اس لیے اس کا نیا

استحقاق تھا، اور یہ اجتماع یہیں ہونا چاہیے تھا، اسی کے ذیل میں میں نے اپنے مقالہ میں دارالمصنفین کی علمی خدمات کا ذکر کیا ہے، یہاں سے شائع ہونے والی کتابوں کا بھی نام لیا ہے، جو ایک طرح سے سارے عالم اسلام کے لیے قیمتی سرمایہ ہے، مستشرقین کے بارہ میں میں اپنے تاثرات کا اظہار مختصر طریقہ پر کر دینا چاہتا ہوں، میں نے یہ لکھا ہے کہ مستشرقین کی جو خدمات ہیں ہم کو ان کی قدر کرنی چاہیے، اس کی طرف سے غفلت کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ ان کی کوششوں کی بدولت بہت سی قیمتی قدیم کتابیں حاصل ہو سکیں، جن سے بہت سے لوگ واقف نہیں تھے، اور وہ دنیا کے مختلف کتب خانوں میں دفن تھیں، یہ بہرحال بہت قیمتی چیزیں ہیں اور ان سے ہم بہت کچھ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، لیکن مستشرقین کی کوششوں کے سلسلہ میں ہم کو چند باتیں مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے، سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ان لوگوں نے جو کوششیں ہماری قدیم کتابوں کو شائع کرنے کے سلسلہ میں کی ہیں وہ کسی بڑے مقصد کے لیے نہیں تھیں، بلکہ درحقیقت ان کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب یورپ کا سیاسی غلبہ ساری دنیا پر ہو چکا تھا اور اسکی ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ مشرق کے افکار و حالات سے واقفیت حاصل کی جائے، اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مستشرقین سامنے آئے، دوسری چیز جس کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ چاہے یہ لوگ جو بھی خدمات انجام دے رہے ہوں ان میں استثناء ضرور ہے، لیکن اکثریت ان لوگوں کی ہے جو صلیبی جنگوں کے نتیجہ میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پیدا ہونے والی نفرت کے اثرات سے بالاتر نہیں ہو سکے ہیں، اور اسی بناء پر کم لوگ ہیں جو حق کو جاننے کے بعد اس کا صحیح حق ادا کرنے کے لیے تیار ہوں، میں نے مثالیں دی ہیں کہ کس کس طرح ان لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو مجروح کرنے اور اسلام کو غلط شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اسلام اور مستشرقین کے سلسلہ میں اپنے ان مختصر خیالات کے بعد میں سنہ

دو تین باتوں پر خصوصیت سے توجہ دلائی ہے، پہلی بات تو یہ ہے کہ جب تک مستشرقین کو یہ مقام حاصل رہے گا کہ وہ علوم اسلامی کے سلسلہ میں مسند و مرجع سمجھے جاتے رہیں، اس وقت تک بلاشبہہ ان کو موقع ملتا رہے گا کہ وہ مسلمانوں میں شکوک و شبہات پیدا کرتے رہیں، اس لیے ہمیں غافل نہ رہنا چاہیے ہم کو آگاہ ہو کر مسلمانوں کو آگاہ کرتے رہنا چاہیے کہ اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کی کیا کوششیں ہو رہی ہیں، تاکہ ان کا مناسب جواب دیا جا سکے، دوسری بات یہ ہے کہ اسلام کے فضائل، مناقب اور محاسن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے مثبت انداز میں ہمیں چیزیں شایع کرنی چاہئیں، جن کا علمی اور تحقیقی لحاظ سے درجہ بہت بلند نہ ہو تو مستشرقین کی کتابوں سے فروتر بھی نہ ہو، اس لیے کہ اس کے بغیر ہم لوگوں کو ان کی کتابوں کے مطالعہ سے باز نہیں رہ سکتے، جب تک کہ اس کا صحیح بدل نہ مہیا ہو، آخری بات جس پر میں نے زور دیا ہے کہ جہاں یہ دونوں باتیں ضروری ہیں کہ ان کی غلط باتوں سے واقف ہونے کے بعد بروقت تردید کی جائے، اور اسلام کے تعارف کے لیے نئی نئی چیزیں شایع کی جائیں وہاں میرے نزدیک سب سے بڑی ضرورت یہ بھی ہے کہ ہم اسلام کو ایک زندہ نمونہ کے طور پر دنیا کے سامنے اپنے انفرادی اور اجتماعی عمل کے ذریعہ لانے کی کوشش کریں، تاکہ لوگ سمجھ سکیں کہ واقعی اسلام کیا ہے، رسول اللہ کی سیرت کیا تھی، ہم اپنے عمل سے یہ ثابت کریں کہ رسول اللہ صرف مسلمانوں کے رسول نہ تھے، بلکہ آپ تمام دنیا کے لیے ہادی و رہنما بنا کر بھیجے گئے تھے، اور آپ ہی کی دینی تعلیمات میں ساری مشکلات و مسائل کا حل مضمر ہے، جن سے اس وقت دنیا دوچار ہے،

آخر میں میں نے اپنے محترم دوست سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کا شکریہ ادا کیا ہے کہ انھوں نے اس جلسہ میں شرکت کی دعوت دے کر مجھے اس کا موقع عنایت فرمایا کہ میں آپ حضرات کے افکار و خیالات سے استفادہ کر سکوں اور باہر کے اور ملک کے گوشہ گوشہ سے جو مہمان آئے ہیں

من کی ملاقات سے مشرف ہوسکوں ، والسلام علیکم ۔

ظفر اسحاق صاحب | مولانا کے اس مقالہ کے بعد جناب ظفر اسحاق انصاری صاحب نے کہا کہ مولانا کے اس مقالہ میں بڑی قیمتی تجاویز ہیں اور بڑے قیمتی مشورے ہیں ، خاص طور پر مسلمان اہل علم کے لیے ، بلکہ تمام مسلمانوں کے لیے ، اس لیے کہ علمی میدان میں کام کرنے والے خواہ سب لوگ نہ ہوں ، لیکن اسلام پر عمل کرنے کی ذمہ داری ہر مسلمان پر ہے ، اور جب تک اسلام کا صحیح نمونہ سامنے نہ آجائے ، اسلام کے بارے میں غلط فہمیوں کا پیدا ہونا ایک فطری امر ہے ، ہم کچھ کہیں لیکن دنیا کی ریت یہی ہے کہ وہ درخت کو اس کے پھل سے پہچانتی ہے ، تو ہم سب مولانا کے ان قیمتی مشوروں اور تجویزوں کے لیے ان کے شکر گذار ہیں ، ابھی متعدد اہم مقالے پیش ہونے ہیں ، اگر کوئی انتہائی اہم سوال ہے تو اس کی گنجایش موجود ہے ، لیکن اگر کوئی بہت زیادہ اہم سوال نہیں ہے تو میری گذارش ہے کہ مجھے اجازت دی جائے کہ میں اگلے مقالہ نگار کو زحمت دوں ، اس کے بعد جناب سید حامد صاحب وایس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو دعوت دی جاتی ہے آپ کے مقالہ کا عنوان ہے "عوامل اور رد عمل" ۔

سید حامد صاحب | سید حامد صاحب نے فرمایا کہ میرے خیال سے وقت بہت کم ہے ، میں شروع میں چند عنوانات کا ذکر کیے دیتا ہوں ، جو وقت بچے گا میں اس میں کچھ حصہ پڑھ دوں گا ، پہلا عنوان یہ ہے کہ مستشرقین سے ہمیں گلہ کیوں ہو سه

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم　　　　که بامن انچہ کرد آں آشنا کرد

یعنی ہم نے جب سے تحقیق کے میدان کو چھوڑا اور اس کو یکسر مستشرقین کے سپرد کر دیا کہ تم آؤ اس میدان میں ، اس کے بعد نتیجہ ظاہر تھا ، اس سلسلہ میں ہم کو مستشرقین سے کیا شکایت ہوسکتی ہے ، لیکن اس سے زیادہ شکایت ہم کو اپنے سے کرنا چاہیے ، مستشرقین کے انداز بیان کا اگر مطالعہ کیا جائے

یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں عیسائیوں کو مسلمانوں سے زیادہ خطرات ہوئے اس وقت ان کے اعتراضات کی شدت بڑھ گئی، اور جب انھوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کو خطرہ نہیں رہا تو ان کے اعتراضات میں کچھ کمی آئی، یہ اتار چڑھاؤ برابر ہوتا رہا، اس آخری دور میں مستشرقین نے ایک خاص روش اختیار کی ہے، جس میں وہ کھل کر اور شدت کے ساتھ مخالفت نہیں کرتے ہیں بلکہ سلیقہ اور قرینہ سے وہ اعتراضات کرتے ہیں جو بعد میں خلش وخلفشار کا باعث ہوتے ہیں، مستشرقین کے پہلے ادوار اور اس دور میں یہ بھی فرق ہے کہ پہلے ان کے مخاطب زیادہ تر اہل یورپ اور اہل عالم ہوتے تھے، اب ان کا روئے سخن اہل اسلام کی طرف ہے اور ان کی کوشش یہ ہے کہ اب مسلمان راسخ العقیدہ نہ رہیں، بلکہ وہ شبہات سے دوچار ہو جائیں، یہ سمت کا فرق ایک اہم بات ہے جس کی طرف میں توجہ دلاؤں گا، ہندوستان میں ہماری ملت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی، ایک تو وہ ہے جو دین کا پاسبان ہے، دوسرا وہ ہے جو جدید تعلیم سے واقف ہے، ملت کی یہ تقسیم خطرہ کا نشان ہے، اور اگر ہم نے اپنے ان طلبہ اور ان بچوں کو جو جدید تعلیم پاتے ہیں ان کے دین اور ان کی تہذیب سے واقف نہ کرایا تو مستشرقین کے خلاف ہماری کوششیں کامیاب نہ ہوسکیں گی، میں نے یہ بھی عرض کیا ہے کہ مستشرقین کے عناد اور ان کی ریشہ دوانیوں کے خلاف ہمارا ردعمل ہمیشہ جذباتی ہوتا ہے، ہم تدبر اور سنجیدگی سے کام نہیں لیتے، ہم یہ کہہ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ انھوں نے بڑی اسلام دشمنی کی ہے، لیکن کبھی سنجیدگی سے یہ نہیں سوچتے کہ جتنی محنت انھوں نے کی ہے اس کا سواں حصہ بھی ہم من حیث القوم کرتے اور ہماری کتابیں بھی چھائی ہوئی رہتیں تو ہم کو مستشرقین سے شکایت نہ ہوتی، ہم نے جو کچھ کام کیا ہے اس کو انگریزی زبان میں منتقل کرنا ضروری ہے، کیونکہ انگریزی دنیا کی عالمی زبان ہو گئی ہے، بہت کچھ جو ہم کر رہے ہیں یا جو قابل قدر تحقیقی کام کیے ہیں ان میں بہت کم ایسے ہیں جو انگریزی یا یورپ کی زبانوں میں منتقل ہوئے ہوں، میں نے یہ بھی عرض کیا ہے اور ابھی

میں مولانا ابوالیث صاحب سے متفق ہوں کہ اقوال سے زیادہ اعمال کے ذریعہ موثر تردید ہوتی ہے، اس کی مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں، مستشرقین جب تک مسلمانوں سے دور رہے ان کے عناد میں شدت رہی اور جب وہ مسلمانوں کے قریب آئے تو مسلمانوں کے بارہ میں ان کا رویہ بدلنا شروع ہوا، اس کے بہت سے شواہد ہیں، شاعری میں ایک صنف ہے تضمین، اور اقبال نے غنی کاشمیری کے ایک شعر پر تضمین کی ہے جو غالباً اردو زبان کی سب سے بہتر تضمین ہے، میں اس کے چند اشعار پیش کرتا ہوں

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے ۔۔۔ وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

اس کے بعد اقبال نے بتایا ہے کہ ہم جہان بین و جہان بان و جہان آرا تھے، اسلام کی عظمت کا ذکر کیا ہے، پھر وہ کہتے ہیں ؎

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی ۔۔۔ نہیں دنیا کے آئین مسلم سے کوئی چارا

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی ۔۔۔ جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشا کن ۔۔۔ کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

گویا اہل فرنگ نے ہماری دولت، سطوت اور اقتدار تو چھینا ہی تھا، ہمارا سب سے قیمتی سرمایہ یعنی ہمارے علوم بھی چھین لیے، کتابوں سے مراد علوم ہی نہیں وہ زاویۂ نگاہ بھی ہے جو علم کا سرچشمہ ہے، ہم سے وہ زاویۂ نگاہ چھین لیا، ہم سے جستجو اور آرزو چھین لی، ہم سے وہ جذبہ چھین لیا جو حقیقت کی تہ تک پہونچنے کے لیے بے تاب رہتا ہے، جو علم کے وسیلہ سے کائنات کو تسخیر کرتا ہے جو انسان کے ذہنی افق کو بے کراں اور اس کے حوصلہ کو فلک شگاف بنا دیتا ہے، کتابیں ہاتھ سے کیا گئیں، آفاق کی قیادت ہاتھ سے چھن گئی، پیش رفت کا اسم اعظم حافظہ سے محو ہو گیا، جو صاحب اجتہاد تھے زندانی تقلید بن گئے، جو عہد آفریں تھے وہ عہدی ہو گئے، ہماری کاہلی اور ہماری جہالت نے یہ دن دکھایا کہ ہمارے علوم و فنون، ہماری ادبیات، ہماری تاریخ و جغرافیہ سب اغیار کے ہاتھوں میں

چلے گئے، ان سب کے لیے ہم دست نگر ہو گئے، چنانچہ ہم اپنی تہذیب اور اپنی میراث کو مغرب کی نگاہ سے دیکھنے لگے، اب ہم شکوہ سنج ہیں کہ اہل مغرب نے اپنی کتابوں میں ہمارے ساتھ انصاف نہیں کیا، مستشرقین کا رویہ ہمارے ساتھ غیر منصفانہ اور معاندانہ رہا، کوئی نہیں بتاتا کہ

اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

اقبال ہماری نادر کتابوں کو یورپ میں دیکھ کر درد سے تڑپ اٹھا، اس نے اس میں ہمارے علمی افلاس کی داستان عبرت پڑھی، یورپ کو شغل علم سونپ کر ہم جہالت کے نہاں خانوں میں چھپ گئے، گویا ایک فرض تھا جس کو ہم ادا کر چکے، ایک بوجھ تھا جس کو ہم اتار چکے، اپنی پشت سے ہم نے علم کا پشتارہ پھینک کر دم لیا اور اب ہم شکایت کرتے ہیں کہ مستشرقین نے ہماری اس طرح حق تلفی کی، ہمارے ساتھ یہ ظلم کیا، علم اور تحقیق، ریاضت اور جستجو سے کنارہ کش ہو کر ہم ہی نے تو انھیں دعوت دی تھی کہ ہم چلے، اب سیاہ وسفید تمھارے ہاتھ میں ہے، اب اگر انھوں نے ہمارے نامۂ اعمال کو سیاہ کر دیا تو حیرت کیا، شکایت کیوں؟ قدرت خلاء کو گوارا نہیں کرتی چنانچہ علم کو جب ہم نے چھوڑا، تحقیق سے جب ہم نے منھ موڑا تو اہل مغرب نے اس خلاء کو پُر کیا، اب ان سے یہ توقع کرنا کہ وہ ہمارے ساتھ انصاف کریں گے، ایک خیال خام ہے، ان کے متعلق یہ سوچنا کہ وہ ہمارے دین، ہماری تاریخ اور تہذیب کو اسی زاویۂ نگاہ سے دیکھیں جس سے ہم دیکھتے ہیں، ایسی بات کی امید کرنا ہے جو ناممکن ہو، نارمن ڈینیل نے اپنی کتاب ''اسلام اور مغرب، تاثرات کی تشکیل'' میں اسلام کے متعلق مغربی رویہ، احساسات، ردعمل اور نگارشات کا جائزہ لیا ہے، کتاب کے آغاز میں جو لکھا ہے اس کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، نقل کفر کفر نباشد گویا یہ بیشتر مستشرقین کے طرز عناد کا اعتذار ہے اس سے اس کی نیت کا اندازہ ہوتا ہے، فاضل مصنف کہتا ہے کہ جب تک اسلام ایک بڑھتی اور چڑھتی ہوئی طاقت تھا، اس وقت تک مغرب کے عیسائی اس کو اپنے مذہب کے لیے سب سے بڑا خطرہ تصور کرتے تھے

اس وقت وہ مسیحیت کے دفاع کے لیے اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف زہر اگلتے ہیں۔ انھوں نے ٹھان لیا تھا کہ اسلام کے چہرہ کو داستانوں روایتوں اور افواہوں کے سہارے کتابوں میں اس قدر مسخ کرکے پیش کیا جائے کہ اہل یورپ کو رغبت کے بجائے اس سے کراہت ہونے لگے، چنانچہ انھوں نے اسلام کا رشتہ بت پرستی سے جوڑنے میں بھی تامل نہ کیا اور سارا یورپ مسلمانوں کو بت پرست سمجھنے لگا، ستم بالائے ستم اس دین کو جو فرد کی مسئولیت، سادگی، خود ضبطی، راستی اور عبادت پر اس قدر زور دیتا ہے، انھوں نے ہوسناکی اور عیش پرستی کا مجموعہ قرار دیا۔ مسلمانوں کی تعریف بھی اگر کبھی کی تو عیسائیوں کو غیرت دلانے کے لیے یعنی مسلمان جو گمراہ اور سیہ کار ہیں، وہ بھی تم نام نہاد عیسائیوں سے بہتر ہیں۔ ڈینیل صاحب کا یہ تجزیہ بھی صحیح ہے کہ مسلمانوں کے متعلق یورپین رائے عامہ کو کسی قدر درست کرنے میں ان اکابر کا بھی دخل ہے جو مسیحی اور صلیبی جنگوں میں ان سے ٹکرائے، ان میں سرفہرست نام صلاح الدین ایوبی کا ہے، جن کا نام صلادین بن کر یورپ کے گھر گھر پہونچ گیا، صلاح الدین کی شجاعت، انصاف، رحم دلی، فراخ دلی، رأفت و لطف نے انھیں یورپ میں بھی ہیرو کے منصب پر فائز کیا، کسی یورپین بادشاہ کو وہ عام مقبولیت حاصل نہیں ہوئی، حالانکہ انھوں نے عیسائیوں کو شکست فاش دی تھی، یہ بات عبرتناک بھی ہے اور دلچسپ بھی کہ مسلمانوں کے اقبال کے دور میں یہودی اور عیسائی اس بات سے تقویت و توانائی حاصل کرتے تھے کہ کلام مجید میں ان کے مذاہب کا ذکر ہے، وہ ان کا دور محکومیت تھا، رابرٹ نے لکھا ہے کہ اگرچہ شریعت اسلامی بہت سے مقامات پر تبسم خیز ہے، بصورت اصل میں ہمارے مسیحی مذہب کے منشور کی تقدیس اور فضیلت کی سب سے بڑی شہادت اور سب سے مضبوط بنیاد ملتی ہے۔

سید حامد صاحب کے بعد ڈاکٹر سید سلمان ندوی کو مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی، ظفر اسحاق انصاری صاحب نے کہا کہ سید سلمان ندوی صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں، دارالمصنفین اور یہ جگہ ان کا اپنا گھر ہے، مولانا سید سلیمان ندوی کے آپ خلف رشید ہیں اور جنوبی افریقہ میں اسلامی علوم و تاریخ کے استاد ہیں۔

ڈاکٹر سید سلمان ندوی | ڈاکٹر سید سلمان ندوی نے حمد و صلوٰۃ کے بعد اپنی تقریر کا آغاز کیا اور کہا کہ امیر مینائی کا ایک بہت مشہور شعر ہے ؎

امیر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

سید حامد صاحب نے ابھی اپنا مقالہ پڑھا، ان کے خیالات اور میرے خیالات خاصے ملتے ہوئے ہیں لیکن (مزاحاً) ہم لوگوں نے ایک دوسرے سے بالکل پوچھا نہیں ہے، ہماری غربت و افلاس کا آج یہ عالم ہے کہ ہمارے مسلم طلبہ ایوروز کو تو جانتے ہیں ابن رشد کو نہیں جانتے، اوی سینا کو جانتے ہیں، ابن سینا کو نہیں جانتے، رازند کو جانتے ہیں، رازی کو نہیں جانتے، حد یہ ہے ہمارے افلاس کی کہ جبرالٹر کو جانتے ہیں جبل الطارق کو نہیں جانتے، یہ وہ مثالیں ہیں کہ جن سے کم از کم یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو تعلیم ہم نے حاصل کی وہ کہاں سے حاصل کی اور وہ کس رخ پر لے جا رہی ہے، ۱۹۴۷ء میں جب میں شکاگو یونیورسٹی میں تھا، اور وہاں تاریخ اسلام کا کورس لیا تھا تو اس وقت وہاں کی بہت مشہور مستشرقہ پروفیسر نبیا ایبوٹ تھیں، وہ بہت سی کتابوں کی مصنفہ ہیں، ان کی کتاب "عائشہ دی بیلوڈ آف پرافٹ" بہت مشہور ہے، لیکن ان کی معرکۃ الآرا تصنیف "نارتھ عربک اسکرپٹ" ہے، اور جس طرح مستشرق شاخت کا جواب فواد سزگین نے دیا ہے جیسا کہ ڈاکٹر ظفر اسحاق نے بتایا، اسی طرح نبیا ایبوٹ نے نارتھ عربک اسکرپٹ کی دوسری جلد میں شاخت کا بہت مدلل جواب دیا ہے، گو پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے صنم خانے سے تو ملے، کعبہ سے نہیں ملے، وہ میرے والد مرحوم سے بھی واقف تھیں، میرے والد صاحب سے ان کا ایک علمی مناظرہ "اسلامک کلچر" حیدرآباد دکن کے رسالہ میں ہوا تھا، یہ مناظرہ لفظ ہمایونی پر تھا، یعنی ہمایونی کا مطلب "رائل" ہے یا اس کا مطلب خود بادشاہ ہمایوں سے ہے، انھوں نے مجھے ایک مضمون لکھنے کے لیے دیا، جس کا عنوان تھا "اسلام اور مسیحیت دو بہنیں ہیں" میں نے اس میں یہ لکھا کہ اگر اس سے یہ مراد ہے کہ دونوں کا منبع ایک ہے تو بس کافی ہے، مشابہت یہیں ختم ہو جاتی ہے، اس کے بعد جو اختلافات اور بنیادی فرق تھے میں نے ان کو ظاہر کر کے ان کے سامنے پیش کیا تو ان کا ریمارک یہ تھا کہ میں اپنے مذہب کا دفاع کرنا چاہتا ہوں، مطلب یہ تھا کہ میں اگر کچھ آبجکٹیو یعنی معروضی ہوں تو پھر مجھے کچھ تنقید بھی کرنی چاہیے، واقعہ یہ ہے کہ مستشرقین نے اب تک جو کچھ لکھا ہے اور جو علمی تحقیق کی ہیں، ہم اس کا انکار نہیں کرتے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی ہمارے گلے میں [illegible] ڈالتا رہے اور ہم اسے احسان سمجھتے ہوئے اپنا سر جھکاتے رہیں، مستشرقین کے درجات ہیں، [illegible]

پادری ہیں اور دوسرے الگ ہیں، درجہ بدرجہ یہ لوگ مختلف دور میں بدلتے رہے اور اب اور آج سے چند سال قبل مستشرقین سول سروس میں بھی موجود تھے، جن کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنی حکومت کو بتائیں کہ کس قوم سے الجھنا مقصد ہے، یہ حکومت کو اطلاع بہم پہونچاتے اور مشورہ دیتے رہے کہ کس طرح ان سے نپٹا جائے، ایران کے واقعہ کے بعد صدر کارٹر نے مستشرقین اور چند مسلم مصنفین اور اسکالرز کو جو امریکہ میں تھے، دعوت دی اور اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ میں ان کی ایک کمیٹی بنائی، جس نے ان کو یہ مشورے دیئے کہ ایران کو کس طرح کمزور کیا جا سکتا ہے، یہ فریاد بے کار ہے اور یہ شکوہ بے سود ہے کہ کس مستشرق نے کیا لکھا اور کیوں لکھا، اگر وہ نہ لکھتے تو مستشرق ہی کیوں کہلاتے، ان کا انداز بدل گیا، اس وقت سب سے زیادہ ہمدرد مستشرق مونٹگمری واٹ ہیں، جن کو آج عالم اسلام میں مقبولیت حاصل ہے، اور میں انتہائی تکلیف والم کے ساتھ کہتا ہوں کہ مسلم دنیا میں سیرت کی سیرت کانفرنسوں میں ان کو دعوت دی جاتی ہے، پاکستان کی سیرت کانگریس میں بھی وہ بلائے گئے اور ابھی چند ماہ ہوئے جب میں کراچی میں تھا تو ایک اور مستشرق کو دعوت دی گئی، ٹی۔ وی پر ان کا انٹرویو لیا گیا، جن لوگوں نے ان سے انٹرویو لیا وہ اور بھی زیادہ غریب الفہم اور غریب الفکر تھے، وہ ان سے رسول اللہ کے متعلق رائے پوچھ رہے تھے، رسولؐ کی نبوت کی شہادت ان سے چاہتے تھے، منٹگمری واٹ کی کوئی کتاب بھی آپ پڑھیں وہ طنز سے خالی نہیں ان کی ایک کتاب جس کو عالم اسلام میں بڑی ہمدردی سے دیکھا گیا، اور جس کی بنا پر یہ سمجھا گیا کہ وہ اسلام کے ہمدرد ہیں، اس سے ایک اقتباس سنیئے جس میں وہ عجیب کشمکش میں مبتلا ہیں، ع کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے، وہ کہتے ہیں رسول اللہؐ سے خطا و نسیان ہوئے، مگر وہ قصداً نہیں تھے، آپ ان کو معاف کر دیجیے کہ یہ غلطیاں ہوا ہی کرتی ہیں، دوسرے اقتباس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اگر رسول اللہؐ کی حیات کو دیکھیں تو ان کے اپنے عہد کے مطابق ان کی زندگی بڑی اچھی اور صاف ستھری تھی لیکن ہاں آج کل کے معیار سے ان کی ذات ویسی اعلیٰ نہیں سمجھی جا سکتی ہے، جو ذہن کچا ہے ایسی باتیں کسی تنقید کے بغیر قبول کر لیتا ہے، میں ایک دوسری چیز کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں

جس کا رونا نہیں ہے اور بقول سید حامد صاحب ہماری ذمہ داری اپنے آپ سے ہے، مسلمان اسکالرز، خصوصاً ٹیچر جو اس وقت یورپ، امریکہ اور افریقہ میں ہیں جب یہ چاہتے ہیں کہ نصاب میں ایسی کتابوں کو داخل کریں جن کو مسلمان مصنفین نے لکھا ہو، تو حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے پاس کوئی کتاب نہیں، ابھی تک سب سے مشہور کتاب جو عام طور سے پیش کی جاتی ہے، وہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی انٹروڈکشن ٹو اسلام ہے، محمد علی لاہوری کی بھی ایک کتاب ہے، ایک کتاب نیاز محمود کی شایع ہوئی ہے، مستشرقین کا رونا نہیں ہے مگر

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

ہمارے پاس اس وقت جو سرمایہ اردو میں ہے وہ بڑا کافی سرمایہ ہے، ان سے مستشرقین کے جوابات دیے جاتے رہے، مگر آج کی علمی زبان انگریزی ہے، آپ اسے تسلیم کریں یا نہ کریں اس وقت اردو زبان کے ذخیرہ سے ہندوستان اور پاکستان کے مسلمان فائدہ اٹھا سکتے ہیں، لیکن اس وقت ہماری لڑائی ہندوستان پاکستان میں نہیں ہے، لڑائی اس وقت یورپ اور امریکہ میں لڑی جارہی ہے، اس لیے میں یہ تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں کہ دارالمصنفین، ندوۃ المصنفین یا اسی قسم کے دیگر ادارے اپنی تمام کتابوں کو انگریزی میں منتقل کرنے کا ایک مستقل پروگرام اور ایک جامع منصوبہ تیار کریں اور اس کے لیے خاطر خواہ آدمی مقرر کریں، جن کی انگریزی بہتر سے بہتر ہو، بہت زمانہ ہوا، مولانا شبلیؒ نے ندوہ کے مخالفین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ندوہ نے ایک سید سلیمان پیدا کیا، بہت کیا، میں کہنا چاہتا ہوں کہ دارالمصنفین نے اب تک جو خدمات انجام دی ہیں، وہ بہت قیمتی ہیں، میرا خیال ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ وہ اپنا دل کچھ بدلے، وہ اپنی کتابوں کو انگریزی میں منتقل کرے، حضرۃ الاستاذ مولانا علی میاں کی کچھ کتابیں انگریزی میں منتقل ہوئیں جن سے ہم کو کچھ سہارا ملا، ہمارے یہاں مستقل ایک کورس ہے، اسلامک ریفارمر پر، لیکن اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں، تاریخ دعوت و عزیمت کا انگریزی ترجمہ ہوا تو وہ بہت کام آئی، مطلب یہ ہے کہ ترجمہ کرکے اس کے لیے باقاعدہ پریس قائم کیے جائیں، طباعت اور اس کی نکاسی کا

بھی پورا انتظام ہو، دوسری تجویز یہ ہے کہ ٹیکسٹ بک اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک کی تیار ہوں، تاکہ یہ یورپ اور امریکہ جائیں تو ہم ان سے فائدہ اٹھا سکیں، یہ فریاد و شکوہ چھوڑ دیں، خود جو کرنا ہے کریں۔

ڈاکٹر سلمان ندوی کی اس تقریر کے بعد خاکسار نے چند باتیں عرض کیں، ابھی دارالمصنفین کا ذکر ہمارے بھائی ڈاکٹر سلمان ندوی نے کیا جس میں انھوں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ دارالمصنفین کی ساری کتابوں کا ترجمہ انگریزی میں کیا جائے، دارالمصنفین نے سیرت اور علوم اسلامیہ پر جتنا کام کیا ہے اس پر اس کو فخر ہے، اگر آپ اجازت دیں تو کہوں کہ ایک بار ڈاکٹر اقبالؒ اور سید صاحبؒ کی گفتگو افغانستان کے سفر میں ہوئی تو سید صاحبؒ نے ڈاکٹر صاحبؒ سے یہ فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب! جب تک آپ کی شاعری ہندوستان میں پڑھی جائے گی اس وقت تک اسلام ہندوستان میں زندہ رہے گا، ڈاکٹر صاحبؒ نے بڑے عجز و انکسار سے فرمایا کہ نہیں، جب تک علامہ شبلیؒ اور دارالمصنفین کی کتابیں ہندوستان میں باقی رہیں گی، ہندوستان میں اسلام باقی رہے گا، اس موقع پر سر راس مسعود بھی موجود تھے، انھوں نے کہا کہ آپ حضرات اس معاملہ میں اختلاف کیوں کرتے ہیں، اگر یہ کہا جائے کہ ڈاکٹر اقبال کی شاعری اور مولانا شبلی اور دارالمصنفین کا لٹریچر جب تک ہندوستان میں باقی رہے گا، ہندوستان میں اسلام بھی باقی رہے گا، یہاں سے سیرت پر سات جلدیں شائع ہوئی ہیں، صحابۂ کرامؓ پر ۱۲ بارہ جلدیں لکھی گئیں، تاریخ اسلام پر بھی ۱۲ بارہ جلدیں مرتب ہوئیں، تابعین، تبع تابعین، ائمۂ اسلام، محدثین اسلام، صوفیائے اسلام اور حکمائے اسلام پر بھی بہت سی کتابیں شائع ہوئیں لیکن اب ہم سے یہ تقاضا کیا جاتا ہے کہ ان کتابوں کا ترجمہ ہندی میں کر دو، ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ان کو منتقل کر دو، ابھی عرب سے جو فضلا تشریف لائے ہیں، وہ ہماری علمی نمائش دیکھنے کے لیے تشریف لے گئے تو میں نے ذکر کیا کہ سیرت کا ترجمہ ترکی، فارسی، تامل اور گجراتی میں ہو چکا ہے یہ سن کر انھوں نے جب یہ فرمایا کہ کیا عربی ہی ایسی مظلوم زبان تھی جس میں اب تک سیرت کا ترجمہ نہیں

ہو سکا ہے تو میری گردن ندامت سے ضرور جھک گئی، میں نے عرض کیا کہ سیرت کا عربی ترجمہ اسمٰعیل ندوی مرحوم نے کیا ہے، لیکن وہ اب تک شائع نہیں ہو سکا ہے، دارالمصنفین کو جو لٹریچر ایک خاص مقصد کے تحت پیش کرنا تھا وہ کر چکا، اب ہم کو توقع یہ ہے کہ جو کتابیں جن لوگوں کو پسند ہیں کیا وہ ان کے ترجمے کے لیے آگے نہیں بڑھ سکتے، ہم تو ڈاکٹر سلمان ندوی سے یہ کہتے ہیں کہ تم کو جو موقع میسر ہے، ہم تو اپنے محدود ذرائع یا کسی اور وجہ سے اپنے کام کا پھیلاؤ نہیں کر سکتے ڈاکٹر سلمان ندوی اور ان کے جیسے دوسرے دانشور اپنے ذمہ یہ کام لے لیں کہ دارالمصنفین کی جو کتاب ان کو پسند ہو اس کو وہ انگریزی زبان یا کسی بھی زبان میں ترجمہ کر دیں، سارا بار ہم پر کیوں ڈالا جائے، ہم سے کہا جاتا ہے کہ یہ بھی کرو وہ بھی کرو، لیکن یہ بھی تو سوچنا چاہیے کہ ہمارے ذرائع کتنے ہیں، اگر سب کام ہم اپنے ذمہ لے لیں تو جو اصل کام ہے وہ بھی جاتا رہے گا، اس وقت دنیا کے نامور علماء موجود ہیں، ان کو میں یہی دعوت دیتا ہوں، کراچی کی سیرت کانگریس میں یہ تجویز پیش ہوئی تھی کہ سیرۃ النبیؐ کے ترجمے مختلف زبانوں میں کر دیے جائیں اور میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں، سیرت پر شاید کسی دوسری زبان میں اتنی مکمل اور جامع کتاب شائع نہیں ہوئی، ہمیں تو توقع تھی کہ جو دوسری زبانوں کے جاننے والے ہیں وہ ہمارا بوجھ ہلکا کریں گے، ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم نہ تو رائلٹی لیں گے نہ کوئی دوسرا مطالبہ کریں گے، ہمارا تو مشن یہ ہے کہ اسلام کا پیغام دنیا کے ہر گوشہ میں پہونچے، اگر وہ یہ کام اپنے ذمہ لے لیں تو ہم ان کے بڑے ممنون ہوں گے۔

خاکسار کے ان معروضات کے بعد جناب عبدالصبور مرزوق کو دعوت دی گئی، اس موقع پر حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے فرمایا کہ ڈاکٹر عبدالصبور مرزوق رابطۂ عالم اسلامی کے ڈائرکٹر جنرل ہیں اور آج ہی یوگنڈا سے تشریف لائے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالصبور مرزوق | ڈاکٹر عبدالصبور مرزوق نے رابطۂ عالم اسلامی کے مکمل تعاون کا ذکر کیا۔

انھوں نے بتلایا کہ سیرۃ النبیؐ کا انگریزی ترجمہ رابطہ کی جانب سے بہت جلد شایع ہونے والا ہے، سیرت کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب نے اپنی کتاب السیرۃ النبویۃ فی القرآن کا ذکر کیا، رابطہ کے سلسلۂ دعوۃ الحق کی بعض کتابوں کا بھی ذکر کیا، اس سلسلہ نے ایک رسالہ الرسول فی کتابات المستشرقین یعنی 'سیرت رسول مستشرقین کی تحریروں میں' کا ذکر خصوصیت سے کیا مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہا کہ یہ سب انفرادی کوششیں ہیں، اب ضرورت اس بات کی ہے کہ تاریخ اسلام نئے سرے سے لکھا جائے اور سیرت پر جو کتابیں موجود ہیں انھیں نئے اسلوب اور نئے طرز پر مرتب کیا جائے اور کوشش یہ رہے کہ سیرت کے مثبت پہلو زیادہ سے زیادہ نمایاں ہو سکیں، انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہمارے مسلم طلبہ اب اسلامی علوم میں تخصص کے لیے یورپ کا رخ نہ کریں، خود ہماری عرب یا اسلامی یونیورسٹیاں خود کفیل ہوں اور اسلامی علوم و فنون میں طالب علم کو یہ ضرورت محسوس نہ ہو کہ وہ یورپ جائے اور وہاں علم حاصل کرے، ایک بات ڈاکٹر صاحب نے بہت اہم کہی کہ مستشرقین نے جن کتابوں کو بطور مراجع پیش کیا ہے، ان کا بھی جائزہ لیا جائے، کیونکہ مستشرقین مراجع میں بھی تحریف سے کام لیتے ہیں، لہٰذا بڑی حد تک ان مستشرقین کے پیدا کردہ اشکالات، شبہات اور اعتراضات کا رد خود ان کے مراجع کے ذریعہ ہی مل جائے گا۔

ڈاکٹر صاحب کے بعد مولانا ابوالحسن علی ندوی نے فرمایا کہ سیرۃ النبیؐ کا عربی ترجمہ تیار ہے، اور میری گفتگو اس سلسلہ میں ڈاکٹر یوسف قرضاوی اور ان کے دوستوں سے ہوئی ہے، قطر میں سیرت کے ایک بین الاقوامی اجتماع میں یہ طے ہوا تھا کہ اس سلسلہ میں ایک مستقل سکریٹریٹ الامانۃ العامۃ قائم کیا جائے، یہ سکریٹریٹ اس بات کا خواہشمند ہے کہ وہ سیرۃ النبیؐ کا عربی ترجمہ شایع کرے، میں نے اس سلسلہ میں نشاندہی کی تھی کہ اس کے دو حصوں کا ترجمہ ڈاکٹر اسمٰعیل ندوی نے کیا تھا، پہلا حصہ غالباً شیخ عبداللہ ابراہیم انصاری کے پاس پہونچ چکا ہے، یا عبدالحلیم احمد

کے پاس سب سے بڑے ناشر ہیں، میری ہی فرمایش پر انھوں نے وہ نسخہ حاصل کر لیا تھا، افسوس ہے کہ ڈاکٹر اسماعیل ندوی کے اچانک انتقال کی وجہ سے اس کے دوسرے حصہ کا سراغ نہیں مل رہا ہے، وہ ترجمہ مکمل کر چکے تھے، سید صاحبؒ کی سیرت عائشہ کا ترجمہ میرے فاضل دوست مولانا ناظم ندوی نے عرصہ ہوا کر لیا تھا، وہ میرے پاس موجود ہے، میرا مشورہ تھا کہ اسے کسی عرب ناشر کو دے دیا جائے وہ اسے شایع کر دے اور وہ وہاں سے بآسانی اہل علم کے پاس پہونچ جائے، لیکن ہمارے فاضل دوست سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کی خواہش ہے کہ وہ دارالمصنفین کی مطبوعات کے سلسلہ میں شامل ہو اور وہ ندوہ کے پریس میں چھپے، ڈاکٹر عبدالصبور مرزوق نے نہایت فراخدلی کے ساتھ اس کا اعلان کیا ہے اور وہ یہ اعلان کرنے کی پوزیشن میں ہیں کہ اس سلسلہ میں رابطہ کی طرف سے جو بھی تعاون ممکن اور مفید ہو، اس کے لیے وہ تیار ہیں۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی کے ان کلمات کے بعد جناب خواجہ احمد فاروقی کو مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی، ان کے مقالہ کا عنوان تھا "مستشرقین کے تصور اسلام کا تاریخی پس منظر" لیکن تاخیر زیادہ ہونے کی وجہ سے انھوں نے مقالہ پیش نہیں کیا، اور اخیر میں صدر جلسہ جناب حکیم محمد سعید دہلوی نے صدارتی کلمات ادا فرمائے۔

حکیم محمد سعید | حکیم صاحب نے فرمایا کہ مجھے اس کا بخوبی احساس ہے کہ تاخیر بہت ہو چکی ہے، اور اس نشست کو جلد از جلد ختم کرنا چاہیے، لیکن میرا یہ خوشگوار فرض ہے کہ آج کی مجلس کے مقررین کا بصمیم قلب شکریہ ادا کروں کہ انھوں نے نہایت اہم نکات کی طرف اس موتمر کو متوجہ کیا ہے، اور شکریہ ادا کرتا ہوں ان مقالہ نگار حضرات کا جنھوں نے تاخیر کے سبب اس وقت مقالہ نہ پڑھنے کا فیصلہ کیا ہے، اور شکریہ ادا کرنا چاہیے ان مترجمین کا جنھوں نے نہایت خوش اسلوبی

اس فرض کو انجام دیا، میں نے اس موتمر میں التزام سے شرکت کی ہے اور تمام مقالات غور سے سنے ہیں، اور مسئلۂ مستشرقین اور مسئلۂ مستغربین پر احتیاط سے غور کیا ہے، اس موتمر کا رجحان بالعموم یہی رہا ہے کہ مستشرقین نے جو اچھائیاں کی ہیں ان کا اعتراف کیا جائے اور انھوں نے جو قصداً یا شرارتاً غلطیاں کی ہیں ان کا ازالہ کرنے کی کوشش کی جائے، میری رائے اس معاملہ میں یہی ہے کہ اس میدان میں ہمیں قدم بڑی احتیاط سے بڑھانا چاہیے، نہ یہ مناسب ہے کہ ہم لڑائی مول لیں اور نہ یہ صحیح ہے کہ خاموشی اختیار کریں، اس میدان میں میری اپنی رائے یہ ہے کہ اس موتمر کو اختتام سے قبل کسی حتمی نتیجے پر پہونچنا چاہیے، مجھے توقع ہے، بلکہ یقین ہے کہ اس موتمر کے منتظمین ان نکات اور ان رموز کو نوٹ کر رہے ہوں گے جن کو بالآخر تجاویز کی شکل دی جاسکے، کیونکہ اگر ہم نے تجاویز مرتب نہ کیں اور لائحۂ عمل مرتب نہ کیا تو یہ احتمال ہے کہ اس اہم موتمر سے وہ نتائج حاصل نہ ہوسکیں گے جس کے لیے ہم نے عزم و ارادہ کیا ہے، اس سلسلہ میں میری ایک تجویز یہ ہے کہ ہمیں اس موتمر کو ایک مستقل شکل دینی چاہیے، یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ کانفرنس ہر سال اعظم گڈھ ہی میں ہو اور دارالمصنفین پر اس کا بار پڑے، یہ ہوسکتا ہے کہ دوسرے ممالک بھی اس معاملہ میں پیش قدمی کریں اور اس کانفرنس میں یہ طے کرلیں کہ آیندہ کانفرنس اگلے سال کس ملک میں ہوگی، جب تک ہم اس کام کو مستقل اور مرکزی حیثیت نہ دیں گے، یہ کام خوش اسلوبی سے آیندہ انجام نہ پاسکے گا۔

جناب حکیم محمد سعید صاحب کے ان خیالات کے بعد ہی مندوبین حضرات نے کانفرنس کے آیندہ انعقاد سے متعلق اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا، خود حکیم صاحب کی تجویز تھی کہ یہ کانفرنس ہر سال منعقد ہو، بعد میں جناب یوسف قرضاوی صاحب نے قطر کی طرف سے پیش کش کی کہ وہاں کے شریعت کالج اور مرکز السنۃ والسیرۃ کی طرف سے اگلی بار اس کی مہمان نوازی کے فرائض انجام دیے جائیں گے، لیکن ان کی تجویز یہ تھی کہ اس قسم کے سمینار ہر سال کے بجائے ہر دوسرے سال پر منعقد ہوں، تاکہ اچھی طرح سے تیاری کرلی جائے، یہ سمینار پہلا تجربہ ہے اور پہلے تجربہ میں عموماً کوتاہیاں رہ جاتی ہیں، تیاری

پوری طرح نہیں ہو پاتی، اگلی بار اس کا اہتمام کیا جائے کہ لوگوں کو سیمینار کے انعقاد سے کافی قبل موضوعات دے دیے جائیں، تاکہ وہ سیمینار زیادہ مفید نتائج کا حامل ہو۔

اس موقع پر خاکسار نے عرض کیا کہ مجھے اس کی خوشی ہے کہ قطر میں اس کی دعوت دی گئی ہے لیکن میری ذاتی رائے یہ ہے کہ دو سال کا وقفہ نہ دیا جائے، اس لیے کہ اس سیمینار سے جو جذبات پیدا ہوئے ہیں، مجھے اندیشہ ہے کہ دو سال کے بعد یہ کہیں سرد نہ پڑ جائیں ویسے یہ میری ذاتی رائے ہے، میں آپ لوگوں کی رائے کا بھی طلبگار رہوں گا کہ دو سال کے بعد یہ سیمینار کرنا مناسب ہوگا یا ہر سال؟ اس کے بعد ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری نے اعلان کیا کہ اس سیمینار کی ایک کمیٹی ہے جو ان تجاویز پر غور کر رہی ہے اور اس کے بعد ان کو آخری شکل دے کر ان شاء اللہ کل سفارشات آپ کے سامنے پیش کرے گی، میری رائے یہ ہے کہ اس مسئلہ پر مزید ہم کسی گفتگو میں وقت صرف نہ کریں۔

اس کے بعد حکیم محمد سعید صاحب نے فرمایا کہ میں جناب محترم سید صباح الدین صاحب کی اس تجویز سے متفق ہوں کہ یہ سیمینار ہر سال کرنا چاہیے، بہرحال کمیٹی فیصلہ کرے گی اور امید ہے کہ اگلے سال یہ کانفرنس ان شاء اللہ پاکستان میں ہوگی، لیکن پھر انھوں نے قطر میں اس کانفرنس کے پہلے انعقاد کو بھی پسند کیا، انھوں نے ایک اہم تجویز یہ بھی رکھی کہ اس سیمینار کا ایک سکریٹریٹ یعنی ایک اساسی کمیٹی ہونی چاہیے جس کا مرکز دارالمصنفین ہو۔

خاکسار نے اس موقع پر کہا کہ میرے لیے فخر کی بات ہے کہ دارالمصنفین کو اس کا مرکز بنایا جارہا ہے، لیکن میری گذارش یہ بھی ہے کہ اس موقع پر کمیٹی کے ممبروں کے نام بھی تجویز کر لیے جائیں، بہرحال طے یہ ہوا کہ سیمینار کی کمیٹی ان سارے امور پر غور کر کے اپنی تجویز آئندہ نشست میں پیش کر دے گی۔

اس کے بعد یہ نشست ختم ہوگئی۔	(باقی)

مطبوعات جدیدہ

دعوۃ القرآن (تفسیر سورہ فاتحہ و سورۂ بقرہ و سورہ آل عمران و سورۂ نساء) | مرتبہ جناب شمس پیرزادہ صاحب تقطیع کلاں کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۳۴۶ قیمت بارہ روپیہ، پتہ۔ ادارۂ دعوۃ القرآن، ۵۹۔ محمد علی روڈ۔ بمبئی، ۳۔۔۔۔۔۴۔

غیر مسلموں میں دعوت و تبلیغ اور مختلف زبانوں میں قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر کی اشاعت کے لیے ادارۂ دعوۃ القرآن بمبئی کا قیام عمل میں آیا ہے، اس نے تھوڑے عرصہ میں کئی مفید کتابیں شائع کی ہیں اور اردو، مرہٹی، گجراتی اور انگریزی میں قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر کی اشاعت کا منصوبہ بھی بنایا ہے، ترجمہ و تفسیر کی خدمت جناب شمس پیرزادہ انجام دے رہے ہیں جن کو اچھا علمی و دینی ذوق بھی ہے، اور جو اس سے پہلے بعض عربی کتابوں کا ترجمہ شگفتہ اردو میں بھی کر چکے ہیں ابھی ابتدا سے سورۂ نساء تک کے ترجمہ و تفسیر کی اشاعت دو جلدوں میں ہوئی ہے پہلی میں فاتحہ و بقرہ اور دوسری میں آل عمران و نساء کی تفسیر ہے، اسے مرہٹی، گجراتی اور انگریزی میں بھی منتقل کرنے کا انتظام کیا گیا ہے، اور ان زبانوں میں بعض حصے چھپ بھی چکے ہیں، اردو میں اس سے پہلے قرآن مجید کی متعدد مفید اور بہتر تفسیریں لکھی گئی ہیں، مگر یہ سب عموماً ضخیم ہیں، اور بہت تفسیر کی فنی بحثوں اور دقیق مسائل پر مشتمل ہونے کی وجہ سے عام لوگوں اور غیر مسلموں کے لئے زیادہ کارآمد نہیں ہیں، اس نئی تفسیر میں فنی اور مشکل تفسیری بحثوں کو نظرانداز کرکے اختصار و جامعیت سے قرآن کے مطالب کی دلنشین تشریح کی گئی ہے، اور موجودہ زمانہ کے شکوک و شبہات کا جواب بھی دیا گیا ہے، اس کی زبان سلیس، اسلوب دلکش،

اور طریقہ بحث و استدلال موثر ہے مصنف نے اختصار کے باوجود اہم مطالب کی بقدر ضرورت توضیح و تشریح کی ہے اور آیتوں کی باہمی مناسبت، سورتوں کے عمود و نظام اور ان کے مضامین کا تجزیہ بھی کیا ہے ایک حد تک احادیث اور بائبل کے حوالے بھی دئے ہیں، اور کسی خاص نقطۂ نظر کی جا و بیجا حمایت کے بجائے قرآن کے اصل مقصد کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے اس لئے اس میں جدید تعلیم یافتہ اشخاص اور غیر مسلموں کے ذوق و تشفی کا سامان ہے مصنف نے اس میں جابجا نقشے بھی دئے ہیں اور آخر میں ایک مفصل اشاریہ بھی ہے، مگر کہیں کہیں ترجمہ ترجمانی کی حد میں آگیا ہے بعض جگہ ترجمہ میں حشو و زوائد بھی ہیں جیسے وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ کا "اور نہ وہ کہیں سے مدد ہی پا سکیں گے" خط کشیدہ الفاظ زائد ہیں اگر یہ مترجم کے نزدیک ناگزیر تھے تو ان کو قوسین میں دینا چاہئے تھا، نیز صیغۂ مجہول کا ترجمہ بلا ضرورت صیغۂ معروف سے کرنا بھی خلاف احتیاط ہے، اسی طرح عَلٰی مُلْكِ سُلَيْمَانَ کا ترجمہ سلیمان کی حکومت کی طرف منسوب کرکے نہ صرف زائد بلکہ غلط ہے "سلیمان کے عہد حکومت میں" کافی تھا بعض آیتوں کے ترجمہ سے مفہوم پوری طرح واضح نہیں ہوسکا ہے۔ حواشی میں اس کی وضاحت ضروری تھی جو نہیں کی گئی ہے۔ فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ۔ "مگر جو بات کہی گئی تھی اسے ظالموں نے دوسری بات سے بدل دیا" ظاہر ہے یہ دوسری بات توضیح طلب تھی، ترجمہ میں گو عربی جملوں کی ترتیب کا ہر جگہ بعینہٖ لحاظ ممکن نہیں ہوتا۔ مگر قرآن کے ترجمہ میں جس قدر ممکن ہو اس کی پابندی کرنی چاہئے لیکن لائق مترجم نے بامحاورہ ترجمہ کے شوق میں اس کا اکثر لحاظ نہیں کیا ہے، مصنف نے بعض آیتوں کا جو مفہوم بیان کیا ہے ان کے دوسرے مفہوم کا احتمال بھی ہے اور وہ بہت زیادہ نامناسب بھی نہیں ہے، اس لئے اسکا ذکر بھی کرنا چاہئے تھا۔

"ض"

مولانا سید سلیمان ندوی کی چند کتابوں کے جدید ایڈیشن

نقوشِ سلیمانی

سید صاحب کے ہندوستانی اور اردو زبان و ادب سے متعلق مختلف ادبی کانفرنسوں کے خطبہ ہائے صدارت، ان کی دوسری تقریروں تحریروں، تبصروں اور مقدموں کا مجموعہ جن کا انتخاب خود فاضل مصنف نے اپنی زندگی میں کیا تھا، اور نہایت اہتمام سے معارف پریس میں چھپوایا تھا، وہ اردو کو ہندوستان کی نسبت سے ہندوستانی کا نام دے کر ملک کی مشترکہ زبان بنانا چاہتے تھے، افسوس کہ ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، اور ہندی ملک کی سرکاری زبان قرار پا گئی، طبع دوم عکسی،

قیمت :- ۲۵ روپیے،

خیام

خیام کو فارسی کے ایک باکمال رباعی گو شاعر کی حیثیت سے عالمی شہرت حاصل ہوئی اور اس کی رباعیات کا یورپ اور ایشیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو گیا ہے لیکن اس کے علاوہ وہ اور بھی بہت کچھ تھا، وہ فلسفی تھا منجم تھا، ریاضی داں تھا ہیئت داں تھا، اور حکیم و طبیب تھا، جس کی طرف شعر العجم میں خیام کے تذکرہ میں مولانا شبلی نے بھی اشارہ کیا ہے، اس کتاب میں پہلی مرتبہ اس کے سوانح و حالات کے ساتھ اس کی انہی حیثیات پر بہت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، آخر میں اس کے چند نایاب فارسی و عربی کے فلسفیانہ رسائل اور اس کی مستند رباعیات بھی شامل کر دی گئی ہیں،

طبع دوم عکسی، قیمت : ۲۵ روپیے،

عرب و ہند کے تعلقات

سید صاحب نے عرب و ہند کے تعلقات پر ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد میں چند خطبے دیے تھے، یہ انہی کا مجموعہ ہے، طبع دوم عکسی، قیمت :- ۳۰ روپیہ

"منیجر"

بزم تیموریہ

یہ کتاب پہلے ایک جلد میں تھی جس میں سلاطین بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، اورنگ زیب عالمگیر، اور آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر اور تیموری شاہزادوں اور شاہزادیوں کے علمی ذوق، علم دوستی اور علم پروری اور ان سب کے دربار سے وابستہ اہل ذوق امرا، علما، فضلا اور شعرا کے تذکرہ اور ان کے علمی و ادبی و شعری کمالات اور ان کے تصنیفات کے بہترین منتخبات پر مشتمل تھا، اس کے دوسرے ایڈیشن میں اتنی اصلاح و ترمیم، تغیر و تبدل اور اس کثرت سے اضافے ہوئے کہ اس کا حجم بہت بڑھ گیا، اس لئے قدر دانوں اور مستفیدین کی سہولت کے لئے اس کو تین جلدوں میں کر دیا گیا اس میں بعض نئے ماخذوں کی مدد سے ان سلاطین، شہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور علم پروری کی تفصیلات ایسے دلچسپ اور دل پذیر انداز میں درج کی گئی ہیں کہ بانی سلطنت تیموریہ شہنشاہ بابر سے لے کر آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر تک کے عہد کے علم و ادب اور شعر و سخن کا پورا مرقع نظروں کے سامنے آجاتا ہے، پہلی جلد میں پہلے تین مغل سلاطین یعنی بابر، ہمایوں اور اکبر کے علمی ذوق اور ان کے دربار کے امراء، شعراء اور فضلاء کے تذکرہ کے ساتھ ان کے علمی کمالات اور کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے، دوسری جلد جہانگیر و شاہجہاں اور ان کے دربار کے امراء کی علم دوستی اور ان کے دور کے شعراء، ادباء، فضلاء اور ارباب کمال کے تذکرہ اور ان کے علمی کمالات پر مشتمل ہے، تیسری جلد [illegible] اورنگ زیب عالمگیر اور آخری دور کے مغل فرمانروا بہادر شاہ ظفر وغیرہ اور تمام تیموری شاہزادوں اور شاہزادیوں مثلاً گلبدن بیگم، نور جہاں بیگم، جہاں آرا صاحب مونس الارواح، اور زیب النساء بیگم وغیرہ اور ان کے متوسل ارباب کمال کے حالات اور کارناموں پر مشتمل ہے، جلد اول قیمت ۲۰ روپے، دوم ۲۳ روپے، سوم ۱۳ روپے

مرتبہ :- سید صباح الدین عبد الرحمن

شوال ۱۴۰۲ھ　　　　ستمبر ۱۹۸۲ء

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مجلہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

قیمت مبلغ روپے سالانہ

دفتر دارالمصنفین اعظم گڈھ

(دارالمصنفین کی دو نئی کتابیں)

سیرۃ النبی جلد ہفتم

سیرۃ النبی جلد ششم کے بعد سید صاحب سیرۃ جلد ہفتم بھی جو معاملات سے متعلق تھی لکھنی شروع کر دی تھی، اور اسی پر یہ مقدس سلسلہ ختم بھی ہو جاتا لیکن ابھی اس موضوع پر چند ہی مضامین لکھے تھے کہ آپ کا انتقال ہو گیا، اس لیے یہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکی، یہ ان ہی متفرق مضامین و مباحث کا مجموعہ ہے، جن کے عنوانات یہ ہیں: اسلام میں حکومت کی حیثیت، عہد نبوی میں نظام حکومت، سلطنت اور دین کا تعلق وغیرہ" شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی کے قلم سے پیش لفظ

قیمت: [illegible]

مؤلفہ مولانا سید سلیمان ندوی

صوفی امیر خسرو

اس میں ہندوستان کے شہرۂ آفاق محب وطن فارسی شاعر، نہ سپہر، شیریں خسرو، لیلیٰ مجنوں، دول رانی خضر خان، اور وسط الحیات جیسی شاہکار مثنویوں کے مصنف اور حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء کے جان نثار مرید حضرت امیر خسرو کو، معاصر تذکروں و تاریخ کی کتابوں اور خود ان کے کلام کے مجموعوں اور مثنویوں کی روشنی میں ایک صاحب دل صوفی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، بزم صوفیہ کے بعد سلوک و عرفان کے مباحث و مسائل پر دوسری اہم کتاب

قیمت: [illegible]

مؤلفہ سید صباح الدین عبدالرحمن

جلد ۱۳۰ ماہ ذی قعدہ ۱۴۰۲ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۸۲ء عدد ۳

مضامین

شکست

مغربی بیروت پر یہودیوں کی وحشیانہ بمباری کے بعد فلسطینیوں کو جس طرح پھر ایک بار بے گھر ہونا پڑا، اس سے متاثر ہو کر قلم صد ہزار نمکدان لے کر پھر جراحتِ دل کی پرسش کرنے چلا ہے،

یہودی خوش ہوں گے کہ ۱۹۶۷ء کی طرح عربوں یعنی مسلمانوں پر ان کو ایک اور فتح ہوئی، مگر بیروت میں انھوں نے جو سفاکی دکھائی اس سے ان کے خلاف بڑی بین الاقوامی نفرت پیدا ہو گئی ہے لیکن وہ دنیا کی نفرت کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ اب کوئی نفرت ان کے لئے باعثِ ندامت نہیں، فلسطینیوں کو بظاہر شکست ہوئی لیکن پوری دنیا کی ہمدردی ان کے ساتھ ہے، اسرائیلیوں کا تنہا لیکن بہت بڑا حلیف امریکہ ہے اور یہ جنگ اسرائیل کیا لڑ سکتا تھا، امریکہ ہی لڑ رہا تھا، وہ بھی یہودیوں کی بربریت سے چیخ اٹھا، اور اس کی طرف سے یہ اعلان ہوا ہے کہ فلسطینیوں کو ایک وطن ملنا ضروری ہے، جو اسرائیل کے پڑوس میں اردن سے ملحق غازہ کی پٹی میں ہونا چاہئے، اسرائیل پر گویا آسمان ٹوٹ پڑا، اس کی ساری خوشی زائل ہو گئی، اس کو امریکہ کی یہ تجویز منظور نہیں لیکن پیرک امریکہ کی اس داشتہ کو اس نتیجہ پر پہنچنا پڑے گا کہ اس کی اپنی خواہش کوئی خواہش نہیں،

مسلمان اپنی گذشتہ تاریخ میں اب تک صرف عیسائیوں ہی سے برابر برسرپیکار رہے، بنوعباس نے رومن امپائر کے حکمرانوں کے خلاف لڑ کر ان سے جزیہ بھی وصول کیا، صلیبی جنگ میں عیسائیوں کی متحدہ قوت سے نبرد آزما ہو کر ان کو زیر کیا، عثمانی فرمانرواؤں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر کے رومن امپائر کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی، اور وہ ایک مدت تک یورپ کے جنگی محاذوں پر غالب رہے، مگر ایسا بھی زمانہ آیا کہ دول یورپ نے مل کر پہلی جنگ عظیم میں دولتِ عثمانی کو حصہ کش اپنا

کہ وقتی طور پر لیبیا سے لے کر عرب جنگ تک مشرق وسطیٰ پر پھیل گیا۔ اور نو آبادیاتی نظام کا پرچم لہرا دیا لیکن بیسویں صدی میں کسی ملک کو غلامی کا طوق پہنائے رکھنا آسان نہیں ہو سکا۔ اسلامی ممالک آزاد ہو کر ایک بڑی طاقت بن کر ابھر رہے تھے کہ عیسائیوں نے یہودیوں کو اپنا آلۂ کار بنا کر ان کی نشاۃ ثانیہ پر کاری ضرب لگانے کی مہم شروع کر دی۔

ممکن ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کی مشترکہ سازش کی کامیابیوں سے عربوں اور مسلمانوں میں مایوسی، بددلی اور پست ہمتی پیدا ہو اور وہ اپنا مستقبل تاریک دیکھنے لگیں۔ یہ صحیح ہے کہ عیسائیوں کی ریشہ دوانیوں نے انھوں نے صقلیہ، اندلس، اور ٹرکش امپائر، ایشیا کی اور دوسری حکومتیں کھو دیں مگر ان کی تاریخ یہ بھی رہی ہے کہ احد اور حنین کے بعد غیر معمولی طاقت بن کر ابھری۔ جمل اور صفین کی لڑائیاں لڑنے کے باوجود دنیا ان کے قدموں سے آلگی۔ کربلا کی خون آشامیوں کے بعد بنو امیہ کا دائرۂ حکومت اتنا بڑھا کہ آج تک اس پر فخر کیا جاتا ہے۔ بنو امیہ کا سقوط بڑی بے دردی کے ساتھ کیا گیا لیکن اسی کے بعد بنو عباس کے کارناموں میں الف لیلہ کی داستان کا رنگ پیدا ہو گیا۔ خود عباسیوں کا خاتمہ تاتاریوں نے جس بے رحمی سے کیا، وہ دنیا کا ہولناک ترین المیہ ہے لیکن اسی کے بعد دولت عثمانیہ کا عروج دیکھ کر دنیا متحیر تھی۔ خود دولت عثمانیہ کا خاتمہ مسلمانوں کی تاریخ کا ایک دوسرا زبردست المیہ ہے لیکن اسی کی خاک سے اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی بیالیس (۴۲) حکومتیں قائم ہیں جو اگر صحیح معنوں میں متحد رہیں، تو وہ دنیا کے سیاسی توازن کو اپنے قابو میں کر لیں۔

حکومتوں کا شکست و ریخت ہونا تاریخ کے لئے کوئی نئی چیز نہیں۔ یہ لازمی طور پر پیش آتی ہے۔ بخت نصر، سکندر، سیزر، ہنیبال، بسمارک، نپولین، ہٹلر اور مسولینی وغیرہ کے کارنامے بس زیب داستان بن کر رہ گئے ہیں۔ بابل، نینوا، روما، اسپین، ٹرکش امپائر اور برطانوی امپائر کی تاریخ ہو چکی، سینوں اور سفینوں میں بند ہو کر رہ گئی ہے۔ ابھرنا، ڈوبنا، ڈوب کر ساحل سے آلگنا، چھپنا، پلٹنا، اور پلٹ کر جھپٹنا زندہ قوموں کی تاریخ رہی ہے۔ ان کی شکست کبھی فتح، اور ان کی فتح کبھی شکست بن جاتی ہے۔

یہ فیصلہ کرنا ابھی قبل از وقت ہے کہ جھوٹ باتوں کے سننے والے، مال حرام کے کھانے والے گناہ اور تعدی کی طرف تیزی سے بڑھنے والے یہودی [illegible] ۱۹۶۷ء مشرق وسطیٰ کی لڑائیوں میں جو کامیاب رہے ہیں یا وہ ساری دنیا سے [illegible]

اسرائیل کے نفاذ میں اس بے پناہ حوصلے نے کمی پیدا کی، بربادی کے اسباب فراہم کیے، عرب کو اس کی شکست ضرور ہوئی ہے، مگر کلام پاک میں اُن کو ہدایت کی گئی ہے کہ اہلِ کتاب اور مشرکوں سے تم ایذا کی باتیں سنو گے اور اگر صبر کیے رہو اور پرہیزگاری پر قائم رہو تو یہ ہمت کے کام ہیں۔ (آل عمران ع ۱۹)

یہودیوں اور عربوں یعنی مسلمانوں کے تصادم کی نوعیت یہ ہو کہ ایک اپنی ازلی نکبت کو دور کرنے کی فکر میں ہے، دوسرا اپنی دیرینہ غفلت کو برقرار رکھنا چاہتا ہے، ایک امریکی اسلحہ اور اپنی خباثت پر بھروسہ ہے، دوسرے کو خیرالامت ہونے کی بشارت اور اپنی ایمانی حرارت کا سہارا ہے، اس سے قطع نظر فلسطینیوں نے گذشتہ پچاس برس سے اپنی متحرک زندگی کا جو ثبوت دیا ہے وہی اُن کے زندہ رہنے کی اصلی ضمانت ہے، انھوں نے بیروت کی بمباری کے موقع پر جس پامردی اور بے جگری کا مظاہرہ کیا ہے وہ رزمیہ نظم کا موضوع بن سکتا ہے، وہ دنیا کی نظروں میں ہیرو بن کر ابھری ہیں اور وہ بے خانماں و برباد ہونے کے باوجود جہاں پہونچے اُن کا استقبال ابطالِ حریت ہی کی طرح ہوا، ان کی جانبازی اور سرفروشی کی طرح قرآن مجید کی ہدایت کے مطابق ان میں پرہیزگاری بھی ہو جائے تو وہ یہودیوں کے شر سے خیر پیدا کر کے مسلمانوں کی تاریخ کا رُخ موڑ سکتے ہیں، اب یہ روشن پہلو ضرور سامنے آرہا ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کی شر انگیزیوں سے عربوں میں اتحاد اور یکانگت کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے، عرب لیگ اور اسلامی ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس اس کا عملی ثبوت ہے،

برطانیہ کے مشہور مورخ آرنلڈ ٹوائن بی نے اپنی موت سے بہت پہلے فلسطین کے مسئلہ پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ایک مورخ کی حیثیت سے مجھے وہ وقت یاد ہے جب صلیبی جنگ نے عربوں اور اسلام کے لئے ایسے ہی عظیم مسائل پیدا کر دیئے تھے جیسا کہ اسرائیل کے قیام سے پیدا ہو گئے ہیں، پہلی صورت میں عربوں کا ردعمل فوری نوعیت کا نہیں تھا، مگر انجام کار عرب ایک مضبوط اتحاد قائم کرنے اور خود کو درپیش خطرے کا مقابلہ کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے، مجھے اس بات کا یقین ہے کہ موجودہ حالت میں بھی عربوں میں اتحاد کی تحریک ضرور پھیلے گی جیسا کہ آٹھ سو سال پہلے پھیلی تھی، عربوں کے اتحاد و دانشادہ ۹نا نیہ سے دنیا کو فائدہ پہنچ سکتا ہے، وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کو بہت کچھ دے سکتے ہیں کیونکہ ان کی تہذیبی روایات انسانیت کے مشترکہ خزانے کا قیمتی سرمایہ ہیں،

ٹوائن بی کی پیشین گوئی کا صحیح ثابت ہونا کوئی تعجب انگیز بات نہ ہوگی،

خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہئے اس کو خونِ عرب سے

مقالات

مستشرقین، استشراق اور اسلام

از

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، ریڈر اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ، اسلام آباد

میرے مقالہ کا عنوان ہے "مستشرقین، استشراق اور اسلام" یہ سیمینار کے مرکزی موضوع "اسلام اور مستشرقین" سے ذرا ہٹ کر ہے، سیمینار کے موضوع کا مطلب جہاں تک میں نے سمجھا، یہ ہے کہ مستشرقین اسلام کو کس نظر سے دیکھتے ہیں، اور اسلام کے ساتھ ان کا رویہ کیا ہے، جب کہ میں نے اپنے مقالہ میں اس مسئلہ سے بحث کی ہے کہ اسلام مستشرقین کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔

سب سے پہلے میں موضوع میں شامل الفاظ کی مختصر لغوی اور معنوی تشریح پیش کرتا ہوں اس سے آیندہ مباحث کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

مستشرق مشتق ہے استشراق سے، جس کا مادہ شرق ہے، جو ضد مقصود ہوتا ہے غرب کا، میں نے "مقصود ہوتا ہے" کہا، اس لیے کہ میرے نزدیک یہ تقسیم و تفریق حقیقی نہیں، اعتباری ہے، اور غیر صحت مند رجحانات کی پیداوار ہے، شرق و غرب کے دو باہم متضاد اور اردو میں مستعمل مترادفات مشرق و مغرب ہیں، عربی میں مستشرق ہی نہیں خود اس کا اسم یا مصدر استشراق بھی مولد یعنی نیا اور بعد کی پیداوار ہے، چنانچہ قدیم عربی لغات میں اس مادہ کا باب استفعال سرے

مفقود ہے، جدید لغات میں یا قدیم لغات کے جدید ایڈیشنوں میں البتہ مستشرق اور استشراق کے الفاظ بطور اسم فاعل اور اسم مصدر کے ملتے ہیں، جن کا استعمال مخصوص بھی ہے اور محدود بھی استشراق بطور فعل کے ان لغات میں بھی مذکور نہیں ہے، عربی یا اردو لٹریچر میں بھی یہ لفظ زیادہ پرانا نہیں ہے اور الفاظ پہلے استعمال میں آتے ہیں اس کے بعد ہی لغات میں جگہ پاتے ہیں، درحقیقت یہ الفاظ ترجمہ یا چربہ ہیں اورینٹلسٹ اور اورینٹلزم کا جو اوریئنٹ سے ماخوذ ہیں، انگریزی میں اوریئنٹ لسٹ کا ہم معنی ہے، اہل مغرب نے یہ نام اپنے ان نام نہاد اسکالروں کو دیا جنھوں نے بزعم ان کے مشرقی علوم وفنون، زبان وادب اور تہذیب وثقافت کو جس میں مذہب بھی آجاتا ہے، اپنی دلچسپی کا موضوع بنایا اور ان کا خصوصی مطالعہ کرکے براہ راست اس سے واقفیت حاصل کی، عربی میں اس کے لیے کوئی لفظ پہلے سے موجود نہیں تھا، اس لیے جب اس کی ضرورت پیش آئی تو انگریزی ہی کے طرز پر الفاظ وضع کر لیے گئے۔

عربی زبان میں ایک ہی مادہ کو مختلف ابواب میں لے جاکر بذریعۂ اشتقاق طرح طرح کے الفاظ بنانے کا ایک وسیع نظام موجود ہے، بایں طور کہ مادے کا اصل معنی باقی رہتے ہوئے اس میں تنوع پیدا ہوتا چلا جاتا ہے، عربی کی ایک نمایاں اور اہم خصوصیت جس کو خاصیت ابواب کہتے ہیں، اس باب میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے، مثلاً عربی کا ایک باب تفاعل ہے، اس کی ایک خاصیت یہ ہے کہ یہ اصل مادہ کے مفہوم کو بناوٹی طور پر اختیار کرنے کا تصور دیتا ہے، م ر ض ایک مادہ ہے، اس کے معنی بیمار ہونے کے ہیں، وہی مادہ باب تفاعل میں جاکر جب تمارض بن جاتا ہے تو اس کا معنی ہو جاتا ہے جھوٹ موٹ کا بیمار بننا، ایک اور مثال لیجیے، شعر سے شاعر بنا تو وہ واقعی شاعر کے لیے استعمال ہوا، لیکن باب تفاعل سے متشاعر بنا تو اس کا مطلب ہوا جھوٹا بناوٹی شاعر، اسی طرح تجاہل کے معنی جان کر انجان بننا۔

مثلاثی مزید کے ابواب میں سے باب استفعال جس کے وزن پر استشراق بنایا گیا ہے، اس کی ایک خاصیت صیرورۃ اور اتخاذ ہے، جس میں بن جانا، اپنانا یا حاصل کرنا مفہوم ہوتا ہے، مثلاً استحجر الطین مٹی پتھر بن گئی، استوطن القریۃ بستی کو اپنا وطن بنالیا، استفادکا فائدہ حاصل کرنا۔ اسی اصول اور قاعدہ کے تحت جب کسی زمانہ میں کچھ لوگوں نے باہر سے آکر جزیرۃ العرب میں بود و باش اختیار کی اور وقت گذرنے کے ساتھ وہ بھی عرب ہو گئے تو ان کو عرب کے قدیم اور اصلی باشندوں سے ممیز کرنے کے لیے اسی باب استفعال سے کام لے کر ایک لفظ بنایا گیا استعرب، عرب بن گیا، چنانچہ عرب کی قدیم تاریخ میں عرب، عاربہ اور مستعربہ کی اصطلاحیں ملتی ہیں، اردو میں ہم اسے اصلی عرب اور نقلی عرب بھی کہہ سکتے ہیں، نئے اور پرانے، سچے اور جھوٹے سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں، اس مسئلہ کی میں نے تحقیق نہیں کی کہ عربی میں مستشرقین اور استشراق کا لفظ پہلے پہل کس نے وضع کیا، اس کے واضع خود مستشرقین ہیں یا ان کے غیر، اگر خود مستشرقین ہیں تو ان سے چوک ہوئی، اور اگر غیر ہیں تو ان کا تیر نشانہ پر لگا، استشراق کی حقیقت اور اس کی تاریخ جن کی نظر میں ہے وہ تسلیم کریں گے کہ یہ نام ان کے لیے انتہائی موزوں ہے، خود یہ نام ان کا راز فاش کرتا ہے، ان کے چہرے سے نقاب اٹھا کر ان کی اصلیت کو ظاہر کرتا ہے، حاصل کلام یہ کہ از روئے عربی زبان استشراق کے معنی ہوئے بہ تکلف مشرقی بننا اور مستشرق کے معنی وہ شخص جس نے بہ تکلف مشرقیت اختیار کی یا مشرقی بنا، اور ظاہر ہے کہ اس فعل کی نسبت کسی مغربی ہی کی طرف ہو سکتی ہے، خود کسی مشرقی کا مشرقی بننا مہمل سی بات ہے، لیکن عموماً اہل لغت اس کو ظاہر نہیں کرتے، چنانچہ جب وہ مستشرق کے معنی لکھتے ہیں تو بلا کسی فرق و امتیاز کے علی الاطلاق اس کا ذکر کرتے ہیں، میں نمونتہً ایک معمولی عربی لغت المنجد کا حوالہ دوں گا جو بہت متداول ہے، اس کے قدیم ایڈیشنوں میں تو یہ لفظ موجود ہی نہیں ہے، جدید ایڈیشنوں میں ہے، المستشرق ، العالم

بااللغات والآداب والعلوم الشرقیۃ، یعنی مشرقی زبانوں، ادبیات اور علوم کا جاننے والا۔ کیا ہم مشرق سے تعلق رکھنے والے ایسے کسی عالم کو مستشرق کہہ سکتے ہیں جو مشرقی علوم و السنہ کا جاننے والا ہو، اسی طرح کیا ہم کسی ایسے مسلمان کو مستشرق کہہ سکتے ہیں خواہ اس کا تعلق مغرب ہی سے کیوں نہ ہو؟ ظاہر ہے نہیں کہہ سکتے، معلوم ہوا کہ اصطلاحاً یا عرفاً یہ لفظ مخصوص ہے ان غیر مسلم علمائے مغرب کے لیے جو مشرقی زبانوں اور علوم و آداب میں دلچسپی لیتے ہوں، خود مشرقی زبانوں اور علوم و آداب میں بھی تحدید کی ضرورت ہے، مشرق سے تعلق رکھنے والی غیر مسلم زبانوں، غیر اسلامی علوم و فنون اور اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کے عالم کو بھی مستشرق نہیں کہہ سکتے، چاہے وہ کوئی غیر مسلم اور مغربی ہی کیوں نہ ہو، سنسکرت، ہندومت اور بدھ مت کے کسی عیسائی مغربی اسکالر کو کوئی مستشرق نہیں کہتا، تو گویا بات یہاں تک پہونچی کہ مستشرق مغرب کے ان غیر مسلم خاص کر یہودی اور عیسائی اسکالروں کو کہتے ہیں جو اسلام، اسلامی علوم، اسلامی زبانوں اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے مطالعہ میں خصوصی دلچسپی لیتے ہیں، اور میں نے جہاں تک اندازہ لگایا ہے اس کانفرنس کے مرکزی موضوع میں لفظ مستشرق کا یہی تصور مراد ہے، ورنہ اگر ہم المنجد کے مذکورۃ الصدر مفہوم کو سامنے رکھیں گے تو اس سے کئی الجھنیں پیدا ہوں گی، میں نے تحقیق نہیں کی، مگر میرا اندازہ ہے کہ المنجد کا مولف خود مستشرق ہے اور خود اس لفظ کی تعبیر و تاویل میں بھی اس کے استشراق کی دانستہ یا نادانستہ طور پر کارفرمائی موجود ہے، مدعا کی مزید وضاحت کیلئے میں لغت ہی سے متعلق استشراق کی ایک مثال پیش کرنا چاہوں گا، الفرائد الدریہ کا مصنف جُنُب کا مفہوم بیان کرتا ہے تو نہ صرف اپنی طرف سے اس میں ذم کا پہلو شامل کر دیتا ہے، بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ اس کی نسبت قائم کرتا ہے، عربی زبان کے مطابق جنب اس شخص کو کہتے ہیں جو حالت جنابت میں ہو، یا جسے جنابت لاحق ہو گئی ہو، جنابت ایک ایسی حالت ہے

جس میں فی نفسہ ذم کا کوئی پہلو نہیں، اور یہ حالت مسلم غیر مسلم کسی کو بھی پیش آسکتی ہے، لیکن
الفرائد الدریہ کا پادری مصنف ہوا جب اس کے معنی لکھتا ہے تو اس کے ساتھ مسلم کا لفظ لگا کر
اپنے استشراق کا مظاہرہ کرتا ہے، ج ن ب کی فصل ملاحظہ ہو:

جنب معنی Polluted Muslim یعنی غلیظ یا پلید مسلمان۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ مستشرق کا مطلب بتاتے وقت جہاں لغوی اور اصطلاحی دونوں پہلو سے اس کو مقید کرنے کی ضرورت تھی وہاں تو اس کو مطلق رکھا گیا لیکن جنب کا مطلب بیان کرنے میں جہاں تقیید و تحدید کی کوئی گنجایش نہیں تھی وہاں کس طرح اپنی طرف سے اقول کا اضافہ کر دیا گیا، گویا کہ اسلام اور مسلم دشمنی کا دوسرا نام استشراق ہے، اور ہر وہ عالم شخص جو اس رجحان کا حامل ہو وہ مستشرق ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں ایک اور نکتے کی طرف اشارہ ضروری سمجھتا ہوں، بات مستشرق اور استشراق کی ہو رہی تھی، جیسا کہ میں نے ابتدائی سطور میں عرض کیا، ان الفاظ کی اصل شرق یا مشرق ہے جو ضد ہے غرب اور مغرب کا، آپ ذرا غور کیجیے مشرق و مغرب کی تقسیم اور حد بندی کی حقیقت کیا ہے، یہ نکتہ بھی غور طلب ہے کہ اس کی ابتدا کب اور کیسے ہوئی، اور اس کے پیچھے کیا محرکات کار فرما ہیں؟ جہاں تک کہ ان کے امر واقعہ ہونے کا تعلق ہے تو یہ کائناتی صداقتیں ہیں، یہ مظاہر فطرت ہیں، ان کے وجود سے کون انکار کر سکتا ہے، جس سمت سے سورج طلوع ہوتا ہے اس کو مشرق کہنا اور جس سمت میں غروب ہوتا ہے اس کو مغرب کہنا ایک قدرتی واقعہ کا اظہار ہے، لیکن اس کی بنیاد پر دنیا کو تقسیم کرنا انسانیت کی روا کو تار تار کرتا ہے، یا اقبال کے الفاظ میں یہ تمیز فساد آدمیت ہے، یہ تدلیس ابلیس ہے، یہ فساد قلب و نظر کا شاخسانہ ہے، اہل ہوس نے ہوائے نفس کی تکمیل کے لیے جو حیلے تراشے ہیں ان میں سے

ایک گمراہ کن حیلہ یہ بھی ہے اور ایک سازش ہے [illegible] دین و روح کے خلاف

اقبال نے جدید و قدیم کی تفریق کو ہدفِ ملامت بنایا

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک — دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم

بالکل یہی حال مشرق و مغرب کی تقسیم کے اس افسوں کا ہے جو اہل مغرب نے اپنے اغراض فانی مقاصد کے لیے پھونکا ہے، آپ اپنی دنیا کی قدیم تاریخ پر نظر ڈالیے، کیا نام نہاد اہل مغرب کے ظہور سے پہلے بھی اس قسم کی تقسیم کا وجود اس تصور کے ساتھ کہیں ملتا ہے جو اہل مغرب نے دنیا کو دیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ شرق و غرب یا مشرق و مغرب کی تفریق و تقسیم اور ان کے مابین تضاد کا موجودہ تصور بھی دین ہے اہل مغرب ہی کی جس کو انھوں نے اپنے استعماری مقاصد کے لیے عام کیا، ورنہ اسلام کے نقطۂ نظر سے مشرق و مغرب دونوں ایک ہی دریا کے دو کنارے ہیں اور ان میں تفریق و تقسیم کی کوئی بھی واقعی یا حقیقی بنیاد موجود نہیں ہے، قرآن کہتا ہے:

لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ — اللہ ہی کے ہیں مشرق و مغرب،

(بقرہ: ۱۱۵ و ۱۴۲)

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (شعراء ۲۸، مزمل ۹) رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ (رحمٰن ۱۲) مشرق و مغرب سب کا خالق مالک پروردگار جب اللہ تعالیٰ ہے تو انسانوں کے ایک گروہ کو یہ کہاں سے حق حاصل ہوگیا کہ وہ دنیا کی بندر بانٹ کرکے اپنا حصہ ہی نہیں کل کا کل ہضم کرنے کے لیے مکر و فن سے کام لیں۔

میں نے مشرق و مغرب کی غیر فطری تقسیم کے لیے بندر بانٹ کا استعارہ استعمال کیا ہے، اس کی بلاغت کا کما حقہٗ ادراک کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس استعارہ میں جو تلمیح ہے اس کو

ذہن میں تازہ کر لیا جائے، دو بلیوں میں کسی شے کی تقسیم پر جھگڑا ہوا، وہ خود جھگڑا طے نہ کر سکیں تو تصفیہ کے لیے ایک بندر کے پاس لے گئیں، بندر چالاک تھا، اس نے اس شے کے دو غیر مساوی حصے کیے اور ان کو ترازو کے دو پلڑوں میں رکھ دیا، اس کے بعد جو حصہ زیادہ تھا اس میں سے اتنا نکال کر کھا لیا کہ جو حصہ زیادہ تھا وہ کم اور جو کم تھا وہ زیادہ ہو گیا، یہ عمل اس نے کئی بار دہرایا، یہاں تک کہ دونوں پلڑے خالی ہو گئے اور بلیوں کے لیے کفِ افسوس ملنے کے سوا کچھ باقی نہ رہا، ان دانایانِ فرنگ نے اب تک ہماری دنیا کے ساتھ کیا کیا ہے، جب سے ان کو دنیا کے معاملات میں عمل دخل کا موقع ملا ہے، ان کی بندر بانٹ جاری ہے، پہلے انھوں نے دنیا کو مشرق و مغرب میں تقسیم کیا اور حکمتِ عملی یہ اختیار کی کہ مغرب تو ان کا ہے ہی کہ وہ مغرب کے ہیں اور مغرب ان کا ہے، رہا مشرق تو اس کو انھوں نے طرح طرح کے حربے اور ہتھکنڈے اختیار کر کے اپنے استعماری اور استحصالی عزائم کی آماجگاہ بنا رکھا ہے، ان ہی حربوں اور ہتھکنڈوں میں سے ایک استشراق بھی ہے، یہ مستشرق جنھیں اسکالر کا پُر فریب نام دیا جاتا ہے، یہ درحقیقت مغربی استعمار کے دو پاؤں میں سے ایک ہے، میں نے ان کے لیے ایجنٹ کا لفظ استعمال نہیں کیا، ایجنٹ دوسروں کا کارندہ اور آلۂ کار ہوتا ہے، یہ کسی کے آلۂ کار نہیں، یہ ان کا اپنا کاروبار ہے، یہ فقط تقسیم کار ہے، ہاں ان کے آلۂ کار بھی ہیں، ان کا ذکر بھی میں کروں گا، ان کے ذکر کے بغیر یہ داستان نامکمل رہ جائے گی۔

مستشرقین کے نام میں بظاہر بڑی معصومیت ہے، اور نام ہی پر کیا موقوف ہے ان کے کام کو بھی دیکھیں تو بادی النظر میں اس میں برائی کی بات نظر نہیں آئے گی، آخر اس میں برائی کی کیا بات ہے، اگر بے چارے مغربی اسکالر اور مفکرین مشرقی علوم و فنون کی تحصیل و تحقیق میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں، وقت ہی نہیں سرمایہ اور ذہنی صلاحیتیں بھی، وہ کام جو ہمیں

کرنا چاہیئے تھا وہ کر رہے ہیں، کیا یہ ان کا احسان نہیں ہے اہل مشرق پر؟ سادہ لوح اہل مشرق سادہ لوح مسلمان ان کا احسان مانتے ہیں، لیکن ساتھ ہی ان کو گلہ بھی ہے کہ ؎

مجھ پہ احساں جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا

اس لیے کہ ؎ ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

اب میں عنوان کے تیسرے لفظ اسلام کی طرف آتا ہوں۔

اسلام کی دو تعبیریں ہیں، ایک لغوی، دوسری اصطلاحی۔ لغوی تعبیر کی رو سے اسلام ابتدائے آفرینش سے انسانیت کا آسمانی مذہب رہا ہے، آدم سے لے کر نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک معلوم نامعلوم، معروف غیر معروف، تمام انبیاء دین اسلام ہی کے حامل داعی اور نقیب تھے؛

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ — اللہ کا اصل دین اسلام ہے

(آل عمران: ۹)

نوح، ابراہیم، داؤد و سلیمان، موسیٰ، عیسیٰ علیہم السلام سب کا دین اسلام ہی تھا، اس لیے کہ انھوں نے جس دین کی دعوت دی اس کی روح بنیادی طور پر ایک تھی، لیکن اصطلاحاً بطور اسم علم کے یہ نام اس دین کو اس وقت دیا گیا جب نبی آخر الزماںؐ کو اس کے بار امانت سے سرفراز کیا گیا

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ (المائدہ: ۳)

اب میں نے تمھارے لیے تمھارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی، اور تمھارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند فرمایا۔

اس کی شہادت قرآن میں مذکور اس دعا سے بھی ملتی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُمت مسلمہ کے نام سے ایک نئی امت متعارف کرانے کے لیے کی، غالباً اسی لیے قرآن نے وجہ تسمیہ کے ذکر میں اس کی نسبت حضرت ابراہیمؑ کی طرف کی ہے: هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ (حج) (حضرت ابراہیمؑ ہی نے تمہیں مسلم کا نام دیا) عرف عام میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کے لیے اسلام لفظ خصوصیت کے ساتھ جو بولا جاتا ہے تو اس میں اسلام کی یہی اصطلاحی تعبیر مراد ہوتی ہے، اور آج کے موضوع میں بھی بالفعل اسلام کی یہی تعبیر مراد ہے، جس کی تاریخ خدا کے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اس کی آخری کتاب قرآن مجید کے نزول سے شروع ہوتی ہے۔

استشراق کی تاریخ کا رشتہ یورپ کی نشأۃ ثانیہ اور تحریک احیائے علوم سے جوڑا جاتا ہے، لیکن یہ غلط ہے، استشراق کے لفظ اور اس کے ظاہر سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے ؏

میرے ظاہر سے نہ کر اندازۂ باطن مرا

یہ تحریک بہت پرانی ہے، اس کے ڈانڈے ازل سے ملے ہوئے ہیں ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز — چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

زیر بحث موضوع کے دائرے میں ہم اسلام کے ساتھ اس کے تعلق کے آغاز اور اس کی نوعیت کا سراغ لگائیں اور عہد بہ عہد اس کی رفتار کار کا جائزہ لیں تو ہم جلد اس نتیجے پر پہونچ جاتے ہیں کہ الفاظ اور اصطلاحات سے صرف نظر کر کے دیکھیں تو نظر آتا ہے کہ روح استشراق روز اول سے موجود ہے، موجود ہی نہیں فعال اور سرگرم عمل ہے، حالات کے تحت وہ بھیس بدلتی رہی، اپنی حکمت عملی تبدیل کرتی رہی، اس کے طریق واردات، حربی تدابیر، زور آزمائی کے داؤ پیچ میں کمی بیشی ہوتی رہی، اتار چڑھاؤ آتا رہا اور رد و بدل ہوتا رہا، مگر یہ عمل اس وقت سے لے کر اب تک جاری ہے، اور آئندہ بھی کسی نہ کسی صورت میں جاری رہے گا، اور اس کا مقصد

ان کے اپنے نقطۂ نظر سے جو بھی ہو، اور وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں، ان سے بھی نہیں، ہم سے بھی نہیں، مگر اس کا مقصد ہمارے نقطۂ نظر سے یہ ہے کہ ہمارے دعویٰ ایمان اور جذبۂ اسلام کا امتحان ہوتا ہے، اور اللہ یہ دیکھ لے کہ جو لوگ ایمان کے دعویدار ہیں ان میں کون اپنے دین پر ثابت قدم رہتا ہے اور کون گمراہ ہو کر دین سے پھر جاتا ہے۔ اس کی نشاندہی بھی قرآن مجید نے اپنے زمانۂ نزول ہی میں کر دی تھی، سورۂ بقرہ میں جہاں تحویلِ قبلہ کا ذکر ہے ذرا مختلف سیاق و سباق میں اس حکمت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ	اور جس قبلہ پر تم تھے ہم نے اس کو صرف
عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ	اس لیے ٹھہرایا تھا کہ ہم الگ کر دیں
الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ	ان لوگوں کو جو رسول کی پیروی کرنے والے
عَلَىٰ عَقِبَيْهِ	ہیں، ان لوگوں سے جو پیٹھ پھیر جانے
(بقرہ : ۱۴۳)	والے ہیں۔

یہی نہیں، ذرا دور تک گہرائی میں جا کر دقتِ نظر سے دیکھا جائے تو تصادم، کشاکش اور آویزش کی داستان اتنی ہی قدیم ہے کہ جتنا خود انسان، روزِ ازل آدم اور ابلیس کا قصہ، پھر آدم اور شیطان کا ایک ساتھ ہبوط، دنیوی زندگی میں حق کے ساتھ باطل، اسلام کے ساتھ کفر، ایمان کے ساتھ الحاد کو بھی اپنا کاروبار جاری رکھنے کی کھلی چھوٹ کا مقصد کیا ہے؟ معرکۂ خیر و شر اس دنیا میں کب برپا نہیں رہا، روزِ ازل سے یہ معرکہ جاری ہے اور رہتی دنیا تک جاری رہے گا، قصہ کوتاہ یہ کہ وہ روح جسے استشراق کا خوشنما نام دیا جاتا ہے، بہت پرانی ہے، اس کا بھیس بدلتا رہتا ہے، اقبال نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں ۔۔۔ اگرچہ پیر ہے آدم، جواں ہیں لات و منات

جیسا کہ میں نے کہا استشراق ایک تحریک ہے، اس کی ایک تاریخ ہے، اس کا ایک مقصد ہے، اس کے ہاں مقصد کے حصول کا طریقہ بدلتا رہتا ہے، مقصد نہیں بدلتا، اسلام بھی ایک تحریک ہے، اس کی بھی ایک تاریخ ہے، اس کا بھی ایک مقصد ہے، لیکن اس کے ہاں مقصد کی طرح طریقہ کار بھی نہیں بدلتا، ان دونوں میں فرق کی وجہ ان دونوں کا باہمی اختلاف ہے، یہ اختلاف سطحی نہیں، بلکہ بنیادی ہے، اور اس کا تعلق ان کی فطرت سے ہے، اسلام حق کا علمبردار ہے جو رنگ نہیں بدلتا، استشراق باطل کا حاشیہ بردار ہے جو موقع محل دیکھ کر رنگ بدل لیتا ہے، اقبال نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول
باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے

استشراق کی ابتداء کب اور کن حالات میں ہوئی اور اس کے پیچھے کیا مقاصد تھے، کس قسم کے اسکالروں نے اس کی طرف توجہ کی، ان کے اپنے حالات وکوائف کیا تھے، اس زمرے سے تعلق رکھنے والے مختلف اسکالروں کا رویہ اور طرز عمل مشرق بالخصوص اسلام کے ساتھ کیا رہا ہے، ہمدردانہ یا غیر ہمدردانہ، حقیقت پسندانہ یا متعصبانہ، جانبدارانہ یا غیر جانبدارانہ، روادارانہ یا جارحانہ اور معاندانہ؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کے متعلق کافی بحث ہو چکی ہے اور اب بھی کوئی شخص ان کا تجزیاتی جائزہ لینا چاہے تو اس کی ضرورت یا افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، مگر مجھے بالفعل ان سوالات سے تعرض نہیں کرنا ہے، یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ استشراق نے ایک روایت، تحریک بلکہ باقاعدہ منظم ادارے کی شکل اختیار کر لی جس کی اپنی ایک تاریخ ہے، یہ تحریک کس طرح پروان چڑھی، کس کے جلو میں مغرب کا یہ ابر رحمت مشرق میں آیا اور اہل مشرق پہ سایہ فگن ہوا؟ یہ کوئی سربستہ راز نہیں، مغرب کے افق سے طلوع ہونے والا یہ سورج کیونکر دور دراز کا سفر طے کر کے ہوا مشرق میں لمعہ افگن ہوا، مشرق جسے مبدأ فیاض سے خلقۃً یہ شرف حاصل رہا کہ

خدا میں کہ آفاق و مطالع سے آفتاب عالمتاب کا نور ہی نہیں پھیلتا اور ماہتاب کی چاندنی ہی نہیں چھٹکتی بلکہ علم کی روشنی اور دین و مذہب کا اجالا بھی یہیں سے نمودار ہوتا رہا۔ اسے کیسے گہن لگ گیا؟ میں ان امور کو بھی نہیں چھیڑنا چاہتا، یہ طویل طویل بحثیں ہیں، میں جن سے صرف نظر کر کے اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔

اسلام حق کا پیغام لے کر آیا تو اس کے راستے میں جو لوگ حائل ہوئے اُن میں کفار قریش کے علاوہ یہود و نصاریٰ بھی تھے، یہود و نصاریٰ کی نفسیات بوجوہ اس باب میں کفار قریش سے مختلف تھیں، ان میں نسلی تعصب کے علاوہ مذہبی عصبیت بھی تھی، نسلاً ان کا تعلق حضرت ابراہیمؑ کی دوسری شاخ حضرت اسحاقؑ سے تھا، جبکہ داعئِ اسلام کا تعلق اس خاندان سے تھا جو حضرت اسماعیلؑ سے چلا، مذہبی اعتبار سے یہود و نصاریٰ پہلے سے حامل کتاب تھے اور اس بات کے منتظر تھے کہ آخری نبی کی بعثت بھی ان ہی میں ہوگی، خاندانی رقابت کا یہ احساس ان میں اس حد تک غالب تھا کہ انھوں نے قبلہ اور ذبح عظیم کے واقعہ کی اصلیت کو چھپانے کے لیے خود اپنی کتابوں میں تحریفیں کیں، اسلام جب انھیں ایک غالب قوت کی حیثیت سے ابھرتا نظر آیا تو انھوں نے اس کا راستہ روکنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور حالات کے تحت ادل بدل کر وہ تمام تدبیریں اختیار کیں جو وہ کر سکتے تھے، ان ہی تدابیر میں سے ایک تدبیر وہ بھی تھی جسے آج کی زبان اور اصطلاح میں استشراق کا نام دیا جاتا ہے، ظاہر ہے اس کی نسبت اسلام کا رویہ مذمت اور اظہار نکیر ہی کا ہو سکتا ہے۔

قرآن مجید نے اس زمانہ میں موجود روح استشراق کی پردہ دری ان الفاظ میں کی ہے:

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا	اور کافروں نے کہا اس قرآن کی آیتیں
لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ	نہ سنو اور اس میں گڑبڑ پیدا کرو شاید

لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ — اس طرح تم غالب آجاؤ۔

(حٰم السجدہ : ۲۶)

اسرائیل اور بعض باطل پرست فرقے قرآن مجید کے غلط نسخے چھاپ کر پھیلانے کی جو ناپاک کوشش کر رہے ہیں، کیا وہ اسی سلسلہ کی کڑی نہیں جس کا ذکر مذکورہ بالا آیت میں کیا گیا ہے؟

اہل کتاب کے ایک گروہ نے یہ حربہ اختیار کیا کہ ان کے آدمی صبح اسلام لاتے اور شام کو دائرۂ اسلام سے نکل جاتے، تاکہ اس طرح لوگ اسلام سے برگشتہ ہوں جس کا ذکر آل عمران کی آیت ۷۲ میں کیا گیا ہے:

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ۔ (آل عمران: ۷۲)

اور اہل کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے کہ مسلمانوں پر جو چیز نازل کی گئی ہے اس پر صبح کو ایمان لاؤ اور شام کو اس کا انکار کر دیا کرو تاکہ وہ بھی اس سے برگشتہ ہوں۔

باطل پرستوں کی ایک چال یہ بھی ہوتی ہے کہ کچھ دو اور کچھ لو کا معاملہ کر کے بیچ کا راستہ اختیار کریں، لیکن حق کے لیے یہ قابل قبول نہیں، آنحضورؐ کے زمانہ میں بھی یہ حکمت عملی موجود تھی جس کی نشاندہی قرآن مجید نے سورۂ نون کی آیت ۹ میں کی ہے:

وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (نون : ۹)

وہ چاہتے کہ کچھ تم اپنے موقف سے ہٹو تو وہ بھی ہٹیں۔

یہ رجحان اس زمانہ ہی میں نہیں تھا، بلکہ آج کے استشراق میں بھی موجود ہے، مسلم کرسچین ڈائیلاگ کے عنوان سے آج جو کوششیں ہو رہی ہیں، ان کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہے کہ بیچ کا راستہ نکال

دقتی الوقتی کی جائے، جبکہ اسلام اس کو پسند نہیں کرتا، وہ صاف صاف کہتا ہے :

اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً — اسلام میں پورے طور پر داخل ہو جاؤ

اس کے نزدیک دو ہی راستے ہیں، اسلام یا کفر :

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ . (بقرہ : ۸۵) — کیا تم کتاب الٰہی کے ایک حصہ پر ایمان رکھتے ہو اور اس کے دوسرے حصہ کا انکار کرتے ہو؟

یہ حکمت عملی اس کے نزدیک کفر ہی کی ایک صورت ہے، سورۂ بقرہ کی آیت ۸۵ میں اس طرزِ عمل کی نشاندہی کر کے صرف دنیوی ذلت اور عذاب آخرت کی دھمکی دی گئی ہے، لیکن سورۂ نساء کی آیت ۱۵۰ میں اس روش کو حقیقی کفر سے تعبیر کیا گیا ہے :

وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَّیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا، اُولٰٓئِکَ هُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا. (نساء : ۱۵۰) — اور وہ کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں اور بعض کا انکار کرتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کے درمیان کوئی راہ نکالیں، یہی لوگ درحقیقت پکے کافر ہیں۔

قرآن مجید کی یہ چند آیات جو اوپر بیان کی گئیں ان کے آئینے میں ہم آج کے مستشرقین اور استشراق کا چہرہ بے نقاب دیکھ سکتے ہیں اور اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اسلام ان کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے، قرآن واشگاف الفاظ میں یہود ونصاریٰ کے ساتھ ربط وتعلق قائم کرنے سے منع کرتا ہے اور ایسے لوگوں کو جو ان کے ساتھ دوستی رکھتے ہیں ان کو انہی میں شمار کرتا ہے، سورۂ مائدہ کی آیت ۵۱ میں کس قدر دوٹوک انداز میں اس کی صراحت ہے :

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰىٓ اَوْلِيَآءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۔ (مائدہ : ۵۱)

اے ایمان والو! تم یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور تم میں سے جو ان کو اپنا دوست بنائے گا تو وہ انہی میں سے ہے، اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرے گا۔

عصر حاضر کے مستشرقین یہود و نصاریٰ نہیں تو اور کون ہیں، لیکن یا للعجب کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ آج مسلمانوں نے انہی یہود و نصاریٰ کے ساتھ مساویانہ حیثیت سے رسم و راہ رکھنا تو ایک طرف، ان کو استاد کا درجہ دے کر اپنے دل و دماغ کی زمام کار ان کے ہاتھ میں دے رکھی ہے۔ اسلام اور مسلمانوں سے مستشرقین اور استشراق کے تعلق کے مختلف ادوار ہیں، ایک زمانہ میں انھوں نے مسلمانوں سے مختلف دنیوی علوم سیکھے، اس میں استادی کا درجہ حاصل کرنے کے بعد انھوں نے عربی اور اسلامی علوم کی طرف توجہ کی اور بڑی ہوشیاری سے آہستہ آہستہ ان کے بھی امام بن گئے، اور نوبت باین جارسید کہ آج کسی کو طبیعی اور سائنسی علوم میں ہی نہیں عربی اور اسلامیات میں سند فضیلت لینی ہوتی ہے تو وہ یورپ اور امریکہ کی ان جامعات کا رخ کرتا ہے جہاں یہ نام نہاد اسکالر دام تزویر بچھائے دانہ ڈال کر شکار کی گھات میں بیٹھے ہیں، کیا ان کا مقصد واقعی مسلمان نوجوانوں کو عربی اور اسلامیات پڑھا کر اسلام اور ملت اسلامیہ کی خدمت کرنا ہے؟ پورے پورے شعبے انھوں نے اس لیے کھول رکھے ہیں کہ مسلمان ذہن تیار ہوں؟ اسکالرشپ میں بڑی بڑی رقمیں وہ اس لیے خرچ کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں علماء اُمتی کانبیاء بنی اسرائیل پیدا ہوں؟ کوئی ہوشمند اور دیانتدار آدمی اس کا جواب اثبات میں نہیں دے سکتا۔

استشراق کی تاریخ یہاں پہونچ کر ایک نیا موڑ مڑ چکی ہے، وہ کام جو ایک صدی پہلے عیسائی مبلغین اور مستشرقین کر رہے تھے اب اس کام کے لیے انھوں نے مسلمانوں میں سے آدمی تیار کر دیے ہیں، اقبال کا مصرعہ یاد آتا ہے، انھوں نے ہمارے شاندار ماضی کے لیے کہا تھا۔

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

آج صنم خانہ کعبہ سے پاسبان حاصل کر رہا ہے، پہلے اس طرح کی اِکّا دُکّا مثالیں تھیں آہستہ آہستہ اضافہ ہوتے ہوتے ان کی تعداد اتنی ہو گئی ہے کہ ہم اسے استشراق کے ایک علٰحدہ دور سے تعبیر کر سکتے ہیں، میں نے بہت سوچا کہ استشراق کے ان علمبرداروں کو کیا نام دیا جائے، مستشرقین اور مستشرق کی جو صحیح تعریف ہم نے آغاز کلام میں متعین کی تھی وہ تو ان پر صادق نہیں آتی، بعض لکھنے والوں نے ان کے لیے مستغربین لکھا ہے، مگر اس کی موزونیت میں مجھے کلام ہے، میں لغتیات اور اصطلاحات کے ماہرین کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اس کے لیے کوئی مناسب لفظ تجویز کریں۔

شیطان اس دنیا میں انسان کو گمراہ کرنے کا مشن لے کر آیا تھا، اس کو جب انسانوں میں بھی ایسے شاگرد مل گئے جو اس کے مشن کو اس سے زیادہ مستعدی کے ساتھ تکمیل کرنے لگے تو وہ فارغ ہو گیا، اسی طرح ہمارے مستشرقین بھی اب فارغ ہو چکے ہیں، کچھ وقت گذرنے کے بعد ان کا نام صرف تاریخ میں باقی رہ جائے گا، لیکن اسلام رہے گا اور اسے مستشرقین کی جگہ اس نئی مخلوق سے واسطہ ہو گا جو کام انھی کا کرے گی، لیکن اس کا نام کچھ اور ہو گا، یہ مشیت الٰہی ہے، جو لوگ اسلام کے نام لیوا ہیں، دل سے اسلام کی حقانیت کے قائل ہیں وہ خبردار ہو جائیں۔ وما علینا الا البلاغ۔

امام ابو حفص ابن شاہین بغدادی

از

مولانا قاضی اطہر مبارکپوری، ایڈیٹر البلاغ، بمبئی

(سلسلہ کے لیے جولائی ۵۳ء کا معارف دیکھئے)

ابن شاہین فقہائے محدثین میں سے تھے، جو فقہی آراء و احکام میں اجتہاد و قیاس کے مقابلہ میں احادیث و آثار پر زیادہ توجہ دیتے ہیں، اور کسی خاص فقہی مسلک کے بجائے روایت و درایت کے اصول پر عمل کرتے ہیں، کہنا چاہیے کہ اہل رائے اور اہل ظاہر کے درمیان فقہائے محدثین کا مسلک ہے، ابن شاہین اسی مسلک پر تھے، اور اپنے کو شافعی، حنفی، مالکی وغیرہ کے بجائے انا محمدی المذھب (یعنی میں محمدی ہوں) کہتے تھے، اتنی سی بات کو ان کے بعض معاصروں اور حریفوں نے رائی کا پہاڑ بنا دیا اور کہہ دیا کہ ابن شاہین تھوڑی بہت بھی فقہ نہیں جانتے تھے، چنانچہ محمد بن عمر داؤدی کا قول ہے:

وکان ایضاً لایعرف من الفقه لا قلیلاً ولا کثیراً، وکان اذا ذکر له من مذاھب الفقهاء کالشافعی وغیرہ یقول انا محمدی المذھب۔[1]

نیز ابن شاہین تھوڑی بہت بھی فقہ نہیں جانتے تھے، اور جب ان کے سامنے امام شافعیؒ اور دیگر فقہاء کا مذہب بیان کیا جاتا تھا تو کہتے تھے کہ میں محمدی المذہب ہوں۔

[1] تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۲۶۶۔

اس کے مقابعد داؤدی نے اپنے دعویٰ کی دلیل میں بیان کیا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ ابن شاہین کو دارقطنی کی مجلس میں دیکھا کہ وہ دارقطنی سے خوف و ہیبت کے مارے منہ سے ایک لفظ نہیں نکال سکے کہ کہیں غلطی نہ ہو جائے، اتنے بڑے دعوے پر یہ دلیل بہت چھوٹی ہے، ابن شاہین کو فقہ میں صفر کا درجہ دینا عجیب سی بات ہے، اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ بہت سے محدثین کی طرح ابن شاہین بھی ثمرات و احکام کے استخراج و استنباط میں احادیث و آثار سے کام لیتے تھے جیسا کہ ان کے کئی شیوخ اسی مسلک کے تھے، چنانچہ ان کے استاذ حدیث امام باغندی (ابو بکر محمد بن محمد بن سلیمان ازدی متوفی ۳۱۲ھ) تفقہ فی الحدیث میں اپنی حذاقت یوں بیان کرتے ہیں:

انا اجیب فی ثلاث مائۃ الف	میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
مسئلۃ فی حدیث رسول اللہ	حدیثوں میں تین لاکھ مسائل کے جواب
صلی اللہ علیہ وسلم[1]	دیتا ہوں۔

تین لاکھ مسائل کا استحضار صرف حدیث کے متن اور سند کے بارے میں نہیں تھا، بلکہ اس میں فقہی احکام و مسائل بھی تھے، ان کے شیوخ میں حسن ابن احمد بن یزید اصطخری قاضی قم متوفی ۳۲۸ھ فقہ شافعی کے ائمہ مذکورین میں تھے۔

وکان احد الائمۃ المذکورین	اصطخری شافعی فقہاء میں قابل ذکر اور
وھو من شیوخ الفقھاء	جلیل القدر امام تھے۔
الشافعیین[2]	

اسی طرح ابو الحسن عبید اللہ بن حسین کرخی متوفی ۳۴۰ھ فقہ حنفی میں اپنے زمانہ میں آخری حجت مانے جاتے تھے، اور ان کے تلامذہ نے ان کے مسلک اور فقہ و فتویٰ کی دنیا میں اشاعت کی۔

---

[1] المنتظم ج ۶، ص ۱۹۳   [2] المنتظم ج ۶، ص ۳۰۲۔

وانتهت اليه رياسة اصحاب	فقہائے احناف کی امامت وسیادت
ابی حنیفة وانتشر اصحابه	امام ابوالحسن کرخی پر ختم تھی، ان کے
فی البلاد [1]	تلامذہ مختلف ملکوں اور شہروں میں پھیلے ہوئے تھے۔

ابن شاہین کے تلامذہ میں بھی فقہ و فتویٰ کے ایمۂ مذکورین و متبوعین شامل ہیں، چنانچہ ان کے شاگرد ابو محمد عبد الوہاب بن علی بن نصر مالکی متوفی ۴۲۲ھ کے بارے میں خطیب بغدادی نے کہا ہے:

کان فقیهاً علی مذهب مالك	وہ امام مالک کے مسلک کے فقیہ تھے،
وولی قضاء بادرایا و باکسایا	بادرایا اور باکسایا کے قاضی تھے... میں نے
.... وکتبت عنه وکان ثقة	ان سے حدیث حاصل کی ہے، ثقہ محدث
و لم نلق من المالکیین احداً	تھے، ہم نے مالکیوں میں ان سے بڑا
افقه منه [2]	فقیہ کسی کو نہیں پایا۔

قاضی ابو عبد اللہ صمیری (حسین بن علی بن محمد متوفی ۴۳۶ھ) ایمۂ احناف میں نہایت ثقہ بزرگ اور صاحب نظر مانے جاتے ہیں، ابن شاہین کے شاگرد اور خطیب بغدادی کے استاد ہیں، ان کے ذکر میں ہے:

وکان احد الفقهاء المذکورین	وہ اہل کوفہ کے فقہائے مشاہیر میں سے
من العراقیین، حسن العبادة	ایک تھے، عابد، بالغ نظر، صدوق، بڑے
جید النظر ..... وکان صدوقاً	عقلمند، سلیقہ مند اور علماء کے

[1] المنتظم ج ۶، ص ۳۶۹ [2] ایضاً ج ۸ ص ۶۱۔

وافر العقل، جمیل المعاشرۃ قدردان عالم تھے۔
عارفاً بحقوق العلماء[1]

ان کی کتاب "اخبار ابی حنیفۃ واصحابہ" ۱۳۹۶ھ میں احیاء المعارف النعمانیۃ حیدرآباد سے شایع ہوئی ہے، جس عالم و محدث کے اساتذہ و تلامذہ میں مختلف فقہی مذاہب کے ایسے ایسے فقہائے کبار ہوں، اس کے متعلق یہ کہہ دینا کہ فقہ میں صفر تھے، اور اس کی دلیل میں اپنا ایک مشاہدہ بیان کردینا وہ بھی ایک معاصر اور حریف کی مجلس کا، آسانی سے تسلیم نہیں کیا جاسکتا، الاگابات کو ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں حمزہ بن یوسف سہمی جرجانی کی روایت سے نقل کیا ہے جس میں صرف ولا یعرف الفقہ (وہ فقہ نہیں جانتے تھے) لکھا ہے، پھر وہی دارقطنی کی مجلس والی بات لکھی ہے، یہ بات اس حد تک قابل تسلیم ہوسکتی ہے کہ وہ اہل رائے کی فقہ سے زیادہ واقف نہیں تھے، اس لیے اپنے کو محمدی المذہب کہا کرتے تھے۔

ابن شاہین عمر میں دارقطنی سے نوسال بڑے تھے، دونوں کے شیوخ و اصحاب ایک ہی طبقہ سے تھے، دونوں اصحاب درس و تصنیف اور حفظ و اتقان ثقاہت و عدالت میں برابر تھے، دارقطنی کی جلالت شان احادیث و علل اور رجال میں مسلم مگر ابن شاہین بھی کچھ کم نہ تھے، بے شک وہ فقہ و فتویٰ میں کسی خاص مکتب فکر سے منسلک نہیں تھے، بلکہ محدثین کا طریقہ فقہی مسلک رکھتے تھے، مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں ہوکہ وہ بالکل ہی فقہ نہیں جانتے تھے اور دارقطنی کے مقابلہ میں طفل مکتب سے بھی کم حیثیت رکھتے تھے

لحن یعنی حدیث میں اعرابی غلطی | ابن شاہین کے بارے میں دارقطنی کے حلقہ سے یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ وہ لحّان تھے، اور لحن پر اصرار کیا کرتے تھے، محمد بن عمر داؤدی نے کہا ہے:

کان ابن شاھین شیخاً ثقۃ ابن شاہین شیخ، ثقہ تھے، مشائخ سے

---

[1] المنتظم ج ۸، ص ۱۱۹۔

یشبه الشیوخ الا انه کان	مشابہت رکھتے تھے، البتہ لحان
لحاناً[1]	تھے۔

حمزہ بن یوسف سہمی نے یہی بات دارقطنی سے منسوب کرکے بیان کی ہے:

سمعت الدارقطنی یقول:	میں نے دارقطنی سے سنا ہے کہ ابن شاہین
ابن شاہین بقیة الشیوخ الا	بقیۃ الشیوخ ہیں، البتہ وہ بہت زیادہ
انه کان لحاناً ولا یعرف	اعرابی غلطی کرتے تھے، اور فقہ نہیں
الفقه[2]	جانتے تھے۔

حمزہ کی دوسری روایت میں ہے:

سمعت الدارقطنی یقول:	میں نے دارقطنی سے سنا ہے کہ ابوحفص عمر
ابوحفص عمر بن احمد ابن شاهین	بن احمد ابن شاہین غلطی پر اصرار کرتے
یلح علی الخطأ وهو ثقة[3]	ہیں، اور وہ ثقہ ہیں۔

محدثین کے نزدیک زبان میں لکنت یا عجمیت یا کسی اور وجہ سے حدیث میں اعرابی غلطی کو لحن کہتے ہیں، ایسی حدیث صحیح ہوتی ہے مگر لحن کی تصحیح ضروری ہے[4]

داؤدی اور دارقطنی نے ابن شاہین کو یشبه الشیوخ، بقیۃ الشیوخ، شیخ، ثقہ مانتے ہوئے لحن اور اعرابی غلطی پر اصرار کرنے والا بتایا ہے، جہاں تک لحن کا تعلق ہے بڑے بڑے ائمۂ حدیث سے ہوا ہے، بلکہ بعض حضرات شدتِ احتیاط کی وجہ سے اگر کوئی حدیث ملحون سنی ہے تو اسی طرح اس کی روایت کرتے تھے، چنانچہ ایک شخص نے امام اعمشؒ سے کہا کہ ابن سیرینؒ ایسی حدیث سنتے ہیں جس میں لحن ہوتا ہے تو اس کو اسی طرح بیان کرتے ہیں، اس پر اعمشؒ نے

---

[1] تاریخ بغداد ج ١١ ص ٢٦٧ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ٣ ص ١٨٤ [3] تاریخ بغداد ج ١١ ص ٢٦٨ لسان المیزان ج ۴ [illegible]

[4] المحدث الفاصل بین الراوی والواعی ص ٥٢۴۔

کہا کہ اگر ابن سیرینؒ اعرابی غلطی کرتے ہیں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں کیا ہے، مطلب یہ ہے کہ لحن کو درست کر لینا چاہیے[1] ابن جریجؒ کا بیان ہے:

کنا نرید ان نرد نافعا عن اللحن فلا یرجع[2]	ہم چاہتے تھے کہ حضرت نافع کو لحن سے روکیں، مگر وہ نہیں رکتے تھے۔

اور اسمٰعیل بن امیہ نے کہا ہے:

کنا نرید نافعا علی ان لا یلحن فیابی الا الذی سمع[3]	ہم لوگ چاہتے تھے کہ نافع لحن نہ کریں مگر وہ جیسا سنتے تھے اسی پر وہ کرانکار کر دیتے تھے

یہ شدت احتیاط محدثین کے نزدیک مستحسن نہیں ہے، بلکہ لحن کی اصلاح و تصحیح ضروری ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ اس سے بری تھے اور بعد کے رواۃ کی وجہ سے یہ غلطی ہوتی تھی جس کا ازالہ واجب ہے۔

ہمارے خیال میں ابن شاہین کے لحن کی بڑی وجہ ان کا اپنے فروع کا اصول سے معارضہ و مقابلہ نہ کرنا ہی ہگر یہ کہنا کہ وہ لحان یعنی بہت زیادہ غلطیاں کرتے تھے اور اس پر اڑے رہتے تھے ان کے مقام ثقاہت و امانت سے بعید ہے اور اس میں معاصرانہ رنگ معلوم ہوتا ہے۔

تفسیر و قرارت امام ابن شاہین جن علوم میں خاص شہرت رکھتے تھے ان میں تفسیر اور تجوید و قرات بھی ہے، یافعی نے مرآۃ الجنان میں، ابن عماد نے شذرات الذہب میں ان کے تعارفی القاب میں "المفسر" بھی لکھا ہے، نیز داؤدی نے طبقات المفسرین میں اور ابن جزری نے طبقات القرا میں مفسر اور مقری کی حیثیت سے ان کا مستقل تذکرہ کیا ہے، انھوں نے التفسیر الکبیر ایک ہزار اجزا میں تصنیف کی ہے، تجوید و قرارت کے ائمہ اور قرآنی علوم کے ماہرین سے تعلیم حاصل کی تھی

---

[1] الکفایہ ص ۱۹۴ [2] المحدث الفاصل ص ۵۲۸ [3] الکفایہ ص ۱۸۷۔

طبقات القرار میں ہے،

وروی الحروف عن ابی بکر بن ابی داؤد وابی بکر بن مجاهد وابی بکر النقاش و احمد بن مسعود بمصر[1]

ابن شاہین نے قرارت کی روایت ابوبکر بن ابوداؤد، ابوبکر بن مجاہد، ابوبکر نقاش اور احمد بن مسعود سے مصر میں کی ہے.

ابوالقاسم بزاز مقری (ایوب بن یوسف بن ایوب) بھی ان کے استاد ہیں.

ابن شاہین نے احادیث کی روایت کے ساتھ تجوید وقرارت کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور اس فن میں ان کے نامی گرامی شاگرد گذرے ہیں، ان میں ابو علی نرسی بزاز (حسن بن محمد بن عمر ابن مدیہ) من اهل القرآن والمعرفة بالقراءات تھے، اسی طرح ابوالفضل بزاز (محمد بن عبید اللہ بن احمد) من القراء المجودین تھے، نیز حسین بن طناجیری نے ان سے قرارت حاصل کی.

وعظ وتذکیر علماء ومحدثین نے ہمیشہ سے تدریس وتصنیف کے ساتھ وعظ وتذکیر کا شغلہ بھی جاری رکھا ہے اور عامۃ المسلمین میں ایمان وعمل کی قوت قصص وعبر اور ترغیب وترہیب کے ذریعہ پیدا کی ہے، امام ابن شاہین وعظ گوئی میں خاص شہرت رکھتے تھے، چنانچہ تاریخ بغداد، تذکرۃ الحفاظ، العبر، لسان المیزان، مرآۃ الجنان، شذرات الذہب، طبقات المفسرین اور الرسالۃ المستطرفہ میں ان کو دیگر القاب کے ساتھ الواعظ کے لقب سے یاد کیا گیا ہے اور ان کے بعد وعظ وتذکیر کا سلسلہ ان کے خاندان میں جاری رہا، چنانچہ ان کے صاحبزادے ابوالقاسم عبید اللہ اپنے والد کی طرح ابن شاہین کی کنیت کے ساتھ الواعظ کے لقب سے بھی مشہور تھے، ابن شاہین اس فن میں اپنے استاذ شیخ ابوالحسن الواعظ (علی بن محمد بن محمد متوفی ۳۳۳ھ) سے خصوصی تلمذ ونسبت رکھتے تھے،

---

[1] طبقات المفسرین ج ۲ ص ۲

خطیب نے لکھا ہے کہ وہ زہد و رقائق میں بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں اور حضرات صوفیہ کی طرح مجالس وعظ منعقد کیا کرتے تھے، جن میں مردوں کی طرح عورتیں بھی شامل ہوتی تھیں، شیخ ابوالحسن واعظ نہایت وجیہ و شکیل تھے، اس لیے مجلس وعظ میں اپنے چہرے پر نقاب ڈال لیا کرتے تھے، تاکہ کسی فتنہ کا خطرہ نہ رہے، ایک مرتبہ ابن شاہین کے دوسرے استاد شیخ ابوبکر نقاش جو خود بھی بڑے عابد و زاہد اور باخدا بزرگ تھے، شیخ ابوالحسن واعظ کی مجلس وعظ میں چھپ کر بیٹھے اور وعظ ختم ہونے کے بعد مجمع کو چیرتے ہوئے ان کے پاس گئے اور کہا:

ایھا الشیخ! القصص بعدک حرام[۱] — اے شیخ! آپ کے بعد وعظ و قصص گویا حرام ہے۔

ابن شاہین کے متعدد شاگرد اپنے دور کے کامیاب واعظ و مذکر تھے، ان کے ایک شاگرد ابوعلی حسن بن علی بن محمد تمیمی متوفی ۴۴۴ھ 'ابن المذہب الواعظ' کے لقب سے مشہور ہیں، نیز ان کی تلمیذہ خدیجہ بنت محمد بن علی شاہجہانیہ صوفیہ متوفیہ ۴۶۰ھ الواعظہ کے لقب سے طبقۂ عباد و زہاد میں پہچانی جاتی ہیں۔

زہد و مشیخت امام ابن شاہین مشایخ محدثین میں سے ہیں، دارقطنی نے ان کو بقیۃ الشیوخ اور قاضی محمد بن عمر داؤدی نے یشبہ الشیوخ کہا ہے، اس دور کی علمی اور دینی اصطلاحات میں طبقۂ علماء و محدثین میں شیوخ اور مشایخ کا اطلاق ان حضرات پر ہوتا تھا جو رسمی صوفیہ میں سے نہیں تھے، مگر زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت، روحانیت و مشیخت کی زندگی بسر کرتے اور دوسرے علماء کے مقابلہ میں ان پر یہ رنگ زیادہ نمایاں رہتا تھا، ابن شاہین ثقہ و مامون حافظ حدیث اور محدث عراق ہونے کے ساتھ زہد و مشیخت میں ممتاز مرتبہ رکھتے تھے، ان کے وعظ و تذکیر کا مشغلہ بھی اسی کا ایک

۱؎ المنتظم ج ۷، ص ۲۶۵۔

شیخ تھا۔ ابو عبدالرحمن سلمیؒ نے طبقات الصوفیہ میں مشہور صوفی و بزرگ حضرت شیخ ابو محمد عبداللہ بن خبیق انطاکیؒ کے تذکرہ میں ابن شاہین سے ایک حدیث روایت کی ہے جو دو واسطوں سے شیخ انطاکیؒ کی سند سے مروی ہے۔[1]

زہد و رقایق میں ان کی دو اہم کتابیں ہیں، ایک کتاب الزہد جو بقول ان کے ایک سو اجزاء میں ہے اور دوسری کتاب الترغیب جس کا ذکر طبقات المفسرین میں ہے۔ ابو بکر خوارزمی کا بیان ہے کہ ۳۷۱ھ میں امام ابو بکر اسماعیلیؒ کی وفات جرجان میں ہوئی، جب اس حادثۂ فاجعہ کی خبر بغداد پہونچی تو وہاں کے فقہاء، محدثین، اشراف اور تجار تین یا پانچ دن تک فقیہ ابوالقاسم دارکیؒ کے پاس ان کی مسجد میں تعزیت کے لیے آتے رہے، مشایخ محدثین میں جو حضرات تشریف لائے تھے ان میں ابو حفص ابن شاہین بھی تھے۔[2]

ابن شاہین کے کئی شیوخ طبقۂ مشایخ اور عباد و زہاد میں سے تھے، جن کی مقدس زندگی کا پرتو ان پر پڑا اور ان کے زمرے میں شمار ہوئے، مثلاً شیخ ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ بن دینار معدل زاہد متوفی ۳۳۳ھ نہایت بزرگ اور ثقہ محدث اور فقہ حنفی کے ایمۂ کبار میں سے تھے، تقویٰ اور صبر و قناعت کے ساتھ قیام و صیام کی زندگی بسر کرتے تھے، اپنے ہاتھ سے رزق حلال کماتے تھے، ہر دس سال کے بعد حج اور ہر تین سال کے بعد جہاد کرتے تھے۔

شیخ ابوالفضل عباس بن یوسف شکلیؒ متوفی ۳۱۴ھ مشہور صوفی و بزرگ حضرت سری سقطیؒ سے شرف بیعت و تلمذ رکھتے تھے، نہایت صالح اور عبادت گذار عالم تھے، شیخ ابو احمد عبدالواحد بن محمد مہتدی باللہ ہاشمی متوفی ۳۱۷ھ صلاح و تقویٰ دینداری و پرہیزگاری میں راہب بنی ہاشم کا لقب رکھتے تھے، شیخ حسن بن احمد بن یزید اصطخریؒ متوفی ۳۲۸ھ عابد و زاہد اور قانع محدث تھے،

---

[1] طبقات الصوفیہ ص ۱۴۲۔ [2] تاریخ جرجان سہمی ص ۴۰۷۔

شیخ ابو محمد خواص جعفر بن محمد بن نصیر خلدیؒ متوفی ۳۴۸ھ کی دینداری اور زہد و تقویٰ کا یہ حال تھا کہ ساٹھ مرتبہ حج ادا کیا۔

اسی طرح ابن شاہین کے اصحاب و تلامیذ میں کئی حضرات درجہ مشیخت پر فائز تھے، اور زہد و تقویٰ میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے، مثلاً شیخ ابو الحسین محمد بن علی بن محمد ابن الغریق متوفی ۴۶۵ھ صلاح و تقویٰ اور زہد و عبادت کی وجہ سے زاہد بنی ہاشم کہے جاتے تھے، شیخہ خدیجہ بنت محمد بن علی شاہجانیہؒ متوفیہ ۴۶۰ھ نہایت عابدہ زاہدہ خاتون تھیں اور واعظہ کے لقب سے مشہور تھیں، شیخہ فاطمہ بنت محمد بن عباس طرزیہ صوفیہؒ متوفیہ ۴۱۲ھ طبقہ صوفیہ میں اعلیٰ مقام رکھتی تھیں، شیخ ابو عبد الرحمٰن سلمیؒ متوفی ۴۱۲ھ نے طبقات الصوفیہ میں ابن شاہین سے روایت کی ہے۔

درس و تدریس | امام ابن شاہین نے ۳۰۸ھ میں گیارہ سال کی عمر میں حدیث کی تعلیم حاصل کرنی شروع کی، اور ۳۳۲ھ میں بصرہ میں حدیث کا پہلا حلقہ درس قائم کرکے تدریسی سلسلہ قائم کیا، ان کا بیان ہے:

واول ما حدثت بالبصرة	سب سے پہلے میں نے بصرہ میں ۳۳۲ھ
سنة اثنتين وثلاثين وثلث	میں درس حدیث دیا۔
مائة .[1]	

وہ حدیث پڑھانے کے لیے مجلس املا قائم کرتے تھے، جس میں اس کثرت سے طلبہ شریک ہوتے تھے کہ مجمع میں ان کی آواز پہونچانے کے لیے ایک مستملی کی ضرورت پڑتی تھی، مجلس املا کی صورت یہ ہوتی تھی کہ استاد اپنی مرویات و مسموعات کو طلبہ کے سامنے رکھ کر یا زبانی سناتا تھا اور مجمع کے کنارے تک آواز مستملی پہونچاتا تھا جس کو سن کر طلبہ لکھ لیتے تھے، بہت سے محدثین کے حلقۂ درس میں اس قدر مجمع ہوتا

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۱، ص ۲۶۷۔

ہوتا تھا کوئی مستملی اس خدمت کو انجام دیتے تھے۔

ابن شاہین کے حلقۂ درس کے مستقل مستملی ابوعبداللہ عثمان بن احمد بن جعفر عجلی تھے، خطیب نے ان کو مستملی ابی حفص ابن شاہین لکھا ہے، وہ خود بھی بہت بڑے محدث تھے، ابوعبداللہ بن عفیر، ابوالقاسم بغوی، عبداللہ بن ابی داؤد، محمد بن عبداللہ بن علاء الکاتب، حسین بن اسمٰعیل محاملی قاسم بن اسمٰعیل محاملی، محمد بن مخلد، عبداللہ بن جعفر بن فارس اصبہانی سے حدیث کی روایت کی ہے اور ان سے خلال، عتیقی، عبدالعزیز ازجی، محمد بن علی بن فتح نے روایت کی ہے، اور خطیب بغدادی نے ان حضرات کے واسطہ سے ابوعبداللہ بن عثمان بن احمد عجلی سے روایت کی ہے[۱] ابن شاہین نے ضبط و اتقان اور حافظہ پر اعتماد کی وجہ سے مجلس درس میں اپنے شیوخ سے سنی ہوئی احادیث کا اصل نسخہ سامنے نہیں رکھتے تھے، بلکہ اس سے منقول نسخہ سے حدیث بیان کرتے تھے، اور ان کا اعلان تھا کہ میں اپنے لکھے ہوئے نسخہ کا اصل سے مقابلہ و معارضہ نہیں کرتا ہوں، اس صورت میں منقول نسخہ میں غلطی کا توی امکان ہوتا ہے اس لیے ان کے کچھ شاگردوں نے امام مسعود ثقفی سے اس بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے بتایا کہ تم لوگ ابن شاہین کے ضبط و اتقان پر پورا اعتماد رکھو اگر وہ کسی ٹھیکری یا پیوند پر لکھی ہوئی حدیث بیان کریں تو لکھ لیا کرو، ابن شاہین کے مشہور شاگرد ابوبکر برقانی نے ان کے اصل اور نقل میں مقابلہ نہ کرنے کی وجہ سے ان سے زیادہ روایت نہیں کی، حالانکہ خود ابوبکر برقانی کا یہی طریقہ تھا، خطیب بغدادی کہتے ہیں کہ انھوں نے بہت سی حدیثیں یہ کہکر بیان کیں کہ ہم سے فلاں نے یہ حدیث بیان کی ہے اور اصل سے مقابلہ نہیں کیا ہے۔

ابن شاہین کے پاس مرویات و مسموعات کا بہت بڑا ذخیرہ تھا جس کی وہ روایت کرتے تھے اور دور دراز مقامات سے ان کے حلقۂ درس میں کثیر تعداد میں جمع ہوتے، صرف ایک استاذ

---

[۱] تاریخ بغداد ج ۱۱، ص ۳۱۰۔

امام نبوی کی احادیث ان کے پاس سات سو یا آٹھ سو اجزاء میں تھیں، ایک مرتبہ ان کی کتابیں ضایع ہو گئی تھیں تو اپنے حافظے سے بیس ہزار یا تیس ہزار حدیثیں لکھ کر اس عظیم نقصان کی تلافی کی، ایک مرتبہ ان کے ایک شاگرد ابو عمرو القاری مخزمی نے ان کی سند سے حدیث بیان کرتے ہوئے تدلیس کی، جو محدثین کے نزدیک بہت بڑا عیب ہے، اور یوں کہا وحدثنا محمد بن احمد النقاش، جب ابن شاہین کو اس کی خبر لگی تو اس پر نکیر کی، کیونکہ اس سے ان کی ثقاہت میں فرق آتا تھا، ان کے ایک مشہور استاذ ابوبکر نقاش تھے جو اپنی جلالت شان کے باوجود منکر روایات بیان کرنے کی وجہ سے ضعیف مانے جاتے تھے۔

دارقطنی اور داؤدی نے کہا ہے کہ ابن شاہین احادیث میں اعرابی غلطی کر کے اس پر اصرار کرتے تھے، چونکہ وہ اپنی کتابوں کا اصل نسخہ سے مقابلہ نہیں کرتے تھے، اس لیے لحن اور غلطی کا امکان ہے، مگر بار بار ایسی غلطی کر کے اس پر اصرار ابن شاہین کی ثقاہت و امانت سے بعید معلوم ہوتا ہے، اگر ایسا ہوتا تو ان کے بعض ثقہ معاصر آنکھیں بند کر کے ان کی حدیث کے سماع و کتابت کا مشورہ نہ دیتے، اور ان کے حلقۂ درس میں زبردست ہجوم نہ ہوتا، جس کے لیے مستملی (املا کرانے والے) کی ضرورت پڑتی تھی۔

ابن شاہین کے ہزاروں اصحاب و تلامیذ میں ابن الغریق ان کے خاتمۃ الاصحاب ہیں جو دنیا میں ان کے آخری شاگرد رہ گئے تھے اور ۴۶۵ھ میں انتقال کیا، ابن جوزیؒ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

وکان غزیر العلم والعقل رحل	ابن الغریق وافر علم و عقل رکھتے تھے، لوگ
الناس الیہ من البلاد لعلو	دور دراز شہروں سے سفر کر کے سند عالی
اسنادہ وکان آخر من حدث	کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے،

فی الدنیا عن الدارقطنی و	وہ دنیا میں آخری عالم تھے جو دارقطنی ،
ابن شاھین وابی بکر بن درست[1]	ابن شاہین اور ابوبکر بن درست سے روایت کرتے تھے

ابن الغریقی کے ذریعہ ابن شاہین کی مرویات دنیا میں خوب پھیلیں اور دور دراز ملکوں میں ان کا دینی اور علمی فیض پہونچا۔

اصحاب وتلامیذ: امام ابن شاہین کا سلسلۂ درس ۳۲۳ھ میں شروع ہوا، اور ان کی وفات ۳۸۵ھ میں ختم ہوا، اس بیالیس تینتالیس سال کی مدت میں ان سے ہزاروں علماء و محدثین نے حدیث کی روایت کی، جن کے ذریعہ ان کا علمی اور دینی فیض دنیا میں عام ہوا، ان میں سے چند مشاہیر تلامذہ کے نام اور حالات تاریخ بغداد، المنتظم، طبقات الشافعیہ اور تاریخ جرجان وغیرہ میں درج ہیں، ان کے علاوہ اور بہت سے علماء و محدثین کو ابن شاہین سے شرف تلمذ حاصل ہے۔

تصنیف وتالیف: امام ابن شاہین چوتھی صدی کے صاحب تصانیف کثیرہ محدث ہیں، ان کے اکثر تذکرہ نگاروں نے ان کے اوصاف وکمالات میں اس کا ذکر کیا ہے، ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ اور العبر میں، یافعی نے مرآۃ الجنان میں، ابن عماد نے شذرات الذہب میں ان کو صاحب التصانیف لکھا ہے اور کتانی نے الرسالۃ المستطرفۃ میں صاحب التصانیف العجیبۃ کے الفاظ سے یاد کیا ہے، ان کے شاگرد قاضی ابوالحسین ہاشمی نے ان کا یہ قول نقل کیا ہے،

وصنفت ثلث مائۃ مصنف	میں نے تین سو تیس ۳۳۰ کتابیں تصنیف
وثلاثین مصنفا، احدھا	کی ہیں، ان میں سے التفسیر الکبیر ایک ہزار
التفسیر الکبیر الف جزء	جزء میں، مسند ڈیڑھ ہزار جزء میں،

---

[1] المنتظم ج ۸، ص ۲۸۳۔

والمسند الف جزء وخمسمائة — التاریخ ڈیڑھ سو جزء میں، اور
جزء، والتاریخ مائة وخمسین — الزہد ایک سو جزء میں ہے۔
جزءا، والزھد مائة جزء۔

دوسرے شاگرد محمد بن ابی الفوارس کا قول ہے:

صنف مالم یصنفه احد [1] — ابن شاہین نے جس قدر کتابیں تصنیف کیں
کسی دوسرے نے نہیں کیں۔

طبقات المفسرین میں ہے:

وجمع الابواب والشیوخ و — انھوں نے ابواب وشیوخ پر تین سو
صنف ثلث مائة وثلاثین مصنفاً [2] — تیس کتابیں تصنیف کی ہیں۔

کثیر التصانیف علماء کو اپنی کتابوں کی تنقیح وتہذیب کا موقع کم ملتا ہے، وہ کہتے تھے کہ میں نے جس قدر کتابیں لکھی ہیں ان کا اصل سے مقابلہ نہیں کیا ہے، اس کا اندازہ ان کی کتاب تاریخ اسماء الثقات سے ہوتا ہے جو خوش نصیبی سے ہمارے پاس موجود ہے، اس میں کثرت سے مکررات نظر آتے ہیں۔

ابن شاہین کی بسیار نویسی کا اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے ایک مرتبہ برسبیل تذکرہ اور تحدیث نعمت کے طور پر بتایا کہ میں اب تک چار سو رطل روشنائی سے لکھ چکا ہوں، ابوبکر محمد بن عمر داؤدی کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ابن شاہین نے بتایا کہ میں نے اس وقت تک جس قدر روشنائی خریدی ہے اس کا حساب لگایا تو مجموعی قیمت سات سو درہم ہوئی، داؤدی کہتے ہیں کہ ہم لوگ اس زمانہ میں ایک درہم کی چار رطل روشنائی خریدا کرتے تھے، اس کے بعد بھی ابن شاہین ایک مدت تک لکھتے رہے [3]۔

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۲۶۷ [2] طبقات المفسرین ج ۲ ص ۲ [3] تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۲۶۷۔

روشنائی کی یہ حیرت انگیز مقدار علمائے مصنفین کے حلقہ میں استعجاب ہی کی نظر سے نہیں دیکھی گئی، بلکہ اس کو ان کی کھلی کرامت قرار دیا گیا، سیوطی نے اپنی کتاب مشتہی العقول و منتہی المنقول میں لکھا ہے:

ومداد تصانیفه انتهی الی	ان کی تصانیف میں استعمال شدہ روشنائی
ثمانية وعشرین قنطاراً۔	کی مقدار اٹھائیس قنطار تک پہونچی ہے
قال ابن الجوزی قلت هذا	اور ابن جوزی نے اس کو طی الزمان
من طی الزمان[1]	کی کرامت بتایا ہے۔

امام ابن جوزی خود صاحب تصانیف کثیرہ ہیں، انھوں نے اپنے قلم کے تراشوں کو جمع کرکے وصیت کی تھی کہ ان کی میت کے غسل کا پانی ان ہی تراشوں سے گرمایا جائے۔ وہ ابن شاہین کی استعمال کردہ روشنائی کی مقدار کو طی الزمان کی کرامت قرار دیتے ہیں، یعنی ان کے لیے زمانہ کی وسعتیں سمٹ آئی تھیں اور تصنیف و تالیف کا جو کام کئی صدیوں میں ہوتا ہے انھوں نے چند سالوں میں کر دکھایا اور جس قدر سیاہی کئی صدیوں میں خرچ ہو سکتی ہے چند سالوں میں خرچ کی۔

ابن شاہین کے تصنیفی کارناموں میں بھی ان کے بعض معاصرین کو کلام ہے، اور وہ اس کو دارقطنی کا فیض قرار دیتے ہیں، ابو عبد اللہ محمد بن عمر بن یزداذ کا بیان ہے کہ ابوبکر ابن البقال نے مجھ سے کہا:

کان ابن شاهین یسألنی عن	ابن شاہین مجھ سے احادیث کے بارے
کلام الدارقطنی علی الاحادیث	میں دارقطنی کے آراء و اقوال معلوم کرتے اور
فاخبره فیعلقه ثم یذکره	میں بتاتا تو ان کو ٹانک لیتے، اس کے بعد
بعد ذلك فی اثناء تصانیفه[2]	ان کو اپنی تصانیف میں ذکر کرتے۔

---

[1] شذرات الذہب ج ۳، ص ۱۱۷ [2] تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۲۶۸۔

جیسے داؤدی کا بیان ہے کہ ابن بقال کے نزدیک ابن شاہین ضعیف ہیں ، غالباً ابن بقال بھی اسی رنگ میں جنھوں نے ابن شاہین کی تضعیف کی ہے ، ہو سکتا ہے کہ ابن شاہین نے دارقطنی سے روایۃ الاکابر عن الاصاغر کے انداز میں کبھی استفادہ کیا ہو ، مگر اس روایت سے یہ سمجھنا کہ ابن شاہین اپنی کتابیں اسی طرح لکھتے تھے ، ان کے ثقہ ، حافظ الحدیث اور محدث عراق ہونے کے عین منافی ہے ، ایسا الزام ابن شاہین اور دارقطنی دونوں بزرگوں کی جلالت شان کے خلاف ہے .

ابن شاہین کی تصنیف و تالیف کے سلسلہ میں ایک نہایت سخت اور نازیبا بات دارقطنی کی طرف منسوب کی گئی ہے ، جس کے دو راوی ہیں ، ایک قاضی ابوبکر محمد بن عمر بن اسمٰعیل داؤدی جن کا بیان تاریخ بغداد میں یوں ہے :

وقال لی الدارقطنی یوماً	دارقطنی نے ایک دن مجھ سے کہا کہ
ما اعمیٰ قلب ابن شاهین احمل الی	ابن شاہین کا دل کس قدر اندھا ہے
کتابه الذی صنفه فی التفسیر	انھوں نے تفسیر میں جو کتاب لکھی ہے اسے
وسألنی ان اصلح ما اجد فیه	لے کر میرے پاس آئے اور کہا کہ میں اس میں
من الخطأ فرأیته قد نقل	جو غلطی دیکھوں اس کی اصلاح کر دوں ،
تفسیر ابی الجارود وفرقه	چنانچہ میں نے دیکھا کہ انھوں نے تفسیر
فی الکتاب وجعله عن ابی	ابی الجارود کو نقل کر کے کتاب میں پھیلا
الجارود عن زیاد بن المنذر	دیا ہے اور اس کو عن ابی الجارود ،
وانما هو عن ابی الجارود زیاد	عن زیاد بن المنذر کی سند سے
بن المنذر[1]	بیان کیا ہے ، حالانکہ یہ عن ابی الجارود

[1] تاریخ بغداد ج ١١ ، ص ٢٦٨ .

زیاد بن المنذر ہے۔

ر دوسرے راوی حمزہ بن یوسف سہمی کا بیان تذکرۃ الحفاظ میں معمولی سے لفظی فرق کے ساتھ
ہے، البتہ اس میں آخری الفاظ یوں ہیں:

فرأیتہ قد نقل تفسیر ابی الجارود فی موضع جعلہ عن ابی الجارود عن زیاد بن المنذر الخ[1]

میں نے ابن شاہین کی تفسیر دیکھی، انھوں نے ایک موقع پر تفسیر ابی الجارود نقل کرکے اس کو عن ابی الجارود، عن زیاد بن المنذر بتایا ہے، حالانکہ الخ۔

داؤدی کی روایت کے مطابق دارقطنی نے ابن شاہین کی تفسیر میں متعدد مقامات پر عن ابی الجارود، عن زیاد بن المنذر دیکھا، جس سے معلوم ہوا کہ ابن شاہین ابو الجارود اور زیاد ن منذر کو دو جدا جدا شخصیت سمجھ رہے ہیں، اور ان کو اتنا پتہ نہیں چلا کہ ابو الجارود کنیت ر زیاد بن منذر نام ہے، اور یہ ایک ہی شخص ہے، اسی پر انھوں نے ابن شاہین کو سخت کور دل یا، اور حمزہ سہمی کی روایت میں ہے کہ ابن شاہین نے اپنی تفسیر میں ایک جگہ ایسا لکھا تھا ر ایک شخصیت کو دو سمجھا تھا جس پر دارقطنی نے ان کو کور دل کہا۔

ابن شاہین رجال وطبقات کے زبردست عالم تھے، ان کی کتاب التاریخ اور کتاب ماء الثقات سے ابن حجر نے الاصابۃ اور تہذیب التہذیب میں بار بار استفادہ کیا ر اس بارہ میں وہ مرجع وماخذ ہیں، لہٰذا یہ سمجھنا کہ ان کو ابو الجارود زیاد بن منذر کے بارے ن اتنی خبر نہیں تھی کہ وہ بار بار اس کو دو شخصیت سمجھ کر عن ابی الجارود عن زیاد بن المنذر قت ہے، بالکل قرین قیاس نہیں ہے، اور اگر ایک آدھ مقام پر ایسا تھا تو یہ سبقت قلم یا

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۵۴۔

دلت تم کا تعجب ہے، خاص طور سے ایسی حالت میں جب کہ ابن شاہین بقول خود اپنی کتابوں کا معارضہ و مقابلہ نہیں کرتے تھے، ان میں کوئی کسر کا پایا جانا یقینی تھا، اس معمولی سی بات پر ان کو اتنا سخت لقب دے دینا مناسب نہیں تھا، اس قسم کے اوہام بڑے بڑے ائمۂ حدیث کی تصنیفات میں ملتے ہیں، ابن شاہین ہی کیوں مورد عتاب بنیں؟ ابن ابی حاتم رازی کی کتاب بیان خطأ البخاری فی تاریخہ اور خطیب بغدادی کی کتاب موضح اوھام الجمع والتفریق خاص طور سے اسی موضوع پر لکھی گئی ہے، اور اس قسم کے اوہام و اخطاء اہل علم کی جلالت شان کے منافی نہیں، بلکہ ان کے کمالات میں شامل ہیں، حضرت احنف ابن قیس نے صحیح کہا ہے

الکامل من عدت سقطاتہ — کامل وہ انسان ہے جس کی لغزشیں شمار کی جائیں۔

ہمارے خیال میں ابن شاہین پر دارقطنی کے عتاب کی بڑی وجہ ان کا تفسیر ابوالجارود سے نقل کرنا ہے، جو روافض کے فرقہ جارودیہ کا امام اور حضرت امام محمد باقر (ابو جعفر محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب متوفی ۱۱۷ھ) کی طرف منسوب ایک تفسیر کا مصنف ہے، شمس الدین داؤدی نے طبقات المفسرین میں امام محمد الباقر کے ذکر میں لکھا ہے:

له تفسیر رواہ عنہ زیاد بن المنذر ابوالجارود الکوفی الاعمیٰ رئیس الجارودیۃ الزیدیۃ من الرافضۃ[2] — ان کی ایک تفسیر ہے جس کو ان سے ابوالجارود کوفی نے روایت کیا ہے، وہ اعمیٰ (اندھا) اور روافض کے فرقۂ جارودیہ زیدیہ کا امام ہے۔

غالباً فرقۂ جارودیہ کے بانی اور رئیس ابوالجارود اعمیٰ کی مناسبت سے دارقطنی نے

---

[1] موضح اوہام الجمع والتفریق ج ۱ ص ۶ [2] طبقات المفسرین ج ۲ ص ۱۹۹۔

ملا علی قلب ابن شاھین کا فقرہ چست کیا ہے، ابن شاہین محمدی المذہب ہونے کے دعویدار بن کر ابو الجارود زیاد بن منذر کوفی (متوفی بین ۱۵۰ھ و ۱۶۰ھ) جیسے بانی فرقہ جارودیہ رافضیہ اور وضاع وکذاب رافضی کی تفسیری روایات کو اپنی تفسیر میں جگہ جگہ استدلال واستفادہ کے طور پر درج کریں اور ہر جگہ لاعلمی یا تدلیس کے خیال سے اس کے نام میں لفظ عن کا اضافہ کر کے اس کو دو شخصیت یا دوسری شخصیت قرار دیں، یہ بات آسانی سے تسلیم نہیں کی جا سکتی ہے، البتہ یہ قرین قیاس ہے کہ ابن شاہین نے اپنی تفسیر میں کسی موقع اور مطلب سے تفسیر ابی الجارود سے کوئی عبارت نقل کی ہو اور اس میں سہواً ابو الجارود اور زیاد بن منذر کے درمیان عن لکھ گیا ہو، پھر یہ بھی محل نظر ہے کہ ابن شاہین دارقطنی کے اس قدر معترف اور قائل ہوں کہ ان کی مجلس میں مارے خوف کے لب کشائی نہ کر سکیں، احادیث کے بارے میں دوسروں سے ان کی باتیں سن کر اپنی کتابوں میں درج کریں اور اپنی تفسیر خود لے جا کر اس کی اغلاط کی تصحیح کی گذارش کریں، حالانکہ وہ دارقطنی سے عمر میں نو سال بڑے تھے، اور دارقطنی چھوٹے ہونے کے باوجود ابن شاہین کو بقیۃ الشیوخ اور ثقہ کہہ کر لحان، مصر علی اللحن، فقہ میں صفر اور دل کا اندھا بتائیں۔

ان واقعات میں دونوں راوی داؤدی اور سہمی کے بیان میں اختلافات بھی ہیں، خطیب بغدادی نے تفسیر والی بات کے علاوہ تمام باتوں کو داؤدی کی طرف منسوب کیا ہے، یعنی یہ سب اقوال ابن شاہین کے بارے میں داؤدی کے ہیں اور سہمی نے بتایا ہے کہ میں نے یہ باتیں دارقطنی سے سنی ہیں، داؤدی نے صرف لحان کہا ہے، جبکہ سہمی نے ایک جگہ دارقطنی کی زبانی یلح علی الخطأ بتایا ہے، داؤدی نے لا یعرف من الفقہ لا قلیلاً ولا کثیراً کہا ہے، اور سہمی نے دارقطنی سے صرف کان لحاناً ولا یعرف الفقہ کہا ہے، تفسیر کے

... وذی نے دارقطنی کا قول نقل کیا ہے کہ فرأیتہ قد نقل تفسیرا بہا الجار وفی ... فی کتاب الخ اور سہمی کی روایت میں ہے فرأیتہ قد نقل تفسیرا بالجار وفی ... محدثین نے لکھا ہے کہ عقیلی، حاکم، ابن مردویہ، ابن جوزی، دیلمی، ابن حبان کی طرح ابن شاہین کی تصانیف میں بھی ضعیف احادیث موجود ہیں۔[1]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کے احیاء و ایمان کی حدیث کو دارقطنی، ابن قانع، ابن ناصر، ابن جوزی، ابن دحیہ نے موضوع بتایا ہے اور ابن شاہین، خطیب بغدادی، ابن عساکر، سہیلی، قرطبی، محب طبری، ابن سید الناس نے اس کو صرف ضعیف کہا ہے، سیوطی نے کتاب التعظیم والمنۃ میں لکھا ہے کہ پہلے گروہ نے اس کے ضعف کے جو علل بیان کیے ہیں وہ سب کے سب غیر موثر ہیں، اس لیے ہم دوسرے گروہ کے قول کو ترجیح دیتے ہیں۔[2]

کتاب التفسیر الکبیر امام ابن شاہین نے مختصر طور سے اپنی تصانیف کا تعارف کراتے ہوئے کہا ہے کہ میں نے تین سو تیس کتابیں لکھی ہیں، ان میں سے التفسیر الکبیر ایک ہزار اجزاء میں ہے،[3] اسی کو سیوطی نے منتہی العقول میں لکھا ہے کہ ایک ہزار جلدوں میں ہے اور اسکا نام منتہی التفاسیر ابن شاہین بتایا ہے۔[4] ذہبی نے لکھا ہے کہ ہمارے شیخ عماد الدین حزامی نے واسط میں مجھے بتایا کہ تفسیر ابن شاہین تقریباً تیس جلدوں میں ہے۔[5]

کتاب المسند المسند ڈیڑھ ہزار اجزاء میں ہے، کتب مسانید میں ہر صحابی کے ذکر میں اس کی ساری مرویات جمع کر دی جاتی ہیں اور ہر ایک کے لیے مستقل باب قائم کیا جاتا ہے اور ان ...

---

[1] فتح المغیث ج ۱۱، ص ۲۶۷، تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۰۴ [2] حاشیۃ الاجوبۃ الفاضلۃ ص ۱۱۹ از شیخ عبد الفتاح ابو غدہ طبع حلب [3] الاجوبۃ الفاضلۃ ص ۱۰۰ [4] شذرات الذہب ج ۳ ص ۱۱۷ [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۰۴۔

میں احادیث کی صحت وغیر صحت سے بحث نہیں کی جاتی ہے[1] العبر، تذکرۃ الحفاظ اور شذرات الذہب میں المسند کو تیرہ سو (۱۳۰۰) اجزاء میں بتایا ہے۔

کتاب التاریخ یہ کتاب ڈیڑھ سو اجزاء میں ہے، ابن شاہین نے یہ کتاب صحابہ اور تابعین کے حالات میں لکھی ہے، حافظ ابن حجر نے الاصابۃ کے مقدمہ میں صحابہ وتابعین کے حالات میں کتابیں لکھنے والوں کے تیسرے طبقہ میں ابو علی بن سکن، ابو حفص بن شاہین، ابو منصور باوردی، ابو حاتم بن حبان اور طبرانی کو شمار کیا ہے[1] اور الاصابۃ میں بار بار ابن شاہین کی کتاب کا حوالہ دیا ہے، مثلاً الاعوس بن عمرو الیشکری کے حال میں لکھتے ہیں قلت وجدتہ فی کتاب ابن شاھین الاعوس بالواو[2] اناہ بن قیس کندی کے ذکر میں لکھا ہے وذکرہ ایضا الطبری وابن شاھین فی الصحابۃ[3] انس بن مدرک خثعمی کے حال میں لکھا ہے ذکرہ ابن شاھین فی الصحابۃ[4] نیز ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں ابن شاہین کی تاریخ سے اخذ ونقل کیا، مثلاً یزید بن ضمیر زنی حمصی کے ذکر میں لکھا ہے، قلت ذکرہ ابن شاھین فی الصحابۃ وقال مات فی خلافۃ معاویۃ[5] عبد العزیز بن عبد اللہ بن خالد بن اسید اموی کے حال میں لکھا ہے وذکرہ ابن شاھین فی الصحابۃ من اجل حدیث ارسلہ[6]

کتاب الزہد یہ کتاب ایک سو (۱۰۰) اجزاء میں ہے، اکثر مشایخ محدثین نے زہد ورقائق کے موضوع پر کتابیں لکھی ہیں، ابن شاہین بقیۃ الشیوخ اور واعظ تھے، زہد وتصوف کا ستھرا ذوق رکھتے تھے، کتاب الزہد میں ترغیب وترہیب کا بیان تھا۔

---

[1] الاصابۃ فی تمیز الصحابہ ج۱، ص ۲ [2] الاصابہ ج۱ ص ۴۵ [3] ایضاً ص ۶۳ [4] ایضاً ص ۶۳
[5] تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۳۴۴ [6] ایضاً ج ۶ ص ۳۴۳۔

کتاب الترغیب | شیخ شمس الدین داؤدی نے طبقات المفسرین میں ابن شاہین کی تصانیف میں کتاب الترغیب کا ذکر کیا ہے، ہوسکتا ہے کہ کتاب الزہد ہی کتاب الترغیب ہو۔

کتاب السنة | کتانی نے الرسالۃ المستطرفۃ میں لکھا ہے کہ ابن شاہین صاحب تصانیف عجیبہ محدث ہیں، انھوں نے احمد بن حنبل، ابوبکر الاثرم، عبداللہ بن احمد بن حنبل کی طرح کتاب السنۃ لکھی ہے جس میں اتباع سنت اور اجتناب بدعت کا بیان ہے۔

کتاب تاریخ اسماء الثقات | اس کتاب کا پورا نام تاریخ اسماء الثقات ممن نقل عنهم العلم علی حروف المعجم ہے، کشف الظنون میں اس کے مصنف کا نام خلیل بن شاہین لکھا ہے[1] اور شیخ عبدالعزیز خولی مصری مرحوم نے مفتاح السنۃ میں کشف الظنون کی طرح خلیل بن شاہین لکھا ہے[2] مگر یہ صحیح نہیں ہے، خلیل بن شاہین ظاہری نویں صدی کے عالم تھے ان کی ایک کتاب جغرافیہ میں "کشف الممالک وبیان الطرق والمسالک" مدت ہوئی پیرس میں طبع ہوئی ہے[3] یہ عجیب بات ہے کہ ابن شاہین کی کتاب اسماء الثقات کا تذکرہ نہیں ملتا ہے، جب کہ ثقات عجلی اور ثقات ابن حبان کا نام کتابوں میں عام طور سے آتا ہے، البتہ ابن حجرؒ نے تہذیب التہذیب میں ثقات ابن شاہین کا تذکرہ کیا ہے، اور اس کی عبارتیں نقل کی ہیں اس کا قلمی نسخہ مکتوبہ ۷۳۱ھ دستیاب ہوا ہے جس سے راقم نے پوری کتاب نقل کر لی ہے۔

کتاب الضعفاء | امام ابن شاہین نے کتاب الثقات کی طرح کتاب الضعفاء بھی لکھی تھی اس کا نام ہم کو صرف ابن حجر کی کتاب تہذیب التہذیب میں ابوالہیثم خالد بن الیاس دوری مدنی کے ذکر میں مل سکا ہے ابن حجر نے لکھا ہے:

---

[1] کشف الظنون ج ۱ ص ۵۲۱۔ [2] مفتاح السنۃ ص ۱۵۲ [3] التحقیقات المعدۃ بحتمیۃ ضم حیم جدۃ، ص ۷۵، از استاذ عبدالقدوس انصاری۔

وقال ابن شاهين فى الضعفاء	ابن شاہین نے کتاب الضعفاء میں
ضعفه محمد بن عمار	کہا ہے کہ خالد بن الیاس کو محمد بن عمار
(ج ۳، ص ۸۱)	نے ضعیف بتایا ہے۔

جنائز | ابن شاہین کی تصانیف میں کتاب الجنائز بھی ہے جس کا تذکرہ مولانا عبدالرحمٰ
، مبارکپوری ؒ نے اپنی کتاب الجنائز (اردو) کے مقدمہ میں ابن شاہین کے حال میں کیا
ا ہے کہ محدث ابن شاہین نے کتاب الجنائز کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی ، آپ کی
، کی نسبت حافظ زیلعی نصب الرایۃ میں لکھتے ہیں مجلد وسط ' یعنی اوسط درجہ کے
تاب ہے ، نہ بہت بڑی ' نہ بہت چھوٹی ، حافظ زیلعی نے نصب الرایۃ میں ابن شاہین
ب الجنائز سے متعدد حدیثیں نقل کی ہیں[1]۔

ناسخ الحدیث ومنسوخہ | نواب صدیق حسن خاں صاحب ؒ نے التاج المکلل میں ابن شاہین کا
ا مختصر تذکرہ کیا ہے جس میں ان دو تصانیف کی نشاندہی کی ہے ، چنانچہ ایک کتاب ناسخ
یث ومنسوخہ کا ذکر کرکے لکھا ہے کہ اس کا اختصار ابراہیم بن علی المعروف با بن
ن نے کیا ہے ، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب بہت طویل تھی ۔ (ص ۳۱۲)

تفسیر فی الحدیث | اس نام کی دوسری کتاب کا تذکرہ التاج المکلل میں ہے (ص ایضاً)
ابن شاہین کی تین سو تیس تصنیفات میں سے دس گیارہ کتابوں کے نام مل سکے ہیں ، اور
صرف ایک کتاب تاریخ اسماء الثقات کا قلمی نسخہ دستیاب ہو سکا ہے ۔ جو نادر و نایاب ہے
ان شاء اللہ ہم اس پر ایک مستقل تعارفی مضمون لکھیں گے ۔

| امام ابن شاہین کی وفات یکشنبہ ذوالحجہ ۳۸۵ھ میں ہوئی ، حافظ ابونعیم نے ۱۱ ذوالحجہ ،

---

[1] ب الجنائز ص ۳ و ۴ ۔

یتی .دوران جی نے ۱۲ رذوالحجہ بتایا ہے، بغداد کے باب حرب کے قبرستان میں امام احمد بن حنبل کے
دیں دفن کیے گئے۔ المنتظم میں الحادی والعشرین یعنی ۲۱ رہے جو غالباً الحادی عشر
اس کی تصحیف ہے۔

[...]بو امام ابن شاہین کے دو صاحبزادوں کا حال معلوم ہو سکا جو اپنے والد کی طرح ابن شاہین
کنیت ولقب سے مشہور تھے اور اپنے زمانہ کے مشہور علماء و محدثین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

طاہر احمد بن عمر بن شاہین | ابو طاہر احمد بن عمر بن احمد بن عثمان، ابن شاہین کے لقب سے مشہور تھے
وں نے حدیث کا سماع ابو عبداللہ بن مخرم، ابو سعید احمد بن محمد بن رمیح نسوی، ابو علی بن صواف،
مد بن خلاد، ابو سلیمان محمد بن حسین حرانی، ابوبکر بن کوثر بربہاری سے کیا تھا، اور ان سے ابوالفرح
طاجیری نے روایت کی ہے، اور طاجیری سے خطیب نے روایت کی ہے، ثقہ محدث تھے، ابوالقاسم
ازہری اور ابوالقاسم تنوخی کے بیان کے مطابق ابو طاہر احمد بن عمر بن شاہین جمعہ ۲۹ ربیع الاول
[...]ھ میں فوت ہوئے۔[3]

ابوالقاسم عبیداللہ بن عمر بن احمد ابن شاہین الواعظ | عبیداللہ بن عمر بن احمد بن عثمان، ابوالقاسم الواعظ المعروف بابن شاہین
کی ولادت ۳۵۰ھ میں ہوئی، انھوں نے حدیث کا سماع اپنے والد
ابن شاہین کے علاوہ ابن مالک قطیعی، ابومحمد بن ماسی، ابوبکر محمد بن حسن بربہاری، حسینک نیشاپوری،
ابن مظفر سے کیا تھا، خطیب نے براہ راست ان سے روایت کی ہے، صدوق محدث تھے، والد کی
طرح وعظ گوئی میں مشہور تھے، اور آبائی مکان میں جو شرقی بغداد کے میدان کے ایک جانب واقع
تھا رہتے تھے، ان کی وفات پنجشنبہ ۴ ربیع الاول ۴۴۰ھ میں ہوئی اور دوسرے دن باب حرب
کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔[4]

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۲۶۸ [2] المنتظم ج ۷، ص ۱۸۳ [3] تاریخ بغداد ج ۴ ص ۲۹۳ [4] تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۳۸۳۔ [5]
المنتظم ج ۸، ص ۱۳۸۔

چند ادیبوں کے خطوط

از

ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی، گورنمنٹ کالج، لاہور

یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا، کسی نہ کسی بہانے وقت کے مشہور ادبا کو خط لکھنا، اور اُن سے جواب کا طالب ہونا کچھ عرصہ اپنا ایک مشغلہ رہا، اس ضمن میں راقم نے جو ادبی نکتے یا سوال اٹھائے اور اُن کے جو جوابات پائے انھیں قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے' ایک خط اس عنوان سے غیر متعلق ہے لیکن چونکہ ایک اہم شخصیت کا لکھا ہوا ہے، اور راقم کے بجائے اس کے ایک عزیز دوست کے نام ہے، اس لئے اسے ضمیمہ کے طور پر اس میں شامل کیا گیا ہے تاکہ وہ ضائع ہونے سے بچ جائے،

غالب کا مشہور شعر ہے:-

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا میری جو شامت آئے اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

اس شعر میں لفظ آئے" ذہن پر بوجھ بنا ہوا تھا جب ادھر ادھر دوستوں سے بحث کے بعد کوئی تسلی بخش بات نہ بن سکی، تو چند اہل قلم حضرات کو اس سلسلے میں زحمت دی، انھوں نے جو جواب دیا وہ حسب ذیل ہے:-

مکرم گستر۔ وعلیکم السلام:- مولانا عبدالماجد دریابادی (مرحوم و مغفور) نے ۲۸ جولائی ۱۹۵۴ء کو تحریر فرمایا: "آئے" دیوان غالب کے صرف چند پرانے نسخوں میں ہے،

باقی ایڈیشنوں میں برابر "آئی" ہی درج ہے،

شارحین میں سے طباطبائی، حسرت، آسی، کم از کم ان تینوں میں سے کسی نے اس فرق پر توجہ نہیں کی ہے،

"آئے" اور "آئی" میں خفیف فرق صرف املا اور تلفظ کا ہے، معنی کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں۔ غالب کے وقت تک بول چال کی زبان میں تلفظاً "آئے" ہی (ئے "کی ہلکی آواز کے ساتھ) جائز تھا اور مصرع کا وزن اس کا مقتضی تھا، اب "آئے" (پوری آواز کے ساتھ) صرف بطور "آئی" "افعال" کی جمع کے لئے جائز ہے،

والسلام عبدالماجد

(اخبار صدق، دریاباد ضلع بارہ بنکی)

نیاز فتحپوری (مرحوم) مدیر مجلہ نگار لکھنؤ نے ۷ جولائی ۱۹۵۴ء کو لکھا،

تسلیم — غالب نے "شامت آئی" لکھا ہے، "آئے" کا کوئی محل نہیں "آئی" کو "آای" نہیں پڑھا جائے گا، بلکہ آی (ہمزہ حذف کرکے) نیاز،

حضرت جعفر علی اثر (مرحوم و مغفور) نے کشمیری محلہ۔ لکھنؤ سے ۱۳ اگست ۱۹۵۴ء کو لکھا:۔

مکرم بندہ ۔ وعلیکم السلام، آپ کا پوسٹ کارڈ ملا، غالب کے شعر کا سمجھ کے دلچسپ تھا، نسخہ میں "آئے" (یائے مجہول) سے ہے، نہ کہ "آئی" (یائے معروف) سے۔ اگر شامت آئی پڑھیں تو قدم لینا ہی شامت آنا ہوجاتا ہے جو شاعر کا مقصود نہیں، اور حقیقت کے بھی خلاف ہے، شامت کہنے سے پاسبان کے قدم لینے اور اس کی منت سماجت کرنے کے بعد (کہ حضور یار میں جانے دے) جو

نیتجہ مترتب ہوا، اس کی طرف اشارہ ہوا، شامت پڑھنے سے شعر غلط اور بے معنی ہو جاتا ہے۔"
خاکسار اثر لکھنوی

مسلم ٹاؤن لاہور سے ۲۳ جولائی ۱۹۵۸ء کو مرحوم عبدالمجید سالک نے اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا:

" مکرمی۔ السلام علیکم:۔ کارڈ ملا۔ گذارش ہے کہ وہ چپ تھا مری جو شامت آئے" میں لفظ "آئے" ہی صحیح ہے "آئی" صحیح نہیں ہے۔ ایک تو "آئی" لکھنے سے مصرع میں عروضی نقص پیدا ہو جاتا ہے، جو آئے سے پیدا نہیں ہوتا، دوسرے محاورہ اہل زبان یہی ہے، جو مرزا صاحب نے لکھا ہے، آپ نے پوچھا ہے کہ "آئے" میں کیا خوبی ہے اس میں خوبی وغیرہ کا کوئی سوال نہیں، محاورے کا معاملہ ہے، کل کو آپ پوچھ بیٹھیں گے کہ قدم لئے میں کونسی خوبی ہے، قدم پکڑنا یا قدم چومنا ہونا چاہئے تو ظاہر ہے کہ اس کا جواب اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ محاورہ اہل زبان، ایسے موقع پر قدم لینا ہی ہے،

" شامت آئے" بالکل صحیح ہے، اس میں کوئی شبہ کی گنجائش نہیں، والسلام

عبدالمجید سالک،

محترم جناب ڈاکٹر سید عبداللہ ان دنوں لاہور سے باہر تشریف فرما تھے، انھیں میرا خط لاہور سے ہوتا ہوا ملا، (واضح ہو کہ راقم نے یہ تمام خطوط پشاور سے لکھے تھے،) اس کے باوجود انھوں نے جواب سے بہت اجلد ممنون فرمایا، ملاحظہ ہو:

" مانسہرہ۔ ضلع ہزارہ۔ ۲۵ جولائی ۱۹۵۸ء

محترم۔ سلام مسنون۔ آپ کا خط لاہور سے ہو کر یہاں آیا، میرے خیال میں

مذکورہ شعر میں "آئے" سے "آئی" بہتر ہے، کیوں؟ اس لئے کہ محبوب مجھے گدا سمجھ کر چلا چپ تھا مگر میری جو شامت آئی تو میں نے پاسبان کے قدم "لے لئے" اس سے وہ یہ سمجھا کہ یہ تو گدا نہیں سودائی ہے، پھر جو ہوا اس کا تصور آپ کر سکتے ہیں۔؟

اس شعر میں ایک واقعہ کا ذکر ہے معمول کا ذکر نہیں، اگر معمول یا عادت کا ذکر ہوتا، تو شاید "آئے" کی گنجائش نکل آتی یعنی وہ گدا سمجھ کر چپ رہتا ہے، مگر میری جب شامت آئے (یعنی آتی ہے) تو میں ......"

میں لاہور سے دور ہوں ورنہ اور نسخوں کو بھی دیکھ لیتا، میری رائے میں "آئی" ٹھیک اور "آئے" غلط ہے۔ والسلام، نیاز مند سید عابد علی

جناب مولانا حامد علی خاں حامد (مدیر الحمرا) نے بھی خطاب کے بغیر اس طرح جواب سے نوازا،

"غالب کے تمام اچھے ایڈیشنوں میں یہ شعر اسی طرح ہے، جیسا آپ نے لکھا (یعنی جو ایڈیشن میری نظر سے گذرے ہیں،) علاوہ ازیں آزاد نے آبِ حیات میں اور حالی نے یادگارِ غالب میں اسی طرح لکھا ہے، یہی میرے خیال میں بہتر بھی ہے، اہلِ پنجاب شاید آسانی سے اس اندازِ بیان کی خوبی نہیں سمجھ سکتے، اس میں بات کے "تیور" کا فرق ہے، جو لطف "مری جو شامت آئے" میں ہے، وہ "شامت آئی" میں نہیں ہے، خدا جانے پنجابی میں یوں کہہ سکتے ہیں یا نہیں "میری جو شامت آوے میں اوہنوں پھڑا آیا" مثلاً اس ذی علم دا میر الحمرا ای نہیں چھڈ دا" اگر پنجابی میں یہ کہہ سکتے ہیں تو "آوے" کی جگہ "آئی" کہہ کر دیکھئے، آدھا لطف رہ جائے گا۔ "حامد"

مرحوم عابد علی عابد کو خدا معلوم میرا خط کیوں نہ ملا، میں نے حصولِ جواب کی خاطر

انھیں دوبارہ ایک مرتبہ بعد میں بھی لکھا، بہرحال کوئی ڈیڑھ برس بعد ان کا جواب مل تو گیا لیکن "مجھ پر احسان جو نہ کرتے تو یہ احسان ہوتا،" والی بات ہوئی (خدائے بزرگ و برتر ان کی مغفرت فرمائے)، ان دنوں وہ ہفت روزہ صادق نکال رہے تھے، انھوں نے شعر پر بحث کرنے کی بجائے اس کی شرح دقت پر شائع کرنے کا وعدہ فرمایا" وہ شرح شائع ہوئی یا نہیں، اس کا ہم کو علم نہیں، (۱۱-۱۲-۱۹[illegible]) ہفت روزہ صادق

وائی ایم سی اے بلڈنگ، دی مال لاہور۔

مکرمی۔ آپ کا خط مل گیا ہے، میرا پتہ نکلسن روڈ، لاہور ہے، معلوم نہیں آپ کے پہلے خطوط کیوں نہیں ملے، غالب کا شعر جس کا آپ نے ذکر کیا ہے، اس کی شرح دقت پر "صادق" میں شائع ہوگی، وہیں ملاحظہ فرما لیجئے گا،

ہمارے ہاں خط کا جواب ضرور دیا جاتا ہے اس لئے آپ کا جوابی کارڈ استعمال نہیں کیا گیا،

فقط "مخلص عابد علی"

آپ نے ملاحظہ کیا کہ ایک معمولی سے لفظ نے ارباب فکر و دانش کے ذہنوں کے چمن میں کیا کیا گل کھلائے! ؟ بہرحال اس ادبی رائے شماری میں جیسا کہ آپ نے دیکھا، لفظ "آئے" کا پلڑا بھاری رہا ہے، محترم مولانا حامد علی خاں حامد نے تو دو مستند حوالوں سے اپنی رائے کو مزید ٹھوس بنا دیا ہے، خوش خطی کے لحاظ سے مرحوم آثر لکھنوی کا خط بڑا پختہ اور پیارا ہے الفاظ کی نوک پلک اپنی جگہ پر درست ہے، ان کے بعد مرحومین سالک و عابد کا نمبر آتا ہے، البتہ مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کے خط کی شکستگی، دریائے حروف کے نیچے دو فالتو نقطوں (کی۔ کسی۔ آئی) کے سبب مکتوب الیہ کو آنکھوں اور ذہن پر کسی قدر بوجھ ڈال کر ان کا خط یعنی تحریر، پڑھنا پڑتا ہے، سالک مرحوم نے نامکمل فقروں کے آگے مکمل فقرے کی علامت لگائی ہے جس کا مطلب ہے، وہ علامت لگا دی

مذکورہ شعر میں "آئے" سے "آئی" بہتر ہے، کیوں؟ اس لئے کہ محبوب مجھے گدا سمجھ کر پہلے چپ تھا مگر میری جو شامت آئی تو میں نے پاسبان کے قدم "لے لئے" اس سے وہ یہ سمجھا کہ یہ تو گدا نہیں سودائی ہے، پھر جو جدا اس کا تصور آپ کر سکتے ہیں، ؟ اس شعر میں ایک واقعہ کا ذکر ہے معمول کا ذکر نہیں، اگر معمول یا عادت کا ذکر ہوتا، تو شاید "آئے" کی گنجائش نکل آتی یعنی وہ گدا سمجھ کر چپ رہتا ہے، مگر میری جب شامت آئے (یعنی آتی ہے) تو میں ......"

میں لاہور سے دور ہوں ورنہ اور نسخوں کو بھی دیکھ لیتا، میری رائے میں "آئی" ٹھیک اور "آئے" غلط ہے۔ والسلام، نیازمند سید عابد علی

جناب مولانا حامد علی خاں حامد (مدیر الحمرا) نے بھی خطاب کے بغیر اس طرح جواب سے نوازا:

"غالب کے تمام اچھے ایڈیشنوں میں یہ شعر اسی طرح ہے، جیسا آپ نے لکھا (یعنی جو ایڈیشن میری نظر سے گزرے ہیں،) علاوہ ازیں آزاد نے آب حیات میں اور حالی نے یادگار غالب میں اسی طرح لکھا ہے، یہی میرے خیال میں بہتر بھی ہے، اہل پنجاب شاید آسانی سے اس انداز بیان کی خوبی نہیں سمجھ سکتے، اس میں بات کے "تیور" کا فرق ہے، جو لطف "مری جو شامت آئے" میں ہے، وہ "شامت آئی" میں نہیں ہے، خدا جانے پنجابی میں یوں کہہ سکتے ہیں یا نہیں "میری جو شامت آوے میں اوہنوں بھرا آکھیا۔ مثلاً اس ذرا [illegible] میرا گھر ساری ہی نہیں چھڈ دا۔" اگر پنجابی میں یہ کہہ سکتے ہیں تو "آوے" کی جگہ "آئی" کہہ کر دیکھئے، آدھا لطف رہ جائے گا۔ "حامد"

مرحوم عابد علی عابد کو خدا معلوم میرا خط کیوں نہ ملا، میں نے حصول جواب کی خاطر

انھیں دو ایک مرتبہ بعد میں بھی لکھا، بہرحال کوئی ڈیڑھ برس بعد ان کا جواب ملا تو گیا لیکن "مجھ پہ احسان جو نہ کرتے تو یہ احسان ہوتا،" والی بات ہوئی (خدائے بزرگ و برتر ان کی مغفرت فرمائے)، ان دنوں وہ ہفت روزہ صادق نکال رہے تھے انھوں نے شعر پر بحث کرنے کی بجائے اس کی شرح وقت پر شائع کرنے کا وعدہ فرمایا" وہ شرح شائع ہوئی یا نہیں، اس کا راقم کو علم نہیں، (۱۱-۱۲-[illegible]) ہفت [illegible] صادق

جائی ایم سی اے بلڈنگ، دہلی مال　　　لاہور۔

مکرمی۔ آپ کا خط مل گیا، ہی میرا پتہ نکلسن روڈ، لاہور ہے معلوم نہیں آپ کے پہلے خطوط کیوں نہیں ملے، غالب کا شعر جس کا آپ نے ذکر کیا ہے، اس کی شرح وقت پر "صادق" میں شائع ہو گی، وہیں ملاحظہ فرما لیجئے گا،

ہمارے ہاں خط کا جواب ضرور دیا جاتا ہے اس لئے آپ کا جوابی کارڈ استعمال نہیں کیا گیا۔

فقط　　"مخلص عابد علی"

آپ نے ملاحظہ کیا کہ ایک معمولی سے لفظ نے ارباب فکر و دانش کے ذہنوں کے چمن میں کیا کیا گل کھلائے؟ بہرحال اس ادبی رائے شماری میں جیسا کہ آپ نے دیکھا، لفظ "آئے" کا پلڑا بھاری رہا ہے، محترم مولانا حامد علی خاں حامد نے تو دو مستند حوالوں سے اپنی رائے کو مزید ٹھوس بنا دیا ہے، خوش خطی کے لحاظ سے مرحوم اثر لکھنوی کا خط بڑا پختہ اور پیارا ہے الفاظ کی نوک پلک اپنی جگہ پر درست ہے، ان کے بعد مرحوم سالک و عابد کا نمبر آتا ہے، البتہ مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم کے خط کی شکستگی اور یائے معروف کے نیچے دو فالتو نقطوں (کی۔ کسی۔ آئی) کے سبب مکتوب الیہ کو الجھن اور ذہن پر کسی قدر بوجھ ڈال کر (الفاظ یعنی تحریر) پڑھنا پڑتا ہے، سالک مرحوم نے نامکمل فقروں کے آگے مکمل فقرے کی علامت لگائی ہے جس کا مطلب ہے، وہ علامت لگا دی

کے معاملے میں اتنے محتاط نہ تھے،

غالباً ۱۹۵۶ء میں فیروز سنز لاہور والوں نے تذکرۂ شعرائے جدید شائع کیا، میری مطالعہ میں وہ شعر بھی نظر پڑی، مجھے تذکرہ نگار نے ریاض خیرآبادی سے منسوب کیا تھا، لیکن راقم نے اسے کسی مضمون میں گستاخ رامپوری سے منسوب پایا تھا، چنانچہ فوراً رگ جواب طلبی پھڑکی اور راقم نے نیاز فتحپوری مرحوم کو خط لکھ ڈالا، ۲۰ اپریل ۱۹۵۶ء کو لکھنؤ سے ان کا حسب سابق دوسطری جواب ملا،

صد سالہ دور چرخ تھا، ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

لکھنؤ ۲۰ اپریل ۱۹۵۶ء

"یہ شعر یقیناً گستاخ کا ہے کسی غلطی کی وجہ سے ریاض سے منسوب ہو گیا،" نیاز

تذکرہ ادارے کی توجہ اس طرف دلائی گئی تو یہ جواب موصول ہوا:۔

"فیروز سنز لاہور

"کارڈ محررہ ۲۲ اپریل موصول ہوا، آپ نے جس شعر کا حوالہ دیا ہے بازار سے ریاض رضوان کے نہ ملنے سے اس کی تصدیق تو نہیں ہو سکی، کہ ان کے دیوان میں بھی ہے یا نہیں لیکن ایک دوست کی بیاض سے معلوم ہوا ہے، کہ یہ گستاخ دہلوی کا شعر ہے' دہلوی اور رامپوری کا تو قضیہ (؟ غالباً یہی لفظ ہے) نہیں۔ اگر آپ کے پاس ریاض رضوان ہو تو اس سے دیکھ کر پتہ دیں کہ یہ شعر ریاض کا ہے، یا نہیں تاکہ اگر نہ ہو تو آئندہ ایڈیشن میں نکال دیا جائے، ہم بھی کوشش کر رہے ہیں، اگر ریاض مرحوم کی مستند کتاب مل گئی تو اس شبہ کو دور کرنے کی کوشش کی جائیگی'

آپ کی اس عنایت کا شکریہ،

جوابی کارڈ لکھکر آپ نے تکلف سے ہی کام لیا ہے، ؟ نیاز کیش، اقبال احمد ،، ہمایوں
راقم کے پاس مذکورہ کتاب تھی، چنانچہ فوراً اس سے انھیں آگاہ کر دیا گیا اور پھر وہی معاملہ

ہوا یعنی :- ع :- آں راکہ خبر شد خبرش باز نیامد

جعفر علی اثر مرحوم خود کو "میر ثانی" کہا کرتے تھے، ایک مرتبہ محترم ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کا
میر تقی میر پر ایک مضمون ماہنامہ ادب لطیف لاہور کے کسی شمارے میں شائع ہوا، اس میں میر کا ایک
مصرع یوں درج تھا :- طالع نے چشم پوشی یہاں تک کی ہم نشیں
اثر مرحوم نے اس مضمون کے جواب میں ایک مضمون لکھا، یہ مضمون اب صحیح طور پر یاد نہیں
کہ ادب لطیف ہی میں شائع ہوا، یا ماہنامہ الحمراء لاہور میں، بہرحال اس مضمون میں یہ مصرعہ
اس طرح درج تھا جب کہ کلیات میر مرتبہ آسی میں ذرا سے فرق کے ساتھ ہے، راقم کو بہانہ
ہاتھ آیا، اثر مرحوم کو لکھا کہ میر پر آپ کا "جواب مضمون" پڑھا تعجب ہوا کہ آپ ایسے "میر ثانی" بھی میر
کا شعر غلط لکھیں، ؟ اس کے ساتھ ہی ان کی تصانیف کے بارے میں بھی ایک سوال لکھ ڈالا
مرحوم نے کمال عنایت سے یہ جواب تحریر فرمایا :

کشمیری محلہ - لکھنؤ، ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۲ء

مکرمی - تسلیم :- خط کا شکریہ، ادب لطیف کا وہ نمبر
اس وقت نہیں ملتا، جس میں جناب پروفیسر سید عبداللہ کا مضمون شائع ہوا ہے
اور میرا مضمون جس کا جواب ہے، انھوں نے غالباً میر کا مصرع یونہی درج کیا تھا

ع : طالع نے چشم پوشی یہاں تک کی ہم نشیں،

میں نے اس طرف توجہ نہیں کی، کہ اس کے الفاظ میں کچھ رد و بدل ہے آپ کا

تحریر کئے۔ پر کلیات میر میں دیکھا تو مصرعہ اسی طرح درج ہے جس طرح آپ نے تحریر فرمایا ہے، اگر میں نے بھوپالی صاحب کا تتبع کیا ہے، تو بھی ان سے واقف ہیں کہ؟ ورنہ میں گنہگار رہوں،

"جہاں تک میرے علاوہ ملک اور مجموعہ اثر کے تنقیدی مضامین شائع ہوا ہے دو دیوان ہیں بہارستان اور بہاراں، ایک مجموعہ رنگ بست ہے، جس میں غیر زبانوں کے آزاد منظوم تراجم ہیں نغمۂ جاوید گیتا کا منظوم ترجمہ۔ لالہ و گل مجموعہ رباعیات و قطعات۔ اور بھی تصنیفات ہیں، آپ کا دماغ کہاں تک پریشان کروں،" نیاز کیش اثر

تیس برس قبل مولانا عبدالماجد دریابادی کی کتاب "خطوط مشاہیر حصہ اول" (مطبوعہ تاج کمپنی لاہور) میں مولانا کے نام حضرت اکبر الہ آبادی مرحوم کا یہ خط نظر سے گذرا تھا:

الہ آباد - ۸ ستمبر ۱۴ء

عزیزی وحبیبی سلمہ اللہ تعالیٰ، ! مجھ کو حیرت ہوئی کہ آپ ایسے شعر کہہ سکتے ہیں[1] جو رنگ سخن ظاہر ہوتا ہے، وہ بہت پختہ ہے، کیا کہنا چاہئے، اور کیونکر کہنا چاہئے اول میں کوئی جگہ اعتراض کی نہیں ہے۔ بلکہ آپ کی تقلید مناسب ہے، دوم میں البتہ

[1] مولانا نے یہاں یہ حاشیہ دیا ہے "۱۹۱۲ء سے میرا دور غزل گوئی شروع ہوتا ہے جو کہ اس سے دو سال قبل شروع ہوا، اور شادی کے ڈیڑھ دو سال بعد تک رہا۔ پہلی غزل: زاریاں بگیں میاں ... نگین کی زمین میں تھی، یہی غزل اصلاح کے لئے حضرت اکبر کی خدمت میں روانہ کی ہے، حالانکہ طبیعت پر رنگ حسرت موہانی کا غالب تھا،"

(خطوط مشاہیر ص ۱۷)

کہیں کہیں کچھ اصلاح کی ضرورت ہے، بہرکیف میں آپ کی غزل دیکھ کر بہت خوش ہوا، یہ شعر تو ہر اعتبار سے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے:

رہی ہر چند عقل صبر آموز / نہ گئیں بے قراریاں نہ گئیں،

کیا خوب کہا ہے۔ آپ ان شاء اللہ بڑی باطنی ترقیاں حاصل کریں گے، دو دن سے طبیعت اچھی نہیں نزلے میں مبتلا ہوں، زیادہ نہ لکھ سکا۔

دعاگو اکبر حسین

کبھی دل چاہے تو دو ایک دن کے لئے چلے آئیے آپ تو طالب علمانہ حالت میں ہیں اور میرے عزیز ہیں۔ سفر کا بل میرے ذمہ[1]

یہ خط پڑھنے کے بعد راقم نے مولانا کو اُن کے مجموعۂ کلام کا نام پوچھنے کی خاطر خط لکھ ڈالا جس کا انھوں نے ازراہِ لطف وعنایت درج ذیل جواب دیا:

ہفتہ وار صدق لکھنؤ

مورخہ ۲۶ر نومبر ۱۹۵۲ء دریاباد ضلع بارہ بنکی (یو۔پی)

عزیزم۔ وعلیکم السلام:۔ اپنی شاعری کی بساط ہی کیا، زندگی میں کل ۲ دور شاعری کے آئے، ایک آخر ۱۳ء سے ۱۶ء تک رہا جب عمر ۲۱ تا ۲۴ تھی، وہ غزل کی شاعری تھی، اور ایک جائز عشق کا نتیجہ۔ ایک ڈراما "ناظر" کے فرضی نام سے ۱۵ء میں لکھا تھا" زود پشیماں" کچھ غزلیں اس میں آگئی ہیں، اب کہاں ملیں گی، دوسرا دور ۲۲ء سے ۲۴ء تک قائم رہا۔ اب ملحد نہیں، بلکہ ازسرنو مسلمان ہوچکا تھا، اس دور کی غزلیں نعتیہ ہیں، زیادہ تر مولانا محمد علی جوہر کے اتباع میں۔

---

[1] خطوط مشاہیر، حصہ اول ص ۷۰، ۷۱

بس یہی کل کائنات شاعری کی ہے،

محوی صاحب کی کتاب اور مقدمہ نظر سے نہیں گذرا، بات کوئی ایسی اہم اور بحث طلب ہے ہی نہیں[۱]

صحیح پتہ لکھنو کا نہیں دریاباد کا ہے،   والسلام   دعاگو

عبدالماجد

فارسی کا ایک مشہور شعر ہے، (جس کا ایک مصرع ضرب المثل کی صورت اختیار کر گیا ہے)

نوروز و نو بہار و مے و دلبرے خوش ست   بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اسے برصغیر میں مغلیہ خاندان کے بانی ظہیرالدین بابر سے منسوب کیا گیا ہے لیکن بعض محققین[۲] اسے کسی اور بابر کا بتاتے ہیں، راقم نے اس ضمن میں دارالمصنفین اعظم گڑھ کے علمی و ادبی مجلہ کے مدیر محترم سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی رائے معلوم کرنے کے لئے انھیں خط لکھا، انھوں نے کمال مہربانی سے تفصیلی جواب ارسال فرمایا، ملاحظہ ہو،

۱ر جون ۵۳ء   محترمی، تسلیم

نوازش نامہ ملا تھا، رمضان شریف اور دوسری مشغولیت کی وجہ سے جواب دینے میں تاخیر ہوئی جس کے لئے معذرت کا خواہاں ہوں، حسب ذیل شعر

نوروز و نو بہار و مے و دلبری خوش است   بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

---

[۱] حسن سجزی کی بحث کی طرف اشارہ ہے۔ [۲] مثلاً حسین دوست سنبھلی نے اپنی کتاب تذکرۂ حسینی (مطبوعہ نولکشور پریس ص ۴۴) میں اسے سلطان ابوالقاسم بابر میرزا ابن بایسنقر (بایسنغر) میرزا سے منسوب کیا، اور پہلا مصرع اس طرح دیا ہے، ع

نوروز و نو بہار و مے و دلبراں خوش است

بابر ہی کا شعر ہے، تاریخ فرشتہ (نول کشور پریس) کے جلد اول ص ۲۱۱ پر یہ شعر اسی کی
طرف منسوب ہے، پروفیسر عبدالغنی نے اپنی کتاب پرشین لینگویج اینڈ لٹریچر ایٹ دی
مغل کورٹ جلد اول (ص ۵۵) اور اس عاجز راقم نے اپنی حقیر تالیف بزم تیموریہ
(ص ۸ ایضاً) اس شعر کو بابر ہی کا شعر قرار دیا ہے۔ تذکرہ حسینی بارہویں صدی ہجری
یعنی ۱۱۶۳ھ میں لکھی گئی ہے اس لئے فرشتہ کا بیان اس کے مقابلہ میں زیادہ قابل ترجیح ہے

حسینی دوست سنبھل ضلع مرادآباد (مرادآباد ؟) (یو۔پی) کے رہنے والے تھے،
ان کے والد بزرگوار کا نام سید ابوطالب تھا، وہ سنبھل سے دہلی آئے، اور یہاں
رہ کر شعر و شاعری کا اچھا ذوق پیدا کیا، دوستوں کے اصرار سے ایک تذکرہ لکھا
جس کا نام تذکرہ حسینی رکھا، اس میں زیادہ تر شعراء کا تذکرہ ہے، بعض اولیاء اللہ
شہزادوں کا بھی ذکر آگیا ہے محققین اس تذکرہ کا حوالہ برابر دیتے رہے ہیں
لیکن یہ تذکرہ اپنے عہد کے شعراء کے لئے تو مستند سمجھا جا سکتا ہے لیکن قدیم شعراء
کے حالات کے لئے معاصر تذکروں ہی کے بیانات کو ترجیح دینا چاہئے ،.......

.... والسلام صباح الدین عبدالرحمٰن

مشہور ہے کہ زیب النساء دختر اورنگ زیب عالمگیر شاعرہ تھی، اور مخفی تخلص کرتی تھی، غالباً
اسی بنا پر برصغیر میں شائع شدہ ایک فارسی مجموعۂ کلام "دیوانِ مخفی" کو اس سے منسوب کیا گیا لیکن
چونکہ علامہ شبلی مرحوم نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اس کی بیاض تالاب میں گر گئی تھی، اس لئے اس
دیوان کا اس سے کہاں تک تعلق ہے، یہ مسئلہ زیر بحث تھا اس سلسلے میں جوش ملیح آبادی کو
اور مدیر معارف اعظم گڑھ کو خطوط لکھے گئے، جوش صاحب کو لفظ "خضر" کے تلفظ کے بارے میں کچھ
پوچھا گیا تھا، جوش صاحب نے لکھا :

دہلی ۱۱؍مارچ ۱۹۵۶ء

مکرمی، دیوان مخفی کے متعلق میری کوئی تحقیقاتی رائے نہیں ہے،
"خضر" ایسا نام ہے جو "ض" کے سکون، فتح اور کسرہ تینوں طرح سے ملفوظ
ہوتا ہے،

امید کہ آپ بخیریت ہوں گے، جوش

معین الدین احمد صاحب (معارف) سے یہ بھی پوچھا گیا تھا کہ معارف کا پرچہ (جس کی
فروخت بعض پابندیوں کے سبب یہاں محدود ہو کر رہ گئی تھی) لاہور میں اب کہاں سے
دستیاب ہو سکتا ہے،:

مکرمی السلام علیکم

آپ کا خط ملا، معارف کے پرچے آپ کو مکتبہ جدید انار کلی لاہور (سے)
مل جائیں گے۔ معارف کا خاص نمبر نہیں نکلتا، دیوان مخفی زیب النساء کا
نہیں ہے، بلکہ ایک دوسرے شاعر کا ہے، جو زیب النساء کی جانب منسوب ہو گیا ہے"

والسلام معین الدین احمد ۱۴؍اکتوبر ۱۹۵۲ء

اس سے قبل اسی سال جولائی کے مہینے میں نیاز فتحپوری مرحوم کو کسی بات پر خط لکھا تھا
جس میں مجلہ نگار سے متعلق کوئی تجویز بھی پیش کی گئی تھی، تجویز کیا تھی، کچھ یاد نہیں، البتہ کیا
پدی کیا پدی کا شوربا" والی بات ہو گی، ظاہر ہے اس کا جواب کچھ کرارا ہی ہو گا چنانچہ آپ
دیکھیں گے کہ نیاز مرحوم نے جواب میں کس بھرپور طنز سے کام لیا ہے،

دفتر نگار لکھنؤ۔ ۱۵؍جولائی ۱۹۵۲ء

مکرمی۔ یاد فرمائی کا شکریہ۔ سالنامہ کے متعلق آپ کی تجویز بہت

معقول ہے لیکن اس نامعقول دنیا میں معقول بات کون سنتا ہے، بہر حال
آیندہ سالنامہ مرزا داغ کے لئے وقف ہوگا، یہ بات طے ہو چکی ہے،

خاکسار نیاز فتح پوری

مولانا محمد علی جوہر مرحوم کے ایک دوست عرفان مرحوم تھے، جن کا تعلق صوبہ سرحد کے ضلع ہزارہ سے تھا، ان کا ایک بھتیجا راقم کا شاگرد تھا، ایک روز باتوں باتوں میں اس نے مجھ سے اس دوستی اور مرحومین کی باہمی خط و کتابت کا تذکرہ کیا، اور یہ بھی بتایا کہ جوہر مرحوم کے کئی خطوط ان کے گھر موجود ہیں، میں نے اسے دکھانے کو کہا، ایک روز چھٹیوں کے بعد گاؤں سے وہ ایک پوسٹ کارڈ لے آیا، اور کہنے لگا کہ تلاش بسیار کے باوجود صرف یہی ایک کارڈ مل سکا ہے، باقی بے توجہی کی نذر ہو گئے ہیں، بڑا دکھ ہوا، تاہم اسے تبرک سمجھ کر بہت احتیاط سے لیا، اور آج فخر کے ساتھ اسے ہدیۂ قارئین کر رہا ہوں،

پوسٹ کارڈ کے ایک جانب بعض عمارتوں کی رنگین تصویریں ہیں، اور نیچے انگریزی میں یہ عبارت چھپی ہے،

3 B. I. lines, Crater, Aden,

دوسری جانب وسط میں انگریزی حروف میں پوسٹ کارڈ لکھا ہے، اور دائیں جانب میں چھوٹا سا چوکھٹا ہے جس میں Printed in Germany کی عبارت ہے، اس کے ساتھ ہی پتے کا حصہ ہے، درمیان میں اوپر سے نیچے ایک لکیر کھینچی گئی ہے میں یہ عبارت ہے،: This is a real Photograph

کارڈ کی اسی جانب جوہر مرحوم کی خوشخط اور ذرا موٹے قلم کی تحریر ہے، ملاحظہ

"عرفان - ابھی عدن ہو کر آیا ہوں، ہندوستان کی غلامی کے لئے یہ بھی غلام ہے

جبل الطارق ہی سے ہندوستانی غلامی کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، یہ آخری کڑی ہے،
خدا اس زنجیر کو جلد توڑے۔"

تمہارا محمد علی

عدن۔ ۷ر جون ۲۸ء

کارڈ پر کوئی ٹکٹ نہیں، غالباً یہ کارڈ کسی لفافے میں ڈال کر بھیجا گیا ہے کیونکہ اس پر عرفان مرحوم کا پتہ نہیں ہے،

اس صراحت سے اندازہ ہوگا کہ مولانا محمد علی کو اپنے وطن کی غلامی سے کیسا دکھ رہا، دور دراز علاقوں پر جب ان کی نظر پڑتی تو ان کے دل میں ہوک اٹھتی کہ ان ہی راستوں کے ذریعہ سے ہندوستان کی گردن میں غلامی کا طوق پڑا،

اسلام اور مستشرقین

پر
دارالمصنفین کا بین الاقوامی سمینار

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۷)

سمینار کی پانچویں نشست رابطۂ اسلامیہ مکہ کے ڈائرکٹر جنرل ڈاکٹر عبدالصبور مرزوق کی صدارت میں شروع ہوئی، ان کی صدارت کی تحریک کرتے ہوئے مولانا ابوالحسن علی ندوی نے ایک بار پھر فرمایا کہ رابطۂ اسلامیہ نے خاص طور سے ان کو اپنا نمایندہ بناکر اس سمینار کے لیے بھیجا ہے، وہ بہت ہی مشغول آدمی ہیں، اس وقت یوگنڈا سے یہاں کی شرکت کے لیے تشریف لائے ہیں، کارروائی کو آگے بڑھانے کے فرائض ڈاکٹر سید سلمان ندوی نے انجام دیے، انھوں نے جناب ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی دہلی یونیورسٹی کو اپنا مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی، جس کا عنوان "مستشرقین کے تصور اسلام کا تاریخی پس منظر" تھا۔

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی | اس مقالہ کے کچھ ٹکڑے یہ ہیں:

مشرق کے خلاف یورپ کی جارحیت ہمہ جہت تھی، ان کے حملے صرف فوجوں کے ذریعہ نہیں ہوئے، اس میں ان کے دانشور مستشرقین، اہل فکر، شعراء اور اساتذہ بھی شامل تھے، اسی لیے

اقبالؒ نے مغربی مدرسوں کی کور نگاہی اور بے ذوقی کی شکایت کی ہے ؎

نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت نہ نگاہ

مغربی اثرات کے چیلنج کا رد عمل مشرق پر ایک دائرہ کی شکل میں رونما ہوا، جس میں رد و قبول، تقلید و تخلیق، تنقیدی فکر اور بہترین اقدار کا انتخاب اور اعتماد کے ساتھ اپنی صالح مشرقیت پر جمے رہنے کا انداز کار فرما ہے، لیکن مغرب نے نئے نئے دام بچھائے تھے، اور ایک ایسی نسل کو تیار کیا تھا جو اپنی ذہنیت اور مرعوبیت میں بالکل مغرب زدہ اور مشرق سے بیزار تھی، درحصل اہل کلیسا کا یہ نظام تعلیم اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

اقبال نے علامہ سید سلیمان ندویؒ کے نام ایک خط میں صراحت سے لکھا ہے کہ لندن میں مشرقی واقعی علوم کا ادارہ صرف برطانوی سامراجیت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے قائم کیا گیا ہے اسی قسم کے خیالات انھوں نے حافظ فضل الرحمٰن انصاری کے نام ایک خط میں ظاہر کیے ہیں، لکھتے ہیں:

> "جہاں تک اسلامی ریسرچ کا تعلق ہے، فرانس، جرمنی، انگلستان اور اٹلی کی یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے مقاصد خاص ہیں، جن کو عالمانہ تحقیق اور احقاق حق کے ظاہری طلسم میں چھپایا جاتا ہے، سادہ لوح مسلمان طالب علم طلسم میں گرفتار ہو کر گمراہ ہو جاتا ہے۔"
>
> (اقبال نامہ، ص ۲۹۲)

اقبالؒ کو افسوس تھا کہ مغربی کالجوں کے پڑھے ہوئے مسلمان نوجوان روحانی اعتبار سے فرومایہ ہیں، ان کی نظر مساوات شکم سے آگے نہیں جاتی، وہ روح کو معدہ میں تلاش کرنا چاہتے ہیں حالانکہ روح کی قوت و حیات کا جسم سے کوئی تعلق نہیں، یہ اور اسی قسم کے بہت سے خیالات

ان مغربی دانشوروں کے ذریعہ پھیلے، جن کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیے بغیر ترقی ممکن نہیں تھی۔

جب اقوام مغرب نے مشرق کا بحری راستہ معلوم کیا اور مشرق پر اپنی حاکمیت قائم کرنا شروع کی تو اس کی ضرورت بھی محسوس کی کہ ان کی زبانوں کو، ان کے مذاہب کو اور ان کے تہذیب و تمدن کو سمجھیں اور ان کو اپنے رنگ میں اس طرح پیش کریں کہ مغرب مقابلۃً اعلیٰ و ارفع نظر آئے اور اس کی صنعت و حرفت اور سامان تجارت بہتر ٹھہرے، جن عالموں نے اس اقلیم میں قدم رکھا وہ مستشرقین کہلائے اور پورا ایک نیا علم اورینٹلزم کے نام سے وجود میں آگیا، یہ مشرق اورینٹ (ایسٹ نہیں) اصل میں مغرب کا زائیدۂ فکر ہے، جہاں تخیل ہی تخیل ہے، رومانس ہی رومانس ہے، اس میں شدید جنسیت ہے، عیش و عشرت کی بہتات ہے، بھوک اور بے رحمی ہے، اس کی میزان قدر میں قرآن پاک اہم نہیں ہے، الف لیلہ اہم ہے، جو عربی ادبیت میں معمولی درجہ کی کتاب ہے، یہ مشرق و مغرب کی بنیادی تہذیب کا حصہ بن گیا ہے، اس میں عجیب و غریب آدمی رہتے ہیں، نیم وحشی، نیم متمدن، نیم برہنہ، خواجۂ سگ پرست بھی، نعمان سیاح بھی، زاہد بھی رند بھی، اس مشرق کی دولت بے کراں ہے، اس کی خام پیداوار کے بغیر مغرب کے کارخانے نہیں چل سکتے، یہ مشرق تہذیب کا گہوارہ اور مذاہب کا سرچشمہ ہے، یہ مشرق مغرب کے مادی مفادات کا مرکز و محور ہے، اس مشرق کو یورپ نے سماجیاتی، فوجی، جنگی اور سیاسی طور پر پیدا کیا ہے، اور اس پر اتنی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ ان سے ایک اچھا خاصا کتب خانہ تیار ہو سکتا ہے، اس مشرق کا جو کلیتۂ مغربی تصورات اور مفادات کی پیداوار ہے، کچھ تھوڑا سا اندازہ دانتے کی مشہور و معروف نظم طربیہ خداوندی سے ہو سکتا ہے، جو ۱۳۱۴ء اور ۱۳۲۱ء کے درمیان تصنیف ہوئی، اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ عہد وسطیٰ میں اہل یورپ مشرق بالخصوص اسلام کے متعلق کیسے گھناونے تصورات رکھتے تھے، اور ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ عشق محمدؐ ان کے دل سے

نکال دیں، اس لیے کہ ان پر ان کی عظمت قائم تھی، اس نظم نے یورپ کے ذہن و ضمیر پر بے انتہا اثر ڈالا ہے اور اتنے ماہ و سال گذرنے کے بعد اس میں تاریخ کی سی تقدیس اور سچائی پیدا ہوگئی ہے طربیۂ خداوندی کے تین حصے ہیں، دوزخ، برزخ اور فردوس، دانتے مشرق و مغرب کی اہم شخصیتوں سے واقف تھا، مثلاً وہ ورجل، ہومر، ابن سینا اور ابن رشد سے واقف ہے، اور مسلمانوں اور یہودیوں کی تاریخ سے بھی ناآشنا نہیں تھا، اس میں عیسائیوں کی کورنگہی تنگ دلی اور عصبیت کوٹ کوٹ کر بھری ہے، اس کا یہ ایمان ہے کہ مغفرت کے سزاوار صرف کیتھولک عیسائی اور باقی سب دوزخ کا کندہ ہیں، دانتے نے دوزخ کے کینٹو اٹھائیس[۲۸] اور نویں طبقہ جہنم یعنی اقلیم عذاب میں حضور رسالت آب صلی اللہ علیہ وسلم کی نعوذ باللہ بڑی ہی ہیبت ناک تصویر کھینچی ہے، نقل کفر کفر نباشد، یہ دکھلایا ہے کہ شکم مبارک چاک ہے اور حضور سرور کائنات کی نعوذ باللہ آنتیں باہر نکلی ہوئی ہیں اور وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جن کو خود نعوذ باللہ دو حصوں میں چیر دیا گیا ہے فرماتے ہیں: دیکھو میری یہ حالت سیاہ ترین بدمستیوں اور بدکاریوں کا نتیجہ ہے، یہ عیسائیت کو مسخ کرنے، فریب اور ریاکاری اور نفاق کو پھیلانے اور اختلاف کا بیج بونے کی سزا ہے، استغفر اللہ دانتے کو پاپائیت اور کیتھولک فلسفہ اور عقیدے پر پورا یقین تھا، اور اس کے تخیل کے سارے نقش و نگار اسی مذہبی تعصب کے پیدا کردہ ہیں، طربیۂ خداوندی کی تعمیر و ترکیب میں بھی یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کی روایتوں، تمثیلوں اور یونانی، رومی اور عرب صنمیات کے علاوہ سب سے زیادہ دخل اس تعصب کو ہے جو صلیبی جنگوں سے عیسائیوں کے دلوں میں جاگزیں تھا، اور اس میں سب سے بڑی کرشمہ سازی اس زہریلے تخیل کی ہے جو دانتے کی شاعری کا حصہ بن گیا تھا، اس کا اتنا گہرا اثر مغرب پر ہوا ہے کہ انھوں نے طربیۂ خداوندی کو صحیفۂ آسمانی شمار کر لیا تھا۔

میرے عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ دانتے سے لے کر ڈاکٹر اسپرنگر اور سر ولیم میور اور بیسویں صدی کے مانٹ گمری واٹ تک اسلام کا کم و بیش یہی تصور ان کے سامنے رہا ہے، اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ہندوستان میں جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز افسر آئے وہ بھی یہی تخیل رکھتے تھے، اور وہ عیسائیت کی سب سے بڑی خدمت یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو عیسائی بنائیں، ان کی عظمت دیرینہ کو ختم کر دیں اور ان کے دل سے حضور رسالت مآبؐ کی محبت نکال دیں، وہ خوب جانتے تھے کہ اس محبت کے بغیر اسلام کی عمارت ڈھہ جائے گی۔

۱۸۴۲ء سے ۱۸۵۴ء کے درمیان مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان جو مناظرے پہلے آگرہ اور پھر دہلی میں ہوئے ان میں بھی یہی تخیل اور یہی تعصب کارفرما ہے، ۱۸۰۳ء میں عیسائیوں نے دہلی میں قدم جمائے اور ۱۸۰۳ء ہی میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے یہ فتویٰ دیا کہ ہنگلی سے لے کر دہلی تک سارا علاقہ انگریزوں کے زیر اثر آگیا ہے، اس لیے ان کے خلاف لڑنا ہمارا دینی فرض ہے، لیکن اسی کے ساتھ ہمیں ان کے نئے علوم کو بھی سیکھنا چاہیے، ۱۸۴۰ء اور ۱۸۵۴ء میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خاں اور ریورنڈ فینڈر کے درمیان آگرہ میں جو مذہبی بحثیں اور مناظرے ہوئے ان سے بھی عیسائیوں کی یہی کور فہمی، تنگ نظری اور عصبیت جھلکتی ہے، جو صلیبی جنگوں اور دانتے کی بدولت ان کو وراثۃً ملی تھی، سر سیدؒ کا یہ خیال صحیح ہے کہ اسی کی وجہ سے ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں علماء نے قلم چھوڑ کر تلوار اٹھالی تھی۔

۱۸۳۳ء میں جو چارٹر ایکٹ آیا، اس نے بھی مسیحی مبلغین کو بالکل بے لگام کر دیا تھا، اور انھوں نے مسلمانوں کی دلشکنی اور دل آزاری میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی، اس کی شہادت ڈپٹی نذیر احمد اور سر سیدؒ کی تحریروں سے بخوبی مل جاتی ہے۔

اٹھارویں اور انیسویں صدی میں مشرق کے زوال اور مغربی استحصال کے ساتھ ساتھ اسلام

اور اسلامی ممالک کی غلط تعبیر کے لیے ایک نیا ڈسپلن وجود میں آیا جس کو اورینٹلزم کہا جاتا ہے،
میں اس کا کھلے دل سے اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ اس شر میں خیر بھی شامل تھا، اس سے بالواسطہ
تحقیق کی نئی راہیں بھی کھلیں اور سماجی اور سائنسی علوم کی مدد سے پہلے کے مقابلہ میں زیادہ
خزینہ دار اور تونگر بن گئیں، لیکن انیسویں صدی کے اواخر تک یہ کوشش صرف جھوٹی سچی اور اُڑتی ہوئی
افواہوں اور افسانہ طرازیوں اور صحیح و موضوع حدیثوں کا مجموعہ تھی جس کے پیچھے سامراجی مقاصد تھے
ان مقاصد پر خوبصورت پردے پڑے ہوئے تھے اور عام طالب علم ان پردوں کے نقش و نگار
ہی کو حقیقت سمجھ بیٹھے تھے، ڈاکٹر اسپرنگر کی کتابیں بزبان انگریزی و جرمن اس کے ثبوت میں
پیش کی جا سکتی ہیں، اس نے انگریزی میں لائف آف محمد کے نام سے لکھی جو الٰہ آباد سے ۱۸۵۱ء میں
شایع ہوئی، پھر جرمن زبان میں لائف اینڈ ڈاکٹرینز آف محمد کے نام سے تین جلدیں لکھیں جو
۱۸۶۵ء میں شایع ہوئیں، اسپرنگر کا ماخذ واقدی ہے جس کے متعلق تمام دنیا یہ جانتی ہے کہ وہ
اندھیری رات میں لکڑیاں چننے والا تھا اور اس کی غلط روایتوں، افسانہ طرازیوں اور جھوٹے
قصے کہانیوں اور بے سند باتوں کی وجہ سے تمام علمائے اسلام نے غلط اور نامعتبر قرار دیا ہے،
یہی حال سرولیم میور کا ہے جن کے اعتراضات سے سرسید کا کلیجہ چھلنی ہو گیا تھا اور اسی کا جواب
لکھنے کے لیے وہ انگلستان گئے اور اس کا جواب انھوں نے خطبات احمدیہ کے نام سے ۱۸۷۰ء میں اپنے
برتن بیچ بیچ کر لندن سے شایع کیا ...... سرولیم میور نے حضور رسالت مآبؐ کی شان میں ......
وہ تمام رکیک اور بیہودہ الفاظ استعمال کیے ہیں جو اس سے قبل صلیبی جنگ اور دانتے کے ذریعہ
رائج ہو چکے تھے ...... کارلائل اور گبن کے یہاں چند اچھے کلمات مل جاتے ہیں، لیکن ان کی
استثنائی حیثیت ہے اور صحیح معنوں میں وہ مستشرق نہیں ہیں، انیسویں اور بیسویں صدی کے
اوائل تک حضور رسالت مآبؐ اور اسلام کو بھی تعصب سے جانچا گیا اور اسلامی تاریخ کو مسخ کیا

اسکولوں اور کالجوں میں پیش کیا گیا، عیسائیوں نے مسلمانوں کی عظمت دیرینہ اور تہذیبی برتری پر کاری ضرب لگائی، اس لیے کہ بقول اسپرنگر جو قدیم دہلی کالج کا پرنسپل تھا اسی عظمت کے احساس نے ان کو لکھنؤ اور دہلی کی مدافعت میں جو ۱۸۵۷ء اور ۱۸۵۸ء میں عمل میں آئی ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا کر دیا تھا کہ موت سے آنکھیں ملا سکیں اور بے پناہ اور ناقابل تسخیر بن جائیں۔۔۔۔ بیسویں صدی میں عیسائیوں کے ضمیر نے ایک نئی کروٹ لی ہے، یا یہ پرانے شکاری ایک نیا جال لائے ہیں، یا تیل کی اہمیت کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے بارے میں اپنی رائے کچھ نرم کرنا چاہتے ہیں، بہرحال اسی وجہ سے علم کی خاطر کم اور سیاست کی وجہ سے زیادہ دوڈبروک کالج سیلی اوک نے کرسچین مسلم ڈائیلاگ شروع کیا ہے، اس سے امید بندھتی ہے کہ تعصب کے پردے چاک ہوں گے، مسلمانوں اور عیسائیوں کی باہمی کوشش سے ایک صحیح تصویر ابھرے گی۔

جناب سید اطہر حسین صاحب اس مقالہ کے بعد جناب سید اطہر حسین صاحب آئی۔ اے۔ ایس کو اپنا مقالہ پیش کرنے کی زحمت دی گئی، وہ اترپردیش کی حکومت میں اعلیٰ ترین عہدوں پر رہ چکے ہیں، اردو اور انگریزی میں بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، قرآن مجید اور حدیث پر ان کی اچھی نظر ہے، جس موضوع پر چاہتے ہیں بڑی بے تکلفی اور آسانی سے انگریزی اور اردو میں چھوٹے بڑے رسالے قلمبند کر لیتے ہیں، شاعر بھی ہیں، دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے معزز رکن بھی ہیں، ان کے مقالہ کا موضوع "قرآن اور مستشرقین" تھا، انگریزی اور اردو دونوں میں ان کا یہ مقالہ تھا، انگریزی میں ان کا یہ مقالہ چھپا ہوا تھا، جو لوگوں میں تقسیم کیا گیا، انھوں نے اپنا یہ مقالہ کچھ اردو اور کچھ انگریزی میں پڑھا، اس میں یہ دکھایا ہے کہ یورپ کے فضلاء کلام پاک کے غلط سلط ترجمے کر کے کس طرح گمراہی پھیلاتے ہیں، خود یورپ کے بعض اہل نظر نے ان کی مذمت کی ہے، اس کا اقتباس ذیل میں درج ہے:

جارج سیل نے انگریزی زبان میں سب سے پہلی بار قرآن کا ترجمہ ۱۷۳۴ء میں کیا اپنے ترجمہ کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ اس سے قبل جو لاطینی زبان میں ترجمے تھے، ان میں اصل سے انحراف تھا، ببلی اندڑ نے جو ۱۵۴۳ء میں لاطینی میں ترجمہ کیا اس کو ترجمہ ہی نہیں کہا جاسکتا ہے، کیونکہ اس میں اتنی کثیر غلطیاں ہیں اور اتنی جسارت سے کام لیا گیا ہے اور اتنی چیزوں کا اضافہ کیا گیا ہے یا تبدیلی کی گئی ہے کہ اس کو اصل سے کوئی مطابقت یا مماثلت نہیں ہے Andrea Arrivabene کے لاطینی ترجمہ کے متعلق جارج سیل نے لکھا ہے کہ وہ اور بھی ناقص ہے اور جو ترجمہ Andrew du Ryer نے فرانسیسی زبان میں کیا ہے وہ کسی طرح ترجمہ کہلانے کے لائق نہیں، کیونکہ اس کے ہر صفحہ پر بے شمار غلطیاں ہیں جا بجا تحریف یا اضافے ہیں اور آیتوں کو مسخ کیا گیا ہے جو ناقابل معافی ہے، اسی فرانسیسی ترجمہ کو الکزنڈر روس نے انگریزی میں کیا جس کے متعلق جارج سیل کی رائے ہے کہ وہ عربی زبان مطلق نہیں جانتا تھا، اور نہ اس کو فرانسیسی زبان پر عبور تھا، اس نے اصل مترجم کی غلطیوں میں اپنی طرف سے اضافہ کیا اور بہت ہی مذموم زبان استعمال کر کے ترجمہ کو مضحکہ خیز بنا دیا۔ Father Lewis Marracci نے لاطینی زبان میں ۱۶۹۵ء میں ترجمہ کیا تھا جس کے متعلق سیل نے یہ اظہار خیال کیا ہے کہ اس تفسیر و ترجمہ میں تمام تر تکرار ہے جس کی وجہ سے ضخامت بڑھ گئی ہے، مگر اتنا ہی غیر اطمینان بخش ہے، کہیں کہیں زبان میں جسارت اور گستاخی سے کام لیا گیا ہے، خود اپنے ترجمہ کے متعلق سیل کا کہنا ہے کہ اس کا مقصد ان غلط فہمی کو دور کرنا ہے جو ان ترجموں سے پیدا ہو گئی ہے، اس کا خیال تھا کہ پروٹسٹنٹ کامیابی کے ساتھ قرآن پر حملہ کر سکتے ہیں، اور اس کو بھروسہ ہے کہ قدرت نے پروٹسٹنٹ کا بجا انتخاب کیا ہے کہ وہ قرآن کو شکست فاش دے دیں، اس نے اپنے پیش رو مترجمین اور مستشرقین کی مذمت کی،

چاہیں نے رسول اکرمؐ کی ذات گرامی یا قرآن عظیم پر بے بنیاد الزامات تراشے اور نہایت ہی قابل اعتراض زبان استعمال کی، مگر اپنی بے لوث کوشش اور فراخ دلی کے متعلق کہتا ہے کہ "محمدؐ (نعوذ باللہ) کتنے ہی مجرم کیوں نہ ہوں کہ انھوں نے انسانیت پر ایک غلط مذہب تھوپا، مگر ان کی ذات و صفات سے انکار نہیں ہو سکتا ہے، اور میں متقی اور لایق Spanheminus کو داد دیتا ہوں کہ ہر چند وہ سمجھتے تھے کہ وہ (یعنی محمدؐ) (نعوذ باللہ) ایک بدقماش جعلساز تھے مگر انھیں بھی تسلیم ہے کہ قدرت نے ان کو یعنی محمدؐ کو تمام کمالات سے متصف کیا تھا، جس میں جسمانی خوبصورتی لطیف زیرکی، اخلاق حمیدہ، غربا پروری، تواضع، حریفوں اور غنیموں کے ساتھ ہمدردی استقلال، ثابت قدمی، خدا کی حمد وستایش کرنے والے کی صفت، مکاریوں، زانیوں، قاتلوں، حریصوں اور افترا پردازی کے خلاف سختی شامل تھی، ہمت، استقلال، ترحم، شکر، والدین بزرگوں کی عزت کے بڑے داعی اور مبلغ تھے، اور ہمہ وقت حمد باری تعالیٰ میں لگے رہتے تھے"

جارج سیل نے خود حضورؐ کی توصیف ان الفاظ میں کی کہ "آپ کی ہوشمندی، عاقلانہ اور کریمانہ برتاؤ اور رویہ جس کے تحت اپنے مشن میں مصروف رہے اس جاہلانہ اعتراض کی تردید کرتے ہیں کہ آپ ایک سخت خود مذہبی پیشوا تھے، سورۂ فاتحہ کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ مان لیا جائے کہ وہ آپ کے جذبات و خیالات کی صحیح ترجمانی کرتی ہے تو وہ دیدہ و دانستہ جعلسازی نہیں کرتے تھے، آپ سورۂ فاتحہ نماز کی ہر رکعت میں بڑے خشوع و خضوع سے پڑھتے تھے، لیکن

جارج سیل نے اس میں شک ظاہر کرنے سے گریز نہیں کیا، ریورنڈ Wherry نے سیل کے ترجمہ کو اپنی تفسیر کے ساتھ چار جلدوں میں شایع کرایا، اور خود دیباچہ میں یہ انکشاف کیا کہ (نعوذ باللہ)، قرآن خود ثبوت فراہم کرتا ہے کہ وہ جعلسازی کی پیداوار ہے، اور پیغمبر اسلام کا یہ جھوٹا دعویٰ ہے کہ قرآن سابق کتب الٰہی کی تصدیق کرتا ہے، پادری صاحب نے اپنا مقصد

[illegible] واضح کیا کہ مسلمانوں میں اس کو واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ اس کو تسلیم کریں کہ حضرت عیسیٰ کی عظیم ہستی کے متعلق تمام انبیاء نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ وہ خداوند قدوس کے فرزند اور گنہگاروں کے نجات دہندہ تھے،

جناب اطہر حسین نے اپنی زبانی تقریر میں یہ فرمایا کہ انھوں نے اپنے مقالہ میں ان تمام تراشیدہ الزامات، اعتراضات، بہتان اور مفروضات کی تردید کی ہے، اور آخر میں کہا کہ جارج سیل، وہری، رچرڈ بل، اربری، روڈ ویل اور پکتھال نے قرآن کے ترجمے میں جو غلطیاں کی ہیں، ان کے چند نمونے میں نے اپنے انگریزی کتابچہ میں پیش کیے ہیں، اس وقت انھیں دہرانا ممکن نہیں، پکتھال نے جو غلطیاں کی ہیں وہ عبارت کی ہیں، اور عربی زبان میں قرآن کے اسلوب اور عربی محاوروں سے پوری واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے کی ہیں، اربری کی غلطیاں ترجمہ میں اصل کی طرح موسیقیت اور نغمہ بھرنے کی کوشش کی وجہ سے ہوئیں، اور کچھ عربی محاوروں سے ناواقفیت کی بنیاد پر بھی ہوئیں، اور دوسروں نے دیدہ و دانستہ اور بدنیتی سے فاش غلطیاں کیں

ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری پہلے ذکر آچکا ہے کہ ڈاکٹر صاحب ظہران یونیورسٹی (سعودی عرب) کے نمایندہ کی حیثیت سے تشریف لائے تھے، اپنی متانت اور سنجیدگی کی وجہ سے شرکا رکے جاذب توجہ بنے رہے، بولتے تو معلوم ہوتا کہ علم بول رہا ہے، ان کے مقالہ کا عنوان 'حدیث اور جوزف شاخت' تھا، مائک پر آئے تو بولے کہ سب سے پہلے مجھے ایک معذرت پیش کرنی ہے اور وہ یہ ہے کہ میں نے یہ مقالہ انگریزی میں لکھا ہے اور انگریزی میں لکھنے کے اسباب میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ اگر ہم اپنے مباحثہ سے مستشرقین کی اصلاح چاہتے ہیں تو بہتر یہ ہے کہ ہم اپنی آواز اسی زبان میں پہونچائیں، جو ان کے لیے قابل فہم ہو، اس مقالہ کے اصل مخاطب مسلمان نہیں ہیں بلکہ اس کے مخاطب مستشرقین ہیں، یا وہ لوگ ہیں جو ان مستشرقین کے اٹھائے ہوئے سوالات سے

دلچسپی لیتے ہیں، میں معذرت چاہتا ہوں کہ اس کا ترجمہ اردو میں نہیں کر سکا۔

اس کے بعد انھوں نے اپنے مقالہ کا کچھ حصہ پڑھا، جو افسوس ہے کہ ٹیپ نہیں ہو سکا۔

ان شاء اللہ اس کا اردو ترجمہ معارف کی کسی آیندہ اشاعت میں شایع ہوگا۔

جناب اوصاف علی | جناب اوصاف علی ڈائرکٹر ہمدرد اسلامک اسٹڈیز انسٹی ٹیوٹ بڑے جوان ہمت، لائق اور مجمع کو متاثر کرنے والے اہل قلم اور صاحب علم ہیں، دنیا کے ہر گوشہ کی بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کرتے رہتے ہیں، ان کا مقالہ بھی ٹیپ نہیں ہو سکا، ان سے مقالہ حاصل بھی نہیں کیا جا سکا ہے ان شاء اللہ یہ بھی معارف کی کسی آیندہ اشاعت میں شایع ہوگا،

ڈاکٹر اکمل ایوبی | ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری صاحب کے مقالہ کے بعد جناب اکمل ایوبی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اپنے مقالہ "مغربی مستشرقین کے چند بنیادی مقاصد ان کی تحریک کی تاریخ کی روشنی میں" کے چند اقتباسات پڑھ کر سنائے، سب سے پہلے انھوں نے کہا کہ میں اوصاف صاحب سے یہ کہوں گا کہ مغربی مستشرقین زیادہ تر یہودی ہیں، جن کو اسلام سے گہری دلچسپی ضرور ہے، ان کے انہماک اور علمی تلاش داد کے لائق بھی ہے، وہ دیدہ ریزی اور دقت نظر کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں، ان کی کوششوں سے بہت سے علمی نوادرات بھی منظر عام پر آئے ہیں، وہ اخلاص و تصوف کے گہرے سمندر میں مشاق غوطہ خور کی طرح بار بار تیرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں، انھوں نے ہمارے قدیم و نایاب علمی شہپاروں کی تلاش و جستجو میں وقت بھی صرف کیا ہے، ان کے متون بھی شایع کیے ہیں، ان کا طرز بیان بھی شستہ اور شگفتہ ہے، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مغرب کے اہل قلم حضرات کو اسلام اور پیغمبر اسلام سے متعلق شروع سے کلیسا کے علمبرداروں سے تعصب و تنگ نظری کا جو ورثہ ملا تھا، اس سے وہ اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکے، میں نے اپنے مقالہ میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان مستشرقین نے اپنی تحریروں میں کیا کیا مختلف طریقے استعمال کیے، انھوں نے اسلام اور اسلامی معاشرہ میں انتشار پیدا کرنے

کی خاطر سب سے پہلے ترکوں کو چنا اور ترکی کے قدیم تہذیب و تمدن کو اس طرح پیش کیا کہ بہت سے ترک دیوں نے اسلام سے اپنا رشتہ منقطع کرنے کی کوشش کی، اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم کردار مصطفےٰ کمال اتاترک کا ہے، ان کے متعلق لکھا ہے کہ انھوں نے صرف اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن سے ہی نہیں بلکہ اسلامی دنیا سے ہی رشتہ منقطع کر لیا، مغربی مستشرقین کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا، چنانچہ مغرب میں اتاترک کے کارناموں کا زور شور سے چرچا ہوا اور یہ ظاہر کیا گیا کہ ترکی میں ایسا انقلاب آگیا ہے کہ ترکوں نے اسلام سے رشتہ بالکل منقطع کر لیا ہے، اسی اتاترک کو کسی نے سرفروش مجاہد، کسی نے پرجوش فدائی، کسی نے قابل تقلید سیاست داں، کسی نے قوم کا مصلح اعظم، کسی نے ملک و ملت کا معمار، کسی نے عجوبۂ روزگار، کسی نے آزادی کا عاشق، کسی نے مجاہد اعظم، کسی نے شمع آزادی کا پروانہ، کسی نے دل و دماغ اور روح سب کو آزاد کرنے والا انسان، کسی نے عظیم الشان جذبات کا نورانی پیکر کہا، ان ہی مستشرقین کی کتابیں ہم ہندوستانیوں کی معلومات کا ماخذ بنیں، اس لیے واقعات کی پوری نوعیت اور صحیح حقیقت پورے طور پر واضح نہیں ہو سکی، اور نہ عام اور غیر سرکاری ترکوں کا نقطۂ نظر ہمارے سامنے آسکا، غالباً اسی وجہ سے ہندوستان میں مصطفےٰ کمال سے خوش عقیدگی پائی گئی، اور دینی حلقوں میں بھی ان پر تنقید گوارا نہیں کی گئی، ان کے سیاسی و قومی خدمات کی وجہ سے ان کے لادینی اقدامات کو بھی نظر انداز کر دیا گیا، اس لیے اس کی ضرورت ہے کہ ہمارے ہاں ایسا علمی و تحقیقی کام ہو جس سے مصطفےٰ کمال کی اصلاحات کے ساتھ مذہب سے ترکوں کی وفاداری کی تصویر بھی سامنے آجائے، اور وہ فرق بھی ظاہر ہو جو حکومت کے مختصر اور محدود طبقہ میں اور مسلمان عوام ترک میں آج بھی موجود ہے، ابھی رسالہ "اسلام اور عصر جدید" کی جلد ۱۴، شمارہ بابت جنوری ۱۹۸۲ء میں پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے برنارڈ لویس کے مقالہ 'اسلام' کا ترجمہ شائع کیا ہے، یہ مقالہ کافی پہلے کا لکھا ہوا ہے، لیکن یہ بہت

لم لوگوں کی نظر سے گذرا ہوگا، اس میں برنارڈ لویس نے خود اعتراف کیا ہے کہ یورپ میں لکھی گئی اسلامی تہذیب و تمدن سے متعلق زیادہ تر کتابیں ایسے حضرات نے لکھی ہیں جو اصل ماخذ کی زبان سے ناواقف تھے، وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ یوروپی تاریخ کی زیادہ تر کتابیں عثمانی حکومت اور اس کے اثرات کو مسخ کرکے پیش کرتی ہیں، یہ کتابیں خالصۃً مغربی شواہد پر مبنی ہیں، جو زیادہ تر ناقص گھڑی اور غیر معتبر ہیں، ان میں ترکوں کے رول کی افسوسناک حد تک گمراہ کن تعبیر ملتی ہے، اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان اہل قلم اپنی مذہبی، علمی، تہذیبی اور ادبی تاریخ خود مرتب کریں جو مستند معلومات پر مبنی ہو۔

اس کے بعد ڈاکٹر سید سلمان ندوی نے بزرگ عالم جناب قاضی زین العابدین کو مقالہ پیش کرنے کے لیے دعوت دی، قاضی صاحب کے مقالہ کا عنوان تھا "ہمارے عصری تعلیمی اداروں پر مستشرقین کے اثرات"۔

جناب قاضی زین العابدین صاحب: صدر محترم اور حاضرین کرام! بہت پابندیوں کے ساتھ مجھے یہاں بیٹھ کر آپ صاحبان سے خطاب کرنا ہے، اور بغیر کسی تمہید کے میں یہ کہوں گا کہ مستشرقین کا تصور جو ہمارے ذہن میں ہے اس سے وہ تصور مختلف ہو سکتا ہے جو ہمارے دوستوں کے ذہن میں ہے، میں سمجھتا ہوں کہ استشراق کی تاریخ سولہویں صدی ہجری سے شروع نہیں ہوئی، بلکہ اسپین کے میدانوں میں مسلمانوں سے شکست کھانے کے بعد عیسائی پادریوں نے اسلام کا مقابلہ شتم رسول سے کیا، وہیں سے استشراق کی تاریخ شروع ہو جاتی ہے، تاریخ سے واقف لوگ جانتے ہیں کس طرح اسپین کے عیسائیوں کو مسلمانوں کے خلاف صف آرا کیا گیا، انھوں نے اس سلسلہ میں بڑی بڑی قربانیاں دیں، وہ آتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو گالیاں دیتے، آپ کی شان میں گستاخیاں کرتے اور قتل ہو جانا گوارا کر لیتے، پھر شہداء کا نام پاتے، اسپین کے مسلمانوں کو ختم کرنے کے بعد پھر یورپ میں یہ مسئلہ سامنے آیا کہ اسے کس طریقہ سے مسلمانوں سے محفوظ رکھا جائے، اپنی ناقص رائے کے مطابق میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہاں آنجناب کا

بت بنایا گیا، اور بت بھی بہت شنیع قسم کا، کل یہ بحث چل رہی تھی کہ مسلمانوں کا محمڈن اور مسلمانوں کے کالجوں کا محمڈن کالج وغیرہ نام رکھنے کا رواج کیسے چلا، وہ تو ہمارے رسولؐ کے اسم مبارک کو بھی بگاڑنے کی فکر میں لگے رہے، جناب رسول اللہؐ کو محماد یا محمت کہا گیا اور آپؐ کا عجیب وغریب شنیع اور نہایت ہی ناپاک قسم کا تصور ذہنوں کے اندر راسخ کیا گیا، اسی لیے انگریز ہندوستان میں آئے تو انھوں نے اسلام کو محمڈن ریلیجین قرار دیا، اور بہت سے مسلمانوں نے اپنی ناواقفیت کی بنا پر اس نام کو قبول کیا، اب گالی گلوج کا زمانہ نہیں رہا، زمانہ اس کا ہے کہ جوتیوں کو ریشم کے اندر لپیٹ کر پیش کیا جائے، عمدہ قسم کے شربت کے گلاس میں گندگی ڈالی جائے، مستشرقین نے یورپ میں ادارے قائم کر رکھے ہیں، اور اسلامک اسٹڈیز کی تعلیم دیتے ہیں، یہ صحیح ہے کہ انھوں نے تفسیر وحدیث اور سیرت وغیرہ کی نایاب کتابوں کے بھی ترجمے کیے، ان کو اڈیٹ کیا، ان کو طبع کرایا، اس سلسلہ میں مسند احمد بن حنبل کی طباعت پر واقعی سارا عالم اسلام ان کا شکر گذار ہے، یہ واقعی بڑی خدمت ہے، ہمارے مولانا شبلی رحمۃ اللہ نے تو بہت ہی مبالغہ آمیز طریقہ پر اس کی تعریف کی ہے، اس بیچارے کو مسند احمد بن حنبل کا ایک ایک لفظ اس لیے دیکھنا پڑا کہ اس کو کتاب چھپوانے میں پروف ریڈنگ خود ہی کرنا تھا، اور علمائے اسلام اس لیے مطالعہ نہ کر سکے کہ اس وقت تک یہ چھپی نہ تھی، اس کتاب کی طباعت واشاعت سے اس کو جناب رسول اللہؐ کی سیرت یا آپؐ کی تعلیمات سے واقف ہونا نہیں تھا، میں ان لوگوں کو برا نہیں سمجھتا ہوں، ذاتی طور پر یہ لوگ بہت اچھے ہوتے ہیں، مجھے کینٹول اسمتھ صاحب سے ملاقات کرنے کا موقع ملا، اور میری ان سے جو گفتگو ہوئی اس کی ترجمانی پروفیسر محمد مجیب نے کی، بہت اچھے آدمی ہیں، انھوں نے مجھ کو بتایا کہ عراق، شام اور دوسرے اسلامی ملکوں میں لا الٰہ الا اللہ کے ورد کے طریقے کیسے کیسے مختلف انداز کے دیکھے، میں نے اس وقت بھی اور بعد میں اپنے دوستوں سے کہا کہ کاش یہ ضربیں پروفیسر اسمتھ کے کان سے گذر کر دل تک بھی پہونچتیں، ویسے وہ بہت نیک آدمی ہیں،

میں اپنا مقالہ شروع کرنے والا تھا کہ اس سے پہلے ہی ختم کرنے کا تقاضا کیا گیا، اس لیے میں مقالہ تو چھوڑے دیتا ہوں، لیکن ایک بات ضرور کہوں گا کہ مسند احمد بن حنبل کو ایک مستشرق نے ایڈٹ کیا ہے مستشرقین کی نئی نئی کتابیں آرہی ہیں اور بہت خوبصورت آرہی ہیں، اندر کیا ہوتا ہے، وہ دیدہ ور ہی لوگ سمجھ سکتے ہیں، ہمارے جدید تعلیم یافتہ مسلمان ان کی طرف لپکتے ہیں، اور ان کی صورت شکل دیکھ کر طبیعت یہ چاہتی ہے کہ ہم بھی ان کا مطالعہ کریں، لیکن میں عرض کرتا ہوں کہ اس شربت روح افزا کے اندر زہر کے قطرے ملے ہوئے ہیں، اسلامک اسٹڈیز کی طرح جدید اسلامی فلکے جو ادارے جگہ جگہ قائم ہو رہے ہیں، افسوس ہے اس میں وہی کتابیں پڑھائی جارہی ہیں جو مستشرقین یورپ کی لکھی ہوئی ہیں، ہمارے دوست جو پروفیسر اسمتھ کے شاگرد ہیں، وہ ان کا یقیناً احترام کریں گے اور ان کو احترام کرنا چاہیے، لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہماری مسلم یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اور جامعہ عثمانیہ وغیرہ کے مخلص بانیوں نے تعلیم دینیات کے لیے اسلامی اور دینی ادارے قائم کیے ان میں سے بعض یونیورسٹیوں میں دینیات کے شعبے ختم کیے جا چکے ہیں اور اسلامک اسٹڈیز کے ادارے بھی قائم ہوئے ہیں، میں جب جامعہ ملیہ میں تھا تو میں نے بخاری پڑھائی، میں نے وہاں تفسیر بھی پڑھائی، فقہ کے ساتھ ساتھ حماسہ پڑھائی اور متنبی اور سبعہ معلقہ بھی پڑھایا، لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہاں یہ ڈپارٹمنٹ ہی ختم کر دیا گیا اور اسلامک اسٹڈیز کا شعبہ قائم ہے، میں نے ابھی حال ہی میں ایک لکچرر صاحب جناب ماجد علی خاں صاحب کا ایک مضمون پڑھا تو مجھے بہت افسوس ہوا، مستشرقین نے علوم اسلامیہ کی جو تاریخ لکھی ہے یا جو انھوں نے تنقید کی ہے ان کو ضرور پڑھیے، مطالعہ کیجیے اور جواب دیجیے، لیکن طلبہ کے ذہن کو جناب رسول اللہ ﷺ کے سرچشمہ سے سیراب کرنے کے لیے ضروری ہے کہ قرآن، حدیث، علم کلام اور فقہ کی اصل کتابیں نصاب میں داخل رہیں، جیسا کہ علی گڑھ میں ہے کہ شعبۂ دینیات بھی ہے، اسلامک اسٹڈیز بھی ہے، اسلامک اسٹڈیز کے شعبے

آپ قائم کر سکتے ہیں، تاریخ فقہ، تاریخ حدیث اور تاریخ قرآن کے پڑھانے سے ہم آپ کو منع نہیں کرتے، لیکن ایسی تاریخیں جو فقہاء، صوفیاء اور محدثین کے کیرکٹر کو مجروح کر دیں اور ان بنیادوں کو ہی گرا دیں جن پر اسلام اور تعلیمات اسلام کی عمارت کھڑی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت ہی غلط ہوگا، میں بلڈ پریشر کا بھی مریض ہوں اور ادھر ادھر سے بھی دباؤ پڑ رہا ہے، میں اپنے ان دوستوں سے جو اسلامک اسٹڈیز کے شعبوں میں پڑھا رہے ہیں اور ناواقفیت کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں، معذرت کرتا ہوں، وہ لوگ اخلاقی اعتبار سے بہت اچھے ہیں، مگر ظاہری اخلاق کے اعتبار سے وہ اپنے اساتذہ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔

قاضی صاحب کی اس تقریر کے بعد جامعہ ملیہ کے پروفیسر مشیر الحق صاحب کچھ کہنا چاہتے تھے، ڈاکٹر سید سلمان ندوی نے ان سے کہا کہ وہ مختصر طریقہ پر اپنا جواب دیں۔

پروفیسر مشیر الحق پروفیسر مشیر الحق نے کہا کہ شاگردان مستشرقین پر تین دنوں سے جو کچھ کہا جا رہا ہے، اس پر تو میں کچھ بھی نہیں کہوں گا، اس لیے کہ شاید اسی طرح ان کے ناکردہ گناہوں کی کچھ نہ کچھ تلافی ہوتی جا رہی ہے، لیکن چونکہ مولانا نے ایک متعین ادارہ کا نام لے کر وہاں کے بارہ میں جو معلومات مہیا کی ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ مولانا کو ان کے بارہ میں پوری طرح صحیح اطلاع نہیں ہے، جامعہ ملیہ میں کبھی بھی دینیات کے نام سے کوئی شعبہ قائم نہیں تھا جس کو ختم کر دینے کا کوئی سوال پیدا ہو، مولانا حماسہ و متنبی اور اسی قسم کی جو کتابیں پڑھاتے رہے ہیں تو وہ چیزیں آج بھی باقی ہیں، فرق اتنا ہو گیا ہے کہ یہ شعبۂ عربی کی چیزیں ہیں، شعبۂ عربی میں پڑھائی جا رہی ہیں، اسلامک اسٹڈیز یا شعبۂ دینیات کے نام سے پہلے جامعہ ملیہ میں کوئی شعبہ نہیں تھا بلکہ ایک سسٹم تھا جس میں یہ مضامین پڑھائے جاتے تھے، ۵۲ء سے میں جامعہ سے منسلک ہوں، میں نے وہیں تعلیم حاصل کی اس وقت بھی وہاں کوئی ایسا ڈپارٹمنٹ نہیں تھا، ممکن ہے جس وقت مولانا محمد علی جوہر نے

جامعہ ملیہ قائم کی اس وقت کوئی ایسا شعبہ رہا ہو، جو لوگ ہندوستان میں رہتے ہیں ان کو یہ بات سوچنی چاہیے کہ عربی و دینی مدارس میں جس طرح سے تعلیم ہوتی ہے اور جس پس منظر سے طالب علم آتے ہیں اس میں اور یونیورسٹیوں میں جو طالب علم آتے ہیں ان میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

پروفیسر مشیر الحق صاحب کی اس وضاحت کے بعد ڈاکٹر سید سلمان ندوی نے شبلی کالج کے ایک نوعمر طالب علم مرزا اسمر بیگ کو اسٹیج پر بلایا، اس کمسن طالب علم کی حوصلہ افزائی کے لیے بولنے کا موقع دیا گیا، اس کمسن بچے نے انگریزی میں بہت صاف اور متین لہجہ میں مستشرقین پر ایک تقریر کی، اس کے بعد ڈاکٹر سید سلمان ندوی نے صدر نشین جناب ڈاکٹر عبد الصبور مرزوق کو صدارتی کلمات کہنے کی زحمت دی۔

ڈاکٹر عبد الصبور مرزوق | ڈاکٹر صاحب نے سب سے پہلے حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی اور دار المصنفین کے کارکنان کا شکریہ ادا کیا، سیمینار کی کامیابی پر مبارکباد دی، انھوں نے کہا اکثر مقالات سے یہ ظاہر ہوا کہ مستشرقین نے جو کچھ لکھا ہے اس میں سے اکثر کی تحریروں میں تعصب اور ان کے جہل اور ناواقفیت کا اظہار ہوتا ہے، مجموعی طور پر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مستشرقین سے کوئی بہتر توقع نہیں کی جاسکتی اس لیے ان سے خوش گمانی کے کوئی معنی نہیں، قرآن پاک بھی ایسی ہی تعلیم دیتا ہے، خدا تعالیٰ کا قول ہے وَلَا تُؤْمِنُوٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ، لہٰذا ہمارے دین کے علاوہ جو دوسرے ادیان کے پابند ہیں، ان کی بات کو کس طرح ہم قابل اعتماد اور قابل وثوق سمجھ سکتے ہیں، قرآن پاک اور تعلیم رسولؐ ہم کو یہ بھی سکھاتی ہے کہ لا یلدغ المؤمن من جحر مرتین، جب ہم اس حقیقت سے واقف ہیں کہ رسول اللہؐ کے زمانہ سے لے کر آج تک یہ مستشرقین ڈنک مارتے اور ہم کو نقصان پہونچاتے رہے تو پھر ان کے

حسن نیت پر یقین کر لینا اور ان کی طرف سے صفائی پیش کرنا کچھ معنی نہیں رکھتا، دوسری بات یہ ہے کہ مستشرقین میں سے وہ مستشرقین جنھوں نے واقعی صاف دل اور حسن نیت سے اسلام کا مطالعہ کیا ہے تو پھر ان کا دل اسلام کی حقانیت سے معمور ہوا، اور وہ اسلام میں داخل ہو گئے، مستشرقین جب تمہید کے طور پر اسلام کی یا رسول اسلام کی تعریف کرتے ہیں، تو درحقیقت وہ ان کی ایک علمی اور ماہرانہ چال ہوتی ہے، جس کے بعد وہ اپنا اصل مقصد بیان کر کے اپنی منزل مقصود تک پہونچنا چاہتے ہیں، اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک مفصل پروگرام وضع کر کے ضروری تجویزیں پیش کی جائیں، ایک تجویز یہ ہو کہ ایک ایسی کمیٹی تشکیل دی جائے جو مستشرقین کی غلطیوں کی نشان دہی کرے، اور ان کو مرتب کر کے یکجا کرے، تاکہ ان پر غور کیا جا سکے، ایک اور تجویز جو قابل غور ہے وہ یہ کہ اسلامی یونیورسٹیاں اور اسلامک اسٹڈیز کے شعبے اس بات کا اہتمام کریں کہ ان کے طالب علم مستشرقین کے مراجع پر اعتماد نہ کریں، بلکہ خود مسلمانوں کی کتابوں کو اعتماد کا مقام دیں اور محض ضمنی طور پر مستشرقین کی کتابوں کو استفادہ کے لیے دیکھیں، اس کی بھی ضرورت ہے کہ یونیورسٹیوں کے طلبہ کو یورپ میں ایسی جگہوں پر نہ بھیجا جائے جہاں وہ مستشرقین سے استفادہ پر مجبور ہوں، ایک اہم مسئلہ مستشرقین کے تلامذہ کا ہے، یعنی وہ افراد اور نوجوان جو مستشرقین کے افکار سے زیادہ متاثر ہیں ان لوگوں کے بارے میں عام طور سے بدگمانی مناسب نہیں ہے، کیونکہ ان میں بہت سے ایسے اسکالر ہیں جنھوں نے صفائت کا صحیح حق ادا کیا ہے، اچھی ترجمانی کی ہے، صحیح تعارف کرایا ہے، اپنے مستشرقین اساتذہ کے تعارف میں ادب کا لحاظ رکھتے ہوئے ان پر تنقید بھی کی ہے، ان حضرات میں ڈاکٹر عبدالکریم، ڈاکٹر مصطفےٰ اعظمی ڈاکٹر محمد امین مصری اور ڈاکٹر مصطفےٰ سباعی جیسے محققین اور دانشور ہیں، آخری بات یہ ہے کہ مکہ معظمہ میں جو تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی تھی اس میں ایک تجویز پاس ہوئی تھی جس میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مروج موجودہ نصاب تعلیم کو کھنگالا جائے اور ان سے وہ تمام اجزا نکالے جائیں جو اسلامی علوم وفنون کیلئے مضر

ادبیات

ایک دوست کے نام

از جناب جگن ناتھ آزاد صاحب، کشمیر

جس نے مجھے میرے موجودہ مشکل دورِ زندگی میں یہ مشورہ دیا ہے کہ میں
اپنے فلاں عزیز کی دعوت پر انگلستان جا کر آباد ہو جاؤں

میں اگر آباد ہو جاؤں دیارِ غیر میں — تم مرا ہمسر، مرا ثانی کہاں سے لاؤ گے
حل کرے اقبال کے جو فکر و فن کی مشکلات — ایسا انساں تم بآسانی کہاں سے لاؤ گے
جس میں اطمینانِ دل بھی ہو سکونِ جاں بھی ہو — اس طرح کی تم پریشانی کہاں سے لاؤ گے
نطق سے جس کے ہوں اسرار و رموزِ علم فاش — ایسا اک مجموعۂ نادانی کہاں سے لاؤ گے
ہر گھڑی محوِ سفر ہو جو دیارِ ہند میں — ایسی تصویرِ تن آسانی کہاں سے لاؤ گے
سینہ چاکی ہی رہے جس کا شعارِ زندگی — وہ عدوِ چاکِ دامانی کہاں سے لاؤ گے
جس نے اپنا سوز بھارت کے مسلماں کو دیا — وہ ادائے کفر سامانی کہاں سے لاؤ گے
شعر جس کا بے مثال و نثر جس کی بے نظیر — اس قلم کی شانِ جولانی کہاں سے لاؤ گے
جس سے اردو کے مخالف راکھ ہو کر رہ گئے — نثر کی وہ شعلہ سامانی کہاں سے لاؤ گے
کارواں اردو کا جس کے دم سے بڑھتا ہی گیا — نظم کی وہ شانِ طوفانی کہاں سے لاؤ گے

دوستو! جوئے رواں میں بہ گیا جو ایک بار
پھر اگر چاہو تو وہ پانی کہاں سے لاؤ گے

مطبوعات جدیدہ

کیمیا کی کہانی :۔ مرتبہ جناب سید شہاب الدین صاحب دسنوی تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۲۸، قیمت سات روپے پچاس پیسے' پتہ:۔ ترقی اردو بورڈ نئی دھلی۔

مرکزی حکومت کے قائم کردہ ادارہ ترقی اردو بورڈ نے مختلف علوم' جدید فنون اور بچوں کے ادب و سائنس سے متعلق متعدد کتابیں شایع کی ہیں، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی مفید کڑی ہے" اس میں بعض عناصر ہوا اور آگ وغیرہ کی دریافت کے بارہ میں چند یوروپین سائنسدانوں کے تجربات وانکشافات بیان کیے گئے ہیں، اس سلسلہ میں لے وائسر، ہمفری ڈیوی، رابرٹ بنسن، اکرشوت، ہنری کے ونڈش اور مادام کیوری وغیرہ کی غیر معمولی محنت وجانفشانی کی سرگذشت تحریر کی گئی ہے، جو دلچسپ اور سبق آموز ہے، اس کو پڑھ کر جہاں بچوں کی معلومات میں اضافہ ہوگا وہاں ان کے اندر اس قسم کی چیزوں کی تحقیق و دریافت کی امنگ بھی پیدا ہوگی گو یہ کتاب بچوں کے لیے لکھی گئی ہے، مگر جدید علوم سے ناواقف اور معمولی پڑھے لکھے لوگوں کیلئے بھی یہ مفید اور دلچسپ معلومات سے پُر ہے، اس کے لائق مرتب جناب سید شہاب الدین دسنوی وسیع علمی وتعلیمی تجربہ رکھنے کے علاوہ اردو کے اچھے اہل قلم بھی ہیں، وہ انجمن اسلام اور صابو صدیق پالیٹیکنک بمبئی کے کامیاب اور نیک نام پرنسپل کی حیثیت سے شہرت حاصل کر چکے ہیں، اور انھوں نے بچوں کے کورس کی متعدد مفید کتابیں لکھی ہیں، امید ہے کہ یہ کتاب بھی مقبول ہوگی۔

بہار میں اردو نثر کا ارتقا (۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک) | مرتبہ ڈاکٹر سید مظفر اقبال صاحب تقطیع متوسط، کاغذ کتابت طباعت بہتر صفحات ... مجلد مع گرد پوش قیمت [illegible] پتہ: [illegible]

زیرنظر کتاب وہ مقالہ ہے جس پر پٹنہ یونیورسٹی سے ۱۹۷۲ء میں مصنف کو ڈی۔ لٹ کی ڈگری ملی تھی اس میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک کے صوبۂ بہار سے تعلق رکھنے والے اردو مصنفین اور ان کی نثری تصنیفات کا ذکر ہے، یہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں ۱۸۵۷ء سے پہلے بہار میں اردو نثر کے عہد بعہد ارتقا کا حال بیان ہوا ہے، اس ضمن میں وہاں کے تاریخی و سیاسی حالات اور ہندوستان میں اردو نثر کے آغاز و ارتقا کا اجمالی ذکر بھی کیا ہے، اور اردو کی پہلی نثری تصنیف پر بھی اظہار خیال کیا ہے، دوسرا باب ان مذہبی تحریکوں کے لیے مخصوص ہے جن کی بدولت ۱۸۵۷ء کے بعد بہار میں اردو نثر کو زیادہ فروغ ہوا، اس سلسلہ میں تحریک اہلحدیث کی مساعی و خدمات کا کسی قدر تفصیل سے تذکرہ ہے کیونکہ بہار اس تحریک کا خاص مرکز تھا۔ لائق مصنف نے اس تحریک کی تائید و حمایت کی طرح اس کی مخالفت میں لکھی جانے والی کتابوں اور ان کے مصنفین کا ذکر بھی کیا ہے، اسی باب میں شیعیت کی تائید و تردید اور عیسائیت، آریہ سماج اور قادیانیت وغیرہ کے جواب پر مشتمل کتابوں کا ذکر بھی ہے، تیسرا باب دو حصوں پر مشتمل ہے، پہلے حصہ میں اردو صحافت کے آغاز و ارتقا اور ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک بہار سے شائع ہونے والے اردو اخبار و رسائل کے متعلق معلومات درج ہیں اور دوسرے حصہ میں تاریخ، تذکرہ، سیر، سوانح، آپ بیتی، سفرنامہ، جغرافیہ، ریاضی، قانون، طب، سائنس، فلسفہ اور تعلیم وغیرہ فنون کی تصانیف اور ان کے مصنفین کا تذکرہ ہے، چوتھے باب میں داستان، تمثیل، ناول، ڈرامہ اور فن تنقید کی کتابوں کا جائزہ لیا ہے، آخری باب میں لغت، انشا، قواعد، محاورات اور ضرب الامثال کے متعلق تصانیف کا خاکہ دیا ہے، صوبہ بہار کی اردو نثر کی خدمات پر اس سے پہلے بھی کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں، لیکن جس عہد کے نثری کارناموں کا اس کتاب میں جائزہ لیا گیا ہے اس پر کوئی مستقل کتاب موجود نہیں تھی، اس کتاب سے یہ کمی پوری ہو گئی لیکن اس طرح کے کاموں میں برابر نئی نئی باتیں دریافت ہوتی رہتی ہیں اس لئے یہ کتاب مکمل نہیں کہی جا سکتی تاہم اس موضوع پر

کام کرنے والوں کو آئندہ اس سے بڑی مدد ملے گی، یہ کتاب تلاش و محنت سے مرتب کی گئی ہے اور اس سے مصنف کے ادبی ذوق، ترتیب و تالیف میں سلیقہ مندی اور نقد و نظر کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے انھوں نے اپنی تحقیق و جستجو سے متعدد فراموش شدہ کتابوں اور ان کے مصنفین کا نام ضائع ہونے سے بچا لیا، اس کتاب میں ۱۸۵۷ء سے قبل کے نثری کارناموں کا اجمالی ذکر بھی آگیا ہے، اس سلسلہ میں مصنف نے پیش رو اہل قلم کی کاوشوں کا خلاصہ پیش کیا ہے اور کہیں کہیں اس پر مفید اضافہ کیا ہے، چوتھے باب میں داستان، تمثیل اور ناول کی کتابوں کا مبسوط تعارف کرایا ہے، مگر دوسری نوعیت کی اہم کتابوں پر اس قدر سیر حاصل بحث نہیں کی ہے، ص ۱۰۲ پر وسیلۂ شرف و ذریعۂ دولت کا ذکر چند سطروں میں کیا ہے اور ان کے مصنف کے حالات تو درکنار اس کا پورا نام بھی تحریر نہیں کیا ہے، ان دونوں کتابوں کا چوتھا اڈیشن مصنف کے ہم صوبہ ڈاکٹر محمد طیب ابدالی کی تصحیح و تحشیہ کے بعد ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا ہے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس کے ایک ہی اڈیشن کا علم ہے، انھوں نے وسیلۂ شرف کا سنہ تصنیف ۱۳۱۴ھ بتایا ہے جبکہ خود اس کے آخر میں ۱۳۱۲ھ اور ڈاکٹر محمد طیب نے ۱۳۱۱ھ لکھا ہے، نیز انھوں نے دونوں کے متعلق لکھا ہے کہ پہلی بار مطبع پنچ بانکی پور سے ۱۳۱۴ھ میں شائع ہوئیں، حالانکہ ڈاکٹر محمد طیب کا بیان ہے کہ ان کی پہلی اشاعت مصنف کی زندگی ہی میں احسن المطابع پٹنہ سے ۱۳۱۳ھ میں ہوئی اور دوسری اشاعت مطبع اخبار پنچ بانکی پور پٹنہ سے ۱۳۳۴ھ میں ہوئی، مشہور اشخاص کے مفصل حالات تحریر کرنے کے بجائے غیر معروف اشخاص کا مبسوط حال قلم بند کرنا چاہئے تھا، مصنف کو اعتراف ہے کہ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا زیادہ حصہ رہا ہے مگر انھوں نے تصوف کی کتابوں کا ذکر کسی مستقل عنوان کے تحت نہیں کیا ہے، رد شیعیت کی کتابوں کے آخر میں بلا عنوان فقہی و دینی کتابوں کا ذکر بے موقع ہے، ص ۹۰ پر ایک کتاب کا نام جلاء العینین مع الدرة رکتا بالنزول فی وضع الیدین علی الصدر و تحت السرۃ لکھا ہے، اس کا موضوع یہ بتایا ہے کہ "کتاب و سنت کی روشنی میں ترک رفع یدین کو صحیح اور جائز ثابت کیا گیا ہے" مگر نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں نماز میں سینہ کے بجائے ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کو صحیح ثابت کیا گیا ہوگا، بعض جگہ ثقیل نامانوس بلکہ غیر مناسب الفاظ لکھے ہیں مثلاً "رد عیسائیت میں چند رسائل لکھے تھے جواب منتظر ہیں" (ص ۲۰۹) حسن اتفاق یہ ہے کہ تینوں جبن طبع نصاریٰ میں مشارک ہیں" (ص ۲۲۰) بعض کتابوں کے نام بھی تصحیح طلب ہیں۔

" ض "

مولانا سید سلیمان ندوی کی چند کتابوں کے جدید ایڈیشن

نقوشِ سلیمانی

سید صاحب کے ہندوستانی ادارہ، زبان و ادب سے متعلق مختلف ادبی کانفرنسوں کے خطبات صدارت، ان کی دوسری تقریروں، تحریروں، تبصروں اور مقدموں کا مجموعہ جن کا انتخاب خود فاضل مصنف نے اپنی زندگی میں کیا تھا، اور نہایت اہتمام سے معارف پریس میں چھپوایا تھا، وہ اردو کو ہندوستان کی نسبت سے ہندوستانی کا نام دے کر ملک کی مشترکہ زبان بنانا چاہتے تھے، افسوس کہ ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، اور ہندی ملک کی سرکاری زبان قرار پا گئی، طبع دوم عکسی،

قیمت:- ۲۵ روپے،

خیام

خیام کو فارسی کے ایک باکمال رباعی گو شاعر کی حیثیت سے عالمی شہرت حاصل ہوا اور اس کی رباعیات کا یورپ اور ایشیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو گیا ہے لیکن اس کے علاوہ وہ اور بھی بہت کچھ تھا، وہ فلسفی تھا، منجم تھا، ریاضی داں تھا، ہیئت داں تھا، اور حکیم و طبیب تھا، جس کی طرف شعر العجم میں خیام کے تذکرہ میں مولانا شبلی نے بھی اشارہ کیا ہے۔ اس کتاب میں پہلی مرتبہ اس کے سوانح و حالات کے ساتھ اس کی انہی حیثیات پر بہت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے آخر میں اس کے چند نایاب فارسی و عربی کے فلسفیانہ رسالے اور مستند رباعیات بھی شامل کر دی گئی ہیں،

طبع دوم عکسی قیمت: ۲۵ روپیہ

عرب و ہند کے تعلقات

سید صاحب کے عرب و ہند کے تعلقات پر ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد میں چند خطبے دیئے تھے یہ انہی کا مجموعہ ہے۔ طبع دوم عکسی، قیمت:- ۳۰ روپیہ

"منیجر"

بزم تیموریہ

بزم تیموریہ کا پہلا ایڈیشن تیموری علم پرور سلاطین بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، عالمگیر اور آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر اور تیموری شاہزادوں اور شاہزادیوں کے علمی ذوق، علم دوستی اور علم پروری کا اور ان سب کے درباروں کے اہل ذوق امراء، علماء، فضلاء اور شعراء کے تذکرہ اور ان کے علمی و ادبی و شعری کمالات اور ان کے نثر و نظم کے بہترین اقتباسات پر مشتمل تھا، اس کے دوسرے ایڈیشن میں نئی اصلاحات و ترمیم، تنقیح و تبدیلی اور اس کثرت سے اضافے ہوئے کہ اس کا حجم بہت بڑھ گیا، اس لئے قدردانوں اور مستفیدین کی سہولت کے لئے اس کو تین جلدوں میں کر دیا گیا، اس میں بعض نئے ماخذوں کی مدد سے ان سلاطین، شہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور علم پروری کی تفصیلات ایسے دلچسپ اور دل پذیر انداز میں درج کی گئی ہیں کہ بانی سلطنت تیموریہ شہنشاہ بابر سے لے کر آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر تک کے عہد کے علم و ادب اور شعر و سخن کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے، پہلی جلد میں پہلے تین مغل سلاطین یعنی بابر، ہمایوں اور اکبر کے علمی ذوق اور ان کے دربار کے امراء، شعراء اور فضلاء کے تذکرہ کے ساتھ ان کے علمی کمالات اور کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے، دوسری جلد جہانگیر و شاہجہاں اور ان کے دربار کے امراء کی علم دوستی اور ان کے دور کے شعراء و ادباء، فضلاء اور ارباب کمال کے تذکرہ اور ان کے علمی کمالات پر مشتمل ہے، تیسری جلد صاحب رقعات اورنگ زیب عالمگیر اور آخری دور کے مغل فرمانروا بہادر شاہ ظفر وغیرہ اور تمام تیموری شاہزادوں اور شاہزادیوں مثلاً گلبدن بیگم، نورجہاں بیگم، جہاں آرا صاحب مونس الارواح اور زیب النساء بیگم وغیرہ اور ان کے متوسلین ارباب کمال کے علمی کمالات اور کارناموں پر مشتمل ہے، جلد اول قیمت ۲۰ روپے، دوم ۱۲ روپے، سوم ۱۲ روپے۔

مرتبہ:- سید صباح الدین عبدالرحمن

ناظم دارالمصنفین اعظم گڑھ

جلد نمبر ۱۳۰ ماہ اکتوبر ۱۹۸۲ء

معارف

مجلس دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

قیمت ... روپیہ

دارالمصنفین اعظم گڑھ

مجلسِ ادارت

(دارالمصنفین کی دو نئی کتابیں)

سیرۃ النبی جلد ہفتم

سیرۃ النبی جلد ششم کے بعد سید صاحب سیرۃ جلد ہفتم میں جو معاملات سے متعلق تھی لکھنی شروع کر دی تھی، اور اسی پر یہ مقدس سلسلہ ختم بھی ہو جاتا لیکن ابھی اس موضوع پر چند ہی صفحات لکھے تھے کہ آپ کا انتقال ہو گیا، اور یہ پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکی، یہ ان ہی متفرق مضامین و مباحث کا مجموعہ ہے، جن کے عنوانات یہ ہیں، اسلام میں حکومت کی حیثیت، عہد نبوی میں نظام حکومت، سلطنت اور دین کا تعلق وغیرہ شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا مقدمہ ہے۔

قیمت:- ۱۱ روپے

مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

صوفی امیر خسرو

اس میں ہندوستان کے شہرۂ آفاق عجب و طن فارسی شاعر، سپہر، شیریں خسرو، لیلیٰ مجنوں دولرانی خضر خاں، اور دوسرا ایجاز جیسی شاہکار مثنویوں کے مصنف اور حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء کے جاں نثار مرید حضرت امیر خسرو کے معاصر تذکرہ و تاریخ کی کتابوں اور ان کے کلام کے مجموعوں اور مثنویوں کی روشنی میں ایک صاحب دل صوفی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے، ... کے بعد سلوک و عرفان کے مباحث ... دوسری ...

قیمت ...

مرتبہ ...

جلد ۱۳۰ ماہ ذی الحجہ سنہ ۱۴۰۲ھ مطابق ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۸۲ء عدد ۴

مضامین

ایک ضروری تصحیح

معارف بابت ماہ جنوری ۱۹۸۲ء کے صفحہ ۶۹ پر قرآن مجید کی آیتوں کی طباعت کی غلطیوں کی تصحیح ناظرین اصلاح کرلیں

سطر	غلط	صحیح
۸	عیسی ابن مریم ورسول اللہ	عیسی ابن مریم رسول اللہ
-	یُبَشِّرُكَ	یُبَشِّرُكِ
۱۳	المسیح بن مریم	المسیح عیسی ابن مریم

شذرات

کشمیر کی گل پوش وادی کے شیر شیخ عبداللہ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے اب وہاں ہیں جہاں ایک نہ ایک دن سب کو جا کر بارگاہِ ایزدی میں اپنا اپنا اعمال نامہ پیش کرنا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمتِ بے پایاں سے سرفراز فرمائیں، آمین۔ علمی مجلسوں میں اکثر یہ گفتگو رہتی ہے کہ ہندوستان میں انیسویں صدی میں جتنی عظیم اور قد آور شخصیتیں پیدا ہوئیں اتنی بیسویں صدی میں نہ ہو سکیں، مگر اس صدی میں جو چند عظیم المرتبت شخصیتیں پیدا ہوئیں ان میں شیخ عبداللہ بھی تھے، ان کی زندگی شروع سے فعال، متحرک اور ہنگامہ پرور رہی، اپنی جوانی میں مہاراجہ کشمیر کی استبدادیت سے ٹکر لی، اور جیل گئے، پاکستان کی تحریک اور اس کے قیام کے بعد محمد علی جناح سے بھی تصادم مول لیا، ۱۹۴۷ء کے بعد کشمیر کا الحاق ہندوستان سے کر کے اپنے سیکولرزم کا ثبوت دیا، اور پاکستان سے جنگ بھی کی لیکن پھر کشمیر کی مخصوص حیثیت کی خاطر اپنے دوست پنڈت جواہر لال نہرو سے بھی ان کی وزارتِ عظمیٰ کے زمانہ میں سیاسی ہنر آزمائی کی جس کے نتیجہ میں اپنی جوانی کے بہترین ایام قید اور نظربندی کی صعوبتوں میں گذارے، حکومتِ ہند سے ان کی معرکہ آرائی الف لیلیٰ کی داستان سے کم نہیں، چھپٹے، پلٹے، پلٹ کر جھپٹے، جھپٹ کر پلٹے، کشمیر کے عوام کے استصواب رائے، حقِ خود اختیاری، اور سرزمینِ کشمیر کی آزادی کے نعرے بلند کرتے رہے، مگر جب یہ فضا میں صرف گونج کر رہ گئے، تو پھر حکومت سے مصالحت کر لی، کشمیر کے وزیرِ اعظم تو نہیں لیکن وزیرِ اعلیٰ بن گئے، اور اسی حیثیت سے ان کی وفات بھی ہوئی، اور جنازہ بھی اٹھا جس کے بے پناہ ہجوم سے کشمیر میں ان کی محبوبیت کا اندازہ ہوا۔

وزیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے ان کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ کشمیر میں یونیورسٹی تک تعلیم مفت کر دی، اردو کو اپنی ریاست کی سرکاری زبان بھی بنایا، گو ان کی مادری زبان کشمیری تھی لیکن کشمیری زبان سے اپنی محبت بھی برقرار رکھی، اور ان ہی کی سرپرستی میں یہ ترقی کر کے ایک اچھی علمی زبان بن گئی ہے، پھر ریاست کی ڈوگری

اور لسانی زبانوں کو فروغ دینے میں ہر قسم کی سہولتیں فراہم کیں جو اُن کے سیکولرزم کی مزید مثال ہے،

۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت کرنے والا کوئی نہیں رہا تو شیر کشمیر کی جری اور بہادر شخصیت کی طرف نظر اٹھی تھی لیکن وہ مولانا محمد علی جوہر اور نہ مولانا ابو الکلام آزاد بن سکے، شاید طویل قید بند کی صعوبتوں سے تھک چکے تھے، یا انھوں نے صرف کشمیر ہی کے لئے جام حیات نوش جاں فرمانا طے کر لیا تھا، اپنی وزارت کے زمانہ میں بہت کم باہر نکلے، ہندوستان کے چھوٹے بڑے وزیر کسی نہ کسی بہانہ سے ممالک غیر کی سیر کر آتے ہیں مگر شیخ صاحب نے تو اپنے علاج کے لئے کشمیر سے باہر جانا بھی پسند نہیں کیا، ان کو وہاں کی حسین اور رنگین وادی، اور اس کی وزارت اعلیٰ کے گوشۂ عافیت میں جو ذہنی اور سیاسی سکون ملا، اُن کو شاید کہیں اور ملنے کی امید نہ تھی، اسی لئے وہ اپنی زبان حال سے یہ کہتے رہے،

قدم ز نقطۂ کشمیر بر نمی گیریم مقیم مرکز عیشیم و جائے ما اینجاست

اور ان پر یہ اندرونی جذبہ کارفرما رہا،

کشمیری ستانم از حق بجائے جنت اما نمی ستانم جنت بجائے کشمیر

مغربی بیروت میں صیہونیوں نے صابرہ اور شطیلہ کے فلسطینی کیمپوں میں گھس کر جو المناک قتل عام کیا ہے، اس کی ہولناکی سے پوری دنیا چیخ اٹھی ہے، یہودیوں کی یہ سفاکی کوئی نئی نہیں، ان ہی نے حضرت عیسیٰ کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائیں، ان کی پشت مبارک پر چابک لگائے، ان کے ہاتھوں پر کیلیں ٹھونکیں، اور عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق تختۂ دار پر چڑھایا، پھر بھی تعجب ہے کہ امریکہ اور لبنان کے عیسائیوں کی اعانت سے یہی یہودی بیروت میں قیامت صغریٰ برپا کئے ہوئے ہیں اور یہ بھی باعث تعجب ہے کہ اب جب کہ بقول ایک شاعر فلسطینیوں کے اس قتل عام سے خود اجل کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار جاری ہے، اور اسلام کے خلاف ایک زبردست سازش پس دیوار جاری ہے، اس وقت عربوں میں باہمی تکرار، اُن کی محفل میں رقص بادہ گساری اور عشرت کدوں میں منت اغیار جاری ہے،

پھر بھی مسلمان یہ سمجھ رہے ہیں کہ اسرائیل کی زبردست قوت کی وجہ سے فلسطینی اور عرب ممالک ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، تو وہ اپنے ایمان کی پختگی اور حرارت سے محروم ہیں۔ ان یہودیوں کو اسی سرزمین میں ختم ہونا ہے جب رات کو بیروت کے قتلِ عام کی خبر سنی تو دوسرے دن فجر کی نماز کے بعد تلاوتِ کلام پاک میں یہ آیتیں نظر سے گذریں، جن کے ترجمے مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے یہ کئے ہیں "ہم نے اپنی کتاب میں بنی اسرائیل کو اس بات پر متنبہ کر دیا تھا، کہ تم دو مرتبہ زمین میں فساد برپا کرو گے، اور بڑی سرکشی دکھاؤ گے، آخر کار جب ان کی پہلی سرکشی کا موقع پیش آیا تو اے بنی اسرائیل، ہم نے تمہارے مقابلے پر اپنے ایسے بندے اٹھائے جو نہایت زورآور تھے، اور تمہارے ملک میں گھس کر ہر طرف پھیل گئے، یہ ایک وعدہ تھا جسے پورا ہو کر ہی رہنا تھا، اس کے بعد ہم نے تمہیں ان پر غلبے کا موقع دیا، اور تمہیں مال اور اولاد سے مدد دی، اور تمہاری تعداد پہلے سے بڑھا دی، دیکھو تم نے بھلائی کی تو وہ تمہارے اپنے ہی لئے بھلائی تھی، اور برائی کی تو وہ تمہاری اپنی ذات کے لئے برائی ثابت ہوئی، اور پھر جب دوسرے وعدہ کا وقت آیا تو ہم نے دوسرے دشمنوں کو تم پر مسلط کیا تاکہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں، اور مسجد (بیت المقدس) میں اسی طرح گھس جائیں جس طرح پہلے دشمن گھسے تھے، اور جس چیز پر ان کا ہاتھ پڑے، اسے تباہ کر کے رکھ دیں، ہو سکتا ہے اب تمہارا رب تم پر رحم کرے، لیکن اگر تم نے اپنی سابق روش کا اعادہ کیا تو ہم بھی اپنی سزا کا اعادہ کریں گے، اور کافرِ نعمت لوگوں کے لئے ہم نے جہنم کا قید خانہ بنا رکھا ہے"

(بنی اسرائیل، رکوع ۱۰)

کلام پاک کی ان آیتوں پر یقین کامل رکھنا اپنے ایمان کا ثبوت دینا ہے، ضرورت صرف اس کی ہے کہ مسلمان اپنی زندگی میں اسلامی شعائر کا اعادہ صحیح معنوں میں کریں، بارگاہِ ایزدی میں دعا ہے

احساس عنایت کر آثارِ مصیبت کا،

امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے

مقالات

گل رعنا

مؤلفہ مولانا حکیم سید عبدالحیٔ

از

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

ہندوستان میں انگریزوں کے اقتدار اور جدید نظام تعلیم کے رائج ہونے سے پہلے ایک ہی نظام تعلیم رائج تھا جو فارسی وعربی درسیات، زبان کے قواعد، ریاضی، منطق وفلسفہ، ادب (نثر ونظم)، بلاغت وفن عروض سے لے کر علوم دینیہ (فقہ، اصول وحدیث وتفسیر وعلم کلام) پر مشتمل تھا، صدیوں تک ہندوستان میں ذہنی صلاحیتوں کے نشو ونما، فطری جوہر وملکات کے چمکانے اور اعلیٰ ثقافت (کلچر) پیدا کرنے کا یہی واحد ذریعہ تھا جس سے ملک کے انتظامیہ کے لیے اعلیٰ عہدیدار، یہاں تک کہ وزیر سلطنت، محاسب اعلیٰ (اکاونٹنٹ جنرل) جس کو عہد قدیم میں "مستوفی الممالک" کے نام سے یاد کرتے تھے، دبیر ومنشی (انشا پرداز وسکریٹری) اور قاضی ومفتی یکساں طور پر پیدا ہوتے تھے، مستوفی الممالک مولانا شمس الدین خوارزمی (صدر ومحاسب اعلیٰ بعہد غیاث الدین بلبن)، خواجہ جہاں محمود گاواں گیلانی (وزیر سلطنت بیدر دکن) جملۃ الملک سعد اللہ خان علامی (وزیر شاہجہاں بادشاہ) اور تفضل حسین خاں علامہ (وزیر سلطنت [illegible]) کے نام بطور نمونہ پیش کیے جاسکتے ہیں، جو سب اسی دور کی یادگار، اور اسی طرز تعلیم کا نتیجہ تھے۔

اسی عہد میں جس طرح ہر طرح کے باصلاحیت تعلیم یافتہ افراد پیدا کرنے کے لیے جو ہر طرح کی ذمہ داری سنبھال سکیں، کوئی اور ذریعۂ تعلیم اختیار نہیں کیا جاتا تھا، اسی طرح ادب و انشار، تحریر و تصنیف، نقدِ سخن اور شاعری اور سخن سنجی کا مذاق اور سلیقہ پیدا کرنے کے لیے بھی کوئی متوازی نظامِ تعلیم یا اختصاص پیدا کرنے کا کوئی شعبہ موجود نہ تھا، جس طالب علم میں جس فن کی نظری صلاحیت اور رضا اوادہ مناسبت ہوتی تھی، یا اس کے مخصوص محرکات جمع ہو جاتے تھے، وہ اس میں امتیاز و اختصاص پیدا کر لیتا تھا اور اس کو اپنی زندگی کا مشغلہ بنا لیتا تھا، فارسی ادبیات کا آتنا وافر حصہ اور اس کے ایسے دلکش و دلآویز نمونے نصابِ تعلیم میں داخل تھے[1] اور بالعموم اساتذہ ان کو ایسی دلچسپی و دلسوزی سے پڑھاتے تھے کہ بجز ان لوگوں کے جو فطری طور پر ذوق اور ادبی صلاحیت سے محروم ہوتے تھے، عام طور پر فارسی کا ذوق اور شعر و ادب سے لطف لینے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی تھی، اور چونکہ فارسی اور اردو کا گہرا تعلق ہے اس لیے اردو میں بھی اس سے بیش قیمت مدد ملتی تھی، اس زمانہ میں نصابِ تعلیم زندگی، ملک کی زبان و ادب اور مجالس و معاشرت سے الگ تھلگ کوئی چیز نہ تھی، جیسا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے واضح طریقہ پر نظر آنے لگا، یہی باکمال اساتذہ جو مسندِ درس پر بیٹھ کر منطق و فلسفہ کی خشک و بے مزہ کتابیں پڑھاتے تھے اور علمی مباحث اور دقیق مضامین میں بال کی کھال نکالتے تھے، اور حدیث و تفسیر کے درس کے وقت وقار و تمکنت کی تصویر ہوتے، دوسرے وقت اپنے شہر و قریہ کی ادبی مجلسوں میں بے تکلف شریک ہوتے، اچھے شعر کی دل کھول کر داد دیتے، خود بھی طبع آزمائی کرتے اور شعر کا کھرا کھوٹا خوب پرکھتے، بلکہ اکثر اوقات انہی کا قول اس بارے میں

---

[1] قدیم نصابِ تعلیم میں عربی کے مقابلہ میں فارسی ادبیات کے نمونے اور اس کی نظم و نثر کا انتخاب بہتر تھا، اس لیے اس نصاب سے فارسی کا جتنا اچھا مذاق پیدا ہوتا تھا، اور اس میں انشار و تحریر کی جو صلاحیت پیدا ہوتی تھی، وہ عربی میں عام طور پر مفقود تھی۔

قولِ فیصل ہوتا، مولوی محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں اپنے استاد ذوق کے حالات میں لکھا ہے کہ ذوق نے اپنے استاد شاہ نصیر کی غزل پر غزل لکھی :

"شاہ صاحب کی طرف سے بجائے خود اس پر اعتراض ہوئے جشن قریب تھا، شیخ علیہ الرحمۃ نے بادشاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ اس طرح میں لکھا، مگر پہلے مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کے پاس لے گئے کہ اس کے صحت و سقم سے آگاہ فرمائیں، انھوں نے سن کر پڑھنے کی اجازت دی، مگر ولی عہد بہادر نے اپنے شقہ کے ساتھ اسے پھر شاہ صاحب کے پاس بھیجا، انھوں نے جو کچھ کہا تھا وہی جواب میں لکھ دیا اور یہ شعر بھی لکھا ؎

بود بگفتۂ من حرفِ اعتراض چناں کسے بدیدۂ بینا فرد برد انگشت

شیخ مرحوم کا دل اور بھی قوی ہوگیا اور دربارِ شاہی میں جاکر قصیدہ سنایا"[1]

۱۸۵۷ء اور اس کے کچھ عرصہ بعد تک جب تک ملک میں نیا نظامِ تعلیم رائج و مقبول نہیں ہوا تھا، ادبی و علمی محفلوں میں اسی قدیم نصاب کے ساختہ و پرداختہ فضلا، صدر نشین ہوتے، وہی زبان و ادب کی اس ملک میں سربراہی اور رہنمائی کا فرض انجام دیتے، انہی کا قول ان اصناف میں حجت مانا جاتا، انہی کے قلم سے ان مباحث پر بلند پایہ تصنیفات نکلتیں، اس لیے کہ پورے ملک میں یہی سب سے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ تھا، ۱۸۵۷ء سے پہلے اور اس کے کچھ عرصہ بعد تک بھی مولوی امام بخش صہبائی، مولانا عبداللہ خان علوی، مفتی صدر الدین خان آزردہ اور مولانا فضلِ حق خیرآبادی جس طرح علومِ معقول و منقول میں اپنے دور کے امام مانے جاتے تھے اسی طرح نکتہ شناسی، دیدہ وری و سخن فہمی میں بھی معیار تسلیم کیے جاتے تھے اور ان کا قول حرفِ آخر اور زبان و ادب کے بارے میں بھی "فتویٰ" کی حیثیت رکھتا تھا، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ جن کی سخن فہمی اور نکتہ رسی ان کے دور میں ایک ایسی

[1] "آبِ حیات" مطبع کریمی لاہور ص ۴۴۵ ۔

حقیقت بن گئی تھی کہ غالب تک کو یہ کہنا پڑا سہ

غالب بہ فنِ گفتگو نازد بایں ارزش کہ او ننوشت در دیواں غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد

اسی نظامِ تعلیم کے فیض یافتہ و پروردہ تھے مولانا فضل حق خیرآبادی جو اس دور آخر میں علوم عقلیہ کے امام مانے جاتے ہیں اور جن کا سارا وقت منطق و فلسفہ کی اعلیٰ کتابوں کی درس و تدریس اور ان کی موشگافیوں میں گذرتا تھا، اس پایہ کے سخن فہم و سخن شناس تھے کہ غالب نے ان کی خاطر اپنے اشعار (جو شاعر کے لیے اولاد کی طرح عزیز ہوتے ہیں) کے ایک بڑے حصہ پر خطِ نسخ پھیر دیا، مولانا حالی لکھتے ہیں کہ "مولانا کی تحریک سے مرزا نے اپنے کلام سے دو ثلث کے قریب اشعار نکال ڈالے اور اس کے بعد اس روش پر چلنا چھوڑ دیا۔"[1]

اس دور کے بعد بھی اسی طبقہ کے ہاتھ میں ملک کی علمی و ادبی قیادت رہی، مولوی محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی اور علامہ شبلی نعمانی جن کو دورِ آخر میں زبان و ادب کی عمارت کے چار ستون کہنا بجا ہوگا، اسی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور انھی کے قلم سے آبِ حیات، مقدمہ شعر و شاعری اور موازنۂ انیس و دبیر جیسی معرکۃ الآرا کتابیں نکلیں۔

مولانا حکیم سید عبدالحیؒ اسی دورِ واپسیں کی آخری یادگاروں میں تھے، انھوں نے جس عہد میں آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا، اس میں گھر گھر شعر و سخن کے چرچے تھے، شہروں کو چھوڑ کر جہاں مشاعرہ لازمۂ تمدن بن گیا تھا، قصبات اور بڑے دیہاتوں میں بھی مشاعرہ کی محفلیں آراستہ ہوتیں، اور نوجوان تو نوجوان، بچے تک شعر موزوں کرنے کی کوشش کرتے، ان کے والد مولوی سید فخرالدین صاحب خیالی جیسا کہ اس کتاب کے باب اول سے معلوم ہوگا، پرفکر شاعر اور کہنہ مشق نثار و ادیب تھے، مولانا سید عبدالحی صاحب جب لکھنؤ میں تحصیلِ علم میں مشغول تھے، اس وقت منشی امیر احمد امیر مینائی، حکیم

---

[1] یادگارِ غالب۔

ضامن علی جلال، شیخ امیر اللہ تسلیم اور مولوی محمد محسن محسن کاکوروی کی شاعری کی دھوم مچی ہوئی تھی، ان میں سے بعض اساتذۂ سخن اگرچہ دربار رام پور سے متعلق ہو گئے تھے، لیکن وطنیت کے تعلق سے لکھنؤ کے در و دیوار ان کے اشعار کی تعریف و تحسین کے شور سے گونج رہے تھے، اور بچہ بچہ کی زبان پر ان کا نام اور کلام تھا، ادھر مرزا سلامت علی دبیر اور میر ببر علی انیس کے مراثی کی دھوم مچی ہوئی تھی، اور سارا شہر ان کے کلام سے مست ہو رہا تھا، وہ خود درد مند دل اور موزوں طبیعت لے کر آئے تھے، اردو تو ان کی زبان تھی، عربی و فارسی، ادب و زبان سے بھی انکو فطری مناسبت تھی، بھوپال گئے تو وہاں بھی والا جاہ امیر الملک نواب سید صدیق حسن خان بہادر (جو مفتی صدر الدین خان آزردہ کے عزیز شاگرد تھے) کی جوہر شناسی اور قدر دانی سے شہر باکمال و صاحب ذوق علماء و ادباء کا مرکز بنا ہوا تھا، اور افتخار الشعراء حافظ محمد خان شہیر، غلام احمد فرید فرخی اور متعدد نامی گرامی شعراء موجود تھے، اس ماحول اور اس انداز کی تعلیم و تربیت میں شعر و سخن کا ذوق سلیم اور سخن فہمی کا مذاق صحیح پیدا نہ ہونا تعجب ہے، چنانچہ یہ مذاق نہ صرف یہ کہ پیدا ہوا، بلکہ اس نے اس حد تک ترقی کی کہ ان کے قلم سے اردو شعراء کا ایک تذکرہ مرتب ہوا جو ان کی زندگی کے بعد "گل رعنا" کے نام سے شایع ہوا۔

ہندوستان میں ترکی و افغانی النسل فاتحین اور حکمرانوں کے اثر سے فارسی ہی تصنیفی و دفتری زبان قرار پائی، اور ۱۸۳۵ء کے کچھ بعد تک ہر قسم کا سنجیدہ علمی و تحریری کام یہاں تک کہ مراسلت، باپ بیٹوں اور دوستوں کی خط و کتابت بھی بالعموم اسی زبان میں ہوتی تھی، اس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ اردو شعراء کے تذکرے ۱۸۵۰ء تک فارسی ہی میں لکھے گئے، یہ سب تذکرے اردو شاعری کے خد و خال اس کی زبان کے نکتوں، اشعار کی نوک پلک اور شعراء کی امتیازی خصوصیات اور ان کے طرز کلام کو ظاہر کرنے کے لیے لکھے گئے، اور ان میں تمام تر ان کے اردو کلام کا نمونہ ہی پیش کیا گیا ہے، لیکن تذکروں کی زبان فارسی ہی ہے، چنانچہ میر تقی کی نکات الشعراء، میر حسن اور مصحفی کے تذکرے ....

مولوی قدرت اللہ کا طبقات الشعراء، فتح علی شاہ کا تذکرہ، اسی طرح سے بزم سخن، مہر جہاں تاب، اور بعد یہ ہے کہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا گلشن بے خار سب فارسی ہی میں ہے۔

مولوی محمد حسین آزاد مرحوم کا یہ بہت بڑا علمی و ادبی کارنامہ اور اردو پر احسان ہے کہ آب حیات لکھ کر انھوں نے پہلی مرتبہ اردو والوں کو اردو شاعری کی کہانی اردو میں سنائی، وہ اردو زبان و شاعری کے گہوارہ میں پلے تھے، اور اردوئے معلّٰی کے اجڑنے سے پہلے اس کی بہار دیکھی تھی استاد ذوق جیسے استاد کے عزیز شاگرد تھے، ذوق، غالب، مومن، شیفتہ کی مجلسیں اور بے تکلف صحبتیں دیکھی تھیں، لکھنؤ بھی وہ اس وقت آئے جب ناسخ و آتش کے تذکروں سے محفلیں گرم اور دبیر و انیس کی خوش نوائی سے لکھنؤ کا چمن بول رہا تھا، سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ پیدائشی طور پر سخن فہم و سخن شناس تھے، ان کا خمیر شعر و ادب سے اٹھا تھا، اور اس کا ذوق ان کے رگ و ریشہ میں پیوست ہو گیا تھا، پھر وہ اس درجہ کے انشاء پرداز ہیں کہ ان کی انشاء پردازی دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے کلاسیکل ادب، اور ان کے ادبی شہ پاروں سے آنکھیں ملاتی ہے، ان کے سب سے بڑے ناقد مولانا حکیم سید عبدالحئی نے "گل رعنا" میں ان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اور ان کے اس یگانہ کمال کا جس طرح اعتراف کیا ہے، اس پر اضافہ مشکل ہے، وہ لکھتے ہیں:

> "سب سے بہتر اور عمدہ تصنیف ان کی "آب حیات" ہے، جو اردو زبان اور ریختہ شعر کی تاریخ میں پہلی کتاب، اور اردو انشاء پردازی کا بہترین کارنامہ ہے، عبارت کی بے ساختگی اور برجستگی، اور اس میں شاعرانہ تخیل، استعاروں کی دلفریبی کے ساتھ ایسی چیز ہے جس پر غزلوں کے سیکڑوں دیوان قربان کر دینے کے قابل ہیں۔

اس کتاب کی مقبولیت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ جو غلط اور نادرست روایتیں مصنف کے جادو نگار قلم نے لکھ دی ہیں، وہ آج اردو کی انشاء پردازی کے قالب میں روح کی طرح پیوست ہو گئی ہیں،

اور ضرب المثل کی طرح زبانوں پر چڑھ گئی ہیں جس طرح اقلیدس کے اصولِ موضوعہ بے چون وچرا
مانے جاتے ہیں، اسی طرح ان کو بے تکلف کام میں لایا جاتا ہے[1]"

لیکن کوئی موضوع کسی بڑے سے بڑے مصنف پر ختم اور اس کے لیے وقف نہیں ہوتا ، اور کوئی کتاب بھی (خواہ وہ کتنے ہی عظیم مصنف کے قلم سے نکلی ہو) اپنے فن و موضوع کی آخری کتاب قرار نہیں دی جاسکتی، علم و فن، فلسفہ و حکمت، شعر و ادب، صناعی و معماری، مصوری و نقاشی، اختراع و ایجاد سب کی وسعت و ترقی کا راز اسی نکتہ میں ہے کہ ان کے کسی نقش کو نقشِ دوام اور ان کی تحقیق کو حرفِ آخر قرار نہیں دیا گیا اور حوصلہ مند مصنفین اور نیک نیت ماہرینِ فن اور علم و تحقیق کی سچی لگن رکھنے والے اہلِ قلم نے اپنے پیش روؤں کے فضل و کمال اور ان کی اولیت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کا علمی محاسبہ بھی کیا، اور تحقیق کا ایک قدم آگے بڑھانے اور ان کے معلومات کے اندوختہ میں اضافہ کرنے کی جرأت کی، یہ دنیا کی کسی زبان اور کسی علم و فن کی تاریخ میں کبھی بھی گناہ یا شوخی و گستاخی نہیں قرار دی گئی، بلکہ ہر نئی نسل کے بساطِ علم و تحقیق کے تازہ واردوں کے کان میں ہمیشہ یہی غیبی آواز آتی اور ان کا دل بڑھاتی رہی ہے

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کارِ مغاں		ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

"آبِ حیات" بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں، وہ اپنی غیر معمولی مقبولیت اور اپنی اعلیٰ انشاپردازی، دقیق نکتہ سنجی، بلکہ ذوق آفرینی اور ادب آموزی کے ساتھ ہر انسانی کام کی طرح نقائص سے یکسر مبرا اور غلطیوں اور فروگذاشتوں سے کلیتہً خالی نہ تھی، مولانا آزاد پیدائشی اور خلقی طور پر ادیب تھے، اور ادب و حسنِ انشا، ان کے تیغِ قلم کا اصل جوہر ہے، ادبی مزاج اور تاریخی مزاج میں ایک طرح کا بُعد اور ادبی تقاضوں اور تاریخی تقاضوں میں بعض اوقات تعارض پایا جاتا ہے، ادب تخیل پسند

[1] "گلِ رعنا" ص ۰۰-۴۷ طبع چہارم ۱۳۷۰ھ، ۱۹۵۱ء۔

ہوتا ہے اور تاریخ حقیقت پسند، ادب اپنی پرواز کے لیے آزاد اور بے قید فضا چاہتا ہے، تاریخ اپنے سفر کے لیے ایک محدود اور نپا تلا راستہ، ادب تشبیہ اور استعارہ اور تخیل سے آب و رنگ پیدا کرتا ہے اور تاریخ خوالوں، واقعات اور قدیم تحریروں کی پابندی سے گرانبار ہوتی ہے، مولانا آزاد کا اصل مزاج اور رجحان طبیعت ادب و انشا پردازی ہے، وہ خواہ کسی تاریخی موضوع پر قلم اٹھائیں، یہ ذوق ان پر غالب آکر رہتا ہے، اس کی مثال دیکھنا ہو تو دربار اکبری کا مطالعہ کیا جائے۔

آب حیات کے ان تشنہ گوشوں کو جو ایک نئی تصنیف کے متقاضی تھے، ہم تین قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) آب حیات میں جن شعراء کا تذکرہ ہے، بہت خوب ہے، اور آزاد نے ان کے بارے میں اپنی سخن شناسی اور ذوق کی لطافت کا پورا ثبوت دیا ہے، لیکن ہر دور کے شعراء کی ایک بڑی تعداد جن میں سے بہت سے ان شعراء کے ہم پایہ تھے جن کا تذکرہ آب حیات میں آیا ہے، اور بعض اپنے ان خوش قسمت معاصرین سے جن کا آب حیات میں تذکرہ آگیا ہے، بلند پایہ تھے، نظر انداز ہو گئی ہے، ان کے تذکرہ کے بغیر اردو شاعری کی مسلسل تاریخ میں بیچ بیچ میں خلا محسوس ہوتے ہیں، اور بعض اہم کڑیاں مفقود نظر آتی ہیں۔

مثلاً طبقہ متقدمین میں سے مولانا نصرتی، فقیر اللہ آزاد، میر سراج الدین سراج، مرزا داؤد داؤد، میر عبدالولی عزلت، عارف الدین خان عاجز اور محمد حسین کلیم نظر انداز ہو گئے ہیں، ان میں سے بعض کا کلام بالخصوص میر سراج الدین سراج کے اشعار صفائی زبان کا نمونہ اور اردو شاعری کی ترقی و پیش رفت کے اظہار کے لیے سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں، اور مرزا مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد کے کلام سے لگا کھاتے ہیں، نیز دور متوسطین میں انعام اللہ خان یقین

میر محمد باقر حزیںؔ، میر محمد بیدارؔ، میر قدرت اللہ قدرتؔ، میر ضیاء الدین ضیاؔ، حکیم ثناء اللہ خاں فراقؔ، میر نظام الدین ممنونؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، نواب مصطفٰے خاں شیفتہؔ، کرامت علی شہیدیؔ کا تذکرہ موجود نہیں، شیخ قیام الدین قائمؔ اور شیخ بقاء اللہ بقاؔ کا تذکرہ حاشیہ میں چند چند سطروں میں آیا ہے، ان میں سے یقینؔ، ممنونؔ، ظفرؔ، شیفتہؔ[1] کسی طرح آزادؔ کے سے جوہر شناس اور کمال کے سچے قدر دان کی قدر دانی سے محروم ہونے کے لائق نہ تھے، اور سہو یا تغافل کی توجیہ اس حالت میں آسان نہیں کہ اس تذکرہ میں میر ضاحکؔ اور میر مستحسن خلیقؔ جیسے شعراء موجود ہیں، جن کے دو دو چار چار شعر سے زیادہ آزاد کو نہ مل سکے اور نہ انھوں نے اپنے عہد اور ادبی رجحانات پر کوئی اثر ڈالا، متاخرین کے دور کو لو تو خواجہ محمد وزیر وزیرؔ، میر وزیر علی صباؔ، نواب سید محمد خاں رندؔ، مرزا محمد رضا برقؔ، میر علی اوسط رشکؔ، مرزا اصغر علی خاں نسیمؔ، میر مظفر علی اسیرؔ، شیخ امداد علی بحرؔ قلم انداز ہو گئے ہیں، اور اسی طرح لکھنؤ کے اُن نامی گرامی شعراء کے تذکرہ سے آبِ حیات خالی ہے جن کا اس عہد میں طوطی بولتا تھا، اور جو دور دور شہرت و مقبولیت حاصل کر چکے تھے، اسی طرح منشی امیر احمد امیرؔ مینائی، نواب مرزا خاں داغؔ، مرزا قربان علی سالکؔ، میر مہدی مجروحؔ اور حکیم ضامن علی جلالؔ اس بزم میں نظر نہیں آتے، جن کی شاعری سے نہ صرف لکھنؤ بلکہ رام پور و حیدر آباد اور خود دہلی کی مجلسیں معمور و مخمور تھیں، اس موقع پر یہ عذر نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی شاعری کے شہپاروں نے آزاد کی وفات کے بعد بال و پر نکالے، اور انھوں نے ارتقاء کے منازل طے کیے، اس لیے کہ یہ سب وہ ہیں، جو شاعری کی دنیا میں نام پیدا کر کے آزاد کی وفات (۱۳۲۷ھ، ۱۹۱۰ء) سے کئی کئی سال پہلے اس دنیا سے سفر اختیار کر چکے تھے، اور آزاد جیسا اردو ادب و شاعری کا قدر دان اور مبصر ان سے

---

[1] نواب مصطفٰے خاں شیفتہ کا صرف نام اور ولدیت مومن خاں کے تذکرہ میں آگئی ہے اور اس کا ذکر ہے کہ وہ گلشنِ بے خار کے مصنف ہیں۔

بے خبر نہیں ہو سکتا، اسی طرح سے آزاد نے انیس و دبیر کا تذکرہ ملا کر لکھا ہے، اور ان کی معنی آفرینی، نازک خیالی اور بلند پروازی اور شکوہ الفاظ کی دل کھول کر داد دی ہے، لیکن نعتیہ اصناف میں مولوی محمد محسن کاکوروی جو ان سے کسی طرح کم نہیں، جن کے متعلق امیر مینائی لکھتے ہیں کہ

" ان کا کلام ایک عالم ہے خیالاتِ نادرہ کا کہ اس کو دیکھ کر انسان حیران ہو جاتا ہے، اور ان کا ہر شعر معراج بلاغت ہے[۱]!"

ان کی نظمیں صبح تجلی، چراغ کعبہ اور سراپا وغیرہ کے بند پڑھے جائیں تو وہ نازک خیالی، مضمون آفرینی، تشبیہات و استعارات کی تازگی اور لطیف تلمیحات میں کسی طرح سے انیس و دبیر سے کم نہیں، فرق یہ ہے کہ انھوں نے اپنی ساری ذہانت و محنت نعت نبوی اور مدح خیر المرسلین میں صرف کی، اور انیس و دبیر نے مرثیہ و منقبت، مصائب اہل بیت اور واقعۂ کربلا کے بیان کرنے میں جس سے آزاد کے دل کو زیادہ لگاؤ اور وابستگی تھی اپنی ذہانت اور قوت شاعری صرف کی۔

اسی طرح سے آب حیات اپنے مصنف کے دور تک بھی اردو شاعری کے تمام عہدوں کے باکمال شعراء کے پورے تذکروں پر حاوی نہ تھی، اور بہت سے ایسے شعراء و اساتذہ نظر انداز ہو گئے، جو نظر انداز ہونے کے قابل نہ تھے۔

اسی طرح آزاد کی آخری زندگی اور اُن کی وفات کے بعد خواجہ الطاف حسین حالی، مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی، لسان العصر سید اکبر حسین الٰہ آبادی نے اردو شاعری میں ایک نیا رنگ اور نیا آہنگ پیدا کیا خود مصنف آب حیات مولوی محمد حسین آزاد بھی اس کے مستحق تھے کہ ان کو اس بزم میں جگہ دی جائے اور اردو شعراء کا تذکرہ جو ان کی وفات کے بعد لکھا گیا ہو، ان کے تذکرہ سے خالی نہ ہو، اس لیے ایک ایسی تصنیف کی ضرورت تھی جو اس کمی کو پورا کرے اور اس عہد تک کے لیے ایک جامع تذکرہ

---

۱ مقدمہ مکتوبات امیر مینائی۔

(۲) آب حیات میں [illegible] پائی جاتی ہیں، اور بعض ایسے بیانات ہیں جن کی تصدیق ان اصل کتابوں سے نہیں ہوتی جن کا حوالہ دیا گیا ہے، اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ آزاد نے ان کے بارے میں سنی سنائی روایات پر یا اپنے حافظہ پر اعتماد کیا، اور کتاب کی تصنیف کے وقت اصل ماخذ کی طرف رجوع کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کی، یا ان کتابوں کے کسی شوشہ اور نقطہ کو اپنے گوہر بار قلم اور قوت متخیلہ سے بڑھا چڑھا کر کہیں سے کہیں پہونچا دیا، وہ زمانہ کتابوں کی کمیابی کا تھا، اس لیے کوئی حیرت واستعجاب کی بات نہیں کہ اردو کے بعض بنیادی تذکرے ان کی نظر سے نہ گذرے ہوں، مثلاً اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی ہے کہ میر تقی میر کا تذکرہ نکات الشعراء ان کی نظر سے نہیں گذرا، اور اس کے لیے آب حیات میں داخلی شہادتیں موجود ہیں، غالباً سب سے پہلے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خان شروانی نے "نکات الشعراء" (جس کو انجمن ترقی اردو نے نظامی پریس بدایوں سے شایع کیا) کے مقدمہ میں اس کو وضاحت اور قوت کے ساتھ ظاہر کیا، اور آب حیات اور نکات الشعراء میں متعدد مقامات میں تضاد ظاہر کرکے آخر میں لکھا ہے:

"میری بدگمانی معاف ہو تو میں کہوں گا کہ نکات الشعراء آزاد کی نظر سے نہیں گذرا، قیاس کی بلند پروازی نے طوطی مینا بنا کر اڑائے ہیں اور ان کی سحر بیانی نے سامعین کو خوش کیا ہے[2]"

یہاں اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

(۱) آزاد کہتے ہیں کہ "میر صاحب دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ یہ اردو کا پہلا تذکرہ ہے، اس میں ایک ہزار شاعروں کا حال لکھوں گا، مگر ان کو نہ لوں گا جن کے کلام سے دماغ پریشان ہو" دیباچہ میں کہیں نہیں ہے کہ اس میں ایک ہزار شاعروں کا تذکرہ لکھوں گا، یہ بھی نہیں ہے کہ ان کا ذکر نہیں لکھوں گا،

---

[1] ملاحظہ ہو "آب حیات" اور "نکات الشعراء"، نکات الشعراء ص ۲۰ تا ۲۴ [2] "نکات الشعراء" (مقدمہ) ص ۲۴۔

بے خبر نہیں ہو سکتا، اسی طرح سے آزاد نے انیس و دبیر کا تذکرہ دل لگا کر کیا ہے، اور ان کی معنی آفرینی نازک خیالی اور بلند پروازی اور شکوہ الفاظ کی دل کھول کر داد دی ہے، لیکن انھی اوصاف میں مولوی محمد محسن کاکوروی جو ان سے کسی طرح کم نہیں، جن کے متعلق امیر مینائی کہتے ہیں کہ

"ان کا کلام ایک عالم ہے خیالاتِ نادرہ کا کہ اس کو دیکھ کر انسان حیران ہو جاتا ہے، اور ان کا ہر شعر معراج بلاغت ہے[1]!

ان کی نظمیں صبح تجلی، چراغ کعبہ اور سراپا وغیرہ کے بند پڑھے جائیں تو وہ نازک خیالی، مضمون آفرینی تشبیہات و استعارات کی تازگی اور لطیف تلمیحات میں کسی طرح سے انیس و دبیر سے کم نہیں، فرق یہ ہے کہ انھوں نے اپنی ساری ذہانت و محنت نعت نبوی اور مدح خیر المرسلین میں صرف کی، اور انیس و دبیر نے مرثیہ و منقبت، مصائب اہل بیت اور واقعۂ کربلا کے بیان کرنے میں جس سے آزاد کے دل کو زیادہ لگاؤ اور وابستگی تھی، اپنی ذہانت اور قوت شاعری صرف کی۔

اسی طرح سے آب حیات اپنے مصنف کے دور تک بھی اردو شاعری کے تمام عہدوں کے باکمال شعراء کے پورے تذکروں پر حاوی نہ تھی، اور بہت سے ایسے شعراء و اساتذہ نظر انداز ہو گئے، جو نظر انداز ہونے کے قابل نہ تھے۔

اسی طرح آزاد کی آخری زندگی اور اُن کی وفات کے بعد خواجہ الطاف حسین حالی، مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی، لسان العصر سید اکبر حسین الٰہ آبادی نے اردو شاعری میں ایک نیا رنگ اور نیا آہنگ پیدا کیا، خود مصنف آب حیات مولوی محمد حسین آزاد بھی اس کے مستحق تھے کہ ان کو اس بزم میں جگہ دی جائے، اور اردو شعراء کا تذکرہ جو ان کی وفات کے بعد لکھا گیا ہو، ان کے تذکرہ سے خالی نہ ہو، اس لیے ایک ایسی تصنیف کی ضرورت تھی جو اس کمی کو پورا کرے اور اس عہد تک کے لیے ایک جامع تذکرہ

---

[1] مقدمۂ مکتوبات امیر مینائی۔

کہلانے کی مستحق ہو۔

(۲) "آبِ حیات" میں متعدد تاریخی فروگذاشتیں پائی جاتی ہیں، اور بعض ایسے بیانات ہیں جن کی تصدیق ان اصل کتابوں سے نہیں ہوتی جن کا حوالہ دیا گیا ہے، اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ آزاد نے ان کے بارے میں سنی سنائی روایات پر یا اپنے حافظہ پر اعتماد کیا، اور کتاب کی تصنیف کے وقت اصل ماخذ کی طرف رجوع کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کی، یا ان کتابوں کے کسی شوشہ اور نقطہ کو اپنے گوہر بار قلم اور قوتِ متخیلہ سے بڑھا چڑھا کر کہیں سے کہیں پہونچا دیا، وہ زمانہ کتابوں کی کمیابی کا تھا، اس لیے کوئی حیرت و استعجاب کی بات نہیں کہ اردو کے بعض بنیادی تذکرے ان کی نظر سے نہ گذرے ہوں، مثلاً اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی ہے کہ میر تقی میر کا تذکرہ نکات الشعراء ان کی نظر سے نہیں گذرا، اور اس کے لیے آبِ حیات میں داخلی شہادتیں موجود ہیں، غالباً سب سے پہلے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی نے "نکات الشعراء" (جس کو انجمن ترقی اردو نے نظامی پریس بدایوں سے شایع کیا) کے مقدمہ میں اس کو وضاحت اور قوت کے ساتھ ظاہر کیا،[۱] اور آبِ حیات اور نکات الشعراء میں متعدد مقامات میں تضاد ظاہر کر کے آخر میں لکھا ہے:

"میری بدگمانی معاف ہو تو میں کہوں گا کہ نکات الشعراء آزاد کی نظر سے نہیں گذرا، قیاس کی بلند پروازی نے طوطی مینا بنا کر اڑائے ہیں اور ان کی سحر بیانی سے سامعین کو خوش کیا ہے"[۲]

یہاں اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

(۱) آزاد کہتے ہیں کہ "میر صاحب دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ یہ اردو کا پہلا تذکرہ ہے، اس میں ایک ہزار شاعروں کا حال لکھوں گا، مگر ان کو نہ لوں گا جن کے کلام سے دماغ پریشان ہو" دیباچہ میں کہیں نہیں ہے کہ اس میں ایک ہزار شاعروں کا تذکرہ لکھوں گا، یہ بھی نہیں ہے کہ ان کا ذکر نہیں لکھوں گا،

---

[۱] ملاحظہ ہو "آبِ حیات" اور نکات الشعراء، نکات الشعراء ص ۲۰ تا ۲۲ [۲] نکات الشعراء (مقدمہ) ص ۲۴۔

جن سے دماغ پریشان ہو۔ نکات الشعراء کے مطبوعہ نسخہ میں صرف ایک سو دو (۱۰۲) شعراء کا تذکرہ ہے۔

(۲) آزاد لکھتے ہیں کہ ان ہزار میں سے ایک بے چارہ بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا، نکات الشعراء کے مطالعہ سے اس کی بالکل تصدیق نہیں ہوتی، بلکہ اس کے خلاف ان کی فراخ دلی، صاف دلی اور وسیع المشربی کا برملا ثبوت ملتا ہے، وہ اعتراف کمال، تحسین سخن شناس کی روشن مثالوں سے بھرا ہوا ہے۔

(۳) آزاد نے لکھا ہے کہ ولی کو جو نوعِ شعراء کا آدم ہے' اس کے حق میں فرماتے ہیں؛

"وے شاعریست از شیطان مشہور تر" (آب حیات ص ۹۰، مطبوعہ مفید عام پریس ۱۹۰۷ء)

یہ فقرہ نکات الشعراء میں کہیں موجود نہیں، اس کے بجائے نکات الشعراء میں یہ الفاظ پائے جاتے ہیں؛ "از کمال شہرت احتیاج تعریف ندارد۔"

(۴) آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ میر صاحب نے میر سوز کو پاؤ شاعر مانا ہے، ایک خود، ایک مرزا رفیع، آدھے خواجہ میر درد، پاؤ میر سوز، مصنف گل رعنا لکھتے ہیں کہ یہ آزاد کی صرف بذلہ سنجی ہے، نکات الشعراء میں خواجہ میر درد اور میر سوز کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ اس کے بالکل برخلاف ہے، اسی طرح ان کے تخلص کے متعلق جو لطیفہ آب حیات میں ہے نکات الشعراء سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی، میر صاحب نے ان کے تخلص کی تبدیلی کے واقعہ کو متانت اور بزرگانہ انداز سے بیان کیا ہے۔

اسی طرح آزاد نے میر صاحب کی بد دماغی و نازک مزاجی کی جو تصویر کھینچی ہے' اور نواب سعادت علی خاں کا سامنا ہو جانے اور ان کی بے پرواہی اور بے نیازی کا جو نقشہ بیان کیا ہے، پھر خلعت بحال کرنے اور دعوت کا ایک ہزار روپیہ بھیجنے اور رد و کد کے بعد قبول کرنے کا جو واقعہ بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے' اس کی واقعات سے تصدیق نہیں ہوتی، مصنف گل رعنا نے میر صاحب کے ایک ہمعصر مرزا لطف علی کی کتاب "گلشن ہند" کے حوالہ سے ثابت کیا ہے کہ ان کا مشاہرہ کبھی موقوف نہیں ہوا' اور ۱۲۲۵ھ تک

ان کا یہی حال رہا۔ انھوں نے ثابت کیا ہے کہ ۱۲۱۵ھ میں جب میر صاحب کی تنخواہ جاری تھی، خود انشا اللہ خاں کی رسائی پہلی مرتبہ نواب سعادت علی خاں کے دربار میں ہوئی۔ اس لیے درانتہی بھی یہ واقعہ صحیح نہیں۔ انھوں نے ان تمام واقعات پر، جو میر صاحب کی طرف منسوب کیے گئے ہیں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

" حقیقت یہ ہے کہ آزاد نے میر صاحب کی جو تصویر آب حیات میں کھینچی ہے، وہ ان کے منھ پہ کھلتی نہیں۔ کچھ شبہ نہیں، میر صاحب نازک مزاج تھے، مگر آزاد نے جو واقعات لکھے ہیں، اگر آج وہ کسی میں پائے جائیں تو ہر شخص اس کو نازک مزاج نہیں "خود دماغ" دیکھے گا۔"[1]

آزاد کی واقفیت اودھ کی تاریخ سے زیادہ گہری اور وسیع نہیں، اور یہ کوئی قابل تعجب بات نہیں کہ اودھ کی تاریخ کا مواد ان کو نہ ملا ہو۔ اس لیے ان کے قلم سے بعض ایسی روایتیں نکل گئی ہیں، جو محض ناواقفیت اور سطحی معلومات پر مبنی ہیں۔ مصنف گل رعنا لکھتے ہیں :

" آزاد کہتے ہیں کہ (سودا) ۱۱۸۵ھ میں لکھنؤ پہونچے، نواب شجاع الدولہ نے بے تکلفی یا طنز سے کہا: مرزا! تمھاری وہ رباعی اب تک میرے دل پر نقش ہے۔ یہ پاس وضعداری پھر دربار نہ گئے۔ یہ سب افسانہ ہے۔ شجاع الدولہ فیض آباد میں رہتے تھے۔ لکھنؤ کی اس وقت ایک قصبہ سے زیادہ حیثیت نہ تھی۔ یہ بھی غلط ہے کہ وہ دلی سے براہ راست یہاں آئے۔ یہ بھی غلط ہے کہ سودا ایک بار کے سوا پھر دربار نہیں گئے۔ شجاع الدولہ جب تک جیتے رہے، یہ ان کی ملازمت میں رہے۔ ان کے کلیات میں متعدد قصیدے شجاع الدولہ کی تعریف میں موجود ہیں، مصحفی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "ہر جا کہ می رفت عزت و حرمت تمام می یافت، نواب مرحوم و مغفور نیز بودن او را در سرکار خود غنیمت می دانستند۔"[2]

---

[1] حاشیہ گل رعنا ص ۱۵۹ ۔ ۱۶۰ طبع چہارم [2] گل رعنا ص ۱۳۹، طبع چہارم۔

صرف نکات الشعراء ہی نہیں اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد کی نظر سے مصحفی کا تذکرہ بھی نہیں گذرا، یا کم سے کم آبِ حیات کی تصنیف کے وقت وہ پیش نظر نہیں تھا، انھوں نے سید انشا کے اس زمانہ کا نقشہ کھینچتے ہوئے جب اقبال نے ان سے منھ موڑ لیا تھا اور ان کے ولی نعمت (نواب سعادت علی خاں) کی نگاہیں ان سے پھر گئی تھیں، مرزا سعادت یار خان رنگین سے نقل کیا ہے کہ "تیسری بار گیا تو ان کو ایک مشاعرہ میں اس طرح دیکھا کہ ایک شخص میلی کچیلی روئی دار مرزئی پہنے، سر پر ایک میلا سا پھینٹا، گھٹنا پاؤں میں، گلے میں پٹکو کا تو بڑا ڈالے ایک لکڑ کا حقہ ہاتھ میں لیے آیا، تو بڑہ میں سے ایک کاغذ نکالا، غزل پڑھی اور کاغذ پھینک چل دیا" اس موقع پر آزاد نے انشا کی وہ غزل لکھی ہے جس کا مطلع ہے ؎

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

مصنف گل رعنا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"آزاد نے انشا کی وہ مشہور غزل اس جگہ نقل کی ہے جو اس موقع کے لیے نہایت موزوں ہے، اور اس کا ایک شعر یہ ہے :

نہ چھیڑ اے نکہتِ باد بہاری راہ لگ اپنی تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

مگر واضح رہے کہ یہ غزل انشا کی اس زمانہ کی تصنیف نہیں جو ان کے جنون اور بے چارگی کا زمانہ بیان کیا جاتا ہے۔ میں نے اس غزل کے چند اشعار تذکرۂ مصحفی میں پڑھے ہیں جو اس زمانہ میں لکھا گیا ہے جس وقت انشا لکھنؤ پہونچے بھی نہ تھے، مصحفی نے تذکرہ میں وہاں تک کا حال لکھا ہے کہ مرشدآباد سے دلی آچکے ہیں اور مرزا عظیم بیگ وغیرہ شعرائے دلی سے معرکے در پیش تھے"[1]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں :

---

[1] حاشیہ گل رعنا ص ۲۶۲، طبع چہارم۔

آزاد نے انشا کے مجنون ہو جانے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کی ایسی دردانگیز تصویر کھینچی ہے کہ اس کو انھی کے الفاظ میں پڑھو تو دل بے قابو ہو جاتا ہے، اور حقیقت میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آزاد کی نری جادو طرازی ہے، حیات میر کے مصنف نے مرزا اوج کی زبانی لکھا ہے جو میر انشا کے نواسے تھے کہ سید انشا نہ مجنون ہوئے، نہ ان کی تنخواہ بند ہوئی، صرف اتنا صحیح ہے کہ نواب سعادت علی خان نے حکم دے دیا تھا کہ دربار کے سوا اور کہیں نہ آئیں جائیں، اور دربار بھی اس وقت حاضر ہوں جب ان کو بلایا جائے، انشا نے اس حبس بے جا کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

بدون حکم وزیر الممالک اے آصف ۔۔۔ چساں کنم حرکت نوکری ست یا بازیست[1]

یہ ان چند تاریخی فروگذاشتوں اور غیر محتاط یا مبالغہ آمیز تصویر کشی کی چند مثالیں ہیں جو آب حیات کے صاف آئینہ پر دھبہ کی طرح نمایاں ہوتی ہیں، اور ان کی تحقیق اور اصل واقعہ کا اظہار ہر اس دیانتدار مورخ کا فرض تھا جو اس موضوع پر آزاد کے بعد قلم اٹھاتا، اور ہمارے علم میں گل رعنا میں سب سے پہلے اس فرض کو انجام دینے کی کوشش کی گئی۔

(۳) آب حیات میں اساتذۂ سخن کے تذکرے، ان کے محاسن و کمالات کا اعتراف و اظہار اور ان کے مرتبہ و مقام کے تعین نیز بعض ہمعصر اور باہم دگر مقابل شعراء کے موازنہ کے بارے میں کچھ ایسی خامیاں پائی جاتی ہیں جن کو ہم اگر آزاد کے احترام اور ان کے فضل و کمال کے اعتراف میں "ناانصافیاں" نہ کہیں تو "ناہمواریاں" ضرور کہہ سکتے ہیں، متعدد مقامات پر ان کے مذہبی جذبات یا ذاتی تعلقات غیر جانبدارانہ تاریخ نویسی کے تقاضوں پر غالب آ گئے ہیں، اس بے اعتدالی کا سب سے زیادہ احساس مرزا مظہر جان جاناں کے تذکرہ کے موقع پر ہوتا ہے، مرزا صاحب ہندوستان کی ان

---

[1] گل رعنا ص ۲۶۲، طبع چہارم۔

باکمال شخصیتوں میں ہیں جن کے وجود پر اس سرزمین کو فخر ہے، بہت سے اہل بصیرت کے نزدیک سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ میں مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے بعد ان کے پایہ کا بزرگ نظر نہیں آتا، ان کے نامور اور صاحبِ نظر معاصر حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ دہلوی جو خود یگانۂ روزگار تھے، ان کے متعلق لکھتے ہیں:

"ہمارے اس دور میں ان ملکوں میں (جن سے ہم واقف ہیں) کسی ملک میں ان کا ہم سر پایا نہیں جاتا اور ماضی اور بزرگان سلف میں اس کا سراغ لگ سکتا ہے، بلکہ سچ پوچھو تو ہر زمانہ میں ایسے بزرگ زیادہ تعداد میں پائے نہیں جاتے، چہ جائیکہ ایسے زمانہ میں جو فتنہ و فساد سے پُر ہے۔"[1]

آزاد نے ان کے تذکرہ میں نہ صرف ان کے مرتبہ و مقام کا لحاظ نہیں رکھا، بلکہ ان ہزاروں، لاکھوں مسلمانوں کے جذبات کا بھی احترام نہیں کیا جو ان کے عقیدت مند اور حلقہ بگوش تھے، اول تو ان کی نازک مزاجی کو اس انداز سے پیش کیا جس سے نہ صرف ان کی غیر واقعی تصویر نگاہوں کے سامنے آتی ہے، بلکہ میر صاحب سے بھی کچھ آگے بڑھ کر وہ ایک نہایت تنک مزاج، مغلوب الغضب اور غیر معتدل انسان کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں، اس میں آزاد نے صرف رنگ آمیزی ہی سے کام نہیں لیا، بلکہ اس میں مذہبی جذبات کی بھی (جو افسوس ہے کہ اکثر حقائق پر پردہ ڈال دیتے ہیں) جھلک پیدا ہو گئی ہے، پھر ان کی طرف بعض ایسے واقعات منسوب کیے ہیں جو ان کے مرتبہ کے دینی پیشوا اور مقتدائے خلائق سے قطع نظر ایک خوش وضع اور ثقہ آدمی کے مرتبہ سے بھی مناسبت نہیں رکھتے۔

مصنف گل رعنا نے جو آزاد کے برخلاف تصوف و صوفیہ کی تاریخ ان کے مزاج و مذاق سے زیادہ آشنا اور مراتب رجال سے زیادہ واقف ہیں اور جن کو براہ راست مرزا صاحب کے افادات و تحقیقات، ان کے علوم عالیہ و مضامین نادرہ پڑھنے اور ان کے متعلق ان کے معاصرین کی

---

[1] کلمات طیبات ص ۱۶۴ - ۱۶۵۔

شہادتوں سے واقف ہونے کا موقع ملا ہے، اس طرزِ نگارش پر احتجاج آمیز تنقید کی ہے، جو انھی کی نہیں ان لاکھوں مسلمانوں کے دلی جذبات کی ترجمانی ہے جو مرزا صاحب کے ہم عقیدہ اور عقیدت مند ہیں۔ وہ مرزا صاحب کے حالات و کمالات کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"افسوس ہے کہ شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد نے حسبِ معمول ان کے حالات بیان کرنے میں چٹکیاں لی ہیں، کہیں واقعہ کی صورت ایسی بنائی ہے جس سے بجائے مدح کے ذم کا پہلو نکلتا ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "ان کے باب میں بہت سے لطائف ایسے مشہور ہیں کہ اگر آج کسی میں پائے جائیں تو زمانہ کے لوگ اچھا نہ سمجھیں کچھ تو اس اعتقاد سے کہ خطائے بزرگاں گرفتن خطا است اور کچھ میں روسیاہ بزرگوں کی ہر بات کو چشمِ عقیدت کا سرمہ سمجھتا ہوں"...الخ (ص ۱۳۸) تاباں کا حال جیسا چٹکا کر لکھا ہے، اور سرگوشیوں کا فسانہ جس طرح بیان کیا ہے، وہ بھی ملاحظہ طلب ہے، (ص ۱۳۹) شعر مندرجہ (ص ۱۰۴) کو پڑھیے، پھر مرزا صاحب جیسے مہذب کو اور آزاد کی معذرت کو دیکھئے، فرماتے ہیں کہ "تہذیب آنکھ دکھاتی ہے، مگر کیا کیجیے ایشیا کی شاعری کا کہتی ہے کہ یہ میر کا صفائی زبان اور طراری کا نمک ہے"۔(ص ۱۴۰) مرزا رفیع سودا کی ہجو پر حاشیہ چڑھاتے ہیں کہ ایک دھوبن گھر میں ڈال لی تھی"۔[1] (ص ۱۴۲)

اس کے بعد ان واقعات کی حقیقت بیان کرتے ہوئے جو آزاد نے دوسرے رنگ سے بیان کیے ہیں، اور یہ ثابت کرنے کے بعد کہ واقعات کو غلط شکل میں پیش کیا گیا ہے، لکھتے ہیں:

"اصل یہ ہے کہ مولانا آزاد نے مرزا صاحب کو آبِ حیات میں ناخواستہ طبیعت جگہ دی ہے، جیسا کہ ان کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے، وہ جوش و خروش اور کثرتِ کلام ڈھونڈتے ہیں، جو یہاں نہیں ملتا۔[2]"

---

[1] گلِ رعنا ص ۱۳۹ - ۱۴۰ [2] ایضاً ص ۱۴۱

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

"یہاں تو نہیں، مگر میر ضاحکؔ اور میر خلیقؔ کے بیاں کیا ل گیا، میر ضاحکؔ کا ایک شعر اور میر خلیقؔ کے دو شعر ہاتھ آئے، مگر ان کے حالات لکھنے کی بے چینی ملاحظہ ہو' میر ضاحکؔ کے حالات میں فرماتے ہیں" ابتدا سے دل چاہتا تھا کہ اس خانوادۂ سیادت کا سلسلہ مسلسل لکھوں، مگر پھول نہ ہاتھ آئے جو لڑی پروتا...... اب کہ طبع ثانی کا موقع ہے' آرزوئے قدیم پھر دل میں لہرائی، ناچار برسوں کے سوکھے مرجھائے پھول دلِ افسردہ کے طاق میں پڑے ہوئے تھے، انھیں کا سہرا بنا کر ساداتِ عظام کے روضوں پر چڑھاتا ہوں" (آبِ حیات ص ۱۹۷)۔[1]

اس کے بعد وہ مرزا صاحب کے بارے میں میرؔ صاحب اور مصحفیؔ جیسے نقادِ سخن کی شہادتیں اور اعتراضات نقل کرتے ہیں، اور ان کے کلام پر تبصرہ کرتے ہیں، اسی افسردگی اور بے دلی کی وجہ سے آزادؔ نے مرزا صاحب کے صرف بیس[2] اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے ہیں' مصنف گل رعنا نے ان کے کلام کا زیادہ سے زیادہ نمونہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے' اور غالباً مرزا صاحب کے اتنے اردو اشعار یکجا کسی تذکرہ میں نہیں آئے ہیں، یہ تعداد میں اکتالیس[3] ہیں۔

مصحفیؔ اور انشاؔ کے تقابل میں پھر یہی اندرونی جذبہ ابھر کر سامنے آگیا ہے، آزادؔ سے نقاد، سخن فہم اور اردو شاعری کے اداشناس اور مزاج داں سے بالکل اس کی توقع نہیں تھی کہ وہ مصحفیؔ جیسے مسلم الثبوت استاد اور صاحبِ طرز شاعر پر جن کے کمالات و فتوحات کی سرحدیں بارہا میرؔ اور سوداؔ کی سرحدوں سے مل گئی ہیں، اور ان کے بعض اشعار صرف اردو شاعری میں نہیں' بلکہ مطلق شاعری کی تاریخ اور اس کے منتخب اشعار میں جگہ پانے کے مستحق ہیں، سید انشاؔ کو ترجیح دیں گے، جن کے متعلق دورِ آخر کے سب سے بڑے مبصر نواب مصطفےٰ خاں شیفتہؔ نے بجا طور پر لکھا ہے کہ "ایں مصنف را بطریقہ شعراء

---

[1] حاشیہ گل رعنا ص ۱۳۱

نہ گفتہ بہ" اور جن کے متعلق خود انھوں نے لکھا ہے کہ "ان کی بے اعتدالیاں کچھ جہالت کا سبب نہ تھیں بلکہ عمداً تھیں یلبے پروائی کی وجہ سے تھیں کہ اپنی طبع وقاد اور جامعیت استعداد کے سامنے قواعد اور اہل قواعد کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔" آگے لکھتے ہیں کہ "انھوں نے الفاظ اور محاورات میں بہت سے تصرف کیے، یہ تصرف اگر صرف محدود مقاموں میں ہوتے تو شکایتیں نہ ہوتیں، کیونکہ اس زبان آور سے زیادہ قادر زبان اور زبان داں کون ہے؟ خصوصاً جب کہ استعداد علمی سے مسلح ہو، لیکن افراط نے ہمیں بھی خاموش کر دیا ہے[1]۔"

آخر وہی ہوا کہ زمانہ نے جس کے متعلق انھوں نے بلیغ انداز میں لکھا ہے کہ "وقت حاکم جابر ہے اور پسند عام اس کا واضع قانون ہے۔" اپنا فیصلہ صادر کر دیا، سید انشا کی ہنگامہ خیزیاں، بزم آرائیاں اور بذلہ سنجیاں ان کے ساتھ گئیں، اور ان کے کلام کا بیشتر حصہ بھی..... اپنے ساتھ لے گئیں، مصحفی کا کلام باقی ہے اور زمانہ جتنا گذرتا جاتا ہے اس کی آب و تاب بڑھتی جا رہی ہے، اور تحقیق و تحسین کے نئے نئے گوشے پیدا ہوتے جا رہے ہیں، آب حیات کا یہ حصہ جس میں ان دونوں کا محاکمہ ہے اور لکھنؤ کی معرکہ آرائیوں کی موئے قلم سے تصویر کھینچی گئی ہے، ان کے ذاتی رجحان اور اندرونی جذبہ کی صرف غمازی نہیں آئینہ داری کرتا ہے، جو آزاد جیسے بے لاگ جوہری کے شایان شان نہیں۔

اسی طرح صرف مرزا مظہر جان جاناں ہی نہیں مومن خاں جیسے استاد کا تذکرہ بھی جو ایک مستقل دبستان کے بانی اور مسلم الثبوت استاد ہیں، انھوں نے بادل ناخواستہ اور غالباً لوگوں کے توجہ دلانے سے کیا ہے، چنانچہ آب حیات کے پہلے ایڈیشن میں..... مومن خاں کا تذکرہ نہ تھا، اس کی انھوں نے بعد کے ایڈیشن میں جو تاویل کی ہے وہ نظر میں جچتی نہیں، مومن خاں جیسے نامور شاعر کے

---

[1] آب حیات ص ۳۰۳ - ۳۰۴، مطبع کریمی لاہور۔

اتنے حالات بھی آزاد کو نہ ملیں (جس نے ان کا زمانہ دیکھا اور ان کی مجلسوں میں شریک ہوا) جس سے اتنا تذکرہ بھی مرتب کیا جا سکے جتنا کم سے کم میر ضاحک اور میر خلیق کا آیا ہے، سمجھ میں نہیں آتا۔ پھر تمہید کی سطریں بتاتی ہیں کہ انھیں مومن خاں کو ذوق و غالب کی بزم میں لانے اور ان کی صف میں بٹھانے میں تامل ہے، وہ لکھتے ہیں:

"پہلی دفعہ اس نسخہ میں مومن خاں صاحب کا حال نہ لکھا گیا، وجہ یہ تھی کہ دورِ پنجم .... جس سے ان کا تعلق ہے، بلکہ دورِ سوم و چہارم کو بھی اہلِ نظر دیکھیں کہ جو اہلِ کمال اس میں بیٹھے ہیں، کس لباس و سامان کے ساتھ ہیں، کسی مجلس میں بیٹھا ہوا انسان جبھی زیب دیتا ہے کہ اسی سامان و شان اور وضع و لباس کے ساتھ ہو جو اہلِ محفل کے لیے حاصل ہے، نہ ہو تو ناموزوں معلوم ہوتا ہے[1]۔"

لیکن پھر زمانے نے دوبارہ اپنا حاکمانہ فرمان صادر کیا اور ذوق اور معلوم نہیں کتنے شعراء کے بجائے جن کا آزاد نے آب و تاب کے ساتھ ذکر کیا ہے، مومن خاں کو اہلِ ذوق اور اہلِ تحقیق کی توجہات کا مرکز بنا دیا، اور ان کے کلام کو ایک نئی زندگی اور تابانی عطا کی۔

غالب کے تذکرہ میں انھوں نے بے ضرورت ایسے لطیفے لکھے جس سے ان کے اثنا عشری .... رجحان کا اظہار اور صحابۂ کرامؓ پہ طنز ہوتا ہے[2]، اس کے مقابلہ میں استاد ذوق کا مذہب بیان کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے، لکھتے ہیں:

"علماء اور اساتذۂ سلف کو ہمیشہ باادب یاد کرتے تھے اور کبھی ان پر طعن و تشنیع نہ کرتے تھے، اس واسطے ان کے مذہب کا حال کسی پر نہ کھلا[3]۔"

اپنے استاد و مربی سے عقیدت حسنِ فطرت اور شرافت کا جوہر ہے، آزاد نے اپنے استاد کے حالات کو جس شیفتگی، دلی شغف اور ان کے کمالاتِ شاعری کو جس جوش و خروش کے ساتھ بیان کیا ہے

---

۱ آبِ حیات ص ۴۲۰ ۲ ملاحظہ ہو آبِ حیات ص ۵۲۸ ـ ۵۲۹ ـ ۵۳۰ ۳ آبِ حیات ص ۴۶۷۔

اس پر وہ قابلِ ملامت یا مستحق شکایت نہیں، بلکہ تعریف و اعتراف کے مستحق ہیں، لیکن جب یہ چیز حدود سے آگے بڑھ جاتی ہے، اور ایک کی حق شناسی کے ساتھ دوسرے کی حق تلفی شامل ہوجاتی ہے تو ضرور قابلِ شکایت ہے، آزاد نے بہادر شاہ ظفر کے کلام کے متعلق جو رائے دی ہے، اور اس کو جس طرح استادی کے پلّہ میں ڈال دیا ہے اس سے خود استاد کی روح خوش نہ ہوگی اور کلام کا فرق سمجھنے والا اس میں شاعر کی زندگی اور واردات کا عکس دیکھنے والا مطمئن نہیں ہوگا، آزاد لکھتے ہیں:

"بادشاہ کے چار دیوان ہیں، پہلے کچھ غزلیں شاہ نصیر کی اصلاحی ہیں، کچھ میر کاظم حسین بے قرار کی ہیں، غرض پہلا دیوان نصف سے زیادہ اور باقی تین دیوان سرتا پا حضرت مرحوم کے ہیں، جن سنگلاخ زمینوں پر قلم چلنا مشکل ہے، ان کا نظام و سرانجام اس خوبصورتی سے کیا ہے کہ دل شگفتہ ہوتے ہیں، والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ بادشاہ تمہارا زمین کا بادشاہ ہے، طرحیں خوب نکالتا ہے، اگر تم سرسبز کرتے ہو ورنہ شور زار ہوجائے، مسودۂ خاص میں کوئی شعر پورا، کوئی ڈیڑھ مصرع، کوئی ایک، کوئی آدھا مصرع، فقط بحر اور ردیف و قافیہ باقی بنجر، یہ ان ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھا کر حسن و عشق کی پتلیاں بنا دیتے تھے"[1]

مصنف گل رعنا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہندوستان کی سلطنت دادا کے وقت میں جا چکی تھی، ایک وظیفہ خوار کی حیثیت سے برائے نام بادشاہ رہ گئے تھے، اور ان کی حکومت دہلی میں قلعۂ معلّٰی کی چار دیواری کے اندر سمٹ کر رہ گئی تھی لیکن اقلیمِ سخن کی فرماں روائی دادا سے ترکہ میں ملی تھی، اور اردوئے معلّٰی ان کے زیرنگیں تھا، افسوس ہے کہ وہ بھی مولوی محمد حسین آزاد نے ظفر سے چھین کر استاد ذوق کو بخش دی۔

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دلِ ما را — بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را"[2]

---

[1] آب حیات ص ۴۹۱ [2] گل رعنا ص ۲۹۰۔

پھر آگے اس کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں :

"لطف یہ ہے کہ چاروں دیوان اس بدنصیب بادشاہ کے چھپ چکے ہیں، اور حضرت ذوقؔ کا بھی تھوڑا بہت جو کچھ کلام مل سکا ہے، وہ ایک دیوان کی شکل میں شایع ہو چکا ہے۔ ان دونوں کو پڑھو، اور ہر ایک کے اندازِ سخن پر غور کرو، پھر اپنی فطرتِ سلیم سے فتویٰ لو، دونوں کی حیثیتیں جداگانہ نظر آئیں گی، ذوقؔ پھر بھی ذوقؔ ہیں، ظفرؔ کے استاد، ان کے کلام کی رنگینی، ترکیب کی چستی، مضمون کی بندش، جوش و خروش، ان کی باتیں ان کے ساتھ ہیں، ظفرؔ کے ہاں جو سامان نظر آئے گا، وہ اس سے ملتا جلتا ہوگا، اور ہونا بھی چاہیے، کیونکہ استاد کا رنگ شاگرد میں آنا ضرور ہے، مگر پھر بھی وہ دوسری طرح کا ہوگا، محاوروں کی فراوانی یہاں زیادہ ملے گی، مگر جوش و خروش کی جگہ دل و جگر کے ٹکڑے حروف و الفاظ بن کر آنسوؤں کی سیاہی اور آہِ جگر دوز کے قلم سے لکھے ہوئے تم کو ملیں گے، اب چاہے ظفرؔ کا سمجھو یا ذوقؔ کا۔[1]"

اسی طرح ان کو اس سے بھی اختلاف ہے کہ نواب الٰہی بخش خان معروفؔ کا کلام استاد ذوقؔ ہی کی شاعری کا کارنامہ ہے، وہ لکھتے ہیں :

"آزادؔ نے 'آبِ حیات' میں جس طرح ظفرؔ مرحوم کی کاوشِ فکر پر پانی پھیرا ہے، ان کے بھی نتایجِ فکر کو اپنے استاد ذوقؔ کے دامنِ کمال سے وابستہ کر دیا ہے، باوجودیکہ اس کہنہ مشق شاعر کی عمر اس وقت چھیاسٹھ[66] برس کی تھی، اور ذوقؔ بمشکل اٹھارہ برس کے رہے ہوں گے، مگر جوشِ عقیدت میں اس کا خیال نہیں رہا۔[2]"

ان فروگذاشتوں اور ناہمواریوں کے باوجود آبِ حیات کی "انفرادیت" قائم تھی، اور رہے گی اور اس کی ادبی قدر و قیمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، ضرورت اس کی تھی کہ اس کے اس تاریخی حصہ کو

---

1. گلِ رعنا ص ۲۹۰ طبع چہارم 2. حاشیہ گلِ رعنا ص ۲۰۰، طبع چہارم۔

مکمل کر دیا جائے، اور اس کی ان غلطیوں کی نشاندہی کر دی جائے جو مصنف کی ادبی افتادِ طبع، یا اس وجہ سے پیدا ہوئیں کہ مصنف کی ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ پر وسیع اور گہری نظر نہ تھی اور وہ اس کے بعض شعبوں (مثلاً تصوف و سلوک، علماء و مشایخ کے حالات، ملفوظات و مخطوطات) کا رمز شناس اور خصوصی طالبِ علم نہیں رہا تھا۔

مولانا سید عبدالحیؒ صاحب نے اپنی عربی تصنیفات نزہۃ الخواطر، معارف العوارف[2] اور جنۃ المشرق[3] کی تالیف و ترتیب کے سلسلہ میں ہندوستان کی سیاسی، تمدنی، علمی اور ادبی تاریخ کا وسیع مطالعہ کیا تھا، اور اس ضرورت سے انھوں نے سیکڑوں متعلق اور غیر متعلق کتابیں اور ہزارہا صفحات پڑھے تھے، ان میں بلا ارادہ بہت سا مواد ان کی نظر سے گزرا جس سے اردو زبان کے آغاز، اس کی شعر و شاعری کی تاریخ اور اردو شعراء کے حالاتِ زندگی اور ان کے کمالات پر روشنی پڑتی تھی، اور ان سے اردو زبان و شاعری کی تاریخ اور شعراء کا تذکرہ مرتب کرنے میں بیش قیمت مدد ملتی تھی، بہت سے نظریات جو اس وقت تک مشہور و مقبول تھے تردید ہوتی تھی، اور بہت سے

---

[1] نزہۃ الخواطر پہلی صدی ہجری سے لے کر مصنف کے عہد تک کی ممتاز ہندوستانی شخصیتوں کے تذکرہ پر مشتمل ہے، اس کی آٹھ جلدیں ہیں، دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد کی طرف سے اس کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ [2] معارف العوارف یہ ہندوستان کے اسلامی عہد کی علمی تصنیفی، تعلیمی تاریخ اور ہندوستانی مصنفین و تصنیفات کی ڈائرکٹری ہے، دمشق کی مشہور و اکیڈمی المجمع العلمی العربی کی طرف سے الثقافۃ الاسلامیۃ فی الھند کے نام سے شائع ہو چکا ہے، دار المصنفین کی طرف سے اس کا اردو ترجمہ "اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ [3] یہ کتاب ہندوستان کے اسلامی عہد کا مرقع ہے، دائرۃ المعارف حیدر آباد کی طرف سے الھند فی العہد الاسلامی کے نام سے، اردو میں "ہندوستان اسلامی عہد میں" اور انگریزی میں India During Muslim Rule کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

نئے حقائق سامنے آتے تھے، آب حیات میں جس کا مطالعہ انھوں نے اس کی اشاعت کے بعد ہی کر لیا ہوگا بہت سی چیزیں ان کے تاریخی ذوق کو کھٹکیں اور ان کی موافقانہ نظر میں چبھی ہوں گی، اس لیے اس کا داعیہ پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا کہ وہ اس موضوع پر قلم اٹھائیں اور ان اغلاط کی تصحیح کریں جو نادانستہ آب حیات میں آ گئی ہیں، اور یہ حق کسی صاحب قلم اور صاحب نظر سے چھینا نہیں جا سکتا۔

شاید ان کو اس کام کی تکمیل میں دیر لگتی، یا عربی تصنیفات کی تکمیل کا کام اور زندگی کے دوسرے مشاغل اس کی مہلت نہ دیتے کہ ۱۳۳۹ھ (مطابق ۱۹۲۱ء) میں وجع مفاصل کا ان پر حملہ ہوا، اور نقل و حرکت ان کو دشوار ہو گئی، مریضوں کو دیکھنا، مطب میں جانا، ندوۃ العلماء کے جلسوں میں شرکت سب ناممکن ہو گئی، تصنیفی و تحریری کام ان کی طبیعت ثانیہ بن گیا تھا اور وہ یکسر بیکار و معطل نہیں رہ سکتے تھے اس حالت میں وقت گذاری اور تفریح کے لیے ان کو اپنی پرانی بیاض یاد آئی، اس کو نکالا تو معلوم ہوا کہ مشہور مشہور شاعروں کا کلام اس میں اتنا جمع ہو چکا ہے کہ اگر اس کو ترتیب دے کر شایع کر دیا جائے تو پڑھنے والوں کو اس سے دلچسپی ہو سکتی ہے، اس کے ساتھ خیال ہوا کہ جن کا کلام ہو ان کے مختصر مختصر حالات بھی لکھ دیے جائیں، تذکرے جمع کیے اور کام شروع کیا، بات میں بات نکلتی آئی اور وہ ایک خاصی کتاب بن گئی۔[1]

یہ گل رعنا کی تصنیف کی مختصر کہانی ہے، جو مصنف نے اس کتاب کی شان ورود کے سلسلہ میں خود سنائی ہے، اس کتاب کا مسودہ انھوں نے مولانا سید سلیمان ندویؒ ناظم دار المصنفین کے پاس بھیج دیا جن سے ان کو عزیزانہ تعلق تھا، اس عرصہ میں ان کی وفات ہو گئی اور وہ کتاب کو مطبوعہ شکل میں نہ دیکھ سکے، غالباً جمادی الاولیٰ ۱۳۴۳ھ میں یہ کتاب دار المصنفین سے چھپ کر شایع ہوئی، اس لیے کہ جمادی الثانی ۱۳۴۳ھ، جنوری ۱۹۲۵ء کے "معارف" کے شذرات میں جو مولانا عبدالسلام صاحب ندوی مرحوم کے

---

[1] پیش لفظ مصنف گل رعنا ص ۳ طبع چہارم

قلم سے ہیں، پہلی مرتبہ اس کتاب کا تعارف اور اس کی طباعت کا اعلان نظر آیا، اس وقت ان کے بہت سے دوستوں اور شناساؤں کے لیے یہ انکشاف تھا کہ ان کو اس موضوع سے اس درجہ کا ذوق اور واقفیت ہے کہ اس موضوع پر ان کے قلم سے ایک ایسی وقیع تصنیف نکل سکتی ہے، رسالہ اردو (انجمن ترقی اردو اورنگ آباد) کے ذی الحجہ ۱۳۴۳ھ، جولائی ۱۹۲۵ء کے شمارہ میں اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے یہ صحیح لکھا:

"جو لوگ مولانا مرحوم سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے، انھیں ممکن ہے کہ اس کا علم ہو، ورنہ عام طور پر لوگ اس سے لاعلم تھے کہ مولانا مرحوم اردو زبان وادب کا ایسا اچھا ذوق رکھتے ہیں اور ایسا خیال کچھ بیجا بھی نہ تھا کیونکہ مولوی صاحبان نے عموماً اردو زبان کی طرف سے غفلت برتی ہے[1]۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادبی ذوق مولانا کو اپنے والد ماجد سے ارثاً ملا ہے، جو اردو فارسی کے اچھے شاعر تھے، اور جن کا حال اور کلام کا نمونہ انھوں نے کتاب کے آخر میں دیا ہے[2]"

کسی تصنیفی کاوش کو اس زمانہ کے حدود، ماحول اور مصنف کے مقرر کیے ہوئے پیمانہ اور اس کے تصنیفی منصوبہ سے علیٰحدہ کرکے کسی دوسرے زمانہ کے حدود و ماحول میں رکھ کر اس زمانہ کے معیاروں، اصطلاحوں اور مقرر کردہ اصولوں سے جانچنا اور ناپنا صحیح نہیں ہوتا، مصنف ادب و شاعری کے ان تنقیدی اصولوں سے واقفیت نہیں رکھتے تھے، جو بیسویں صدی کے وسط میں مغربی ممالک میں مدون کیے گئے، اور صدیوں کی کاوشوں کے بعد انھوں نے ارتقا کے منازل طے کیے، ان میں بھی ایک بڑا حصہ وہ ہے جو مغربی ماحول و معاشرہ کی آب و ہوا، مخصوص سیاسی و تمدنی عوامل کا نتیجہ اور

---

[1] پچھلے دور کے فضلائے مدارس کے متعلق تو یہ کہنا کسی حد تک صحیح ہوگا، لیکن ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد تک کے علماء پر یہ الزام صحیح نہیں، جیسا کہ ہم نے اس مضمون کے آغاز میں ذکر کیا ہے۔ [2] رسالۂ اردو بابت جولائی ۱۹۲۵ء، ص ۵۰۷۔

مغربی زبانوں اور ان کے ادب و شاعری کے مخصوص مزاج سے تعلق رکھتا ہے، اور مشرقی زبانوں اور ان کے ادب و شاعری پر جوں کا توں ان کا انطباق نہیں کیا جا سکتا، مصنف گل رعنا نے کہیں بھی اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ یہ کتاب تنقید کا اعلیٰ نمونہ ہے، اور اس میں وہ تنقید کے اعلیٰ معیاروں کی پیروی کریں گے جو اس وقت تک دریافت ہو چکے ہیں، انھوں نے پوری حقیقت پسندی اور سادگی کے ساتھ اس کتاب کی ترتیب کے محرکات و دواعی اور اس تصنیف کے اغراض و مقاصد اور اس کے پیمانہ اور رتبہ کا اپنے پیش لفظ میں اظہار کر دیا ہے، انھوں نے اردو زبان و ادب اور شاعری کی تاریخ کے طالب علموں کو اس کتاب کے ذریعہ بہت سی نئی معلومات دی ہیں، متعدد نئے ماخذوں کی طرف توجہ دلائی ہے، اردو زبان اور شاعری کے آغاز کو وہ آب حیات اور دوسرے قدیم تذکروں سے کئی قدم پیچھے لے گئے ہیں جب دکن و گجرات میں صوفیائے کرام کے ذریعہ اس عام فہم بولی کا اور سلاطین دکن اور ان کے عہد کے شعراء کے ذریعہ اس مرغوب طبع شاعری کا آغاز ہو گیا تھا، انھوں نے بہت سی تاریخی غلطیوں کی تصحیح کی اور بقول ڈاکٹر مولوی عبد الحق صاحب:

> "ہر شاعر کے کلام سے نمونہ بھی دیا گیا ہے، جس سے فاضل مؤلف کی وسعت نظر کا ثبوت ملتا ہے، اگرچہ زبان و شعراء کے کلام پر اعلیٰ تنقید کا حق ادا نہیں کیا گیا، تاہم ہر شاعر کے کلام پر بہت ہی منصفانہ رائے کا اظہار کیا گیا ہے[1]"

کتاب میں مفید حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے جو بہت معلومات افزا، دلچسپ، اور ان کی اردو انشاپردازی اور سیرت نگاری کا عمدہ نمونہ ہیں، چونکہ ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ اور تراجم رجال ان کا خاص موضوع رہا ہے، اور نزہۃ الخواطر جیسی کتاب ان کے قلم سے نکل چکی ہے، اس لیے ان حواشی میں تاریخ کے طالب علموں کو بہت سی نئی معلومات اور ضخیم کتابوں کا عطر مل جاتا ہے، اودھ چونکہ ان کا وطن ہے اور

---

[1] رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۵ء

اس کی تاریخ کا انھوں نے بنظر غائر مطالعہ کیا ہے، اس لیے اس صوبہ سے تعلق رکھنے والی شخصیتوں پر انھوں نے جو حواشی لکھے ہیں، وہ بہت پُر از معلومات اور مبصرانہ ہیں، اور ان میں ان شخصیتوں کی صحیح تصویر کشی اور سلطنت اودھ کے عہد کی بولتی ہوئی تصویر آ گئی ہے، علم کی سچی پیاس اور اپنی زبان سے بے لوث محبت کا ہمیشہ سے یہ خاصہ رہا ہے کہ اگر ہزاروں صفحات کی ورق گردانی سے کام کی کوئی ایک چیز ہاتھ آجائے تو اس کو آنکھوں سے لگایا جاتا ہے، اور دل میں جگہ دی جاتی ہے، اور اگر کوئی اجنبی اور بیگانہ بھی راستہ گذرتے کوئی ایسی صدا لگا دیتا ہے جس سے منزل مقصود کی دریافت، یا گوہر مقصود کے حصول میں ادنیٰ سی مدد ملتی ہے تو اس کو ہزار بار شکریہ کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے، علم و ادب کی ترقی ہر زبان و ادب اور ہر ملک و ملت میں ان سب لوگوں کی رہین منت ہے جنھوں نے اس کے خرمن میں ایک دانہ کا بھی اضافہ کیا، یا اس کے گیسو سنوارنے یا گرد و غبار اور خس و خاشاک دور کرنے میں ہاتھ کا بھی اشارہ کیا، خود مغربی ممالک کے ادب و زبان اور فن تنقید کی تاریخ تشکر و ممنونیت اور اقرار و اعتراف کے ان شریفانہ نمونوں سے لبریز ہے جس کی تقلید و پیروی ہمارے مشرقی ممالک کے لیے معراج کمال اور ہمارے ادیبوں اور ناقدوں کے لیے سدرۃ المنتہیٰ بنی ہوئی ہے۔

اردو میں آب حیات کے بعد کوئی ایسا مسلسل و مکمل شستہ و شایستہ تذکرہ موجود نہیں تھا جو سلجھے ہوئے انداز اور سادہ اور شیریں زبان میں اردو شعراء کے متعلق ایک متوسط درجہ کے طالب علم اور شایق فن کو بنیادی اور ضروری معلومات مہیا کرتا ہو، اس لیے جیسے ہی گل رعنا ملک کے موقر علمی ادارہ دار المصنفین سے شایع ہوئی وہ ہاتھوں ہاتھ لی گئی، ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں کے اعلیٰ اردو نصاب میں داخل کی گئی، اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں، اور ہندوستان و پاکستان میں یکساں طریقہ پر ایک اہم نصابی کتاب اور وقیع علمی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے، اور مسرت کی بات ہے کہ اب خود دار المصنفین کی طرف سے اس کا پانچواں ایڈیشن شایع ہو رہا ہے۔

سر ہملٹن الیگزنڈر روسکین گب

(۱۸۹۵ء تا ۱۹۷۱ء)

از

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، جامعہ ملیہ دہلی

مشرق کے مذاہب اور تہذیب و تمدن کے مطالعہ کے لیے مستشرقین نے جو کوششیں کی ہیں، ان کے مقام و مرتبہ کا ہمیں احساس ہے، اس میدان میں ان کی کاوشوں نے استشراق کو علم کا ایک ممتاز و وقیع شعبہ یعنی ایک مخصوص ڈسپلن بنا دیا۔

مستشرقین نے مشرق کے علمی خزینے کے ایک بڑے حصہ کو جو وقت کے دبیز دھندلکوں میں دفن تھا، نکالا، نادر اور نایاب کتابوں کا پتہ چلاکر اور انھیں حاصل کرکے ان کا مطالعہ کیا اور ان میں سے بہت سے نوادرات کو ایڈٹ کرکے بنہایت اہتمام کے ساتھ شایع کیا، ان پر حواشی لکھے، بعض کی شرحیں کیں، مختلف زبانوں میں ان کے تراجم شایع کیے اور پھر ان سے مشرق اور مغرب کے عالموں اور محققین نے استفادہ کیا، انھوں نے تحقیق و تنقید کے ارتقا پذیر اصولوں اور طریقوں کی مدد سے اپنے تحقیقی کام اور علمی مقاصد کو باوقار بنانے کی بھی کوشش کی، اس کے علاوہ تہذیبوں اور مذہبوں کے مطالعہ میں انھوں نے دوسرے علوم مثلاً لسانیات، علم الالسنہ، فلسفہ، تاریخ اور سماجی علوم سے بھی مدد لی، اور اس طرح علم الاستشراق کو ایک Inter disciplinary بنا دیا۔

ہمیں ایسے مستشرقین کی علمی خدمات کا اعتراف ہے، لیکن ہمیں اس کا افسوس ہے کہ ان کے علمی کارناموں کی جو کئی لحاظ سے قابلِ قدر ہیں، سب سے بڑی کمزوری ان کی موضوعیت اور داخلیت ہے، انھوں نے دعویٰ تو کیا معروضی مطالعہ کا، لیکن حقیقت میں ان میں شاید ایک بھی ایسا نہیں جو اپنے ذہنی تحفظات اور مذہبی و تہذیبی تعصبات سے اپنا دامن محفوظ رکھ سکا ہو، خاص طور پر اسلام، قانونِ اسلام، قرآن اور پیغمبرِ اسلام سے متعلق ان کے مطالعات غیر معروضی ہی نہیں بلکہ اکثر مصنفین کے یہاں ان کا تعصب بھی صاف طور پر نمایاں ہے۔

مستشرقین میں عیسائی بھی ہیں اور یہودی بھی، لیکن عیسائیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، اور اس کے تاریخی و سیاسی اسباب ہیں، یہ لوگ اسلام اور پیغمبرِ اسلام سے نفرت اور تعصب کی جن روایات کے وارث ہیں، ان کی داستان صدیوں پرانی ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ یہ داستان چودہ سو (۱۴۰۰) برس پر پھیلی ہوئی ہے، اس میں کئی اتار چڑھاؤ ہیں، اس کے کردار بدلتے رہے ہیں، اس کے پلاٹ میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں، لیکن داستان کا بنیادی نکتہ ایک اور صرف ایک رہا ہے۔

بیسویں صدی کے تیسرے دہے سے، اور خاص طور پر دوسری جنگِ عظیم کے بعد مستشرقین کے رویے میں خاصی تبدیلی ہوئی ہے، اس تبدیلی کے سیاسی و معاشی اسباب ہیں، لیکن اس زمانہ میں علم الاستشراق یعنی اورینٹلزم کا علمی اعتبار سے انحطاط بھی ہوا ہے، اور اب ایسے عالم مستشرق نہیں ملتے جیسے کہ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے اوائل میں تھے، بس ایک سنجیدہ اور بردبار مستشرق نظر آتا ہے، جس کا علم بھی گہرا ہے اور نظر بھی دقیق ہے لیکن وہ بھی مکمل طور پر غیر جانبدار نہیں ہے اور ان کی بعض تحریروں میں ان نظریات و تصورات کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو اسے آن شعبۂ علم میں اپنے پیشروؤں سے ورثہ میں ملے ہیں، ہماری مراد سر ہیملٹن الیگزنڈر روسکین گب سے ہے، جو علمی دنیا میں ایچ۔ اے۔ آر۔ گب کے نام سے مشہور ہیں اور وہی اس مقالہ کا موضوع ہیں۔

سر ہیملٹن گب ۲ جنوری ۱۸۹۵ء کو اسکندریہ میں پیدا ہوئے، جہاں ان کے والد ایک کمپنی میں ملازم تھے، ان کی تعلیم اسکاٹ لینڈ میں ایڈنبرا کے رائل ہائی اسکول اور ایڈنبرا یونیورسٹی میں ہوئی، ایڈنبرا یونیورسٹی میں وہ ۱۹۱۲ء میں داخل ہوئے، جہاں ان کے خاص مضامین سامی زبانیں یعنی عبرانی، عربی اور آرامی تھیں، پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو انھوں نے رائل فیلڈ آرٹیلری میں شامل ہوکر فرانس اور اٹلی میں فوجی خدمات انجام دیں، ۱۹۱۹ء میں انھیں ان کی درخواست پر یونیورسٹی سے زمانۂ جنگ کی ڈگری ملی، اور پھر وہ لندن کے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں داخل ہوئے جہاں سے انھوں نے ۱۹۲۲ء میں عربی میں ایم. اے کی ڈگری حاصل کی، ۱۹۲۱ء ہی میں وہ سر تھامس آرنلڈ کی زیر نگرانی عربی کے لکچرر مقرر ہوگئے تھے، ۱۹۲۶ء میں انھوں نے مشرق وسطیٰ کا سفر کیا، جہاں وہ تقریباً ایک سال مقیم رہ کر جدید عربی ادب کا مطالعہ کرتے رہے، اس سے قبل وہ کئی مہینے شمالی افریقہ میں گذار چکے تھے، ۱۹۲۹ء میں وہ لندن یونیورسٹی میں تاریخ ادب عربی کے ریڈر مقرر ہوئے اور ۱۹۳۰ء میں آرنلڈ کے انتقال کے بعد وہ ان کے جانشین کی حیثیت سے اس شعبہ کے سربراہ بن گئے، آرنلڈ کے بعد وہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے انگریزی ایڈیٹر بھی مقرر ہوئے، اس حیثیت سے ۱۹۵۶ء تک وہ اس انسائیکلوپیڈیا کی تالیف میں شریک رہے اس کے دونوں ایڈیشنوں میں ان کے بہت سے مضامین شامل ہیں، لندن یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں وہ ۱۹۳۷ء تک رہے، اسی سال وہ عربی کے پروفیسر ہوکر آکسفورڈ چلے گئے جہاں ان کا قیام ۱۹۵۵ء تک رہا، ۱۹۵۵ء میں امریکہ کی مشہور یونیورسٹی ہارورڈ نے انھیں عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے بلایا، اس خیال سے کہ امریکہ میں مشرق وسطیٰ سے متعلق علاقائی مطالعات کے وسیع امکانات ہیں، انھوں نے ہارورڈ یونیورسٹی کی پیش کش کو قبول کر لیا، ۱۹۵۷ء میں وہ ہارورڈ یونیورسٹی میں مڈل ایسٹرن اسٹڈیز سنٹر کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے، ۱۹۶۴ء میں وہ عربی کی پروفیسرشپ سے

تو ریٹائر ہو گئے، لیکن سنٹر کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے، اسی سال وہ سخت بیمار پڑے اور ان پر فالج کا حملہ ہوا، اس کے بعد زندگی کے باقی دن انھوں نے آکسفورڈ میں گذارے جہاں ان کی اہلیہ لیڈی گب نے ۱۹۶۹ء تک کہ اسی سال لیڈی گب کا انتقال ہوا، ان کی خدمت گذار اور تیمار دار تھیں، لیڈی گب کی وفات کے بعد کوئی دو سال وہ اور زندہ رہے، لیکن یہ دو سال اُن پر بڑے سخت گذرے، تنہائی اور بے بسی کی زندگی، مفلوج زندگی، اب وہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتے تھے، آخر ۲۲ر اکتوبر ۱۹۷۱ء کو انھوں نے اس دنیا کو خیرباد کہا۔

علمی دنیا نے سر ہیملٹن گب کے علمی کارناموں کا خوب خوب اعتراف کیا، کئی اعزاز ان کو ملے، کئی علمی و ادبی سوسائٹیوں کے وہ ممبر رہے، لیکن ان سب کی تفصیلات کا یہ موقع نہیں، البتہ شاید اس بات کا جاننا لوگوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہو کہ گب قاہرہ کی اکیڈمی آف لنگویج اور دمشق اور بغداد کی عربی اکادمیوں کے بھی ممبر تھے، گب نے خود کافی لکھا اور بہت سی کتابوں کے ریویو بھی لکھے، ان کے مضامین کی فہرست بھی خاصی طویل ہے، یہاں ان کی خاص تصانیف کی فہرست تاریخ طباعت کی ترتیب سے درج کی جاتی ہے:

(۱) The Arab Corquest in Central Asia (London) 1923

(۲) Arabic Literature (London, 1926) revised edition oxford, 1963

(۳) Ibn Battuta, Travels in Asia and Africa (London, 1929)

(۴) Damascus Chronicles of The Crusades (London, 1932)

(۵) Modern Trends in Islam (Chicago, 1947)

(۶) Mohammadanism (London, 1949)

اب تک اس کتاب کے پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

(۶) Islamic Society and The West, vol I (Part I London 1950; Part II London, 1957 with H. Bowen)
(۸) The Travels of Ibn Battuta (Cambridge, vol. I, 1958. vol II, 1961)
(۹) Studies on the Civilization of Islam (edd. S. J. Shaw and W. R. Polk. Boston, 1962)
(۱۰) The Life of Saladin - from The Works of Imaduddin and Baha-uddin (oxford, 1973)

مغرب میں سر ہیملٹن گب کے عقیدتمندوں نے انھیں صف اول کے اسلامک اسکالر میں شمار کیا ہے، ظاہر ہے کہ اس سے ان کی مراد مغرب کے ان علمائے محققین سے ہے جنھوں نے اسلام کے مطالعہ میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ صرف کیا، وہ مسلمان بھی ان کی محققانہ قابلیت اور مورخانہ شدت بینی کے قائل ہیں جنھوں نے ان کی تصنیفات کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے، اور اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ پروفیسر گب کی بعض کتابیں اور مضامین ان کے وسیع مطالعہ، تعبیر و تشریح کی بھرپور صلاحیت، فکر کی شادابی و تازگی اور گہری تاریخی بصیرت کے شاہد ہیں، ذیل میں ہم ان کے چند مضامین کے عنوانات درج کرتے ہیں، یہ مضامین تھوڑے تھوڑے وقفہ سے دنیا کے مشہور علمی مجلات میں شائع ہوئے اور ان کے مضامین کے گراں قدر مجموعے Studies on The Civilization of Islam میں شامل ہیں:

(1) An Interpretation of Islamic History (2) Social Significance of The Shu'ubiya (3) The Evolution of Government in Early Islam. (4) The Armies

of Saladin (5) The Achievement of Saladin. (6) Al-Mawardi's Theory of The Caliphate - (7) The Islamic Background of Ibn Khaldun's Political Theory (8) The Structure of Religious Thought in Islam.

ان کے علاوہ جدید عربی ادب کے ارتقاء پر بھی ان کے بعض مضامین ہیں، جن میں جدید رجحانات سے متعلق سیر حاصل بحث کی گئی ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پروفیسر گب اپنے اکثر معاصر مستشرقین کے مقابلہ میں عربی زبان و ادب سے کہیں زیادہ واقف تھے، بلکہ ان سے ایک گہرا تعلق بھی رکھتے تھے۔ ان کے ایک مضمون Islamic Biographical Literature[1] (اسلامی سوانحی ادب) سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اسلام اور تاریخ اسلام کے مطالعات میں عربی ادب کے وسیع مطالعہ کو کتنی اہمیت دیتے تھے، وہ درحقیقت عربی زبان کے شیدائیوں میں تھے، اور عربی ادب کے شہ پاروں کے تخلیقی حسن کے بڑے قدردان تھے، مقدمۂ تاریخ ابن خلدون کوئی چالیس برس تک ان کے فکر و نظر کی جولان گاہ رہا، اور وہ اس سے علم و آگہی اور مسرت و انبساط حاصل کرتے رہے، اس کے ادبی محاسن کا ذکر انھوں نے یوں اس طرح کیا ہے:

"ابن خلدون کا تخیل جو ایک حیات آفریں، براہ راست اور رنگین و رعنا شخصیت کا غماز ہے معنوی عظمتوں کو چھوتا ہے، اس کی طاقت لسانی سے فراوانی اور وفور کا احساس ہوتا ہے، اس کے خیالات آبشار آسا بڑھتے ہیں، مگر کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ پُرجوش بے ربطی کی نیم ظلمتوں میں

---

[1] Historians of the Middle East (edd. B. Lewis and P.M. Holt, 1962), London, 1962, pp. 54-58

لکھے جاتے ہیں، لیکن ان تنفی دن کی خوش وضع اور خوش آہنگ تر چی حد تک انھیں مربوط رکھتی ہے
جملوں میں تراکیب اور فقروں کی چست اور نفیس تنظیم انھیں قابو میں رکھتی ہے، وہ اپنے خیالات کا
اظہار ایک ایسی تربیت یافتہ شائستگی اور لطافت سے کرتا ہے کہ ہر لفظ معنوی طور پر اس کے دلائل کا
تابع ہوتا ہے۔

درحقیقت ہیملٹن گب کا خاص میدان تاریخ و تمدن تھا اور ان دونوں کے ارتقا و نشو و نما میں وہ زبان و ادب کے رول کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے، لیکن تاریخ و تمدن کے موضوعات پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں ہمیں ان کی تمام تعبیرات و تشریحات سے اتفاق نہیں ہے، اور بعض مقامات پر صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے پہلے ہی سے کچھ نظریے قائم کر لیے ہیں، اور واقعات کو وہ اپنے انہی نظریوں کی روشنی میں دیکھتے ہیں، مثلاً اپنے مضمون An Interpretation of Islamic History میں وہ پورے یقین کے ساتھ لکھتے ہیں کہ چونکہ ناگزیر معاشی محرکات نے عرب کے حالات میں استحکام کی کسی صورت کو تقریباً ناممکن بنا دیا تھا، اس لیے بادیہ نشین قبائل کی مخالفت کو فوجی طاقت کے ذریعہ دبا دینا مسئلہ کا مناسب اور مستقل حل نہیں ہو سکتا تھا اس کے لیے ضروری تھا کہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں جن میں عرب کے قبائل اگر اسلام میں پورے طور پر داخل نہ ہوں تو کم از کم اسلام سے اپنے دنیوی مفاد کو وابستہ سمجھیں، یہی وجہ ہے کہ حضرت محمدؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت مکی سرداروں کی قیادت میں قبائل کو شام کی سرحدوں پر حملے کے لیے بھیجا، مقصود گویا یہ دیکھنا تھا کہ اگر قبائل کی توجہ دوسرے ملکوں کی طرف پھیر دی جائے تو ان پر اس کا کیا ردعمل ہوگا، اس میں کامیابی ہوئی تو پھر جنگوں اور فتوحات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔[1]

---

[1] Studies on The Civilization of Islam, London, 1962 p. 6

تعبیر کا یہ وہ انداز ہے جسے ہم سرتاسر معاشی و مادی اندازِ فکر کہتے ہیں، اس میں آپ کو دینِ اسلام کی انقلابی و اصلاحی تعلیمات کی تاریخ ساز کارفرمائی کہیں نظر نہیں آئے گی، یعنی یہ کہ بدوی قبائل نے اسلام کو اس کے اپنے انسانی و روحانی اصولوں کی بنا پر نہیں اپنایا، بلکہ جب انھوں نے دیکھا کہ اس سے ان کا دنیوی و معاشی مفاد وابستہ ہے تو اسلام سے انھیں تعلق پیدا ہوا، ایسا معلوم ہوتا ہے پہلے گب نے اپنے ذہن میں ایک کلیہ قائم کیا اور پھر شام و عراق میں اسلامی فتوحات کو اسی کلیہ کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی، ہمارے نزدیک یہ رویہ فنِ تاریخ نگاری کے جدید اصولوں کے مطابق بھی نہیں ہے، اس لیے کہ اس رویے سے اسی تاریخی معروضیت کا وقار مجروح ہوتا ہے جس پر مغرب کے جدید محققین ناز کرتے ہیں۔

یہی رویہ گب کا حدیث کے بارے میں ہے، اسی مضمون میں وہ اپنے قاری کو حسنِ بیان اور اپنے مخصوص طرزِ استدلال سے مسحور کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ پہلی صدی ہجری کے ختم ہوتے ہوتے چونکہ قانون اور اس کے نفاذ کا پُرپیچ مسئلہ پیدا ہو گیا تھا، اور صورت یہ تھی کہ خلافت کے مختلف شہروں اور صوبوں میں مقامی علماء اپنی اپنی فہم کے مطابق آزادانہ رائے دیتے تھے جو بسا اوقات باہم مختلف اور متضاد ہوتی تھیں اور اس پر مستزاد تھیں عرف و عادت، اور انتظامی ضوابط سے پیدا ہونے والی پیچیدگیاں، اس لیے مذہبی رہنماؤں نے اس صورتِ حال کو خطرناک سمجھا، خاص طور پر جب مقامی قوانین قرآن کے اخلاقی اصولوں سے متصادم معلوم ہوتے تھے، اس مسئلہ کا حل انھوں نے یہ ڈھونڈا کہ پیغمبرِ اسلامؐ کے معاصرین کے واسطہ سے "احادیث" بیان کرنی شروع کر دیں، جن میں واضح مسائل سے متعلق حضرت محمدؐ سے روایتیں منقول ہوتی تھیں اور پھر یہ کہا کہ ان احادیث کی پابندی ضروری ہے اور یہ کہ ان کی حیثیت آیاتِ قرآنی سے بمشکل ہی کمتر قرار دی جا سکتی ہے، اسی سلسلہ میں آگے چل کر جہاں وہ حدیث اور علمِ حدیث کی تدوین کا ذکر

کرتے ہیں تو وہ اسے علمائے حدیث کی "مصنوعی تخلیق" سے تعبیر کرتے ہیں، ہم یہ نہیں سمجھتے کہ پروفیسر گب حدیث لٹریچر کے ارتقا سے قطعی ناواقف ہوں گے یا انھیں ان "اسوۂ حسنہ" کا علم نہ ہوگا جس کا واضح ذکر قرآن کریم میں ہے، اس لیے اس کے علاوہ اور کیا کہیے کہ وہ اپنی مذکورۂ بالا تشریح اور "مصنوعی تخلیق" جیسے الفاظ و تراکیب سے حدیث کے اس دینی وزن اور تشریعی اہمیت کو اپنے مسلمان قاریوں کی نظر میں کم کرنا چاہتے ہیں جو ان کے دل میں اپنے محبوب پیغمبر سے اس کی اٹوٹ نسبت کی وجہ سے جاگزیں ہے اور جو گذشتہ چودہ سو برس میں اسلامی مذہبی ثقافت کے تسلسل و ارتقا میں بنیادی حیثیت کی حامل رہی ہے۔

دوسری بات یہ کہ پروفیسر گب نے اپنے طریقہ سے وہی نقطۂ نظر دہرایا ہے جو حدیث کے سلسلہ میں گولڈ تسیہر، مارگولیتھ اور لیمنس وغیرہ کا تھا اور جس کی کمزوریاں مسلمان علماء و محققین پہلے ہی واشگاف کر چکے ہیں[1]۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ پروفیسر گب کو سلطان صلاح الدین ایوبی کی شخصیت سے گہرا شغف تھا، انھوں نے بارہویں صدی عیسوی کی اس پرکشش اور غیر معمولی اسلامی شخصیت کا گہرا مطالعہ کیا اور ہر پہلو سے کیا، "The Armies of Saladin" کے عنوان سے ان کے مضامین جدید طرز کی تحقیق و تفحص کے اعلیٰ معیار کے نمونے ہیں، جہاں تک ہمیں علم ہے اس موضوع پر اس دور کے مسلمان عالموں اور دانشوروں میں اس پایے کی تحقیق کا سراغ نہیں ملتا، لیکن سلطان صلاح الدین پر گب کا معرکۃ الآرا مضمون The Achievement of Saladin کے عنوان سے ہے، اس مضمون میں انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ

---

[1] دیکھیے: سیرۃ النبیؐ جلد اول از علامہ شبلی نعمانیؒ؛ مقالات سلیمانی جلد دوم از سید سلیمان ندویؒ اور اسلام از فضل الرحمن (لندن، ۱۹۶۶)

صلاح الدین ایوبی ایسی شخصیتوں میں سے نہیں تھے جو محض اپنے گرد و پیش کے حالات کی پروردہ ہوتی ہیں، بلکہ انھوں نے خود ایک بڑے مقصد کے لیے اپنی دینی اخلاق کے سہارے نہ صرف حالات کو اپنے موافق بنایا، بلکہ نئے حالات پیدا کیے اور سیاسی انحطاط اور اخلاقی زوال کے اس عہد میں اسلام اور مسلمانوں کی آبرو باقی رکھی۔

پروفیسر گب نے لکھا ہے کہ عہد وسطیٰ کی تاریخ سے متعلق شاذ و نادر ہی ایسے مستند ماخذ ملتے ہیں جن کی مدد سے صحیح اور مثبت نتیجے نکالے جا سکیں اور جو تاریخی تنقید کے سخت سے سخت معیار پر بھی کھرے ثابت ہوں، لیکن سلطان صلاح الدین کی زندگی اور کارناموں سے متعلق خوش قسمتی سے عربی زبان میں اسی زمانہ کے پانچ مراجع دستیاب ہیں، ابن ابی طے، ابن الاثیر (الکامل فی التاریخ) قاضی بہاء الدین ابن شداد (النوادر السلطانیۃ) عماد الدین (البرق الشامی) اور القاضی الفاضل۔ گب نے ان پانچوں کتابوں اور تحریروں کو ہر پہلو سے جانچا ہے اور ان کی خوبیوں اور کمزوریوں کو تحقیق کے اعلیٰ معیار پر پرکھا ہے، ان مراجع میں وہ بہاء الدین، عماد الدین اور القاضی الفاضل کی تحریروں کو جو سلطان سے بہت قریب اور اس کی زندگی کے ہر گوشہ سے واقف تھے، سب سے زیادہ اہم قرار دیتے ہیں، اور انہی سے استفادہ کرکے وہ اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ صدیوں بعد یہ دیکھنے میں آیا کہ ایک مسلم حکمراں مسلسل تین سال تک میدان جنگ میں اپنی افواج کے ساتھ اپنے ایک متحد دشمن کے مقابلہ میں ڈٹا رہا، جب کہ اس عہد کا فیوڈل فوجی نظام ایسی طویل جنگ کا مشکل متحمل ہو سکتا تھا[1] اور ان کے خیال میں یہ صورت صرف اس وجہ سے ممکن ہو سکی کہ باوجود اس کے کہ سلطان صلاح الدین کوئی بڑے ماہر جنگ یا تجربہ کار حکمراں نہ تھے، وہی ایک ایسی شخصیت تھی جو صلیبی حملہ آوروں کے خلاف مسلمانوں کے مختلف النوع عناصر اور ان کی باہم متصادم سیاسی قوتوں کو اتحاد

---

[1] Studies on the Civilization of Islam, p. 104

کے لیے ایک مرکز پر متحد و مجتمع کرسکتی تھی، ہمت و شجاعت اور صبر و استقامت، ان سب اخلاقی خوبیوں سے تو وہ متصف تھے ہی، اور یہ سب ان کے کام بھی آئیں، لیکن ان کی کامیابی میں ان خوبیوں سے زیادہ دخل تھا ان کی بے غرضی و بے لوثی، سخاوت و فیاضی اور اخلاق اسلامی کے اثبات برتری کو، جنھیں سلطان صلاح الدین نے دوست اور دشمن سبھی کے ساتھ یکساں برتا، وہ سادہ لوح نہ تھے لیکن ان میں غضب کا انکسار اور سادگی تھی، ان کی ایمانداری بے داغ تھی اور بلور کی سی چمک رکھتی تھی، ان کے دشمن حیران تھے کہ ان کی اس بات پر کہ سیاست اور جنگ دونوں میدانوں میں ان کے عزائم اور ان کے طور طریقے کیوں مختلف ہیں، مکر و فریب سے وہ کوسوں دور تھے اور دوسروں کے مکر و فریب کو شاذ ہی سمجھ پاتے تھے، ان کے اسلامی اخلاق نے انھیں معاہدوں کا احترام سکھایا تھا، وہ ہر قیمت پر معاہدوں اور وعدوں کی پابندی کرتے تھے، اور معاہدہ توڑنے والے دشمن کو ہمہ وقت یہ خیال رہتا تھا کہ اسے عہد شکنی کی بھاری قیمت ادا کرنی ہوگی[1]

ہمارا خیال ہے کہ شاید ہی کسی عیسائی مورخ یا سوانح نگار نے مستند معاصر ماخذوں کی اچھی طرح چھان بین کے بعد اور تاریخی تنقید کے سارے اصولوں کو برت کر سلطان صلاح الدینؒ کی ایسی خوبصورت اور سچی تصویر پیش کی ہو۔

لیکن تاریخ و ادب سے ہٹ کر جب پروفیسر گب قرآن پاک اور سیرت رسولؐ کے موضوع پر لکھتے ہیں تو اکثر مقامات پر وہ اپنی تاریخی بصیرت اور علمی معروضیت سے بے وفائی کرتے نظر آتے ہیں، ان کے اس رویہ کی توجیہ اس کے علاوہ اور کیا ہوسکتی ہے کہ ان کے مذہبی عقائد اور اس میدان میں تعصب اور جانبداری کی وہ روایات جو انھیں اپنے علمی حول اور اپنے پیش روؤں سے ورثہ میں ملی تھیں ان کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔

---

[1] Studies on The Civilization of Islam, p.99

قبل اس کے کہ دو تین مثالوں سے ہم اپنے اس خیال کی وضاحت کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان کا ایک قول یہاں نقل کر دیں، اپنی کتاب Modern Trends in Islam کے پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں کہ "ان استعاروں سے جن میں عیسائی عقیدہ روایتی طور پر محفوظ ہے ذہنی طور پر میری تشفی ہو جاتی ہے، کیونکہ یہ استعارے اور علامتیں روحانی صداقت کی ان بلند ترین عظمتوں کی ترجمان ہیں جہاں تک میری فہم کی رسائی ہے، بشرطیکہ ان علامتوں اور استعاروں کی تشریح ایسی زبان میں کی جائے جس سے کسی تجسیمی و تشبیہی عقیدے کا اظہار نہ ہوتا ہو، بلکہ ایسے علومی تصورات کی صورت میں ان کا بیان ہو جو کائنات سے متعلق ہمارے بدلتے ہوئے نظریوں سے مطابقت رکھتے ہوں گے[1]

قطع نظر اس کے کہ گبؔ کے اس قول کے حقیقی ماٰلہ اور ما علیہ کیا ہیں، اتنی بات صاف ہے کہ وہ عقیدۃً پکے عیسائی تھے، اور ہمارے نزدیک انھیں اس کا حق تھا کہ جس عقیدہ میں انھیں ذہنی و روحانی تسکین حاصل تھی، اسے وہ اپناتے، یہ بات خوشی کی ہے کہ وہ مسلمانوں کو بھی اس کا حق دیتے تھے اور اسی لیے ان سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ مسلمانوں کے عقائد اور حضورؐ کی سیرت اقدس پر لکھتے وقت انصاف سے کام لیں گے، ہمارا خیال ہے کہ اس سلسلہ میں ان کی "عیسائیت" تاریخی معروضیت اور مذاہب کے تقابلی مطالعہ کی اس بنیادی خصوصیت پر غالب آگئی جسے آج سے صدیوں پہلے ایک مسلمان عالم اور دانشور ابو ریحان البیرونی نے الآثار الباقیہ اور کتاب الہند کی تصنیف کے سلسلہ میں اپنایا تھا۔

دوسروں کے مذہبی عقائد اور مذہبی روایات کے موضوعات پر لکھنے کی آزادی ہے، کسی ایک خاص مذہب کا پیرو دوسرے مذاہب کا مطالعہ کر سکتا ہے اور اپنے مطالعہ کے نتائج قلمبند بھی کر سکتا ہے، لیکن اس سلسلہ میں تصنیف و تالیف کا اولین اور بنیادی اصول یہ ہونا چاہیے کہ پہلے زیر مطالعہ مذہب کے ماننے والوں کے عقائد پوری وضاحت کے ساتھ مکمل طور پر اس طرح بیان کر دیے جائیں کہ اس کی تشکیات

---

[1] Modern Trends in Islam, Chicago. 1945, P. xi

کوئی گنجائش باقی نہ رہے کہ ان کے عقائد کو غلط طور پر یا توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے، اب اگر لکھنے والا کسی اور نظریے یا عقیدے کا حامل ہے اور وہ اپنے نظریے یا کسی اور کے نظریے کا ذکر کرنا چاہتا ہے تو اسے اس کا حق حاصل ہے، لیکن اسے چاہیے کہ وہ اپنے یا کسی دوسرے کے نظریے کو الگ سے اور پوری وضاحت سے پیش کرے۔

افسوس ہے کہ مستشرقین قرآن پاک اور سیرت پر لکھتے وقت اس بنیادی اصول کو عموماً فراموش کر دیتے ہیں، اور کچھ اس طرح کا غلط بحث کرتے ہیں کہ صرف وہی لوگ جن کا اسلام کا مطالعہ اچھا ہے، یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ لکھنے والا اپنے ذاتی خیال اور عقیدے کو اپنے قاریوں کے ذہن میں اتار دینا چاہتا ہے، حیرت ہے کہ پروفیسر گب جیسا بالغ نظر مصنف بھی جس کی علمیت و متانت کے بہت سے مسلمان بھی معترف ہیں، اپنا دامن اس عیب سے پاک نہ رکھ سکا۔

پروفیسر گب نے اسلام پر جو کتاب لکھی ہے اس کا نام "محمڈن ازم" ہے، مارگولیتھ کی کتاب اسی نام سے سنہ ۱۹۱۱ء میں چھپی تھی، پروفیسر گب نے اس خیال سے کہ بقول ان کے سنہ ۱۹۱۱ء کی علمی فضا اور تھی، نظریے اور تھے، ذہنی وجذباتی تحدیدات مختلف تھے، اور چونکہ ہر دور کے ذہنی تحفظات و تعصبات کی پرچھائیں اس دور کی تحریروں میں باقی رہتی ہے، خواہ ان سے بچنے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے، اس لیے انھوں نے اسلام پر ایک نئی کتاب کا لکھنا ضروری سمجھا۔

وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو یہ پسند نہیں کہ انھیں محمڈن اور اسلام کو محمڈن ازم کہا جائے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اسلام کو محمڈن ازم کہنا ضروری سمجھا، ان کے خیال میں ایسا کہنا غلط بھی نہیں، کیونکہ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ مسلمان بڑے فخر سے اپنے آپ کو "امت محمدیہ" کہتے تھے، دوسرے یہ کہ جب مسلمان لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ کر اسلام پر اپنے یقین کا اقرار کرتے ہیں تو اس کلمہ کے دوسرے حصہ کی اہمیت ان کے ذہن میں اس کے تمام مضمرات کے ساتھ

خصوصیت کے ساتھ موجود رہتی ہے، کیونکہ کلمہ کے پہلے حصہ پر مسلمانوں کے علاوہ بہت سے غیر مسلموں کا بھی اعتقاد و ایمان ہو سکتا ہے، حضرت محمدؐ کے زمانہ سے لے کر اب تک کوئی ایسی مثال نہیں کہ اس کلمہ کے دوسرے حصہ کے منکرین کو کبھی مسلم کہا گیا ہو، یا انھیں اسلامی برادری کا رکن سمجھا گیا ہو، برخلاف اس کے راسخ العقیدہ شارحین اسلام کا موقف ہر دور میں یہی رہا ہے کہ کسی ایسے شخص کو جو علانیہ پورے کلمہ کا اقرار کرتا ہو غیر مسلم نہیں کہا جا سکتا ہے[1]

دیکھا آپ نے، کتنی چابکدستی سے اور کتنے لطیف پیرایہ میں پروفیسر گب نے محمڈن ازم کی اصطلاح کو برحق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، درحقیقت اس ضمن میں وہ مارگولیتھ ہی کے پیرو ہیں، اور ان دونوں کی کتابوں کے مشمولات میں بڑی حد تک یکسانیت بھی ہے، اس لیے ان کی اس بات کا کھوکھلا پن صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ مارگولیتھ کے زمانہ کی علمی فضا اور تھی اور آج کی اور ہے، مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ انھیں مسلم کہا جائے، لیکن کہا یہ جاتا ہے کہ محمڈن کہنا بھی بیجا اور غلط نہیں، قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ خدا کو ایک اور صرف ایک ماننے والے اور محمدؐ کو رسول اور آپؐ پر ختم نبوت کا اقرار کرنے والے "مسلم" ہیں، لیکن پروفیسر گب اپنے مسلم اور غیر مسلم قاریوں کو یہ بتاتے ہیں کہ اسلام کے لیے محمڈن ازم اور "مسلم" کے لیے محمڈن کی اصطلاح بھی صحیح ہے، دراصل یہ وہی تعصب اور اسلام کو مسخ کر کے پیش کرنے کا جذبہ ہے جو صدیوں سے عیسائی دنیا پر مسلط ہے، اور کسی نہ کسی شکل میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔

اپنی اس کتاب کے پہلے ہی صفحہ پر پروفیسر گب یہ کہتے ہیں کہ "اسلام" کا لفظ حضرت محمدؐ نے بعد میں اپنے مذہب کے امتیازی نام کے طور پر اختیار کیا، دراصل ان کا یہ نظریہ ان کی اس بحث کا پیش خیمہ ہے جو انھوں نے کتاب کے تیسرے باب میں جس کا عنوان "قرآن" ہے، اٹھائی ہے

---

[1] Mohammadanism, Newyork, 1966 (fifth edition) p.2

بتاتے ہوئے کہ کس طرح پیغمبر اسلام کے ذہن میں نظریۂ توحید کا ارتقاء ہوا ہوگا ان کا کہنا ہے کہ قرآن میں توحید کا جو نظریہ پیش کیا گیا ہے، اس کا تعلق درحقیقت ان "حنفاء" کے اعتقاد سے ہے جس کے بارے میں ہمیں کچھ زیادہ معلوم نہیں، حضرت محمدؐ نے اس پر فخر کیا اور اسے حضرت ابراہیمؑ سے ایک امتیازی شان کے ساتھ وابستہ کردیا، قرآن کی اس آیت مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَّلَٰكِن كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا کی ایک ابتدائی شکل (قراءت ؛ Reading) میں جو اس سے مختلف تھی، اس بات کا اشارہ موجود تھا کہ حضرت محمدؐ جس عقیدہ کی تبلیغ کرتے تھے اس کے لیے حنیفیۃ کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا، یہ تو بعد میں ہوا کہ حنیفیۃ کی جگہ اسلام نے لے لی[1]

بیان القرآن (طبری) تفسیر کبیر (رازی) درالمنثور (سیوطی) روح المعانی (آلوسی) اور فتح البیان (صدیق حسن قنوجی) میں سے کسی میں بھی آیت مذکورہ کی کسی "مختلف قراءت" (Variant reading)[2] کا سراغ نہیں ملا، اور خود پروفیسر موصوف نے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے، ایسی صورت میں جہاں تک ہم سمجھتے ہیں کسی کمزور روایت کا سہارا لے کر یا خود اپنے طور پر پروفیسر گب نے یہ قیاس آرائی کی ہے کہ پہلے حضرت محمدؐ نے اپنے عقیدۂ توحید کو حنیفیۃ سے تعبیر کیا اور بعد میں اسلام کہا۔

درحقیقت تخیل کا یہ سارا افسانہ اس لیے ہے کہ پروفیسر گب قرآن کریم کو وحی الٰہی کے بجائے پیغمبر اسلامؐ کی تصنیف سمجھتے ہیں، چنانچہ محمڈن ازم کے تیسرے باب کا آغاز ہی اس جملے سے ہوتا ہے:

The Koran is the record of those formal utterances and discourses which Mohammad and his followers accepted as directly inspired[3]

جب سے مغرب کی علمی دنیا میں سائنٹفک تاریخی اصول تحقیق کا چرچا ہوا اُس وقت سے مستشرقین

---

1. Mohammedanism p 38 2. ایضاً 3. ایضاً p.33

یہ ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہیں کہ قرآن کی اساس یہودی و نصرانی روایات ہیں، پروفیسر گب نے بھی مختلف انداز سے یہی بات کہی ہے، غرض پچھلے دو تین سو برس کی طویل مدت میں اس سلسلہ میں بڑی بڑی قیاس آرائیاں کی گئی ہیں، اور ان قیاس آرائیوں سے دور رس تاریخی، ادبی اور دینیاتی نتائج نکالے گئے ہیں، اور پھر اس مفروضے اور ان نتائج کو اتنی بار دُہرایا گیا ہے کہ انھیں حقیقت و واقعیت کا مرتبہ حاصل ہوگیا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ آج بھی یہ مفروضہ ویسے ہی ایک مفروضہ ہے جیسے دو تین سو سال پہلے تھا۔

کیسی عجیب بات ہے کہ ایک طویل عرصہ تک تمام ذہنی و مادی وسائل کے ساتھ تاریخی تنقید و تحقیق کے جدید اصولوں کو برت کر عیسائی دنیا اس بات کا کوئی قطعی اور فیصلہ کن ثبوت فراہم نہ کرسکی کہ قرآن کریم پیغمبر اسلام کی تالیف ہے، جسے آپ نے یہودی و عیسائی روایات سے استفادہ کرکے اور توراۃ و انجیل سے بہت کچھ مستعار لے کر مرتب کیا۔ اس سلسلہ میں ہمارے نزدیک اگر کوئی معاصر اور زندہ شہادت ہے تو وہ خود قرآن کی ہے جس سے اس طرح کا کوئی امکان خارج از بحث قرار پاتا ہے، تاریخی تنقید و تحقیق کے مستند اور جدید اصول کے مطابق اس بولتی ہوئی معاصر دستاویزی شہادت کو جس کے علاوہ اس مرتبہ کی کوئی اور شہادت موجود نہیں، تمام لایعنی قیاس آرائیوں سے بالاتر اور یقینی سمجھنا چاہیے، لیکن مستشرقین اس زندہ حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں، کیونکہ اس سے ان کے نظریے اور عقیدے کی مکمل طور پر نفی اور تردید ہوتی ہے۔

رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی کی پوری تفصیلات موجود ہیں، کسی دوسرے نبیؑ یا دنیا کی بڑی سے بڑی شخصیت کے حالات ہمیں اتنی تفصیل سے نہیں معلوم ہیں، لیکن پروفیسر گب اس سلسلہ میں اپنے قارئین کو شبہہ میں مبتلا کرنا ضروری سمجھتے ہیں، اس لیے وہ بڑی چابکدستی سے آپ کے بچپن سے لے کر بعثت تک کے حالات و واقعات نظر انداز کر دیتے ہیں، بعثت سے قبل کی

آپ کی پاک صاف زندگی، بے مثال امانت و دیانت، دانشمندی و بصیرت، اہل مکہ کی اخلاقی پستی پر آپ کی غمگینی و دلسوزی، کمزوروں، مظلوموں، مسافروں اور اجنبیوں کی بیکسی و بے بسی پر آپ کا جذبۂ دردمندی اور گرد و پیش کے عمومی حالات پر آپ کی روحانی بے چینی ان سب باتوں میں آپ کی انسانی عظمت کے کوئی آثار انھیں نظر نہیں آتے، اور تاریخی معروضیت کے تمام تر بلند بانگ دعووں کے باوجود بالکل مارگولیتھ کے انداز پر پروفیسر گب کو یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ "پیغمبر اسلام کی شروع کی زندگی اور حالات سے متعلق ہمیں یقین کے ساتھ کچھ نہیں معلوم" اور یہ کہ "ان کی کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ وہ مکہ کے رہنے والے تھے"[3] ع ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے۔

اب جب پروفیسر گب جیسے شریف طبیعت اور سنجیدہ عالم کو جن کا شمار صف اول کے مستشرقین میں کیا جاتا ہے، اور جن کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اسلام کا مطالعہ ایک ایسے عیسائی کی حیثیت سے کرتے تھے جسے دونوں مذاہب میں مشترک روحانی اقدار کی تلاش تھی، قرآن پاک کو یہودی عیسائی روایات سے مستعار سمجھنے اور وحی الٰہی نہ ماننے پر اصرار ہو، پیغمبر اسلام کی سیرت میں انسانی و روحانی عظمت کا کوئی پہلو نظر نہ آتا ہو، تصور وحی، منصب نبوت اور شعور نبوت سے متعلق اسلامی موقف کا کوئی شعور نہ ہو تو بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دوسری صف کے مستشرقین مثلاً گیلوم (Guillaume) روزینتھال (Rosenthal) برنارڈ لوئیس (B. Lewis) گرونے بام (Grunebaum) مونٹگمری واٹ (M. Watt) اینڈرسن (Anderson) جوزف شاخت (J. Schacht) اور کینتھ کریگ (K. Cragg) وغیرہم نے قرآن پاک اور سیرت اقدس سے متعلق کیا کیا گل افشانیاں کی ہوں گی۔

---

[1] Margoliouth, Mohammedanism, London, 1911 (?) pp. 51-52

[2] Mohammedanism p. 24 [3] ایضاً ص ۲۵۔

الواحُ الصّنادید

از

پروفیسر محمد اسلم استاد شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی، لاہور

(۲)

لاہور کے گورستانِ میانی میں جتنے علماء، ادباء اور شعراء دفن ہیں، اس کا عشرِ عشیر بھی کسی دوسرے قبرستان میں نظر نہیں آتا، ان مشاہیر کی قبروں کو دیکھ کر بے اختیار یہ مصرع زبان پر آتا ہے، ع

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

اسلامیہ پارک سے اگر فیصح روڈ کی طرف سے قبرستان میں داخل ہوں تو دائیں ہاتھ ایک ٹیلہ پر پٹی (حال ضلع امرتسر) کے مغلوں کی قبریں ہیں، ان ہی قبروں میں ایک قبر محمدی بیگم کی ہے، یہ وہی خاتون ہے جس کے بارے میں مرزا غلام احمد قادیانی نے اعلان کیا تھا کہ اُن کے ساتھ ان کا نکاح عرشِ معلیٰ پر ہو چکا ہے، محمدی بیگم کے والدین نے مرزا صاحب کو زچ کرنے کی خاطر اُن کی شادی پٹی کے ایک نوجوان مرزا سلطان بیگ کے ساتھ کر دی، مرزا صاحب نے اس پر جز بز ہو کر کہا کہ وہ ضرور اُن کے نکاح میں ... آئیں گی، اگر وہ اُن کے نکاح میں نہ آئیں تو پھر ان کی کوئی بیٹی مرزا صاحب کے کسی بیٹے کے عقد میں آئے گی، یہ ایک لمبا قصہ ہے جس کی تفصیل کتابوں میں مل جاتی ہے، محمدی بیگم کا نکاح مدتوں تک مناظروں کا موضوع بنا رہا ہے، اُن کی لوحِ مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:

۷۸۶

یا اللہ یا محمد

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

مرقد

محمدی بیگم مرحومہ

زوجہ

رسالدار مرزا سلطان محمد بیگ آف پٹی

تاریخ وفات ۱۹ر نومبر ۱۹۶۶ء

محمدی بیگم کی قبر سے جانب شمال مشرق میں دو میٹر کے فاصلہ پر مرزا غلام احمد کے رقیب رسالدار سلطان بیگ محو خواب ابدی ہیں، ان کی لوحِ مزار پر یہ عبارت ہے،

۷۸۶

یا اللہ یا محمد

مرقد

رسالدار مرزا سلطان محمد بیگ آف پٹی

تاریخ وفات

۱۰ر جنوری ۱۹۴۹ء

میانی صاحب کی عیدگاہ کی محراب کے عقب میں قبروں کا ایک وسیع احاطہ ہے جو لاہور کے معروف فقیر خاندان کی ملک ہے، اس احاطے میں مشہور ادیب اور ڈرامہ نگار حکیم احمد شجاع کی قبر ہے، ڈرامہ نگاری میں موصوف نے آغا حشر کا تتبع کیا ہے، اُن کے ڈراموں میں سے باپ کا

گناہ، جاں باز، آخری فرعون، بجارت کا لال اور حسن کی قیمت خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، حکیم صاحب نے لاہور سے ایک سالہ بعنوان ہزار داستان۔ جاری کیا تھا، موجودہ صدی کے آغاز میں ٹیبل ٹاک ایک باقاعدہ فن تھا، یہ فن حکیم احمد شجاع کے ساتھ ہی ختم ہو گیا ہے، اُن کی قبر پر جو کتبہ نصب ہے اس پر یہ عبارت ہے،

یا اللہ یا محمد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

حکیم احمد شجاع

ولد

حکیم شجاع الدین الایوبی الانصاری

ادیب، شاعر، مصنف، مقرر، مصنف، مفکر

تاریخ ولادت:- ۴ر نومبر ۱۸۹۶ء

تاریخ وفات:- ۴ر جنوری ۱۹۶۹ء

حکیم احمد شجاع کی قبر سے اندازاً پچاس میٹر جانب مشرق عید گاہ کی محراب سے چند قدم کے فاصلہ پر کرنل فقیر وحید الدین آسودۂ خاک ہیں، کرنل صاحب مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وزیر فقیر عزیز الدین کے خاندان کے چشم و چراغ تھے، انھوں نے اپنے خاندان کے مربی کے بارے میں اردو میں اصل رنجیت سنگھ کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے، اس کے علاوہ موصوف نے روزگارِ فقیر، انجمن اور محسنِ اعظم کے عنوانات سے تین کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں، ان کی لوحِ مزار پر یہ عبارت کندہ ہے:-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یا اللہ یا محمد

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

الحمد للہ .. .. والضالین

آخری آرامگاہ

کرنل فقیر سید وحید الدین

ولد

فقیر سید نجم الدین

پیدائش ۱۹۰۴ء

تاریخ وفات ۱۴ جولائی ۱۹۶۹ء

مطابق ۱۹ ربیع الثانی ۱۳۸۹ھ بروز منگل

چوبرجی سے مزنگ چونگی کی طرف جاتے ہوئے بہاول پور روڈ پر جہاں کوٹھیوں کا سلسلہ ختم ہوتا ہے، وہیں قبروں کے ایک احاطہ کے باہر سنگ مرمر کی سل لگی ہوئی ہے، جس پر احاطۂ مولوی سلطان احمد مرحوم مرقوم ہے۔ احاطہ میں داخل ہوتے ہی پروفیسر عبد الحی پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور کی قبر ہے، اور اُن کے سرہانے ان کے بھائی عبد اللہ بٹ محو خوابِ ابدی ہیں۔ عبد اللہ بٹ بڑے بلند پایہ صحافی تھے، انھوں نے متعدد کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں، ان کی تصانیف میں سے ٹیپو سلطان، یادگارِ زمانہ ہیں یہ لوگ، مقالاتِ شاہ اسمٰعیل شہید، راجہ اور کسان، ابو الکلام آزاد اور مقالاتِ آزاد خاص طور پر مشہور ہیں۔ بٹ صاحب کے برادرِ بزرگ ڈاکٹر عبد القیوم اردو دائرۂ انسائیکلو پیڈیا کے سینئر ایڈیٹر ہیں، بٹ صاحب کی لوحِ مزار پر یہ عبارت ہے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

مرقد

عبداللہ بٹ عمر ۴۰ سال

اڈیٹر "حرف و حکایت" لاہور

ولد فضل دین بٹ مرحوم

ملا نہ پھر کہیں لطفِ کلام تیرے بعد

حدیثِ شوق رہی ناتمام تیرے بعد

مرقد پہ تیری رحمتِ حق کا نزول ہو

حامی ترا خدا اور خدا کا رسول ہو

تاریخ وفات ۲۹ ستمبر ۱۹۶[illegible]ء

نواب فخر یار جنگ مرحوم کی قبر سے اندازاً سو میٹر جانب جنوب ایک احاطے میں مشہور شاعر ساغر صدیقی کی قبر ہے، ساغر بہت اچھے شاعر تھے، ان کے کلام کے مجموعے غم بہار، لوحِ جنوں، شب آگہی، شیشۂ دل، اور مقتل گل کے عنوانات سے چھپ چکے ہیں، ان کی عمر زیادہ نہیں ہوئی، انھوں نے گھٹیا قسم کا نشہ استعمال کرنا شروع کر دیا تھا جو بالآخر جان لیوا ثابت ہوا۔

ان کی لوحِ مزار پر یہ عبارت ہے،

اللہ

حق حق حق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وہاں اب تک سنا ہے سونے والے چونک اٹھتے ہیں
صدا دیتے ہوئے جن راستوں سے ہم گذر آئے (ساغر)

درویش شاعر صدیقی رحمۃ اللہ علیہ

تاریخ وصال ۱۸ جولائی ۱۹۷۴ء لاہور

ساغر صدیقی مرگیا،
ایک شاعر مرگیا،
ایک فقیر مرگیا

ایک انسان مرگیا، سب مرجاتے ہیں، مرنا سب کو ہے لیکن کچھ زندہ رہ کر بھی مُردوں میں ہوتے ہیں، کچھ مرکر بھی زندہ رہتے ہیں، ساغر بھی انہی میں سے ہے، اس لئے کہ اسے اپنے عہد کے معاشرے نے قتل کیا، اور معاشرہ ساغر کا قاتل ہے، روشنی، سچائی، اور نیکی کا قاتل اس لئے کہ ساغر روشنی، سچائی اور نیکی کا پیغامبر تھا،

منجانب خواجہ محمد شفیع مبارک علی لاہور

(ساغر میموریل)

بھاول پور روڈ سے جو راستہ حضرت طاہر بندگیؒ کی درگاہ کی طرف جاتا ہے، اس سے اندازاً پچاس میٹر کے فاصلہ پر برلب شاہراہ مشہور صحافی ابوسعید بزمی صاحب کی قبر ہے، وفات کے وقت موصوف روزنامہ احسان لاہور کے اڈیٹر تھے، وہ صحافیوں کے ایک وفد کے ساتھ امریکہ کا دورہ کر رہے تھے، کہ اچانک ہی لاس اینجلیز میں فوت ہوگئے، بزمی صاحب نے تاریخ انقلابات عالم، جب خون بہہ رہا تھا، ریاستوں کی سیاست، زندگی کے جائزے، اور "مولانا ابوالکلام آزاد تنقید اور تبصرہ کی نگاہ میں" کے عنوانات سے چند کتابیں، اپنی یادگار چھوڑی

ہیں، بزمی صاحب کی لوحِ مزار پر یہ عبارت ہے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرقد

سید ابوسعید بزمی

جو ۵ ارستمبر ۱۹۵۱ء کو لاس انجلیز امریکہ میں انتقال

فرما گئے، اور یہاں ان کی تدفین عمل میں لائی گئی

انا للہ و انا الیہ راجعون

بزمی صاحب کی قبر سے چھ سات میٹر کے فاصلہ پر بوٹا پہلوان کی قبر کے پاس مشہور افسانہ نویس سعادت حسن منٹو کی قبر ہے، وفات سے کچھ عرصہ پہلے منٹو پر فحش نگاری کے جرم میں مقدمہ بھی چلا تھا، منٹو نے اپنی قبر کا کتبہ خود لکھا تھا، ان کی لوح مزار پر یہ عبارت ہے،

۷۸۶

میری قبر کا کتبہ

یہ

لوح

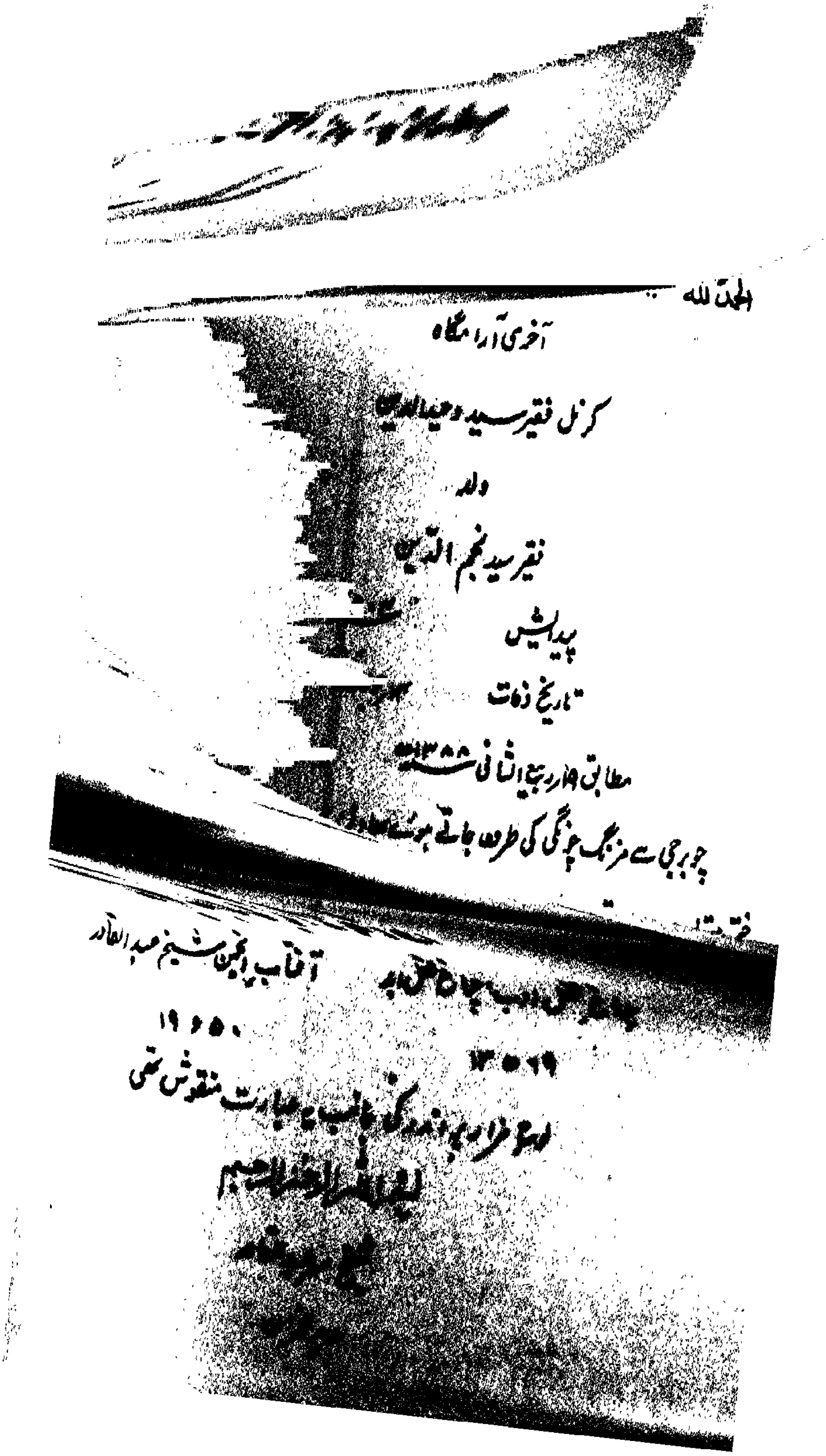
سعادت حسن منٹو کی قبر کی ہے

جو اب بھی سمجھتا ہے کہ اس کا نام

لوحِ جہاں پر

حرفِ مکرر نہیں تھا (منٹو)

پیدائش ۱۱ر مئی ۱۹۱۲ء وفات ۸ر جنوری ۱۹۵۵ء



الحمد لله
آخری آرامگاہ
کرنل فقیر سید وحید الدین
ولد
فقیر سید نجم الدین
پیدائش
تاریخ وفات
چوبرجی سے مزنگ چونگی کی طرف جاتے ہوئے
آفتاب پنجاب شیخ عبدالقادر
۱۹۵۰ء
۱۳۶۹ھ
منقوش تھی

فتنک

(ابن پردیں رقم)

... کے ذریعہ

... رسانی اس

... ، جو صاحب کی قبر سے مغرب کی طرف

... بدالعزیز فلک پیما آسودۂ خاک ہیں

... ن سے حبیب چھپ چکی ہیں، اس کتاب کے دیباچہ میں

... کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے:-

... محبت سے فیض یاب، چہرے پر رونق،

... آنکھوں میں ایک ظلمتی نگاہ، دل کے طوفانوں کی پردہ دار، اپنے کام میں ماہر، گوناگوں تفریحات سے لطف اندوز، غلطیوں سے بے پرواہ، ناشائستگی سے متنفر، حسن کا جو شنکار، معاشرتی آزادی کا علم بردار، محفلوں میں خون حیات دوڑانے والا، نفع رساں، غرض مند، سیاست، مذہب، فلسفہ، اس کے پھندے میں گرفتار، خود دار، شیریں، ظریف، جس کے خیالات میں گریز، درگریز، جس کی تحریر کی ہر دوسری سطر میں ایک انوکھی اچھوتی بات، جس کی زبان میں آزادی اور دلکشی جس کی

ابو سعید بزمی صاحب کی قبر سے حضرت طاہر بندگیؒ کی درگاہ کی طرف چلیں تو اس کے موڑ پر ایک چبوترے پر سر شیخ عبدالقادر مدیر مخزن کی قبر ہے، اُن کی قبر پر ایک چھتری بنی ہوئی تھی جو حال ہی میں زمیں بوس ہو گئی ہے، اسی صدمے سے ان کی لوحِ مزار بھی ٹوٹ پھوٹ گئی ہے، جس وقت ان کی قبر کی لوح صحیح و سالم تھی، تو اس کے باہر کی جانب یہ عبارت تھی،

نوّر اللہ تربتھم

وادخلناھم بجنات نعیم

اللہ جلّ جلالہ

کاوہ خاکسار بندہ جس کے قلبِ متین میں زندگی کے مسلسل نشیب و فراز کے.....

دوران خاکساری اور تسلیم و رضا، جاگزیں رہی

جو علم پرور بھی تھا

اور

علم دوست بھی

اسے ڈھونڈا کریں گی اب نگاہیں

چراغِ محفلِ ادب، چراغِ محفلِ ابد آفتابِ انجمن شیخ عبدالقادر

۱۳۶۹ھ ۱۹۵۰ء

لوحِ مزار پر اندر کی جانب یہ عبارت منقوش تھی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شیخ سر عبدالقادر

مدیر مخزن۔

پیدائش سنہ ۱۸۷۴ء وفات ۹ر فروری سنہ ۱۹۵۰ء

شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں

(اقبال)

خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کردیں

(ابن پردیس رقم)

سر شیخ عبدالقادر اردو زبان کے بہت بڑے محسن تھے، انھوں نے مخزن کے ذریعہ اقبال کو علمی حلقوں میں متعارف کرایا تھا، اقبال نے بانگ درا کا دیباچہ انہی سے لکھوایا تھا۔ شیخ عبدالقادر کی قبر سے چھ سات میٹر جانب شمال مشرق مزدور شاعر احسان دانش کی آخری آرامگاہ ہے لیکن اس پر ہنوز ابھی لوح نہیں لگی۔ شیخ صاحب کی قبر سے مغرب کی طرف اندازاً تین میٹر کے فاصلہ پر مشہور انشاء پرداز میاں عبدالعزیز فلک پیما آسودۂ خاک ہیں۔ ان کی نگارشات "مضامین فلک پیما" کے عنوان سے چھپ چکی ہیں، اس کتاب کے دیباچہ میں میاں بشیر احمد مدیر ہمایوں نے صاحبِ کتاب کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے :-

"میانہ قد، گٹھیلا بدن جسمانی و ذہنی صحت سے فیض یاب، چہرے پر رونق، آنکھوں میں ایک مطمئن نگاہ و دل کے طوفانوں کی پردہ دار، اپنے کام میں ماہر گوناگوں تفریحات سے لطف اندوز، غلطیوں سے بے پرواہ ناشائستگی سے متنفر حسن کا ہوشمند شکار، معاشرتی آزادی کا علم بردار، محفلوں میں خون حیات دوڑانے والا، نفع رساں، غرض مند، سیاست، مذہب، فلسفہ، اس کے پھندے میں گرفتار، خوددار، متین، ظریف، جس کے خیالات میں گریز، درگریز، جس کی تحریر کی ہر دوسری سطر میں ایک انوکھی اچھوتی بات، جس کی زبان میں آزاد دلنشی جس کی

طرز بیان میں بے ساختگی، یہ ہے فلک پیما کی ایک نامکمل سی تصویر،
فلک پیما، کی لوحِ مزار پہ یہ عبارت ہے

۷۸۶

هو العزیز

مرقد میاں عبد العزیز (فلک پیما)

خلف الرشید حاجی شیخ محمد عوض

پیدائش:- ۱۸۷۹ء موچی دروازہ لاہور

وفات:- لاہور، ۷ مئی ۱۹۵۱ء

تاریخ وفات

بس کہ اس کا نام تھا عبد العزیز
سال ذی عزت فلک پیما ہوا

۱۳۷۰ھ

اقرأ باسم ربک .... مالم یعلم

آخری سطر میں اردو عبارت درج تھی، وہ اب سیمنٹ کے نیچے دب گئی ہے،
حضرت طاہر بندگیؒ کے مزار مبارک سے جنوب کی طرف اندازاً بیس میٹر کے فاصلہ پہ مشہور صحافی اور ادیب مولانا محمد وارث کامل کی قبر ہے، مرحوم کافی عرصہ تک "مدینہ" بجنور اور ہفت روزہ چٹان لاہور کے عملۂ ادارت میں رہے، انھیں علامہ تاجور نجیب آبادی کا قرب حاصل تھا، انھوں نے محمد حسین ہیکل کی تصنیف سیرۃ الرسول کا اردو میں ترجمہ کیا ہے، اُن کی لوحِ مزار پہ یہ عبارت ہے،

۴۸۶

ما عرفناک حق معرفتک

مولانا محمد وارث کامل مرحوم

بروز یک شنبہ مورخہ ۲۳ر اکتوبر ۱۹۶۰ء

ہے فکر کہ ہو کندہ سرِ لوحِ مزار

تاریخ کوئی سپئے محمد وارث

ہاتف نے کہا قمرؔ یہ مصرع لکھ دو

دنیا سے اٹھ گئے محمد وارث

۱۳۸۰ھ

تخلص سے تو یہی مترشح ہوتا ہے، کہ یہ تاریخ قمر میرٹھی نے کہی تھی،

گورستانِ میانی صاحب کے عین وسط میں جنازہ گاہ اور غازی علم الدین شہیدؒ کے مزار کے درمیان، ایک قدِ آدم چبوترہ پر لاہوری مرزائیوں کی قبریں ہیں، ان میں سب سے نمایاں قبریں مولوی محمد علی لاہوری اور خواجہ کمال الدین کی ہیں، مولوی محمد علی کی ریلیجس آف اسلام اور قرآن حکیم کے انگریزی ترجمہ کی بہت شہرت ہوئی، مگر اس ترجمۂ قرآن کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریابادی فرماتے ہیں، کہ اس میں بہت سی خامیاں ہیں، غلطیاں ہیں بلکہ بعض جگہ تو ایسی جسارتیں کی گئی ہیں، کہ ان کے ڈانڈے تحریف سے مل جاتے ہیں،

مولوی صاحب کی لوحِ مزار پر یہ عبارت ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

ومن یطع اللہ والرسول فاولٰٓئک مع الذین انعم اللہ علیہم

من النبیین والصدیقین والشہداء والصّٰلحین وحسن اولٰٓئک رفیقا

مرقد پُر نور

مجاہد اعظم سلطان القلم مفسر قرآن مجید مبلغ دین اسلام و شہید قوم حضرت مولانا

محمد علی رحمۃ اللہ علیہ (ایم، اے، ایل ایل بی)

امیر جماعت و صدر احمدیہ انجمن اشاعت اسلام لاہور

جنھوں نے سنہ ۱۹۰۱ء میں اپنے زریں دنیاوی مستقبل کو قربان کرکے دین کو دنیا پر مقدم کرنے کا نمونہ پیش کیا، اور مسلسل پچاس سال تک اسلام کی تائید اور دشمنانِ اسلام کے اعتراضات کے جواب میں پچاس ہزار صفحات تحریر فرمائے، جو دنیا کی مختلف زبانوں میں شائع ہوئے، قرآن مجید کی تفاسیر لکھ کر معارف و حقائق کے، ایسے دریا بہا دیئے، کہ ھو الذی ارسل رسولہ بالہدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ کا نظارہ سامنے آگیا، اس عاشق قرآن نے اپنے ترجمۃ القرآن انگریزی کے چوتھی اڈیشن کی مکمل نظرثانی اور تکمیل کے بعد قرآن مجید کی [ا]لتجا ... [ا]نتقل بنیادر کھتے ہوئے، ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۱ء مطابق ۱۰ محرم الحرام ۱۳۷۱ھ کو شہادت پائی انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی

فی عبادی وادخلی جنتی

خواجہ کمال الدین مرزائیوں کی لاہوری جماعت کے بانی مبانی تھے مولانا عبید اللہ سندھی کی یہ رائے ہے کہ پہلی عالمی جنگ کے دوران میں حسین شریف مکہ اور انگریزوں کے درمیان سازباز کرانے میں خواجہ کمال الدین نے اہم کردار ادا کیا تھا، موصوف کی لوح مزار یہ

یہ عبارت ہے :-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ومن احسن قولا ممن دعا الی اللہ وعمل صالحاً وقال اننی من المسلمین

مرقد

حضرت خواجہ کمال الدین صاحب الملقب بہ حسن بیان

مبلغ اسلام و بانی مسلم مشن ووکنگ انگلستان

یعنی شمع رسالت کا وہ پروانہ، بیقرار گلشن توحید کا وہ بلبل نغمہ سنج علم و فضل کا وہ بحر بیکراں تبلیغ اسلام کا وہ عاشق دلدادہ جس نے اپنی زندگی کو اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے وقف کر دیا، اور کفرستان فرنگ میں برابر بیس (۲۰) سال علم توحید بلند رکھا، اور جو ۶۳ سال کی عمر میں بتاریخ ۲۹ شعبان المعظم ۱۳۵۱ھ .. ..

(یہاں ایک سطر اور تھی جو اب سیمنٹ میں دب گئی ہے۔)

خواجہ کمال الدین کی وفات دسمبر ۱۹۳۲ء میں ہوئی تھی، مولوی محمد علی اور خواجہ کمال الدین کی قبروں کے کتبے دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ مرزائی خدمت اسلام کے کتنے بلند بانگ دعوے کرنے کے عادی ہیں۔

گلبرگ کے ڈی بلاک میں سڑک کے کنارے ایک چھوٹا سا قبرستان ہے، اس قبرستان کے شمال مشرقی کونے میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کے سابق وائس چانسلر پروفیسر حمید احمد خاں محوخواب ابدی ہیں، پروفیسر موصوف مولانا ظفر علی خاں کے حقیقی بھائی تھے۔

حمید احمد خاں مرحوم انگریزی پڑھاتے اور اردو لکھتے تھے، ان کا شمار اردو زبان کے اچھے انشاپردازوں میں ہوتا ہے، یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوش

ہونے کے بعد موصوف ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ اور مجلسِ ترقیٔ ادب سے وابستہ رہے۔ انھوں نے حضورؐ ختمی مرتبت کی سیرت پر ایک کتاب اپنی یادگار چھوڑی ہے۔ ان کی قبر پر جو سنگ مرمر لگا ہوا ہے، اس کی مالیت ۱۲ ہزار روپیہ بتائی جاتی ہے۔ ان کی قبر کی تعویذ پر یہ عبارت ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

والذین آمنوا وعملوا الصالحٰت اولٰئک اصحاب الجنۃ ھم فیھا خٰلدون،

پروفیسر حمید احمد خاں

۱۰ر شعبان سنہ ۱۳۲۱ھ ۲۷ر صفر سنہ ۱۳۹۴ھ

یکم نومبر ۱۹۰۳ء ۲۲ر مارچ ۱۹۷۴ء

چوں بمیرم، از غبار من چراغِ لالہ ساز

تازہ کن داغِ مرا، سوزاں بہ صحرائے مرا

گلبرگ میں کئی قبرستان ہیں جن میں سے ایک گورو مانگٹ کا قبرستان کہلاتا ہے۔ اس قبرستان کے وسط میں سب سے نمایاں قبر مشہور افسانہ نویس و ناول نگار خدیجہ مستور کی ہے۔ ان کے افسانوں کے دو مجموعے "کھیل" اور "بوچھاڑ" کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ ان کو ان کے ایک ناول "آنگن" پر آدم جی ایوارڈ بھی ملا تھا۔ ان کا انتقال لندن کے ایک ہسپتال میں ہوا، اور ان کی میت لاہور لا کر دفن کی گئی۔ اُن کی لوحِ مزار کے باہر کی جانب یہ عبارت ہے:

النصیر

خدیجہ مستور

تاریخ وفات

۲۶ر جولائی سنہ ۱۹۸۲ء

قصر خلد آنکھوں میں، پھر بھی لب پہ قدر آفاق کی
مرتے دم تک یہ بصیرت وجہ حیرت ہے بہت
بجھ رہی تھی شمعِ ہستی، تب خدیجہ نے کہا:
ماہ و انجم کی یہ دنیا خوبصورت ہے بہت

۱۹۶۸۲

لوح کے اندر کی جانب یہ عبارت ہے:

السَّتَّار

خدیجہ مستور

زوجہ

ظہیر بابر

والدہ

پرویز بابر ○ کرن بابر

چمنِ عشق بنی میں آ تسا اٹھیں نکہات خدیجہ مستور
اسی گلپوشش لحد سے ابھرے ماہ درجات خدیجہ مستور

۱۹۶۸۲

اسی قبرستان کے شمالی مغربی کونے میں پاکستان کے سابق چیف جسٹس محمد منیر کی قبر ہے، منیر صاحب نے گورنر جنرل غلام محمد کے پارلیمنٹ توڑنے کے اقدام کو جائز قرار دیکر پاکستان میں جمہوری نظام کا گلا دبا دیا تھا، ۱۹۵۳ء میں جب قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کیلئے تحریک چلی تھی، تو اس تحریک کے خاتمہ پر موصوف ہی کو ایک تحقیقاتی کمیشن کا سربراہ مقرر کیا گیا تھا،

انھوں نے اس تحریک کے بارے میں جو رپورٹ پیش کی تھی، وہ منیر رپورٹ کے نام سے مشہور ہے
ان کو دینی اور سیاسی حلقوں میں ناپسند کیا جاتا ہے، ان کی لوح مزار پر یہ عبارت ہے :-

۷۸۶

محمد منیر

چیف جسٹس پاکستان

چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ

ممبر پنجاب باؤنڈری کمیشن

ولد

ڈاکٹر محمد بخش

۳ مئی ۱۸۹۵ء ، ۲۶ جون ۱۹۷۹ء

ماہنامہ معارف بابت ماہ اگست ۱۹۸۲ء میں شاعر رومان اختر شیرانی کی لوح مزار
پر کے شعر میں کتابت کی غلطی ہوگئی ہے اصل شعر یوں ہے :

دامان خسرا بہ زار میں ہے
اک شاعر نوجوان کی تربت

دارالمصنفین کی ادبی خدمات

اسلام اور مستشرقین پر دار المصنفین کا بین الاقوامی سیمنار

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن

(۸)

ڈاکٹر عبد الصبور مرزوق کی اہم تقریر کے بعد جلسہ کے ناظم جناب ڈاکٹر سید سلمان ندوی نے ان مقالہ نگاروں کے نام کا اعلان کیا جن کے مقالے وقت کی کمی کی وجہ سے پڑھے نہ جا سکے، ان سے معذرت کی گئی اور یقین دلایا گیا کہ یہ مقالے آیندہ شایع ہوں گے، ان مقالہ نگاروں کے نام اور ان کے مقالات کے عنوانات یہ تھے:

(۱) المستشرقون والسیرۃ النبویۃ از الدکتور عماد الدین خلیل (عراق)، (۲) المستشرقون والاسلام از الاستاذ انور الجندی (مصر) (۳) المستشرقون والقرآن از ایضاً (۴) المستشرقون والسنۃ از ایضاً (۵) المستشرقون والسیرۃ النبویۃ از ایضاً (۶) المستشرقون والتاریخ از ایضاً (۷) ہذا ھو الاستشراق فماھی علاقتنا نحوہ از مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی (استاذ ندوۃ العلماء لکھنؤ) (۸) اسلام اینڈ دی اورینٹلسٹ، از جناب محی الدین صاحب (لکھنؤ) (۹) مغرب کا تصور اسلام اور اس کا سیاسی پہلو، از ڈاکٹر عماد الحسن آزاد فاروقی (جامعہ ملیہ نئی دہلی) (۱۰) کیا حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت

مدنی سورتوں میں کی سورتوں سے مختلف ہے؟ اسپرنگر اور وینسک کے اعتراضات، از مولانا ضیاء الدین اصلاحی (دارالمصنفین اعظم گڈھ) (۱۱) اسلام اینڈ دی اورینٹلسٹ، از قاضی عبدالحمید (اندور) (۱۲) اسلام اینڈ دی اورینٹلسٹ از عبداللہ سرفراز (الہ آباد) (۱۳) استشراق اور اسلام کل اور آج از ڈاکٹر عابد رضا بیدار، ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری (پٹنہ) (۱۴) مستشرقین اور علامہ محمد اقبال از پروفیسر جگن ناتھ آزاد (جموں یونیورسٹی)

ڈاکٹر عبدالکریم ساتو | اس آخری نشست کے وقفہ کے بعد جو کارروائی شروع ہوئی تو اس کی صدارت قطر کے علامہ یوسف القرضاوی نے کی، نظامت کے فرائض جناب مولانا رابع ندوی صاحب نے انجام دیے، سب سے پہلے جاپان کے ممتاز فاضل اور عالمی مساجد کونسل کے ممبر جناب ڈاکٹر عبدالکریم ساتو کو مجمع کو خطاب کرنے کی دعوت دی گئی، انھوں نے انگریزی میں اپنی مختصر تقریر میں اس سمینار کے انعقاد اور اس کے بحسن وخوبی خاتمہ پر اپنی خوشی کا اظہار کیا، پھر انھوں نے بتایا کہ وہ پشاور اور لاہور سے افغانی مہاجرین کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد اس سمینار میں شرکت کے لیے آئے ہیں، وہ زیادہ تر افغانی مہاجرین کی مالی اور مادی امداد کرنے کی طرف توجہ دلاتے رہے، پھر بتایا کہ جاپان میں اسلام کی اشاعت کی عمر زیادہ نہیں لیکن بحمداللہ وہاں مسلمان تیزی سے بڑھ رہے ہیں، وہاں ان کی مسجدیں اور انجمنیں ہیں وہ اسلام کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں اور عالم اسلام کے بھائیوں سے تعاون کے خواستگار ہیں۔

علامہ یوسف القرضاوی | ڈاکٹر عبدالکریم ساتو کے بعد علامہ یوسف القرضاوی نے عربی میں ایک جامع اور پُراثر تقریر موقع کی مناسبت سے کی، جس کا خلاصہ یہ ہے:

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہم کو یہ مبارک موقع عطا فرمایا، آج ہم ایک پلیٹ فارم پر اس لیے جمع ہوئے ہیں کہ اسلام کی خدمت علمی انداز سے کرسکیں اور یہ خدمت اسلام اور دور حاضر کی زبانوں میں ہو، اللہ تعالیٰ نے ہم کو یہاں اس لیے بھی جمع کیا ہے کہ ہم اس کے اور اس کے دین کی نصرت وکامرانی کے لیے میدان عمل میں اتریں، دعا ہے کہ اس کی مدد ہمارے شامل حال ہو، ہم خوش قسمتی سے ایک نئی صدی

یعنی پندرہویں صدی ہجری میں داخل ہو رہے ہیں، جب کہ ہم کو اپنا جائزہ لینا چاہیئے اور اپنا احتساب کرکے ہم سلب سے ایجاب، قول سے عمل اور انتشار سے اتحاد کی طرف گامزن ہوں، عیسائی مبلغوں، اسلام دشمن طاقتوں اور مستشرقین نے ماضی میں اپنے مادی اور فکری حملوں سے مسلمانوں کو دفاعی محاذ پر لا کھڑا کیا ہے، اور اس حالت دفاع میں ہم سوائے معذرت کرنے کے زیادہ کچھ نہ کرسکے، معذرت کا رویہ اور کمزوری کا احساس اور اظہار اب ختم ہونا چاہیئے، مغرب کی سیاسی اور فکری بالادستی نے آخر انسانیت کو کیا دیا؟ ان لوگوں نے چاند پر کمندیں ڈالیں، وہاں سے مٹی اور پتھر لائے، لیکن اس ارضی سیارہ میں رہ کر اپنے نفس پر تو کوئی کمند نہ ڈال سکے اور نہ رنج و غم سے دامن چھڑا سکے، نہ خوف و دہشت سے آزاد ہو سکے، اور نہ اس روحانی سعادت کی جھلک پا سکے جس کا امتیاز سرمایۂ سکون و طمانیت ہے، یہ چیز ان کے ہاتھ کیسے آسکتی تھی، یہ تو ایمان حقیقی کے ادراک سے ملتی ہے، کیا یہ مارکسیت کے دست مادیت سے مل سکتی ہے، یا وجودیت اس کو وجود میں لا سکتی ہے؟ یا مسخ شدہ مسیحیت اس کو بازیافت کر سکتی ہے؟ نہیں، یہ نسخۂ کیمیا صرف اسلام کی حیات بخش تعلیمات میں موجود تھا، عقل و دل، دنیا و آخرت، مادہ و روح، حق و فرض، فرد کی مصلحت اور معاشرہ کی ضرورت کی بیک وقت جامعیت کا نمونہ کہیں اور بھی ہے؟ صرف اسلام کے پیغام میں یہ قوت اور اثر ہے کہ وہ انسان کو براہ راست مخاطب اور متاثر کر سکتا ہے، یہ انسان خواہ مشرق کا ہو یا مغرب کا، خلوت میں ہو یا جلوت میں، خاندان میں ہو یا معاشرہ میں، اسلام ہر حال میں اس سے مخاطب ہے، لیکن اسلام کی اس قوت اور تاثیر کے باوجود ہم خود کمزور بنتے گئے، اس کے تاریخی اور سیاسی اسباب جو بھی رہے ہوں، لیکن یہی حقیقت ہے کہ مغربی تہذیب کے زیب و زینت اور چمک دمک اور اس کی ترقی و بالادستی سے ہماری پلکیں جھپکتی رہیں، اس تہذیب کے علمبرداروں کے سیاسی، فوجی اور سائنسی غلبہ سے ہم مرعوب بھی رہے، لیکن یہ ایک وقتی بات تھی، ہم کو اس سے چھٹکارا پانا تھا، اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم بڑی حد تک مغرب کی طلسم کاریوں سے نکل آئے ہیں، اب ہمارا رویہ معذرت خواہانہ نہ ہونا چاہیے، مستشرقین نے ہمارے مذہب کے بارے میں بے شمار غلط فہمیاں پھیلائیں، اپنی علمی اور تحقیقی زرکاریوں سے ہماری نسلوں کو متاثر کرنے میں کامیاب بھی ہوئے لیکن یہ دور گذر چکا، جس طرح ہر فریب، ہر سازش اور ہر جھوٹ کا

مدنی سورتوں میں کی سورتوں سے مختلف ہے؟ اسپرنگر اور ونینک کے اعتراضات، از مولانا ضیاء الدین اصلاحی (دار المصنفین اعظم گڈھ) (۱۱) اسلام اینڈ دی اورینٹلسٹ، از قاضی عبد الحمید (لاہور) (۱۲) اسلام اینڈ دی اورینٹلسٹ از عبد اللہ سرفراز (الہ آباد) (۱۳) استشراق اور اسلام، کل اور آج، از ڈاکٹر عابد رضا بیدار، ڈائرکٹر خدا بخش لائبریری (پٹنہ) (۱۴) مستشرقین اور علامہ محمد اقبال از پروفیسر جگن ناتھ آزاد (جموں یونیورسٹی)

<u>ڈاکٹر عبد الکریم ساتو</u> اس آخری نشست کے وقفہ کے بعد جو کارروائی شروع ہوئی تو اس کی صدارت قطر کے علامہ یوسف القرضاوی نے کی، نظامت کے فرائض جناب مولانا رابع ندوی صاحب نے انجام دیے، سب سے پہلے جاپان کے ممتاز فاضل اور عالمی مساجد کونسل کے ممبر جناب ڈاکٹر عبد الکریم ساتو کو مجمع کو خطاب کرنے کی دعوت دی گئی، انھوں نے انگریزی میں اپنی مختصر تقریر میں اس سیمنار کے انعقاد اور اس کے بحسن و خوبی خاتمہ پر اپنی خوشی کا اظہار کیا، پھر انھوں نے بتایا کہ وہ پشاور اور لاہور سے افغانی مہاجرین کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد اس سمینار میں شرکت کے لیے آئے ہیں، وہ زیادہ تر افغانی مہاجرین کی مالی اور مادی امداد کرنے کی طرف توجہ دلاتے رہے، پھر بتایا کہ جاپان میں اسلام کی اشاعت کی عمر زیادہ نہیں لیکن بحمد للہ وہاں مسلمان تیزی سے بڑھ رہے ہیں، وہاں ان کی مسجدیں اور انجمنیں ہیں، وہ اسلام کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں اور عالم اسلام کے بھائیوں سے تعاون کے خواستگار ہیں۔

<u>علامہ یوسف القرضاوی</u> ڈاکٹر عبد الکریم ساتو کے بعد علامہ یوسف القرضاوی نے عربی میں ایک جامع اور پُر اثر تقریر موقع کی مناسبت سے کی، جس کا خلاصہ یہ ہے:

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہم کو یہ مبارک موقع عطا فرمایا، آج ہم ایک پلیٹ فارم پر اس لیے جمع ہوئے ہیں کہ اسلام کی خدمت علمی انداز سے کر سکیں اور یہ خدمت اسلام اور دور حاضر کی زبانوں میں ہو، اللہ تعالیٰ نے ہم کو یہاں اس لیے بھی جمع کیا ہے کہ ہم اس کے اور اس کے دین کی نصرت و کامرانی کے لیے میدان عمل میں اتریں، دعا ہے کہ اس کی مدد ہمارے شامل حال ہو، ہم خوش قسمتی سے ایک نئی صدی

یعنی پندرہویں صدی ہجری میں داخل ہو رہے ہیں، جب کہ ہم کو اپنا جائزہ لینا چاہیئے اور اپنا احتساب کر کے ہم سلب ایجاب، قول سے عمل اور انتشار سے اتحاد کی طرف گامزن ہوں، عیسائی مبلغوں، اسلام دشمن طاقتوں اور مستشرقین نے ماضی میں اپنے مادی اور فکری حملوں سے مسلمانوں کو دفاعی محاذ پر لا کھڑا کیا ہے، اور اس حالت دفاع میں ہم سوائے معذرت کرنے کے زیادہ کچھ نہ کر سکے، معذرت کا رویہ اور کمزوری کا احساس اور اظہار اب ختم ہونا چاہیئے، مغرب کی سیاسی اور فکری بالادستی نے آخر انسانیت کو کیا دیا؟ ان لوگوں نے چاند پر کمندیں ڈالیں، وہاں سے مٹی اور پتھر لائے، لیکن اس ارضی سیارہ میں رہ کر اپنے نفس پر تو کوئی کمند نہ ڈال سکے اور نہ رنج و غم سے دامن چھڑا سکے، نہ خوف و دہشت سے آزاد ہو سکے، اور نہ اس روحانی سعادت کی جھلک پا سکے جس کا امتیاز سرمایۂ سکون و طمانیت ہے، یہ چیز ان کے ہاتھ کیسے آ سکتی تھی، یہ تو ایمان حقیقی کے ادراک سے ملتی ہے، کیا یہ مارکسیت کے دست مادیت سے مل سکتی ہے، یا وجودیت اس کو وجود میں لا سکتی ہے؟ یا مسخ شدہ مسیحیت اس کو بازیافت کر سکتی ہے؟ نہیں، یہ نسخۂ کیمیا صرف اسلام کی حیات بخش تعلیمات میں موجود تھا، عقل و دل، دنیا و آخرت، مادہ و روح، حق و فرض، فرد کی مصلحت اور معاشرہ کی ضرورت کی بیک وقت جامعیت کا نمونہ کہیں اور بھی ہے؟ صرف اسلام کے پیغام میں یہ قوت اور اثر ہے کہ وہ انسان کو براہ راست مخاطب اور متاثر کر سکتا ہے، یہ انسان خواہ مشرق کا ہو یا مغرب کا، خلوت میں ہو یا جلوت میں، خاندان میں ہو یا معاشرہ میں، اسلام ہر حال میں اس سے مخاطب ہے، لیکن اسلام کی اس قوت اور تاثیر کے باوجود ہم خود کمزور بنتے گئے، اس کے تاریخی اور سیاسی اسباب جو بھی رہے ہوں لیکن یہی حقیقت ہے کہ مغربی تہذیب کے زیب و زینت اور چمک دمک اور اس کی ترقی و بالادستی سے ہماری پلکیں جھپکتی رہیں، اس تہذیب کے علمبرداروں کے سیاسی، فوجی اور سائنسی غلبے سے ہم مرعوب بھی رہے، لیکن یہ ایک وقتی بات تھی، ہم کو اس سے چھٹکارا پانا تھا، اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم بڑی حد تک مغرب کی طلسم کاریوں سے نکل آئے ہیں، اب ہمارا رویہ معذرت خواہانہ نہ ہونا چاہیے، مستشرقین نے ہمارے مذہب کے بارہ میں بے شمار غلط فہمیاں پھیلائیں، اپنی علمی اور تحقیقی زیبائیوں سے ہماری نسلوں کو متاثر کرنے میں کامیاب بھی ہوئے، لیکن یہ دور گذر چکا، جس طرح ہر فریب، ہر سازش اور ہر جھوٹ کا

ایک وقت ہوتا ہے، اسی طرح ان مستشرقین کا بھی ایک وقت تھا جو اب ختم ہو چکا ہے، ان کا اصلی چہرہ اب سامنے آگیا ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ وہ طاقت ور نہیں تھے بلکہ ہم کمزور تھے، خرگوش اور لومڑی کے اس قصے کی طرح کہ جب ایک لومڑی نے خرگوش کو دبوچا تو وہ چیخا، اس کی چیخ سن کر لومڑی کو اپنی طاقت کا احساس ہوا، اس وقت خرگوش نے کہا میں اس لیے نہیں چیخا کہ تمہاری گرفت سخت تھی، میں صرف اپنی کمزوری کو سوچ کر چیخا، تم طاقت ور نہیں ہو، ہاں میں کمزور ضرور ہوں، تو واقعہ یہی ہے کہ ہم مسلمان کمزور ہو گئے، ورنہ مستشرقین کے یہاں کوئی ایسا علمی انکشاف نہیں، جو نیا اور اچھوتا ہو اور جس کا جواب نہ ہو سکتا ہو، ان کے بعض اعتراضات اور شبہات تو ایسے ہیں کہ علمی دیانت اور متانت کو ہنسی آجاتی ہے، اب ہم کمزور نہیں رہے، بلکہ اب ہم اس دور میں ہیں جب حسن قبول ہمارے لیے چشم براہ ہے، یہ عمل کا دور ہے، گذشتہ صدیاں سرمایہ داری اور اشتراکیت کی تھیں، موجودہ صدی اسلام کی فتح مندی اور کامرانی کی ہے، ہم عہد ساز بن سکتے ہیں، جس کے بعد ہماری آیندہ نسلیں ہمارا محاسبہ کریں گی تو شاید وہ یہ اعتراف کریں کہ ہم نے اپنے دور میں دین کی خدمت میں کوئی کوتاہی نہیں کی، ہم سے کوتاہی کیوں ہو، ہمارے پاس وسائل ہیں، قوت ہے، ہماری آبادی تقریباً ایک ارب ہو رہی ہے، جو معمولی قوت نہیں، اللہ تعالیٰ نے جن احسانات کا ذکر کیا ہے ان میں ایک یہ بھی ہے وَاذْكُرُوا إِذْ كُنتُمْ قَلِيلًا فَكَثَّرَكُمْ (اعراف) یعنی یاد کرو جب تم تھوڑے سے تھے تو اللہ نے تم کو زیادہ کیا، ہمارے پاس معدنی دولت ہے، زمین کے سرسبز اور شاداب علاقے بھی ہماری ملکیت میں ہیں، اور سب سے بڑھ کر ہمارے پاس روحانی دولت کا خزانہ ہے، ہم عظیم ترین پیغام اور طاقت ور ترین عقیدے کے حامل ہیں، ہمارے پاس قابل فخر تہذیبی و تمدنی ورثہ بھی ہے، پھر ہم کیوں کمزور بنیں، ہم اللہ تعالیٰ کا جتنا شکر ادا کریں کم ہے، یہ سمینار اپنے فرائض کی ادائیگی کیلئے ایک بہترین یاد دہانی ہے، خواب غفلت سے بیدار ہونے کا ایک ذریعہ ہے، اس میں ایسے علماء و فضلاء موجود ہیں جو اس فرض کو بحسن و خوبی انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان سے یہ کام لے سکتا ہے، اور کیا عجب کہ یہ سمینار اسلام کے غلبۂ نو، اس کے علم کی سربلندی اور دنیا میں حکومت اسلامیہ کے قیام کے لیے ایک نقطۂ آغاز

ثابت ہو، میں سمینار کے شرکاء اس کے کارکنوں اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کا شکر گزار ہوں اور ان سب حضرات کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس سمینار کے انعقاد، نگرانی، بحث و مباحثہ، مقالہ خوانی اور مقالوں کے عربی اور اردو ترجمے کرنے میں حصہ لیا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہماری غلطیوں سے درگذر فرمائے اور ہم کو حق پر ثبات کی توفیق بخشے اور ہمیں اپنی مدد کا مستحق بنائے، وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔

زیادہ تر مجمع اس عربی تقریر کو سمجھ نہیں رہا تھا، لیکن فاضل خطیب کی شان خطابت سے متاثر تھا اور جب اس کا خلاصہ اردو میں سنایا گیا تو سامعین کے چہروں سے اس تقریر کی بشارت سے بشاشت کے غیر معمولی آثار نمایاں تھے، سمینار میں اس کا اہتمام تھا کہ اردو کے مقالات اور تقریروں کا خلاصہ عربی میں کیا جاتا، اسی طرح عربی میں تقریروں اور مقالوں کا ترجمہ اردو میں کر دیا جاتا، یہ فرائض مولانا محمد رابع ندوی، مولانا سید الرحمن الاعظمی اور بائیس تیئیس سالہ نوجوان مولوی سلمان ندوی انجام دیتے رہے، مولانا محمد رابع ندوی اور مولانا سید الرحمن الاعظمی جب عربی سے اردو یا اردو سے عربی میں خلاصہ پیش کرتے تو اس کو سن کر ان کی مسلمہ قابلیت اور فضیلت کی وجہ سے کوئی تعجب نہ ہوتا، وہ توقع کے مطابق یہ فرض انجام دیتے رہے، لیکن جب کمسن مولوی سلمان ندوی اپنی فرشتہ صورت، نئی نئی خوبصورت داڑھی، قد رعنا اور جامہ زیبی کے ساتھ مائک پر آتے اور عربی یا اردو میں خلاصہ پیش کرتے وقت اپنی خطیبانہ آواز کی دلکشی سے حاضرین کی سامعہ نوازی کرتے تو وہ زبان حال سے کہتے نظر آتے کہ یہ لڑکا سمینار کی جان اور شان بنا ہوا ہے، اور سب کے دل سے دعائیں نکلتیں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ اس نوجوان کی عمر دراز کرکے اس کو ملک و ملت کا مایۂ ناز فرزند اور خدمتگذار بنا دے، آمین۔

علامہ یوسف القرضاوی کی صدارتی تقریر کے بعد مولانا رابع ندوی نے ایک کمیٹی کی تیار کی ہوئی تجویزیں پیش کیں جن کو مندوبین نے متفقہ طور سے منظور کیا، یہ حسب ذیل ہیں:

اس مجلس مذاکرہ کے مضامین نیز تجاویز کے مطالعے سے آیندہ کے لائحۂ عمل کے لیے چند نکات سامنے

... پر جو لٹریچر موجود ہے اور آیندہ بھی جو لٹریچر سامنے آئے اس کا علمی مطالعہ اور تجزیہ کیا جائے اور علمی و معیاری بنیاد پر مستشرقین کی غلطیوں کو واشگاف کرنے اور ان غلطیوں کی تصحیح کے لیے ایک واضح تصنیفی و تالیفی پروگرام مرتب کیا جائے۔

(۲) اسلام، تاریخ اسلام، سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور تاریخ اسلام کی اہم شخصیتوں اور ان کے فکری، علمی اور ادبی کارناموں سے متعلق اسکول سے لے کر یونیورسٹیوں کی سطح تک کے طلبہ کے لیے جدید مذاق کے مطابق ایسی کتابیں تیار کرائی جائیں جو ان کے تعلیمی نصاب کا حصہ بن سکیں اور جن سے تعلیم و تدریس کی ہر سطح پر بچوں اور نوجوانوں کے ذہن کی تربیت کا کام لیا جا سکے۔

(۳) اسلامی موضوعات پر حوالہ جات کی معیاری کتابیں تیار کی جائیں۔

(۴) اسلام سے متعلق علم و تحقیق کے جو ادارے پہلے سے موجود ہیں ان کی علمی و تحقیقی سرگرمیوں سے واقفیت حاصل کی جائے اور ان کے یہاں جو کام ہو رہا ہے اسے موجودہ علمی و تحقیقی معیار کے مطابق اور بہتر اور مفید تر بنانے کی کوشش کی جائے۔

(۵) تصنیف و تالیف کے اس تمام کام کا علمی معیار اور تعلیمی مرتبہ دنیا کے موجودہ معیار تحقیق اور جدید اصول تعلیم کے مطابق ہو تاکہ ان کتابوں کا مطالعہ مسلم اور غیر مسلم سب ہی لوگ دلچسپی سے کریں اور اسلام اور اسلام سے متعلق دیگر موضوعات پر صحیح معلومات حاصل کر سکیں اور مستشرقین کی کتابوں سے مستغنی ہو سکیں۔

(۶) دار المصنفین نے اسلامی موضوعات پر جو گراں قدر مطبوعات پیش کی ہیں، ان کو عربی زبان اور آج کی زندہ یوروپین زبانوں خصوصاً انگریزی میں منتقل کیا جائے، تاکہ ان سے بڑے پیمانہ پر استفادہ کیا جا سکے اور اس طرح ہم اس مذاکرۂ علمی کے مقاصد کو عملی جامہ پہنا سکیں۔

اس مذاکرۂ علمی کے شرکا مستشرقین کی ان علمی کاوشوں کو قابل قدر سمجھتے ہیں جو انھوں نے اسلامی

سرمایہ کی حفاظت اور بعض لغات اور مفید کتابوں کی نشر و اشاعت میں خالص علمی انداز سے کی ہیں جس سے ان سے استفادہ آسان ہوگیا، اس سلسلہ میں ہم المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث، مفتاح کنوز السنۃ اور تاریخ ادب کی بعض کتابوں کا نام خصوصیت سے لے سکتے ہیں، اسی طرح ہم بعض انصاف پسند اور غیر متعصب مستشرقین کے مطالعۂ اسلام اور تہذیب اسلام کو قابل قدر سمجھتے ہیں لیکن اسلامی علوم و فنون سے متعلق اکثر مستشرقین کی غلط فہمی اور مذہبی اور سیاسی عصبیت پر رنج و افسوس کا اظہار کرتے ہیں انھوں نے اسلامی عقیدہ و شریعت، قرآن و سنت، سیرت و تاریخ اور تہذیب و تمدن کو غلط رنگ میں پیش کیا ہے جس کے بہت سے عوامل ہیں نفسیاتی بھی تاریخی بھی اور سیاسی بھی۔

اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر مجلس مذاکرہ کا یہ جلسہ طے کرتا ہے کہ اس موضوع پر دو دو سال کے وقفہ سے یہ مجلس مذاکرہ منعقد کی جاتی رہے، اس سلسلہ میں یہ جلسہ دکتور شیخ یوسف القرضاوی کی اس پیش کش کو کہ ۲ دو سال کے بعد مجلس مذاکرہ قطر میں منعقد کی جائے شکریہ اور تحسین کے جذبہ کے ساتھ قبول کرتا ہے، یہ جلسہ جناب حکیم محمد سعید صاحب کا بھی شکر گذار ہے کہ وہ یہ مجلس مذاکرہ قطر کے بعد پاکستان میں منعقد کرائیں گے۔

یہ جلسہ یہ بھی طے کرتا ہے کہ اس سلسلہ میں مزید پیش رفت کے لیے دارالمصنفین میں ایک دفتر رابطہ قائم کیا جائے، جو سمینار کے فیصلوں کے مطابق عمل درآمد کرے اور اہم امور میں حسب ذیل فضلاء سے رابطہ قائم کرے:

(۱) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (ہندوستان) (۲) سید صباح الدین عبدالرحمن (ہندوستان) (۳) مولانا سعید احمد اکبر آبادی (ہندوستان) (۴) پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی (ہندوستان) (۵) دکتور شیخ یوسف القرضاوی (قطر) (۶) دکتور عبدالصبور مرزوق (رابطۂ عالم اسلامی مکہ) (۷) دکتور محمد فتحی عثمان (لندن) (۸) دکتور عبدالسلام الہراس (مراکش) (۹) دکتور عبداللہ نصیف (جدہ) (۱۰) دکتور عبداللہ عبدالمحسن الترکی (ریاض) (۱۱) دکتور عبدالوہاب ابوسلیمان (مکہ مکرمہ) (۱۲) دکتور عبداللہ

ابن عبداللہ نماید (مدینہ منورہ) (۱۳) دکتور ظفر اسحاق الانصاری (ظہران۔ سعودی عرب) (۱۴) پروفیسر سید حسین نصر (ایران) (۱۵) ڈاکٹر سید سلمان ندوی (جنوبی افریقہ) (۱۶) ڈاکٹر محمد کمال حسن (ملیشیا) (۱۷) جناب حکیم محمد سعید صاحب (پاکستان) (۱۸) پروفیسر خورشید احمد (پاکستان) (۱۹) ڈاکٹر نبی بخش بلوچ (پاکستان)

سید صباح الدین عبدالرحمن اس کمیٹی کے سکریٹری ہوں گے، انھیں یہ اختیار ہوگا کہ وہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مشورہ سے دفتر رابطہ کی ضروریات کے لیے مناسب اسٹاف مقرر کریں۔

خاکسار کی اختتامی تقریر: ان تجویزوں کے منظور ہونے کے بعد خاکسار نے اس سمینار کی کامیابی پر اپنے امتنان و تشکر کے جذبات کا اظہار کیا، جن کی شدت کی وجہ سے الفاظ خیالات کا ساتھ نہیں دے رہے تھے، دل کہ امنڈ رہا تھا، آنکھیں اشکبار تھیں، ان ہی کیفیات کے ساتھ عرض کیا:

صدر محترم! میں اپنی اشکبار آنکھوں اور جذبات کے تلاطم کے ساتھ آپ کا، اپنے معزز اور باوقار مہمانوں اور ان ساتھیوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے اس سمینار کو کامیاب بنانے کی کوشش کی، کاش میری آنکھوں میں خوشی کے اتنے آنسو ہوتے کہ ان آنسوؤں کا ایک ایک ساغر اور ایک ایک پیمانہ آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرتا، پھر بھی میرے امتنان اور تشکر کا اظہار پورے طور پر نہ ہوتا، حضرات! آج سے کئی سال پہلے یہ خیال ہوا کہ اسلام اور اورینٹلزم کے عنوان سے ایک سمینار منعقد کیا جائے، دارالمصنفین کی گذشتہ اڑتالیس سالہ زندگی میں انگریز مصنفوں کی کتابیں اور تحریریں پڑھ کر ان کی زہر چکانیوں سے بڑی تکلیف محسوس کرتا رہا، کہ وہ اپنی معروضیت یعنی آبجکٹوٹی کے پردے میں ہمارے مذہب، ہماری تہذیب اور ہمارے تمدن کو طرح طرح سے نقصان پہونچا رہے ہیں، خیال آیا کہ اس کے سدباب کے لیے بہت ہی شرح و بسط کے ساتھ ایک مجلس مذاکرہ منعقد کرائی جائے، مگر اس کو عمل میں لانے کے لیے ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ دارالمصنفین کے کنج عافیت بلکہ ویرانے میں کوئی شاندار اجتماع نہ ہو سکے گا، کیونکہ ہم اپنے مہمانوں کو ان کے معیار کے مطابق راحت اور سہولت نہ پہونچا سکیں گے، ہمارے دارالمصنفین کے مایہ ناز اسلاف کا مسلک یہ رہا ہے کہ Far from The

Madding Crowd of Cities. یعنی شہر کے جنون خیز ہنگاموں سے دور
Under The Greenwood tree سبزہ زار کے درختوں کے سایے کے نیچے بیٹھ کر صرف
اپنے علمی کاموں میں مشغول رہیں ہم کو فخر ہے کہ ہمارے ان بزرگوں نے بوریے پر بیٹھ کر اور دنیا کی تمام آسائشوں
اور نعمتوں سے منھ موڑ کر علوم و فنون کی خدمت کی، ہم نے اس مذاکرہ کے موقع پر اپنے مہمانوں کو کسی تفریح گاہ میں
لے جا کر ضیافت تو نہیں کی، لیکن ہمارے بزرگ علوم و فنون کے گل و صنوبر کا جو گلشن دارالمصنفین میں بنا گئے ہیں
وہاں آکر ہمارے مہمانوں کو اگر تھوڑی بہت ذہنی تفریح ہوگئی ہوگی تو یہی ہماری محنت کا بڑا صلہ ہے اور ہمیں
یقین ہے کہ ہمارے بزرگوں کی روحیں بھی اس اجتماع میں ضرور آگئی ہوں گی، اجازت دیجئے تو ان بزرگوں کے اس
گلشن میں آنے والے مہمانوں کی خدمت میں ان کی طرف سے یہ عرض کروں ؎

نسیم نو بہاری کی طرح آئے ہو گلشن میں   تماشائے گل و سرو و صنوبر دیکھتے جاؤ

حضرات! آپ نے اس سمینار میں جو کچھ دیکھا اس میں میری ہمت اور محنت کے بجائے مولانا ابوالحسن علی
ندوی کی حوصلہ افزائی زیادہ کارفرما رہی، وہ یہ کہہ کر برابر ہمت بڑھاتے رہے کہ کام شروع ہو جائے، پھر ساری
چیزیں خود بخود انجام پا جائیں گی، وہ مجھ سے اتنے اونچے ہیں کہ ان کی اونچائی تک میری نگاہ کسی طرح نہیں
پہونچ سکتی، لیکن جب وہ استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی شاگردی کے رشتہ سے مجھ کو اپنا بڑا
بھائی یا برادر محترم کہتے ہیں تو مجھ کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب قیامت قریب آئی جا رہی ہے، میں نے اپنے کو
ان سے بہت چھوٹا سمجھ کر اس مذاکرہ کا کام شروع کرنے کو تو کر دیا، لیکن سچ یہ ہے کہ یہاں جو کچھ ہوا وہ ان ہی کی
بہار آفریں اور رشک آگیں شخصیت کی بدولت ہوا، ورنہ میری جیسی حقیر شخصیت کے ذریعہ سے اتنا بڑا اجتماع
نہیں ہو سکتا تھا، اس مذاکرہ کا سب سے دردناک پہلو یہ ہے کہ آج سے دس روز پہلے ان کے عزیز بھانجے اور
مولانا محمد رابع ندوی کے بڑے بھائی مولوی محمد ثانی حسنی کی وفات ہوگئی، یہ ناگہانی حادثہ نہ صرف ان دونوں
کے لیے، بلکہ دارالمصنفین کے لیے بھی تھا، خیال آیا کہ اس اجتماع کو ملتوی کر دیا جائے، کیونکہ اس مذاکرہ کی روح

ابن عبداللہ ثنایا (مدینہ منورہ) (۱۳) دکتور ظفر اسحاق الانصاری (ظہران، سعودی عرب) (۱۴) پروفیسر سید حسین نصر (ایران) (۱۵) ڈاکٹر سید سلمان ندوی (جنوبی افریقہ) (۱۶) ڈاکٹر محمد کمال حسن (ملیشیا) (۱۷) جناب حکیم محمد سعید صاحب (پاکستان) (۱۸) پروفیسر خورشید احمد (پاکستان) (۱۹) ڈاکٹر نبی بخش بلوچ (پاکستان)

سید صباح الدین عبدالرحمن اس کمیٹی کے سکریٹری ہوں گے، انھیں یہ اختیار ہوگا کہ وہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مشورہ سے دفتر رابطہ کی ضروریات کے لیے مناسب اسٹاف مقرر کریں۔

<u>خاکسار کی الوداعی تقریر</u> | ان تجویزوں کے منظور ہونے کے بعد خاکسار نے اس سمینار کی کامیابی پر اپنے امتنان و تشکر کے جذبات کا اظہار کیا، جن کی شدت کی وجہ سے الفاظ خیالات کا ساتھ نہیں دے رہے تھے، دل تھا کہ امنڈ رہا تھا، آنکھیں اشکبار تھیں، ان ہی کیفیات کے ساتھ عرض کیا:

صدر محترم! میں اپنی اشکبار آنکھوں اور جذبات کے تلاطم کے ساتھ آپ کا، اپنے معزز اور باوقار مہمانوں اور ان ساتھیوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے اس سمینار کو کامیاب بنانے کی کوشش کی، کاش میری آنکھوں میں خوشی کے اتنے آنسو ہوتے کہ ان آنسوؤں کا ایک ایک ساغر اور ایک ایک پیمانہ آپ حضرات کی خدمت میں پیش کرتا، پھر بھی میرے امتنان اور تشکر کا اظہار پورے طور پر نہ ہوتا، حضرات! آج سے کئی سال پہلے یہ خیال ہوا کہ اسلام اور اورینٹلسٹ کے عنوان سے ایک سمینار منعقد کیا جائے، دارالمصنفین کی گذشتہ اڑتالیس سالہ زندگی میں انگریز مصنفوں کی کتابیں اور تحریریں پڑھ کر ان کی زہر چکانیوں سے بڑی تکلیف محسوس کرتا رہا کہ وہ اپنی معروضیت یعنی آبجکٹویٹی کے پردے میں ہمارے مذہب، ہماری تہذیب اور ہمارے تمدن کو طرح طرح سے نقصان پہونچا رہے ہیں، خیال آیا کہ اس کے سدباب کے لیے بہت ہی شرح و بسط کے ساتھ ایک مجلس مذاکرہ منعقد کرائی جائے، مگر اس کو عمل میں لانے کے لیے ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ دارالمصنفین کے گنج عافیت بلکہ ویرانے میں کوئی شاندار اجتماع نہ ہو سکے گا، کیونکہ ہم اپنے مہمانوں کو ان کے معیار کے مطابق راحت اور سہولت نہ پہونچا سکیں گے، ہمارے دارالمصنفین کے مایۂ ناز اسلاف کا مسلک یہ رہا ہے کہ Far from The

Madding Crowd of Cities. یعنی شہر کے جنون خیز ہنگاموں سے دور
سبزہ زار کے درختوں کے سایے کے نیچے بیٹھ کر صرف Under The Greenwood tree
اپنے علمی کاموں میں مشغول رہیں ہم کو فخر ہے کہ ہمارے ان بزرگوں نے بوریے پر بیٹھ کر اور دنیا کی تمام آسائشوں
اور نعمتوں سے منھ موڑ کر علوم و فنون کی خدمت کی، ہم نے اس مذاکرہ کے موقع پر اپنے مہمانوں کو کسی تفریح گاہ میں
لے جا کر ضیافت تو نہیں کی، لیکن ہمارے بزرگ علوم و فنون کے گل و صنوبر کا جو گلشن دارالمصنفین میں بنا گئے ہیں
وہاں آکر ہمارے مہمانوں کو اگر تھوڑی بہت ذہنی تفریح ہوگئی ہوگی تو یہی ہماری محنت کا بڑا صلہ ہے، اور ہمیں
یقین ہے کہ ہمارے بزرگوں کی روحیں بھی اس اجتماع میں ضرور آگئی ہوں گی، اجازت دیجئے تو ان بزرگوں کے اس
گلشن میں آنے والے مہمانوں کی خدمت میں ان کی طرف سے یہ عرض کردوں ؎

نسیم نو بہاری کی طرح آئے ہو گلشن میں تماشائے گل و سرو و صنوبر دیکھتے جاؤ

حضرات! آپ نے اس سمینار میں جو کچھ دیکھا اس میں میری ہمت اور محنت کے بجائے مولانا ابوالحسن علی
ندوی کی حوصلہ افزائی زیادہ کارفرما رہی، وہ یہ کہہ کر برابر ہمت بڑھاتے رہے کہ کام شروع ہوجائے، پھر ساری
چیزیں خود بخود انجام پا جائیں گی، وہ مجھ سے اتنے اونچے ہیں کہ ان کی اونچائی تک میری نگاہ کسی طرح نہیں
پہونچ سکتی، لیکن جب وہ استاذی المحترم حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی شاگردی کے رشتہ سے مجھ کو اپنا بڑا
بھائی یا برادر محترم کہتے ہیں تو مجھ کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب قیامت قریب آئی جارہی ہے، میں نے اپنے کو
ان سے بہت چھوٹا سمجھ کر اس مذاکرہ کا کام شروع کرنے کو تو کر دیا، لیکن سچ یہ ہے کہ یہاں جو کچھ ہوا وہ ان ہی کی
بہار آفریں اور مشک آگیں شخصیت کی بدولت ہوا، ورنہ میری جیسی حقیر شخصیت کے ذریعہ سے اتنا بڑا اجتماع
نہیں ہوسکتا تھا، اس مذاکرہ کا سب سے دردناک پہلو یہ ہے کہ آج سے دس روز پہلے ان کے عزیز بھانجے اور
مولانا محمد رابع ندوی کے بڑے بھائی مولوی محمد ثانی حسنی کی وفات ہوگئی، یہ جانکاہ حادثہ نہ صرف ان دونوں
کے لیے بلکہ دارالمصنفین کے لیے بھی تھا، خیال آیا کہ اس اجتماع کو ملتوی کر دیا جائے، کیونکہ اس مذاکرہ کی روح

... تھے تو ان کے دماغ مولانا محمد رابع ندوی تھے، یہ خاکسار اس وقت
... جسم تھا، مگر ان دونوں حضرات نے اپنے بے مثال ضبط، تحمل اور صبر کا ثبوت دیا
... ہے کہ حادثہ سخت سہی، لیکن سیمینار ہو کر رہے گا، اور ہوا، اس سے دارالمصنفین سے
... کا بھی اظہار ہوتا ہے ہم اپنے مہمانوں سے معذرت خواہ ہیں کہ ان کو ہم خاطر خواہ
... اعظم گڈھ ایک معمولی سا شہر ہے جہاں اس ترقی یافتہ دور کی زندگی کی ساری آسائشیں
... ضرورت تو رہا کہ ہمارے غیر ملکی مہمان یہاں آجائیں گے تو ہم ان کو کہاں ٹھہرائیں گے، اور ان کی
... کیسے ... لیکن ہمارے دل میں ایک تمنا تھی ایک آرزو تھی، اس بنا پر ہم نے سوچا کہ ہمارے
... لیکن یہ سیمینار ہو کر رہے گا، میں یہ جانتا ہوں کہ ہمارے مہمانوں کو بہت تکلیف ہوئی
... لیکن میں اپنے بزرگوں کی روح، دارالمصنفین کے کارکنوں اور اپنی اشکبار آنکھوں کی طرف سے ان سے
... مانگتا ہوں کہ اپنی تکلیفوں کو سیمینار کے موضوع اور اسلامی علوم و فنون کی محبت کی خاطر نظر انداز
... دیں، جہاں تک ہم لوگوں کا تعلق ہے، یہ تین روز ایسے محسوس ہوئے کہ دارالمصنفین میں ایک دلکش اور سہانی
چاندنی چھٹکی ہوئی ہے اور علم و فن کے سیارے یہ آ رہے ہیں، وہ جا رہے ہیں، یہ جا رہے ہیں وہ آ رہے
ہیں، بیٹھے ہوئے ہیں، چل رہے ہیں، قدم قدم پر روشن روشن پر نئے گل کھلا رہے ہیں، یہ تین دن
ہماری زندگی کے بہت ہی قیمتی اور دلآویز لمحات کے ساتھ گذرے، ہماری زندگی کے بقیہ دن اسی کی
... کے ساتھ گذریں گے کہ آپ حضرات اس دور افتادہ مقام کے سفر کی مشکلیں برداشت کر کے یہاں
تشریف لائے، تکلیفیں اٹھائیں، لیکن ہماری ہمت افزائی کی اور حوصلے بڑھائے، ہمیں یقین ہے کہ اس
... کے بعد دارالمصنفین کے رفتار میں ایک نئی علمی روح کی تابناکی اور ایک نئی علمی زندگی کی درخشانی پیدا
ہو جائیگی، کشمیر کے جناب عبدالرحمٰن کوندو صاحب ہمارے شکریہ کے خاص طور پر مستحق ہیں، انھوں نے بتایا کہ
سری نگر سے جموں تک پورا راستہ برف سے ڈھکا ہوا تھا، پھر بھی وہ دارالمصنفین کی محبت میں اس سیمینار کی شرکت کرنے کیلئے

یہاں پہونچ گئے، اور ابھی ابھی لاہور سے بڑی صعوبتیں اور مصیبتیں برداشت کرکے شیخ نذیر حسین مدیر دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی تشریف لائے ہیں، ہم ان کے بھی شکر گذار ہیں۔ ہم شبلی کالج کے سکریٹری جناب امتیاز احمد صاحب ایڈووکیٹ کے بھی شکر گذار ہیں کہ انھوں نے تعاون کرکے اس سمینار کو کامیاب بنایا، ہم اس کالج کے اساتذہ اور اس کے دوسرے ملازمین کے بھی ممنون ہیں کہ انھوں نے رات دن محنت کرکے ہر قسم کی سہولتیں پہونچائیں، ہم اپنے عزیز شاگرد ڈاکٹر محمد طاہر کے تو انتہائی ممنون ہیں کہ انھوں نے اپنی جان کی بازی لگا کر ہمارے مہمانوں کے کام و دہن کی لذت کا سامان کیا، اللہ تبارک و تعالیٰ ان کو اپنی زندگی میں ہر طرح خوش و خرم رکھے، ہم شبلی کالج کے طلبہ کے بھی شکر گذار ہیں کہ انھوں نے باورچی خانہ کے مشکل سے مشکل کام کو بڑی خوبی سے انجام دے کر ڈاکٹر طاہر کی مدد کی، اس کالج کے اساتذہ میں ڈاکٹر محمد صفی اور ڈاکٹر محمد جمال کے بھی ممنون ہیں کہ انھوں نے ہمارے ایٹ ہوم کا انتظام بہت ہی خوش سلیقگی سے کیا، ہم دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ اور طلبہ کے احسانات سے بھی گرانبار ہیں کہ انھوں نے یہ مثالی نمونہ پیش کیا کہ ایک تقریب کو کامیاب بنانے میں مزدوروں کی طرح کام کرنے میں کوئی عار نہیں ہونا چاہیے، جب میں اپنی آنکھوں سے ان کو اپنے سروں پر کرسیاں اور میزیں لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے دیکھتا تو مجھ کو ندامت کے بجائے فخر ہوتا کہ دارالمصنفین کے طلبہ ایسے جاں نثار بھی ہیں جو ضرورت کے وقت ہر قسم کا کام انجام دے سکتے ہیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ میں مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی کی وہ جد و جہد ہمیشہ یاد رہے گی جب کہ لکھنؤ، بنارس اور اعظم گڈھ کی مسافت کا خیال کیے بغیر تینوں جگہوں کو ایک کر دیا تھا، وہ کبھی مہمانوں کی پیشوائی کرتے دکھائی دیتے، کبھی ضروری مشورے آکر دیتے، ان کا بس چلتا تو اس موقع پر دارالمصنفین پر نچھاور ہو جاتے، ان پر دارالمصنفین کا حق تھا، اور حق تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنا حق ادا کیا، مولانا محمود الازہار نے سمینار کو کامیاب بنانے میں جو محنت شاقہ کی اس کا شکریہ تو ادا ہو ہی نہیں سکتا اور شاید وہ اس شکریہ کو قبول کرنے کے لیے تیار بھی نہ ہوں کہ وہ اپنے اور ساتھی اساتذہ کے ساتھ دارالمصنفین اور ندوہ کو دو الگ چیز نہیں سمجھتے، ہم وہاں ندوہ کے کمسن استاد مولوی سلمان ندوی کا

اگر حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی تھے تو اس کے دماغ مولانا محمد رابع ندوی تھے، یہ خاکسار اس روح اور دماغ کا محض ایک جسم تھا، مگر ان دونوں حضرات نے اپنے بے مثال ضبط، تحمل اور صبر کا ثبوت دیا اور ان کے پیغامات آتے رہے کہ حادثہ سخت سہی، لیکن سیمینار ہو کر رہے گا، اور ہوا، اس سے دارالمصنفین سے ان کی غیر معمولی محبت کا بھی اظہار ہوتا ہے، ہم اپنے مہمانوں سے معذرت خواہ ہیں کہ ان کو ہم فائیو اسٹار ہوٹل میں نہ ٹھہرا سکے، اعظم گڈھ ایک معمولی سا شہر ہے، جہاں اس ترقی یافتہ دور کی زندگی کی ساری آسائشیں میسر نہیں، یہ خیال ضرور ستاتا رہا کہ ہمارے غیر ملکی مہمان یہاں آجائیں گے تو ہم ان کو کہاں ٹھہرائیں گے، اور ان کی کیا ضیافت کر سکیں گے، لیکن ہمارے دل میں ایک تمنا تھی، ایک آرزو تھی، اس بنا پر ہم نے سوچا کہ ہمارے مہمانوں کو تکلیف سہی، لیکن یہ سیمینار ہو کر رہے گا، میں یہ جانتا ہوں کہ ہمارے مہمانوں کو بہت تکلیف ہوئی ہوگی، لیکن میں اپنے بزرگوں کی روح، دارالمصنفین کے کارکنوں اور اپنی اشکبار آنکھوں کی طرف سے ان سے معافی مانگتا ہوں کہ اپنی تکلیفوں کو سیمینار کے موضوع اور اسلامی علوم و فنون کی محبت کی خاطر نظر انداز کر دیں، جہاں تک ہم لوگوں کا تعلق ہے، یہ تین روز ایسے محسوس ہوئے کہ دارالمصنفین میں ایک دلکش اور سہانی چاندنی چھٹکی ہوئی ہے اور علم و فن کے پیاسے یہ آرہے ہیں، وہ جارہے ہیں، یہ جارہے ہیں وہ آرہے ہیں، بیٹھے ہوئے ہیں، چل رہے ہیں، قدم قدم پر، روش روش پر نئے نئے گل کھلا رہے ہیں، یہ تین دن ہماری زندگی کے بہت ہی قیمتی اور دلآویز لمحات کے ساتھ گذرے، ہماری زندگی کے بقیہ دن اسی کی یاد کے ساتھ گذریں گے کہ آپ حضرات اس دور افتادہ مقام کے سفر کی مشکلیں برداشت کرکے یہاں تشریف لائے، تکلیفیں اٹھائیں، لیکن ہماری ہمت افزائی کی اور حوصلے بڑھائے، ہمیں یقین ہے کہ اس اجتماع کے بعد دارالمصنفین کے رفتار میں ایک نئی علمی روح کی تابناکی اور ایک نئی علمی زندگی کی درخشانی پیدا ہوجائیگی، کشمیر کے جناب عبدالرحمن کوندو صاحب ہمارے شکریہ کے خاص طور پر مستحق ہیں، انھوں نے بتایا کہ سری نگر سے جموں تک پورا راستہ برف سے ڈھکا ہوا تھا، پھر بھی وہ دارالمصنفین کی محبت میں اس سیمینار کی شرکت کیلئے

یہاں پہونچ گئے، اور ابھی ابھی لاہور سے بڑی صعوبتیں اور مصیبتیں برداشت کرکے شیخ نذیر حسین مدیر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام تشریف لائے ہیں، ہم ان کے بھی شکر گذار ہیں۔ ہم شبلی کالج کے سکریٹری جناب امتیاز احمد صاحب ایڈووکیٹ کے بھی شکر گذار ہیں کہ انھوں نے تعاون کرکے اس سیمنار کو کامیاب بنایا، ہم اس کالج کے اساتذہ اور اس کے دوسرے ملازموں کے بھی ممنون ہیں کہ انھوں نے رات دن محنت کرکے ہر قسم کی سہولتیں پہونچائیں، ہم اپنے عزیز شاگرد ڈاکٹر محمد طاہر کے تو انتہائی ممنون ہیں کہ انھوں نے اپنی جان کی بازی لگاکر ہمارے مہمانوں کے کام و دہن کی لذت کا سامان کیا، اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو اپنی زندگی میں ہر طرح خوش وخرم رکھے، ہم شبلی کالج کے طلبہ کے بھی شکر گذار ہیں کہ انھوں نے باورچی خانہ کے مشکل سے مشکل کام کو بڑی خوبی سے انجام دے کر ڈاکٹر طاہر کی مدد کی، اس کالج کے اساتذہ میں ڈاکٹر محمد صفی اور ڈاکٹر محمد جمال کے بھی ممنون ہیں کہ انھوں نے ہمارے ایٹ ہوم کا انتظام بہت ہی خوش سلیقگی سے کیا، ہم دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ اور طلبہ کے احسانات سے بھی گرانبار ہیں کہ انھوں نے یہ مثالی نمونہ پیش کیا کہ ایک تقریب کو کامیاب بنانے میں مزدوروں کی طرح کام کرنے میں کوئی عار نہیں ہونا چاہیے، جب میں اپنی آنکھوں سے ان کو اپنے سروں پر کرسیاں اور میزیں لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے دیکھتا تو مجھ کو ندامت کے بجائے فخر ہوتا کہ دارالمصنفین کے طلبہ ایسے جاں نثار بھی ہیں جو ضرورت کے وقت ہر قسم کا کام انجام دے سکتے ہیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ میں مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی کی وہ جد وجہد ہمیشہ یاد رہے گی جب کہ لکھنؤ، بنارس اور اعظم گڈھ کی مسافت کا خیال کیے بغیر تینوں جگہوں کو ایک کر دیا تھا، وہ کبھی مہمانوں کی پیشوائی کرتے دکھائی دیتے، کبھی ضروری مشورے آکر دیتے، ان کا بس چلتا تو اس موقع پر دارالمصنفین پر نچھاور ہو جاتے، ان پر دارالمصنفین کا حق تھا، اور حق تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنا حق ادا کیا، مولانا محمود الازہار نے سیمنار کو کامیاب بنانے میں جو محنت شاقہ کی اس کا شکریہ تو ادا ہو ہی نہیں سکتا اور شاید وہ اس شکریہ کو قبول کرنے کے لیے تیار بھی نہ ہوں کہ وہ اپنے اور ساتھی اساتذہ کے ساتھ دارالمصنفین اور ندوہ کو دو الگ چیز نہیں سمجھتے، اور یہاں ندوہ کے کمسن استاد مولوی سلمان ندوی کا

جو غضب کا اٹھان ہے، اس سے تو میری طرح اس اجتماع کے سارے حاضرین متحیر ہے، وہ جبل شیوہ بیان کی طرح اس مذاکرہ میں چہچہاتے رہے، وہ جب عربی سے اردو اور اردو سے عربی میں مقالوں اور تقریروں کا خلاصہ پیش کرتے تو اس سے متاثر ہو کر حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی کے بغل میں بیٹھا ہوا ان سے عرض کرتا کہ ایک دوسرا ابو الحسن علی ندوی تیار ہونے والا ہے آپ کو اس کی فکر نہ ہونی چاہیے کہ آپ اپنا کوئی جانشین نہیں چھوڑ رہے ہیں، مولانا رابع ندوی کا کیا شکریہ ادا کروں کہ وہ میرے عزیز ترین عزیز ہیں، ان کا شکریہ ادا کر کے خود اپنا شکریہ ادا کروں گا، اور کیا یہ ڈربن سے آئے ہوئے عزیزی ڈاکٹر سید سلمان ندوی کا بھی شکریہ ادا کروں وہ یہیں پیدا ہوئے، ان کے والد بزرگوار حضرت مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے استاذ علامہ شبلیؒ کی وصیت کے مطابق اسی آستانہ پر عمر گذاری، ان کو اپنے استاد سے اس قدر محبت تھی کہ جب وہ حیات شبلی لکھ رہے تھے تو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ بعض اوقات ایک طرف ان کا قلم چل رہا تھا تو دوسری طرف ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، اگر ڈاکٹر سلمان ندوی ڈربن سے یہاں آئے تو انھوں نے اپنا حق ادا کیا اور اپنے مولد کی خاک کو آنکھوں سے لگا کر سعادت حاصل کی۔

ہم یو۔ پی کی حکومت کے وزیر جناب عمار رضوی صاحب کے بھی احسان مند ہیں کہ انھوں نے اس سمینار میں شرکت کر کے دار المصنفین کے مخطوطات کی نمایش کا افتتاح کیا، ان کی پوری کوشش تھی کہ یوپی کے وزیر اعلیٰ اس موقع پر تشریف لائیں مگر وہ اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے نہ آسکے تو انھوں نے خود اپنی تشریف آوری سے ہم کو نوازا، ان کے بے تکلف دوست شوکت سلطان صاحب سابق پرنسپل شبلی کالج کو بھی بڑی خوشی ہوئی، اس تقریب میں ہر قسم کی سہولت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور ایس۔ پی نے پہونچائی، جس کے لیے ہم ان کے بھی شکر گزار ہیں، اور ہاں عزیزی احتشام الرحمٰن، شاکر الرحمٰن اور محمد طارق نے اس سمینار کی پوری کارروائی۔۔۔ کو ریکارڈ کر کے جتنے کیسٹ تیار کیے ہیں، وہ بھی قابل ذکر ہے، یہ کیسٹ ہمارے کتب خانہ کے لیے قیمتی سرمایہ بن جائیں گے، عزیزی ڈاکٹر راشد مصطفےٰ نے اپنے ساتھی فوٹو گرافر محمد طارق کے ساتھ بڑے ذوق و شوق

اس سیمینار کا جو رنگین البم تیار کیا ہے اس سے اس سیمینار کی یاد برابر تازہ ہوتی رہے گی، ان عزیزوں نے اپنا یہ فرض ادا کر کے اپنی سعادت مندی اور دارالمصنفین سے محبت کا ثبوت دیا،

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی الوداعی تقریر اور موثر دعا،

آخر میں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے مجمع کو اس طرح مخاطب فرمایا:

حضرات! مجھے اب تقریر نہیں کرنی ہے، صرف آخری بات عرض کرنا چاہتا ہوں، پھر دعا کر دوں گا اور سب آمین کہیں گے، آپ حضرات کو معلوم ہے کہ میں مختلف مقامات پر جایا کرتا ہوں، جہاں میری تقریر سے پہلے میرا تعارف بھی ہوا کرتا ہے، لیکن ایک تعارف کبھی نہ بھولے گا جیسا وہ انوکھا تعارف تھا، ویسا ہی میرا انوکھا شکریہ بھی اس وقت ہوگا، مجھے ریاست حیدرآباد کے شہر سکندرآباد کی جامع مسجد میں سیرت پر تقریر کرنے کے لیے بلایا گیا تھا، وہ میرے شباب کا زمانہ تھا، وہاں جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات کے صدر مولانا محمد علی نے میرا تعارف اس طرح کرایا کہ اس خدا کا شکر ادا کرنا چاہتا ہوں جس نے میرے ان مہمان خصوصی کو یہ یہ چیزیں عطا فرمائی ہیں، اسی کا شکر ہے اسی کی میں تعریف کرتا ہوں، آج میں بھی اسی کی تقلید کرتا ہوں، میں کسی کا شکریہ ادا نہیں کرتا، میں اس خدا کی حمد کرتا ہوں جس نے ان بھائیوں کو توفیق دی کہ وہ یہاں کھنچ کر آئے اور ہماری حوصلہ افزائی کی، سب تعریف اس خدا کی ہے، سب شکر اسی کا ہے کہ ہم کو آپ کو عمل کی توفیق دی، ہم اور آپ اپنے خدا سے اس بات کے طالب ہوں کہ اب اصل کام کرائے جس کا اعلان ہم نے اس وقت بڑی بلند آہنگی سے کیا ہے، ابھی ہم نے اصل کام میں سے تھوڑا سا کام انجام دیا ہے جس کا نتیجہ ہمارے آپ کے سامنے ہے، اگر اس سے بہت زیادہ کام ہوا تو ہم آپ دیکھیں گے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے، پھر میں خدا ہی کی حمد کرتا ہوں، اسی کا شکریہ ادا کرتا ہوں، ہمارے خطیب اور مقرر شروع میں کہتے ہیں: الحمد للہ الذی ھدانا لھٰذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ، یعنی اس خدا کی تعریف ہے جس نے ہماری رہبری کی، ہم کو یہاں تک پہونچایا اور یہ اہل جنت کہیں گے کہ ہم یہاں تک پہونچنے والے نہیں تھے، اگر توفیق الٰہی نہ ہوتی، آئیے خدا سے

دعا کریں: الحمد للہ رب العلمین وصلی اللہ تبارک وتعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا ومولٰنا محمد وآلہ وصحبہ اجمعین، ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم وتب علینا انک انت التواب الرحیم، ربنا اتنا من لدنک رحمۃ وھیئ لنا من امرنا رشدا، ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وھب لنا من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب، ربنا ولا تحملنا ما لا طاقۃ لنا بہ، واعف عنا واغفر لنا وارحمنا انت مولانا فانصرنا علی القوم الکافرین، ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان، ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا، ربنا انک رؤف رحیم۔ اے اللہ ہم اپنے علم پر نازاں نہیں ہیں، ہم علم پر کوئی بھروسہ نہیں کرتے کہ ہم نے دیکھا کہ ان مستشرقین نے جن کا علم ہم میں سے بہت سے لوگوں سے بہت زیادہ تھا، کیسی کیسی ٹھوکریں کھائی ہیں، اور دریا میں گئے اور دامن بھی ان کا تر نہیں ہوا، دریائے سیرت میں غوطہ لگایا اور ایک بھی موتی لے کر نہ ابھرے، قرآن مجید کے بحر علوم اور بحر معارف میں غواصی کی اور کچھ بھی ان کے حصہ میں نہیں آیا، اے اللہ! ہم ایسے علم سے پناہ مانگتے ہیں جو علم حقیقت تک نہ پہونچائے، جو معرفت عطا نہ کر سکے، جو صداقت کی روشنی نہ دکھا سکے، جو عمل میں رہبری نہ کرے، اے اللہ! ہم تجھ سے علم نافع کے طالب ہیں، اے اللہ ہمیں علم اور عمل کی گمراہیوں سے بچا۔

مطبوعات جدیدہ

تحفۂ علم و حکمت: مرتبہ مولانا ابو عامر محمد اسحاق خاں، تقطیع کلاں، کاغذ عمدہ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۵۴۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۵۰ روپیے پاکستانی، پتے: (۱) ادارہ نشر و اشاعت دار العلوم تعلیم القرآن پلندری پونچھ آزاد کشمیر (۲) اسلامک مشن سنٹر برائے متحدہ عرب امارات ص، ب ۵۱۵ دبئی، متحدہ عرب امارات۔

مولانا محمد اسحاق خاں کا تعلق آزاد کشمیر سے ہے، مگر مدینہ یونیورسٹی سے فراغت کے بعد وہ دبئی میں سعودی عرب کے قائم کردہ اسلامک مشن سے وابستہ ہو کر دینی اور دعوتی خدمات انجام دے رہے ہیں، ان کو تصنیف و تالیف کا ذوق بھی ہے، زیر نظر کتاب میں کتب حدیث کے ذخیرے سے پچاس حدیثیں منتخب کر کے ان کا ترجمہ اور ان کی تشریح کی ہے، یہ سب حدیثیں نہایت اہم ہیں جو نیت، اخلاص، تقویٰ، توکل، اسلامی عقائد و ارکان، جہاد، حسن خلق، دعا، استغفار، ذکر، تسبیح، تحمید، طہارت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، اتباع سنت، اجتناب بدعت، نفاق، وراثت، رضاعت اور حدود وغیرہ سے متعلق ہیں، مجموعہ کی ابتداء نیت والی اس حدیث سے کی ہے جس سے صحیح بخاری کی ابتداء ہوئی ہے، لائق مصنف نے حدیثیں نقل کر کے ان کے بالمقابل مطلب خیز ترجمہ کیا ہے، پھر تشریح میں حدیث کا مقصود و مدعا مختلف حیثیتوں سے واضح کیا ہے، مثلاً پہلے حدیث کی اہمیت و عظمت محدثین اور ائمہ اسلام کے اقوال کی روشنی میں تحریر کی ہے، پھر اس کا خلاصہ اور مرکزی مضمون بتایا ہے اور اس کے ہر ہر لفظ کی تشریح کی ہے، آخر میں حدیث کے فوائد نمبروار لکھ کر اس کے اہم حقائق و معانی کی نشاندہی کی ہے اور ان سے مستنبط ہونے والے احکام و ہدایات بیان کیے ہیں

اگر رسول اللہ صلعم نے حدیث کسی خاص قوم کے لحاظ سے ارشاد فرمائی ہے تو اس کی بھی وضاحت کردی ہے تاکہ اس پس منظر میں اس کا مفہوم اچھی طرح واضح ہو جائے، جن حدیثوں سے مشرکین، یہود و نصاریٰ یا خود مسلمانوں کے فرقوں اور گروہوں کے غلط عقائد و اعمال کی تردید ہوتی ہے ان پر اسی حیثیت سے بحث و گفتگو کی ہے، مثلاً آنحضرتؐ کی عدم بشریت یا امورِ غیب وغیرہ کے جو لوگ قائل ہیں ان کی مدلل تردید کی ہے، حدیث نبویؐ کی اس مفید خدمت پر مصنف مبارکباد کے مستحق ہیں، البتہ تشریح میں تکرار اور غیر ضروری طوالت سے کام لیا گیا ہے، لغت، نحو اور اشتقاق کی بحثیں اردو داں طبقہ کیلئے زیادہ مفید نہیں، مصنف نے محدثین اور علمائے فن کے اقوال بلاحوالہ درج کیے ہیں، جن کتابوں سے حدیثیں نقل کی ہیں ان کے حوالے تو دیے ہیں مگر ابواب، جلدوں اور صفحات وغیرہ کی صراحت نہیں کی ہے، تحریر میں بھی ناہمواری اور کہیں کہیں ژولیدہ بیانی ہے، عربی کے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو اردو میں نامانوس اور غیر مستعمل ہیں، جیسے حنیف، خطورت اور استماع وغیرہ، اسی طرح جیسے اجور، جوانب، زوایا، سائر دیواطن حدیہ ہے کہ عربی قاعدہ کے مطابق تثنیہ کا بھی استعمال کیا ہے، لکھتے ہیں "من اور کلمیں عموم کیلئے آتے ہیں" بہت سے لفظوں کی جمع جاہے غلط نہ ہو مگر ثقیل ضرور ہے، مثلاً خونوں، جانوں، مالوں، معنی طلوع کرنا لکھا ہے، یہ غلط ہے، صحیح معنی طلوع ہونا ہے۔

موج صبا: مرتبہ جناب اختر مسلمی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۱۶ مجلد مع گرد پوش، قیمت بارہ روپے، غیر مجلد دس روپے، پتہ: اختر مسلمی صاحب سرائے میر، اعظم گڑھ۔ یوپی

جناب اختر مسلمی ضلع اعظم گڑھ کے مشہور شاعر ہیں، ان کا پہلا مجموعۂ کلام بیس برس قبل موج نسیم کے نام سے شایع ہوا تھا، اس لیے زیر نظر مجموعہ میں نئے کلام کے ساتھ اس کا انتخاب بھی دیا ہے، انھیں تغزل سے خاص مناسبت ہے اور وہ حسن و عشق کے لطیف اور الفت و محبت کی واردات و کیفیات کی ترجمانی دلآویز پیرایہ میں کرتے ہیں، برسوں کوچۂ مجازی کی خاک چھاننے کے بعد راہ پر گامزن ہوئے ہیں، اس سے ان کے کلام میں جو دانش کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اور اسی لیے انھوں نے اس مجموعہ کی ابتدا حمد و نعت سے کی ہے، اختر صاحب کے حساس اور دردمند دل نے ملک و قوم کے موجودہ حالات و مسائل اور ہماری معاشرتی، قومی اور سیاسی زندگی کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے، اس لیے ابنائے سیاست کی خود غرضی، ملک و قوم کے مسائل سے ان کی غفلت، فرقہ واریت، تنگ نظری، مداہنت اور مصلحت پسندی اور قومی، سیاسی، اخلاقی اور مذہبی زندگی کی تمام ناہمواریاں اور خرابیوں کو بھی ان کا موضوع ... ہے اور اخلاق و شرافت اور حق پسندی و حق بینی کا درس بھی دیا ہے، مگر اس سے تغزل کی

مولانا سید سلیمان ندوی کی چند کتابوں کے جدید ایڈیشن

نقوش سلیمانی

سید صاحب کے ہندوستانی اور اردو زبان و ادب سے متعلق مختلف ادبی کانفرنسوں کے خطبات صدارت، ان کی دوسری تقریروں تحریروں، تبصروں اور مقدموں کا مجموعہ جن کا انتخاب خود فاضل مصنف نے اپنی زندگی میں کیا تھا، اور نہایت اہتمام سے معارف پریس میں چھپوایا تھا، وہ اردو کو ہندوستان کی نسبت سے ہندوستانی کا نام دے کر ملک کی مشترکہ زبان بنانا چاہتے تھے، افسوس کہ ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، اور ہندی ملک کی سرکاری زبان قرار پا گئی، طبع دوم عکسی،

قیمت :- ۲۵ روپیے،

خیام

خیام کو فارسی کے ایک باکمال رباعی گو شاعر کی حیثیت سے عالمی شہرت حاصل ہوئی اور اس کی رباعیات کا یورپ اور ایشیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو گیا ہے لیکن اس کے علاوہ وہ اور بھی بہت کچھ تھا، وہ فلسفی تھا، منجم تھا، ریاضی داں تھا، ہیئت داں تھا، اور حکیم و طبیب تھا، جس کی طرف شعر العجم میں خیام کے تذکرہ میں مولانا شبلی نے بھی اشارہ کیا ہے۔ اس کتاب میں پہلی مرتبہ اس کے سوانح و حالات کے ساتھ اس کی انہی حیثیات پر بہت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے آخر میں اس کے چند نایاب فارسی و عربی کے فلسفیانہ رسالے اور اس کی مستند رباعیات بھی شامل کر دی گئی ہیں،

طبع دوم عکسی قیمت : ۲۵ روپیہ

عرب و ہند کے تعلقات

سید صاحب کے عرب و ہند کے تعلقات پر ہندستانی اکیڈمی الہ آباد میں پانچ خطبے دیے تھے یہ ان کا مجموعہ ہے۔ طبع دوم عکسی، قیمت :- ۳۰ روپیہ

منیجر

[illegible]

[illegible] بہادر شاہ ظفر [illegible]

[illegible] علم دوستی [illegible]

[illegible] تذکرہ اور ان کے علمی و ادبی و شعری کمالات اور ان کے نثر و نظم کے بہترین [illegible] پر مشتمل تھا، اس کے

دوسرے [illegible]

بہت بڑھ گیا، اس لئے [illegible] تین جلدوں میں کر دیا

اس میں بعض [illegible] شہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق اور علم [illegible]

کی تفصیلات ایسے دلچسپ [illegible]

[illegible] آخری [illegible] بہادر شاہ ظفر [illegible]

[illegible] پہلی جلد میں [illegible] علمی ذوق [illegible]

ان کے دربار کے [illegible] شعراء [illegible] کے تذکرہ کے ساتھ ان کے علمی کمالات [illegible]

روشنی ڈالی گئی ہے، دوسری جلد جہانگیر و شاہجہان اور ان کے عہد کے امراء کی علم دوستی

اور ان کے دور کے شعراء و ادباء و فضلاء [illegible] کے تذکرہ [illegible] علمی کمالات

پر مشتمل ہے، تیسری جلد [illegible]

بہادر شاہ ظفر [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

جلد نمبر ۱۳۰ — نومبر ۱۹۸۲ء

معارف

مجلس دار المصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن

قیمت بیس روپے سالانہ

دفتر دار المصنّفین اعظم گڑھ

مجلس ادارت

(دارالمصنفین کی دو نئی کتابیں)

سیرۃ النبی جلد ہفتم

سیرۃ النبی جلد ششم کے بعد سید صاحب نے سیرۃ
جلد ہفتم بھی جو معاملات سے متعلق تھی لکھنی شروع
کر دی تھی، اور امید تھی کہ یہ مقدس سلسلہ ختم بھی
ہو جاتا لیکن ابھی اس موضوع پر چند ہی مضامین
لکھے تھے کہ آپ کا انتقال ہو گیا، اور یہ پایۂ تکمیل
کو نہیں پہنچ سکی، یہ ان ہی متفرق مضامین و
مباحث کا مجموعہ ہے جن کے عنوانات یہ ہیں
اسلام میں حکومت کی حیثیت عہدِ نبوی میں
نظامِ حکومت، قرآن اور اہلِ سلطنت اور
دین کا تعلق وغیرہ، شروع
میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا قلم
سے پیش لفظ ہے، قیمت: [illegible]
[illegible]

صوفی امیر خسرو

اس میں ہندوستان کے شہرۂ آفاق
فارسی شاعر، مثنوی سپہر، شیریں خسرو، لیلیٰ
دول رانی خضر خاں اور وسط الحیات
شاہکار مثنویوں کے مصنف اور حضرت محبوب
الٰہی نظام الدین اولیاءؒ کے جان نثار مرید
امیر خسرو کو معاصر تذکرہ و تاریخ کی کتابوں
خود ان کے کلام کے مجموعوں اور مثنویوں
ایک صاحبِ دل صوفی کی حیثیت سے
گیا ہے، اہم مضمون کے تصوف کے
کے مباحث و مسائل پر دوسری اہم
قیمت: [illegible]
مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن
منیجر

جلد ۱۳۰ ماہ محرم الحرام ۱۴۰۳ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۸۲ء عدد ۵

مضامین

معارف کا سالانہ چندہ ملک و بیرون ممالک کیلئے

۱۔ ہندوستان	20-۰	روپیے
۲۔ پاکستان	40-۰	"
۳۔ سعودی عرب	62	"
۴۔ دیگر ممالک	86	"

"منیجر"

شذرات

اترپردیش کی قانون ساز اسمبلی میں اردو اس ریاست کی سرکاری زبان تسلیم کرنے کو تو کرلی گئی ہے لیکن اب تک اس کے سرکاری ہونے کا ثبوت نہیں مل رہا ہے۔

اس مسئلہ پر کچھ لکھنا سینہ کے داغ سے دل کے پھپھولے جلانا ہے، یا پرانے زخم کے چھالے کو بدل کر مطمئن ہو جانا ہے، بہار میں اردو کچھ اضلاع میں سرکاری زبان تسلیم کرلی گئی تو وہاں کی حکومت کی رواداری اور فراخ دلی کی بڑی شہرت ہوئی، مگر وہاں عام خیال یہ ہے کہ کاغذ پر اردو کی سرکاری حیثیت ضرور تسلیم کرلی گئی ہے لیکن اس سے زیادہ اب تک کچھ اور حاصل نہیں ہوسکا ہے، کہیں یہ صورت حال اترپردیش میں بھی نہ ہو، ستم ظریفی یہ ہے کہ اردو بولنے والوں کے پلے میں کچھ آنے سے پہلے حکومت کے اس فیصلہ کی مخالفت جلسے اور جلوس کے ذریعہ ہو رہی ہے، جیسے اردو بولنے والوں کو وہ سب کچھ مل گیا ہے جس سے ہندی پس پشت ڈال دی جائے گی۔

اردو اور ہندی کا جھگڑا دلائل و براہین یا افہام و تفہیم سے طے کرنے کی منزل میں نہیں، ملک کے مشہور رہنما سیم و تی نندن بہوگنا نے دہلی کے ایک جلسہ میں کہا تھا کہ یہ اردو اور ہندی کا جھگڑا نہیں ہے بلکہ اردو اور ناسمجھی کا جھگڑا ہے، جس روز یہ ناسمجھی ختم ہو جائے گی، یہ جھگڑا بھی ختم ہو جائے گا، یہ ناسمجھی ملک کو کہاں لے جا رہی ہے، اس پر ضرور غور کرنا ہے، رہی اردو تو اردو بولنے والوں کو زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، اگر اردو میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے تو کوئی اس کو مار نہیں سکتا، اور اگر اس میں مر جانے کی صلاحیت ہے تو اس کو کوئی زندہ نہیں رکھ سکتا ہے، ہاں اگر سمجھ داری سے کام لیا جائے تو دونوں ہمسایہ زبانوں کی خوبیاں ایک دوسرے کو متاثر کر کے دونوں کو جاندار اور باوقار بنا سکتی ہیں۔

لیکن ایسے دلائل اب فرسودہ ہو چکے ہیں، کچھ کہنے اور سننے کا موقع نہیں رہا، مگر یہ سوچنا ہے کہ طرز فکر میں جارحانہ رنگ بڑھتا گیا تو ملک کا کیا مستقبل ہوگا، جذباتی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کے نعرے تو برابر یہاں کی فضا میں گونج رہے ہیں، لیکن اس حقیقت پر کون پردہ ڈال سکتا ہے کہ جنوبی ہند کو شمالی ہند پر بھروسہ نہیں رہا، میزورام اور ناگالینڈ سے تشویشناک خبریں آتی رہتی ہیں، ہریجنوں کی طرف سے دلستان کی تحریک کی آواز بھی اٹھنے لگی ہے، کشمیر کی قانون ساز اسمبلی میں جو قرار دادیں منظور ہو رہی ہیں وہ کم تردد طلب نہیں، ملک میں جو ہندو مسلم فسادات ہوتے رہتے ہیں، اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ملک بیرونی حملوں کو مسلح ہو کر جھیل دینے کے لیے تو بالکل تیار ہے، لیکن ان فسادات کو روکنے سے قاصر ہے، سکھوں کو معلوم نہیں اپنے متعلق کیا خوش فہمیاں اور حکومت سے کیا غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں کہ وہ خالصتان کے لیے خم ٹھونک کر میدان میں اتر آئے ہیں۔

ایسی بے اطمینانی، شرانگیزی اور شورہ پشتی تو کم و بیش ہر ملک میں دیکھنے میں آتی ہے، مگر اس پر بھی نظر رکھنا ضروری ہے کہ جذباتی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کی خوشگواری پیدا ہونے کے بجائے کہیں یہ خیال عام نہ ہو جائے کہ یہ ملک سب کا نہیں ہے بلکہ ایک مخصوص طبقہ کا ہے، جس کے جذبات، احساسات اور خیالات کے ماتحت ہو کر سب کو رہنے کا نام قومی بہاؤ ہے، ملک کی سالمیت کی خاطر طبقاتی، علاقائی، لسانی اور مذہبی علیحدگی پسندی تو کسی لحاظ سے مناسب نہیں، ایسے انتشار کو کچل کر رکھ دینا حکومت کا حق ہے، مگر یہاں کے ہر طبقہ کو مطمئن اور خوش رکھنا بھی حکومت کا فرض ہے، پہلے راجا اور بادشاہ بھی ایسی بغاوتوں کو کچل کر رکھ دیا کرتے تھے، اس لیے اس سے ایسی نفرت ہوتی گئی کہ اس کی جگہ اب جمہوریت آگئی ہے، جمہوریت کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہ جھک کر اپنے قد کو بالا کرے، مفتوح ہو کر فاتح بنے، دلوں کو دے کر دلوں کو حاصل کرے، نہ کہ بادشاہت ہی کی تاریخ کو دہرائے۔

بادشاہت اور دنیا کی موجودہ جمہوریت میں اب تک بہت سی چیزیں مشترک ہیں، وہی جوع الارض کی چنگیزی، وہی جاہ طلبی کی پرویزی، وہی اقتدار پسندی کی طالع آزمائی، وہی جنگ و جدل کی خون آشامی، اور خود ہر ملک کے اندر شہریوں کے خون کی وہی ارزانی دکھائی دیتی ہے جو بادشاہت کے زمانہ میں تھی، بادشاہ اپنی بادشاہت کو برقرار

رکھنے کے لیے اس کو ظلِ الٰہی اور نیابتِ الٰہی قرار دیتے تھے جمہوریت کے پاسبان اپنی حکومت کو سنبھالنے کیلئے اس کو عوام کی مقدس امانت اور انسانی فلاح و بہبود کی واحد ضمانت بتاتے ہیں، مگر بادشاہ جس طرح عوام کا استحصال کیا کرتے تھے اسی طرح جمہوریت کے امین عوام کے جذبات سے کھیل کر اپنے اقتدار کا پرچم لہراتے رہتے ہیں۔

مگر دنیا کی اس جمہوریت میں کچھ ایسی چیزیں بھی آگئی ہیں جو بادشاہت کے زمانہ میں نہ تھیں، مثلاً اس جمہوری دور میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں رہی کہ کہو کچھ اور کرو کچھ، بند کمرے میں کچھ اور باتیں کرو، باہر نکلو تو کچھ اور بیان دو، اعلان کچھ اور کرو مگر ضرورت ہو تو اس کی تردید بھی کر دو، عوام کے نام کی مالا جپو مگر عوام کی ضروریات کو پورا کرنا ضروری ہی نہ سمجھو، غریبی کو مٹانے کا نعرہ بلند کرتے رہو، مگر سرمایہ داروں کی اعانت برابر کرتے رہو، سیکولرزم کا پرچم لہراتے رہو، مگر کرو وہی جو خود چاہو، قومی بہاؤ کا درس دو، لیکن اپنی بات منوانے کے لیے جارحانہ رنگ اختیار کرو، چاہے یہ قومی بہاؤ کے منافی کیوں نہ ہو، عوامی حقوق کی بحالی کے لیے جمہوری طرز کا انتخاب لڑو، اور جب انتخاب جیت جاؤ تو جمہوری اور اخلاقی قدروں کی پامالی کرتے رہو، ضرورت ہو تو جھوٹ، ضمیر فروشی اور بے مروتی سے کام لو اور کہہ دو کہ محبت، جنگ اور سیاست میں سب کچھ جائز ہے۔

اب یہ مستقبل ہی بتائے گا کہ ایسی جمہوریت گلاب کے پھول کی طرح شاداب اور دلآویز نظر آئے گی یا مرجھائے اور سوکھے ہوئے پھولوں کی طرح وطن کے چمن کی زینت میں کمی پیدا کرتی رہے گی، پھر شاعرِ مشرق اقبال نے جو یہ کہا ہے کہ

جمہوراست تیغِ بے نیامے

اور یہ کہ

نہ اندر غلافِ خود زمانے   برد جانِ خود و جانِ جہانے

تو کہیں یہ صحیح ثابت نہ ہو۔

مقالات

مستشرقین کے تصورِ اسلام کا تاریخی پس منظر

از

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی۔ دہلی یونیورسٹی

مشرق اور مغرب کا سابقہ، تاریخ کا نہایت مہتم بالشان واقعہ ہے، اس آویزش و پیکار کا اصلی سبب کیا تھا؟ ہیروڈوٹس سے لیکر اس وقت تک، تمام محققین اور مورخین نے اسکا سبب معلوم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ابھی تک اس کا کوئی شافی جواب نہیں مل سکا ہے اصل میں اس کا جواب ہو بھی نہیں سکتا، مشرق و مغرب کی پیکار صرف ایک جغرافیائی سادہ بیانی ہے، ورنہ اس کی سطح کے نیچے بہت سے پُرپیچ اسباب چھپے ہوئے ہیں، جو نژادی اور نسلی بھی ہیں علاقائی بھی۔ سیاسی بھی، مذہبی بھی، لغیاتی بھی، اقتصادی بھی اور نظریاتی بھی' ...... اسی لئے ان اختلافات نے ہر عہد اور ہر زمانہ میں ایک نئی شکل اختیار کرلی ہے ان ہی معرکوں میں وہ زد و برد ست کش مکش نظر آتی ہے، جو صدیوں سے اقوام مغرب کی تہذیب و کلیسا، اور اسلام کے درمیان رہی ہے، اور جس کی ابتدا، ہیرقلس کی شکست سے ہوتی ہے جو

اس کو مسلمانوں سے یرموک کے مقام پر سنہ ۶۳۶ء میں اٹھانا پڑی، یہ آویزش کب ختم ہوگی اس کا جواب بھی آسان نہیں ہے۔

اسلام جس برق رفتاری سے پھیلا ہے اس کی مثال بھی تاریخ عالم میں نہیں مل سکتی ہے، بہت جلد اُس نے شام و مصر سے لیکر فرانس کے پائرینیز تک تمام ملکوں پر قبضہ کر لیا تھا، پھر نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاک کاشغر سنہ ۷۱۱ء میں مسلمان اسپین اور سنہ ۷۱۲ء میں ہندوستان تک پہنچ گئے تھے، اسپین میں قدم جمانے کے بعد انھوں نے پراونس، اٹلی اور سوئٹزرلینڈ پر حملے کئے اور اطالیہ اور فرانس پر اپنا تہذیبی اثر قائم کیا۔

قرطبہ کے فلسفہ اور ابن رشد کے افکار تازہ پر پیرس یونیورسٹی میں بحثیں ہوتی تھیں، عربوں کا فن تعمیر، عربوں کی سائنس، عربوں کا علم ہندسہ و جغرافیہ اور عربوں کی شاعری نے فکر و خیال اور زبان و بیان کو اتنا متاثر کیا کہ اُن سے یورپ میں نشأۃ الثانیہ کا دور شروع ہوا۔

سنہ ۱۱۰۰ء سے لیکر سنہ ۱۳۰۰ء تک صلیبی جنگیں بھی کسی نہ کسی شکل میں جاری رہیں جن کی بدولت مشرق و مغرب میں شدید تصادم بھی ہوا اور پھر امتزاج بھی، مغرب نے مشرق کے اثرات قبول کئے اور اس کے علمی خزانہ سے استفادہ کیا، اور ان تمام اسباب و عوامل نے جدید یورپ کی تشکیل کی، جو نشأۃ الثانیہ دور اصلاح اور ایجاد و دریافت سے عبارت ہے۔

بحیرۂ روم کے مشرق میں بھی کم و بیش یہی صورت تھی، سنہ ۱۰۰۰ء سے سنہ ۱۵۰۰ء تک اسلام اور عیسائیت میں مسلسل آویزش رہی، مسلمان اپنے ولولہ انگیز مذہب، اپنی فصیح و بلیغ مذہبی زبان اور اپنی ہمہ گیر تہذیب کی بدولت تمام ایشیا اور افریقہ و یورپ پر چھا گئے تھے عثمانی ترک قسطنطنیہ (سنہ ۱۴۵۳ء) پراگ، اور وائینا سنہ ۱۵۲۹ء تک پہنچ گئے تھے، سنہ ۱۵۲۶ء میں ہنگری ان کی مملکت میں شامل ہو گیا تھا، اور اسی سنہ میں ہندوستان میں بابر نے سلطنت مغلیہ کی بنیاد

ران کی حکومت بڈا پسٹ سے لیکر بنگال تک قائم ہوگئی، اور تجارت کے بیشتر بحری اور
ری راستے ان کے قبضہ میں آگئے، مصر، یورپ اور ایشیا کے درمیان دیوار بنا ہوا تھا، پانچویں
صلیبی جنگ اسی کو ہٹانے کے لیے لڑی گئی تھی لیکن اس میں عیسائیوں کو ناکامی ہوئی بحیرۂ ہند
بن جواب تک عربوں کی جھیل سی معلوم ہوتی تھی ان کا اقتدار تھا، ۱۴۹۸ء میں پرتگالیوں
نے ہندوستان کا بحری راستہ معلوم کر کے عربوں کے اس بحری اقتدار اور تجارت کو سخت نقصان
پہنچایا اور اسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ مصر کی اقتصادی حالت تباہ ہوگئی۔ ترکوں اور مصریوں نے مل کر
بحیرۂ ہند میں پرتگالیوں کی بحری قوت کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی (۱۵۳۸ء) ترک بار بار
کہتے تھے کہ "اللہ نے زمین تو ہمیں دے دی ہے، لیکن سمندر عیسائیوں کو بخش دیا ہے" اسوقت
ترک سلاطین ہندوستان کے مغل بادشاہ اور قلمرو ایران کے صفوی حکمران یہ تینوں بری طاقتیں
اس لائق نہیں تھیں کہ یورپ کی بحری قوت کا بحیرۂ ہند یا بحر اوقیانوس میں مقابلہ کرسکتیں یورپ
کو ایک نیا راستہ ہی نہیں، امریکہ کا ایک نیا بر اعظم بھی مل گیا تھا۔

پرتگال کو مسلمانوں سے جو عداوت رہی اس کو اس زمانہ کے تاریخی حالات کی روشنی میں
سمجھا جا سکتا ہے، صلیبی جنگوں سے جو کدورت اور دشمنی کا جذبہ پیدا ہوا تھا، وہ جزیرہ نمائے
ہسپانیہ کے ممالک میں، پندرہویں اور سولہویں صدی کے اندر، تیز تر ہوگیا، اس کی ایک تو وجہ یہ تھی
کہ مسلمان اسپین میں طاقتور حکمران کی حیثیت سے موجود تھے، اور پرتگال کو ان سے ہر وقت
ڈر رہتا تھا کہ وہ بھی ضم نہ ہو جائیں، ان سے جنگ مذہبی ضرورت بھی تھی، اور ملکی مصلحتیں
بھی اس لڑائی کی متقاضی تھیں۔

یورپ کے بحری اقتدار سے تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے، رفتہ رفتہ انکی
حاکمیت، ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصوں میں قائم ہوگئی، اور سیاسی اور اقتصادی استحصال

اس کو مسلمانوں سے ٹورس کے مقام پر ۷۳۶ء میں اٹھانا پڑی، یہ آویزش کب ختم ہوگی اس کا جواب بھی آسان نہیں ہے۔

اسلام جس برق رفتاری سے پھیلا ہے، اس کی مثال بھی تاریخ عالم میں نہیں مل سکتی ہے، بہت جلد اس نے شام و مصر سے لیکر فرانس کے پائرینیز تک تمام ملکوں پر قبضہ کر لیا تھا، بحرِ اٹلانٹک کے ساحل سے لے کر تا بہ خاک کاشغر ۷۱۱ء میں مسلمان اسپین اور ۷۱۲ء میں ہندوستان تک پہنچ گئے تھے، اسپین میں قدم جمانے کے بعد انھوں نے پرووانس، اٹلی اور سوئٹزر لینڈ پر حملے کئے اور اطالیہ اور فرانس پر اپنا تہذیبی اثر قائم کیا۔

قرطبہ کے فلسفہ اور ابن رشد کے افکار تازہ پر پیرس یونیورسٹی میں بحثیں ہوتی تھیں، عربوں کا فن تعمیر، عربوں کی سائنس، عربوں کا علم ہندسہ و جغرافیہ اور عربوں کی شاعری نے فکر و خیال اور زبان و بیان کو اتنا متاثر کیا کہ اُن سے یورپ میں نشاۃ الثانیہ کا دور شروع ہوا۔

۱۱۰۰ء سے لیکر ۱۳۰۰ء تک صلیبی جنگیں بھی، کسی نہ کسی شکل میں جاری رہیں، جن کی بدولت مشرق و مغرب میں شدید تصادم بھی ہوا اور پھر امتزاج بھی، مغرب نے مشرق کے اثرات قبول کئے اور اس کے علمی خزانہ سے استفادہ کیا، اور ان تمام اسباب و عوامل نے مل کر جدید یورپ کی تشکیل کی، جو نشاۃ الثانیہ دورِ اصلاح اور ایجاد و دریافت سے عبارت ہے، بحیرۂ روم کے مشرق میں بھی کم و بیش یہی صورت تھی، ۱۳۰۰ء سے ۱۵۰۰ء تک اسلام اور عیسائیت میں مسلسل آویزش رہی، مسلمان اپنے ولولہ انگیز مذہب، اپنی فصیح و بلیغ مذہبی زبان اور اپنی ہمہ گیر تہذیب کی بدولت تمام ایشیا اور افریقہ و یورپ پر چھا گئے تھے عثمانی ترک قسطنطنیہ ۱۴۵۳ء پر اور وائنا ۱۵۲۹ء تک پہنچ گئے تھے۔ ۱۵۲۶ء میں ہنگری ان کی مملکت میں شامل ہو گیا تھا، اور اسی سنہ میں ہندوستان میں بابر نے سلطنت مغلیہ کی بنیاد ڈالی

دران کی حکومت بڈا پسٹ سے لیکر بنگال تک قائم ہوگئی، اور تجارت کے بیشتر بحری اور بری راستے ان کے قبضہ میں آگئے۔ مصر، یورپ اور ایشیا کے درمیان دیوار بنا ہوا تھا، پانچویں صلیبی جنگ اُسی کو لینے کے لیے لڑی گئی تھی لیکن اس میں عیسائیوں کو ناکامی ہوئی بحیرۂ ہند میں جواب تک عربوں کی جھیل سی معلوم ہوتی تھی، ان کا اقتدار تھا، ۱۴۹۸ء میں پرتگالیوں نے ہندوستان کا بحری راستہ معلوم کرکے عربوں کے اس بحری اقتدار اور تجارت کو سخت نقصان پہنچایا اور اسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ مصر کی اقتصادی حالت تباہ ہوگئی۔ ترکوں اور مصریوں نے مل کر بحیرۂ ہند میں پرتگالیوں کی بحری قوت کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی (۱۵۳۸ء) ترک بار بار کہتے تھے کہ "اللہ نے زمین تو ہمیں دے دی ہے لیکن سمندر عیسائیوں کو بخش دیا ہے" اس وقت ترک سلاطین ہندوستان کے مغل بادشاہ اور قلمرو ایران کے صفوی حکمران یہ تینوں بری طاقتیں اس لائق نہیں تھیں کہ یورپ کی بحری قوت کا بحیرۂ ہند یا بحراوقیانوس میں مقابلہ کرسکتیں، یورپ کو ایک نیا راستہ ہی نہیں، امریکہ کا ایک نیا براعظم بھی مل گیا تھا۔

پرتگال کو مسلمانوں سے جو عداوت رہی اس کو اس زمانہ کے تاریخی حالات کی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے، صلیبی جنگوں سے جو کدورت اور دشمنی کا جذبہ پیدا ہوا تھا، وہ جزیرہ نمائے ہسپانیہ میں، پندرھویں اور سولھویں صدی کے اندر، تیز تر ہوگیا، اس کی ایک تو وجہ یہ تھی کہ مسلمان اسپین میں طاقتور حکمران کی حیثیت سے موجود تھے، اور پرتگال کو اُن سے ہر وقت خطرہ رہتا تھا کہ وہ کبھی ضم نہ ہوجائیں، ان سے جنگ، مذہبی ضرورت بھی تھی، اور ملکی مصلحتیں بھی اس لڑائی کی متقاضی تھیں۔

یورپ کے بحری اقتدار سے تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے، رفتہ رفتہ انکی حاکمیت، ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصوں میں قائم ہوگئی، اور سیاسی اور اقتصادی استحصال

سکے بیسے ان کو بڑے بڑے ملک مل گئے، اطالوی اور فرانسیسی، شمالی افریقہ میں حکمراں تھے، جرمن ترکی میں بڑھ رہے تھے، روسی وسط ایشیا کو زیر و زبر کر رہے تھے، اور ہندوستان، مصر اور عراق میں تا حدِ نظر برطانوی اقتدار کا پرچم لہرا رہا تھا، اسی نقطہ سے مسلمانوں کا زوال اور یورپ کا عروج شروع ہوتا ہے۔

یورپ کی یہ توسیع سر تا سر مسلمانوں کے خلاف تھی، ان کی کمزوری ہی پر جو سنہ ۱۷۰۷ء سے سنہ ۱۹۰۰ء تک اپنی آخری حدود کو پہنچ گئی تھی، یورپ کی ترقی کا محل تیار ہوا تھا، اس بات کے اعادے میں بھی مضائقہ نہیں کہ یورپ کی ترقی سے پہلے مسلمانوں کی سلطنت ایشیا اور افریقہ میں پھیلی ہوئی تھی، اور اسی لیے یورپ کی توسیع پسندی اور سامراجیت کا خاص ہدف ایشیا اور افریقہ کے مسلمان ممالک تھے۔

اقوامِ یورپ نے اپنی حاکمانہ اور اقتصادی گرفت کو کئی طریقوں سے مضبوط کیا جس کی تفصیل آگے آئے گی، اس وقت یہ اشارہ کافی ہے کہ مشرق میں قدیم و جدید، سائنس اور مذہب اور اسلام اور عیسائیت کی آویزش خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی، اور اس نے پوری پوری آبادیوں کو جڑوں سے اکھاڑ دیا تھا، اس وقت ایشیا کا سیاسی، مادی اور اخلاقی تنزل انتہا کو پہنچ چکا تھا، یہاں اگر کچھ رہ گیا تھا تو صرف اوہام کا تار و پود۔ قوائے عمل شل ہو گئے تھے اور شعلۂ حیات سرد ہو رہا تھا۔ اور منفی طرزِ فکر نے اُن کو بے عمل بے ذوق، کاہل اور ناکارہ بنا دیا تھا۔ یورپ کا یہ حملہ صرف بحر و بر ہی پر نہیں تھا، یہ حملہ ان کے عقائد، ان کے فلسفہ، ان کی روایات، ان کی تاریخ، اُن کی بلند ترین شخصیتوں پر بھی تھا، سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد تو بقول ٹوئن بی "مغرب کا تیر مشرق کی روح میں پوری طرح پیوست ہو گیا تھا" اور وہ مرغِ بسمل کی طرح تڑپ رہے تھے، "چند غیر معمولی اشخاص کو چھوڑ کر، سب ہی پر یاس و الم کے بادل چھا گئے تھے، شاعر جنازہ بر دوش، عالم تقلید پرست

اور ذوق وجستجو سے عاری، صوفی، فلک کے راستہ میں مستغرق، استاذ تکوینی جوہر سے ناآشنا اور نئے تقاضوں سے یکسر بے خبر۔

مشرق کے خلاف، یورپ کی جارحیت ہمہ جہت تھی، ان کے حملے صرف فوجوں کے ذریعہ نہیں ہوئے، اس میں ان کے دانشور مستشرقین، اہل فکر، شعراء علماء اور اساتذہ بھی شامل تھے، اسی لیے اقبال نے مغربی مدرسوں کی کور نگاہی، اور بے ذوقی کی شکایت کی ہے،

ع نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

مغربی اثرات کے چیلنج کا، ردعمل، مشرق پر ایک دائرہ کی شکل میں رونما ہوا جس میں رد و قبول، تقلید و ایجاد تنقیدی فکر اور بہترین اقدار کا انتخاب اور اعتماد کے ساتھ، اپنی صالح مشرقیت پر جمے رہنے کا انداز کارفرما ہے، لیکن مغرب نے نئے نئے دام بچھائے تھے اور ایک ایسی نسل کو تیار کیا تھا، جو اپنی ذہنیت اور مرعوبیت میں بالکل مغرب زدہ اور مشرق سے بیزار تھی، دراصل اہل کلیسا کا یہ نظام تعلیم اقبال کے الفاظ میں :۔

ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

اقبال نے علامہ سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں صراحت سے لکھا ہے، کہ لندن میں مشرقی و افریقی علوم کا ادارہ صرف برطانوی سامراجیت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے قائم کیا گیا ہے، اسی قسم کے خیالات انھوں نے حافظ فضل الرحمن انصاری کے نام ایک خط میں ظاہر کئے ہیں لکھتے ہیں :۔

" جہاں تک اسلامی ریسرچ کا تعلق ہے۔ فرانس، جرمنی انگلستان اور اٹلی کی یونی ورسٹیوں کے اساتذہ کے مقاصد خاص ہیں، جن کو عالمانہ تحقیق اور احقاق حق کے ظاہری طلسم میں چھپایا جاتا ہے، سادہ لوح، مسلمان طالب علم اس

طلسم میں گرفتار ہوکر گمراہ ہو جاتا ہے،

اقبال کو افسوس تھا کہ مغربی کالجوں کے پڑھے ہوئے مسلمان نوجوان، روحانی اعتبار سے فرومایہ ہیں۔ ان کی نظر مساوات شکم سے آگے نہیں جاتی، وہ روح کو معدہ میں تلاش کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ روح کی قوت وحیات کا جسم سے کوئی تعلق نہیں، یہ اور اس قسم کے بہت سے خیالات اُن مغربی دانش وروں کے ذریعہ پھیلے، جن کے آگے زانوئے تلمذ تہ کئے بغیر ترقی ممکن نہیں تھی۔

جب اقوام مغرب نے مشرق کا بحری راستہ معلوم کیا اور مشرق پر اپنی حاکمیت قائم کرنا شروع کی تو اس کی ضرورت بھی محسوس کی کہ اُن کی زبانوں کو، ان کے مذاہب کو اور ان کی تہذیب وتمدن کو سمجھیں، اور ان کو اپنے رنگ میں اس طرح پیش کریں کہ مغرب مقابلۃً اعلیٰ وارفع نظر آئے اور ان کی صنعت وحرفت اور سامان تجارت بہتر ٹھہرے۔

جن عالموں نے اس اقلیم میں قدم رکھا، وہ مستشرق کہلائے اور پورا ایک نیا علم اورنٹلزم کے نام سے وجود میں آگیا، یہ مشرق اورینٹ (ایسٹ نہیں) اس میں مغرب کا زائیدۂ فکر ہے، جہاں تخیل ہی تخیل ہے رومانس ہی رومانس ہے، اس میں شدید جنسیت ہے عیش وعشرت کی بہتات ہے، بھوک اور بے رحمی ہے، اس کی میزان قدر میں قرآن پاک اہم نہیں ہے، الف لیلا اہم ہے جو عربی ادبیات میں معمولی درجہ کی کتاب ہے، یہ مشرق مغرب کی مادی تہذیب کا حصہ بن گیا ہے، اس میں عجیب وغریب آدمی رہتے ہیں، نیم وحشی، نیم متمدن، نیم برہنہ، خواجہ سگ پرست بھی، نعمان سیاح بھی زاہد بھی، رند بھی، اس مشرق کی دولت بے کراں ہے، اس کی خام پیداوار کے بغیر مغرب کے کارخانے نہیں چل سکتے، یہ مشرق تہذیب کا گہوارہ اور مذاہب کا سرچشمہ ہے، یہ مشرق، مغرب کے مادی مفادات کا مرکز ومحور ہے اس مشرق کو

یورپ نے سماجیاتی، فوجی، جنگی اور سیاسی طور پر پیدا کیا ہے اور اس پر اتنی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ ان سے ایک اچھا خاصا کتب خانہ تیار ہو سکتا ہے۔

اس مشرق کا جو کلیتہً مغربی تصورات اور مفادات کی پیداوار ہے، کچھ تھوڑا سا اندازہ دانتے کی مشہور و معروف نظم طربیۂ خداوندی سے ہو سکتا ہے، ۱۳۱۳ء اور ۱۳۲۱ء کے درمیان تصنیف ہوئی، اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ عہد وسطیٰ میں اہل یورپ، مشرق کے بالخصوص اسلام کے متعلق کیسے گھناؤنے تصورات رکھتے تھے اور ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ عشق محمدؐ ان کے دل سے نکال دیں اسلیے کہ اسی آئیڈیل پر ان کی عظمت قائم تھی۔

اس نظم نے یورپ کے ذہن و ضمیر پر بے انتہا اثر ڈالا ہے اور اتنے ماہ و سال گزرنے کے بعد تو اس میں تاریخ کی سی تقدیس اور سچائی پیدا ہو گئی ہے، طربیہ خداوندی کے تین حصے ہیں، دوزخ، برزخ اور فردوس، دانتے، مشرق و مغرب کی اہم شخصیتوں سے واقف تھا، مثلاً وہ ورجل، ہومر، ابن سینا اور ابن رشد سے واقف ہے، اور مسلمانوں اور یہودیوں کی تاریخ سے بھی نا آشنا نہیں تھا، اس میں عیسائیوں کی کور نگہی، تنگ دلی، اور عصبیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، اس کا یہ ایمان ہے کہ مغفرت کے سزاوار صرف کیتھولک عیسائی ہیں باقی سب دوزخ کا کندہ ہیں دانتے نے دوزخ Inferno کے canto 28

اور نویں طبقۂ جہنم یعنی اقلیم عذاب میں حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نعوذ باللہ بڑی ہی ہیبت ناک تصویر کھینچی ہے، نقل کفر کفر نباشد، یہ دکھلایا ہے کہ شکم مبارک چاک ہے اور حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی نعوذ باللہ انتڑیاں باہر نکلی ہوئی ہیں اور وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جن کو خود نعوذ باللہ دو حصوں میں چیر دیا گیا ہے۔

فرماتے ہیں دیکھو میری حالت، یہ سیاہ ترین بدمستیوں اور بدکاریوں کا نتیجہ ہے، یہ عیسائیت کو مسخ کرنے، فریب اور ریاکاری اور نفاق کو پھیلانے اور اختلاف کا بیج بونے کی سزا ہے۔

استغفراللہ ــــــــــ دانتے کو پاپائیت اور کیتھولک فلسفہ اور عقیدے پر پورا یقین تھا، اور اس کے تخیل کے سارے نقش و نگار، اسی مذہبی تعصب کے پیدا کردہ ہیں،

طربیہ خداوندی کی تعمیر و ترکیب میں بھی یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کی روایتوں، تمثیلوں اور یونانی، رومی اور عرب ضمنیات کے علاوہ سب سے زیادہ دخل اُس تعصب کو تھا جو صلیبی جنگوں سے عیسائیوں کے دلوں میں، جاگزیں تھا اور اس میں سب سے بڑی کرشمہ سازی اُس زہریلے تخیل کی ہے، جو دانتے کی شاعرانہ تخیلات کا حصہ بن گیا تھا، اس کا اتنا گہرا اثر، مغرب پر ہوا ہے کہ انھوں نے طربیۂ خداوندی کو صحائفِ آسمانی میں شمار کر لیا تھا۔

میرا عرض کرنے کا یہ مقصد ہے کہ دانتے سے لے کر انیسویں صدی کے ڈاکٹر اسپرنگر اور سر ولیم میور اور بیسویں صدی کے مانٹ گمری واٹ تک اسلام کا کم و بیش یہی تصور اُن کے سامنے رہا ہے، اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ہندوستان میں، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز افسر آئے وہ بھی یہی تخیل رکھتے تھے، اور وہ عیسائیت کی سب سے بڑی خدمت یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو عیسائی بنالیں۔ اُن کی عظمتِ دیرینہ کو ختم کر دیں اور ان کے دل سے حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نکال دیں، وہ خوب جانتے تھے کہ اس محبت کے بغیر اسلام کی عمارت ڈھ جائے گی، ۱۸۳۰ء سے ۱۸۵۰ء کے درمیان، مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان، جو مناظرے، پہلے آگرے، اور پھر دہلی میں ہوئے، اُن میں بھی یہی تخیل اور یہی تعصب کارفرما ہے۔

۱۸۰۳ء میں عیسائیوں نے دہلی میں قدم جمائے اور ۱۸۰۳ء ہی میں حضرت

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے یہ فتویٰ دیا کہ مشرق سے لے کر دہلی تک سارا علاقہ انگریزوں کے زیر اثر آگیا ہے اس لیے ان کے خلاف لڑنا ہمارا دینی فرض ہے لیکن اسی کے ساتھ ہمیں ان کے نئے علوم کو بھی سیکھنا چاہیے۔ سنہ ۱۸۴۰ء اور سنہ ۱۸۵۴ء میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خان اور پادری Rev. Pfander کے درمیان آگرے میں جو مذہبی بحثیں اور مناظرے ہوئے ان سے بھی عیسائیوں کی یہی کور فہمی، تنگ نظری اور عصبیت جھلکتی ہے جو صلیبی جنگوں اور دانتے کی بدولت ان کو وراثۃً ملی تھی، سرسید کا یہ خیال صحیح ہے کہ اسی کی وجہ سے ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں علماء نے قلم چھوڑ کر تلوار اٹھالی تھی۔

سنہ ۱۸۳۳ء میں جو چارٹر ایکٹ آیا اس نے بھی مسیحی مبلغین کو بالکل بے لگام کر دیا تھا، اور انھوں نے مسلمانوں کی دل شکنی اور دل آزاری میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی، اس کی شہادت ڈپٹی نذیر احمد اور سرسید کی تحریروں سے بخوبی مل جاتی ہے۔

اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی میں مشرق کے زوال اور مغربی استحصال کے ساتھ ساتھ اسلام اور اسلامی ممالک کی غلط تعبیر کے لیے ایک نیا ڈسپلن وجود میں آیا جس کو اورینٹلزم کہا جاتا ہے، میں اس کا کھلے دل سے اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ اس شر میں خیر بھی شامل تھا، اس سے بالواسطہ تحقیق کی نئی راہیں بھی کھلیں اور سماجی اور سائنسی علوم کی مدد سے ریسرچ پہلے کے مقابلے میں زیادہ خزینہ دار اور تونگر بن گئی، لیکن انیسویں صدی کے اواخر تک یہ کوشش جھوٹی سچی روایتوں اور افواہوں، افسانہ طرازیوں اور صحیح و موضوع حدیثوں کا مجموعہ تھی، جس کے پیچھے سامراجی مقاصد تھے، ان مقاصد پر خوبصورت پردے پڑے ہوئے تھے اور عام طالب علم، ان پردوں کے نقش و نگار ہی کو حقیقت سمجھ بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر اسپرنگر کی کتاب بزبان انگریزی Life of Mohammad from original —

-Sources by Dr. Sprenger, Allhd. 1851
III Life and Doctrines of Mahammad from Sources hitherto un-used in 3 vols. by A. Sprenger.

اور یہاں جرمن جو برلن سے ۱۸۶۹ء میں شایع ہوئیں، اس کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اسپرنگر کا ماخذ واقدی ہے، جس کے متعلق تمام دنیا یہ جانتی ہے کہ وہ اندھیری رات میں لکڑیاں چننے والا تھا، اور اس کی غلط روایتوں، افسانہ طرازیوں اور جھوٹے قصے کہانیوں، اور بے سند باتوں کی وجہ سے اسے تمام علمائے اسلام نے جھوٹا اور نامعتبر قرار دیا ہے۔

یہی حال سر ولیم میور کا ہے جن کے اعتراضات سے سرسید کا کلیجہ چھلنی ہو گیا تھا، اور اس کا جواب لکھنے کے لیے وہ انگلستان گئے۔ اور اس کا جواب انھوں نے خطباتِ احمدیہ لکھ کر دیا جسکو انھوں نے ۱۸۷۰ء میں اپنے برتن بیچ بیچ کر لندن سے شایع کیا، یہاں یہ جملہ معترضہ بھی بے محل نہ ہوگا کہ اس وقت ہندوستان دولت سے خالی ہو گیا تھا، اور یہ اسی کے خزانے تھے، جن کی بدولت انگلستان میں صنعت کو فروغ حاصل ہوا، ملک و مال کے جانے کے بعد ہندوستان کا علمی خزانہ بھی خالی ہو گیا تھا، ۱۷۹۹ء، ۱۸۵۶ء اور ۱۸۵۷ء کے بعد یعنی میسور، اودھ اور دہلی کے سقوط کے بعد ہماری کتابیں بھی انگلستان چلی گئی تھیں، اسی لیے سرسید کو ضروری کتابیں دیکھنے کے لیے انگلستان جانا پڑا۔

غنچہ روز سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کن		کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

سرسید سر ولیم میور کی لائف آف محمد کا جواب لکھنا چاہتے تھے، میور نے یہ کتاب پادری فنڈر کے حکم پر اور اس کے مشن کو تقویت پہنچانے کے لیے لکھی تھی یہی وجہ ہے کہ سر ولیم میور نے

حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بڑی بڑی گستاخیاں کی ہیں اور نعوذ باللہ اُن کو بازی گر، فتنہ پرداز، عیش پسند، فریبی اور ریاکار کہا ہے، غرض وہ تمام رکیک اور بے ہودہ الفاظ استعمال کئے ہیں، جو اس سے قبل صلیبی جنگوں اور دانتے کے ذریعہ رائج ہو چکے تھے۔

کارلائل اور گبن کے یہاں چند اچھے کلمات بھی مل جاتے ہیں، لیکن ان کی [۱] استثنائی حیثیت ہے، اور نہ وہ صحیح معنوں میں مستشرق ہیں، انیسویں اور بیسویں ...... صدی کے اوائل تک حضور رسالت مآبؐ کو اور اسلام کو مسیحی تعصب سے جانچا گیا، اور اسلامی تاریخ کو مسخ کرکے اسکولوں اور کالجوں میں پیش کیا گیا، عیسائیوں نے مسلمانوں کی عظمت دیرینہ اور تہذیبی برتری پر کاری ضرب لگائی، اس لیے کہ بقول اسپرانگر جو قدیم دہلی کالج کا پرنسپل تھا، اسی عظمت کے احساس نے اُن کو لکھنؤ اور دہلی کی مدافعت میں جو ۱۸۵۶ء اور ۱۸۵۷ء میں عمل میں آئی، اُن کے اندر یہ حوصلہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ موت سے آنکھ ملا سکیں اور بے پناہ اور ناقابلِ تسخیر بن جائیں۔

بیسویں صدی میں سائنس اور ہائی ٹکنالوجی نے بے حد ترقی کی ہے، آج زمین کی طنابیں کھنچ گئی ہیں اور ہم اسی وقت یہاں بیٹھے بیٹھے دنیا کی خبریں دیکھ اور سن سکتے ہیں، اس صدی کو صحافت اور ٹیلی کمیونی کیشن کی صدی بھی کہا جاتا ہے، لیکن انگلستان اور امریکہ کے بیشتر اخبارات The Times لندن سے لے کر نیویارک کے New York Times تک یہودیوں کے قبضہ میں ہیں، اور انھوں نے اس آویزش و پیکار میں جو صلیبی جنگوں سے شروع ہوئی تھی ایک نئی جہت کا اضافہ کیا ہے، اس معاملہ میں ہماری بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا ایک بھی انگریزی اخبار نہیں، حالانکہ ان کی آبادی ۵ ملین کے قریب بتائی جاتی ہے۔

بیسویں صدی میں عیسائیوں کے ضمیر نے ایک نئی کروٹ لی ہے، پایۂ پرانے

نگاری ایک نیا جال لاتے ہیں، یا تیں کی اہمیت کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے بارے میں اپنے رویے کچھ نرم کرنا چاہتے ہیں، بہرحال اسی وجہ سے علم کی خاطر کم اور سیاست کی وجہ سے زیادہ Wood Brooke College نے Christian Muslim Dialogue شروع کیا ہے، اس سے امید بندھتی ہے کہ تعصب کے پردے چاک ہوں گے، اور گرچہ ہے کس کس کی برائی سے دلے باایں ہمہ مسلمانوں اور عیسائیوں کی باہمی علمی کوشش سے ایک صحیح تصویر ابھرے گی۔

یہاں عالم اسلامی کے سب سے بڑے سیرت نگار اردو کے در مورخ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر ضروری ہے، جن کی ساری زندگی جہاد علمی میں گذری اور انھوں نے مستشرقین کا جواب اپنی گراں قدر تصانیف کے ذریعہ دیا۔

مقالات شبلی تاریخی

جلد ششم

سلسلۂ مقالات شبلی آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے، یہ جلد مولانا کے معرکۃ الآرا تاریخی مقالات پر مشتمل ہے، جو انھوں نے یورپ کے مستشرقین اور تنگ نظر ہندو مورخین کے جواب میں: الندوہ اور دوسرے بلند پایہ رسالوں میں لکھے تھے، مثلاً کتب خانہ اسکندریہ اور مسلمانوں کی علمی بے تعصبی اور ہمارے ہندو بھائی وغیرہ۔

قیمت :- .... ۱۱۰ روپے

دیوانِ صلائی

از: پروفیسر ڈاکٹر امیر حسن عابدی، دہلی یونیورسٹی،

تذکرۂ شمع انجمن اور ریاض العارفین کے مولفین نے امیر جلال الدین حسن متخلص بہ صلائی کا ذکر کیا ہے، نیز ان کو سادات شہرستان میں سے بتلایا ہے ان کو اصفہانی بھی لکھا گیا ہے،

تذکرہ نویسوں کے قول کے مطابق وہ شاہ عباس[1] کے زمانہ میں صدارت کے عہدے پر فائز ہوئے، مگر ۱۰۲۰ھ (۱۶۱۱-۱۲ء) میں ان کو معزول کر دیا گیا، ان دونوں تذکروں میں ان کے یہ شعر درج ہوئے ہیں:-

خدا شکیب دہد این دلِ پریشان را | کہ بر شکستہ دلان رحم نیست خوبان را
مصریان انصاف می خواہم کہ این بہتر است | آفتاب نیمروز یا ماہِ کنعان شما
جور و جفا اگر ز پئے آزمودن است | از من نماند خود اثر این امتحان کیست
سعی طبیب ہرزہ بود بہر چارہ ام | مرہم کجا و این جگر پارہ پارہ ام
از ملک دل بپرس خبر کاندرین دیار | صاحب تصرفی نیست کہ من ہیچ کارہ ام

پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شیرانی کلکشن میں دیوان صلائی[2] کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے، جو خراب حالت میں ہے، نیز اوراق الٹے پلٹے ہوئے، اور بہت سے غائب ہیں، اس سے اس کے مطالعہ میں زحمت ہوتی ہے۔

---

[1] ۹۹۶-۱۰۳۸ھ ۱۵۸۸-۱۶۲۹ عیسوی [2] شمارہ ۲۲۲/۱۵۷۷

فہرست شیرانی کے مؤلف نے صاحب دیوان کا نام احسن بیگ لکھا ہے۔ جب کہ خود نسخہ میں حسن بیگ دیا ہوا ہے۔ یہ نسخہ ۱۰۱۷ھ (۱۶۰۹ – ۱۶۰۸ عیسوی) میں لکھا گیا، اور اسکا کاتب عبدالرحیم ولد سید نجم الدین ہے۔ غالباً یہ نسخہ خود شاعر کی زندگی کا ہے۔ بہرحال یہ صلائی شمع انجمن وغیرہ کے صلائی سے مختلف ہیں۔ اس لیے کہ وہ صلائی سادات شہرستان میں سے تھے۔ جب کہ ان کو بیگ بتلایا گیا ہے۔ نیز ان صلائی کا شہرستان سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ وہ دوسری جگہ کے رہنے والے تھے۔ ان صلائی کے متعلق تذکروں سے کوئی پتہ نہیں چلتا اور تذکرہ نویسوں نے انکا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ البتہ خود اس دیوان کے پڑھنے سے انکی زندگی کے خدوخال درست کیے جا سکتے ہیں۔

جیسا کہ خود ان کے اس قطعہ سے معلوم ہوتا ہے، وہ ۹۵۵ھ ہجری (۱۵۴۸-۴۹ء عیسوی) میں ساحل مرغاب میں پیدا ہوئے لیکن ان کی تربیت اسفراین میں ہوئی۔ ۹۸۱ھ (۱۵۷۳-۷۴ء عیسوی) میں وہ ہندوستان آنے کے لیے بے چین ہوئے۔ اور رخت سفر باندھا۔ لیکن یہاں ان کو وہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ جس کی وہ امید لے کر آتے تھے۔ نیز یہاں ان کو نشیب فراز دیکھنے پڑے۔ ۹۹۹ھ ہجری (۱۵۹۰-۹۱ء عیسوی) میں ان کو کسی بڑی کامیابی کی امید تھی۔ مگر اسکی نوعیت کا اس سے پتہ نہیں چلتا۔ البتہ ایک دوسرے قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سال حج کے لیے گئے تھے۔

بسال نہصد و پنجاہ و پنج از ہجرت — ز شہر بند عدم آمدم بملک وجود
بود مقام تولد بساحل مرغاب — ولیک نشو و نمایم باسفراین بود
چو اکہ آن وطن اصلی پدر بود م — قضا بآن . . . سیر آن دیار فرمود
چو سال نہصد و ہشتاد و یک شد از تاریخ — ہوای ہند عنان دلم زکف بربود

ولی بہند نشد حاصل آنچہ دل می خواست — کہ روزگار چہ نشیب و فراز رو بنمود
بہ نہصد و نود و نہ بروز عید ضحیٰ — بدر کعبۂ امید بخت دیدہ کشود
بیادگار ز من گر بماند فرزندی — کہ جانشین بود م چون بجہان کنم پدرود
ولی باین دل خود شادی کنم کہ بہر — نمرد آنکہ سرایند گفتہ اش بسرود

دوسرا قطعہ یہ ہے :-

بروز جمعہ ذی القعدہ نہصد و نود و نہ — مذاق سعی گرفت از لب ۔۔۔۔۔ کام
پئے طواف حرم چون صلائی ہجور — بربست صدق یقین پیشہ نیت احرام

اس دیوان میں ایسے قصیدے ہیں، جو شاید ہندوستان کی زندگی سے تنگ آکر صلائی نے شاہ عباس کی مدح میں کہے تھے اور جنہیں ایران کو جنت سے بہتر بتلایا گیا تھا۔ نیز شاعر نے ان میں تنگدستی کا ذکر کیا ہے۔

آنقدر زلت کہ در عہدت ز عسرت می کنم — گر کنم تقریر از اظہار خجالت می کشم
ملک ایران رشک جنت گشتہ از عباس شاہ — بار عایت رخت تا آن رشک جنت می کشم
بس بگو عباس شاہ در حرف از اعدا ادار — کس سزاوار ست شرق و غرب و زیر نگین

ان کے علاوہ کئی قصیدے اکبر کی تعریف میں ہیں، جو حتماً ۹۸۱ ہجری (۱۵۷۳-۷۴ سنہ عیسوی) کے بعد کہے گئے ہوں گے۔ مثلاً کہتے ہیں[1] :-

بر درگہ شہنشہ اکبر کہ باد بخشش — فیروز بر اعادی مفتاح بر مشاکل
خدیو ملک ظفر کامیاب اکبر شاہ — کہ می سزد خدمش را خطاب خاقانی

مگر زیادہ تر قصیدے شاہزادہ سلیم کی شاہزادگی کے زمانہ میں انکی تخت نشینی پر

---

[1] ۹۶۳ - ۱۰۱۴ ہجری / ۱۵۵۶ - ۱۶۰۵ عیسوی

اور جہانگیر[1] بادشاہ بننے کے بعد مختلف موقعوں پر کہے گئے ہیں۔ قصیدوں کے بعض اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں :-

نور الدین خسرو جہانگیر ‏ ‏ ‏ شد شاہ سلیم ابو المظفر

شاہنشہ خسرو جہانگیر ‏ ‏ ‏ دارای سریر و عز و اکرام

یہاں رہ کر صلاتی دکن میں قطب شاہی دربار تک بھی پہنچے تھے۔ نیز انھوں نے محمد قلی قطب شاہ[2] کی مدح میں ایسے قصیدے کہے ہیں :-

شہ سپہر مکان قطب شاہ آنکہ بود ‏ ‏ ‏ فلک متابعش و روزگار فرمانبر

صاحب قرآن خدیو محمد قلی شہ آنکہ ‏ ‏ ‏ با مردمی اوست قرین چرخ و اختر شہی

ان کے علاوہ انھوں نے احمد سلطان محمد سلطان نامی بادشاہ کی بھی ذیل کے قصیدے میں تعریف کی ہے۔ مگر ٹھیک سے پتہ نہیں چلتا کہ ان سے کون مراد ہے :-

رسید مژدہ کہ نو گشت دہر را بنیان ‏ ‏ ‏ بعہد احمد سلطان محمد سلطان

ممکن ہے کہ ان سے مراد عثمان بادشاہ احمد اول ہوں[3]۔

بادشاہوں کے علاوہ صلاتی نے امرا کی بھی تعریف کی ہے، جن میں سے خاص طور سے میرزا ابو القاسم[4] کی توصیف کی گئی ہے۔ ان کا نام بار بار ان کے قصیدوں میں لیا جاتا ہے، مثلاً کہتے ہیں :

---

[1] ۱۰۱۴ - ۱۰۳۷ ہجری / ۱۶۰۵ - ۱۶۲۷ عیسوی۔ [2] ۹۸۸ - ۱۰۲۰ ہجری / ۱۵۸۰ - ۱۶۱۲ عیسوی [3] احمد اول سلطان عثمان۔ ۱۰۱۲ - ۱۰۲۶ ہجری / ۱۶۰۳ - ۱۶۱۶ عیسوی۔ [4] آتشکدۂ آذر میں لکھا ہوا ہے کہ آپ اصلاً گلستانۂ اصفہان کے سادات میں سے تھے، مگر خود ترکستان میں پیدا ہوئے اور کابل میں نشو و نما پائی، اس وجہ سے کابلی کہے جاتے ہیں۔ ہمایوں بادشاہ کے زمانہ میں آپ ہندوستان آئے اور آخر عمر گوشہ نشینی میں بسر کرتے رہے۔ آخر میں آپ فقرا کے ساتھ رہنے لگے۔ آپ شاعر بھی تھے، چنانچہ اس تذکرے میں ان کے کئی شعر دیے ہوئے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے :

چوں سایہ ہمرہ ہم بہر جا رواں شوی ‏ ‏ ‏ شاید کہ رفتہ رفتہ بما مہربان شوی

محی دین و دول میرزا ابوالقاسم　　　کہ امر و نہی خدا را زجان بود ماموم

عظیم المرتبہ سعد اختران مرزا ابوالقاسم　　　کہ دیہیم صدارت راست او زیبندہ و فرہنگی

ان کے علاوہ انھوں نے خان اعظم[1] اعظم خان، مقرب خان، مرتضی خان احمد، حافظ کتابت مصطفی خاں[2] وغیرہ کا بھی ذکر کیا اور انکی مدح کی ہے۔

شمس دین و دول آں کز شہ دوران خطاب　　　بہر تعظیم جہانگیر قتلی خان آمد

خلعت دو (دہ) اقلیم ستان اعظم خان　　　کہ چو اجداد رئیس دل حیران آمد

فرید عہد توئی خان مرتضی القاب　　　ز لطف شاہ جہانگیر بخت فرخ فر

مسلم ورع اوست مصطفی خانی　　　بصدر مسند دانش ز آل پیغمبر

تمتن صف نام آوران مقرب خان　　　کہ از علو شرف ہست واجب التعظیم

بوعلی زماں مقرب خان　　　کہ از و ملک شاہ راست نظام

نیوائی حافظ کتابت ار مصاحب خان　　　چو شہر لودہی گشت سربسر ویران

بعض لوگ اتنے بڑے تو نہ تھے کہ ان کی شان میں قصیدے کہے جائیں، لیکن قطعوں میں ان کا ذکر اور انکو یاد کیا گیا ہے۔ مثلاً ہاشم دلال اور کسی مرزا یحییٰ نامی کا بڑے اخلاص سے نام لیا اور ان کو سلام پہنچایا گیا ہے۔

خدمت اخذ التزامی ہاشم سمسار را　　　اے صبا از ما دعا گو با آمین مدام

اے صبا رفتہ بہ مرزا یحییٰ　　　عرض اخلاص صلائی برسان

کسی شاہ جی کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

---

[1] مرزا عزیز کوکہ وفات سنہ ۱۰۳۳ ہجری ۲۴-۱۶۲۳ عیسوی [2] مصطفی خان خلف سہراب خان موصیلو آق قوینلو ترکمان ہے۔ مصطفی بیگ ترکمان خاں ہ وفات سنہ ۱۰۴۳ ہجری ۳۴-۱۶۳۳ء

شادی یا چند دیگر داخلند اما فلاں | زان می گوید فغاں از میرزا خان می کند

مگر دوسری طرف انھوں نے کسی خواجہ حسین کے لڑکے کی اس طرح مذمت بھی کی ہے ۔

سر فراز ابن خواجہ حسین | ہست بعید عذاب روح مرا

کسی کاشانی کے لیے کہتے ہیں ۔

مگر چہ کاشنیست ولی علت قمی دارد | باوجود مثل ز فلانست فلاں

حسب ذیل میں قطعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں کسی چغلخور کی وجہ سے ایک امیر نے اپنے پاس سے ہٹا دیا تھا، پھر یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انھیں کوئی وظیفہ ملتا تھا جو بند کر دیا گیا تھا ۔

اما سپہر مروت دو دم سال شد کم و بیش | کہ از عطا نرسیدہ بہ مخلصاں مناد

قبلہ گاہا امید آنم بود | کہ بپرسد ترحمت یکبار

کہ خدائے محب دیر نیم | از چہ دارد ز بزم وصل کنار

زین تغافل گمان شدہ کہ مرا | یکے از زنان بری نفتار

خوردہ بر گوش الفتت حرفے | کہ چنین خاطرت بگرفت غبار

مشیخت تمہارا حکومت شعار | بمنع وظائف دل ما رنجان

اس دیوان میں کچھ اور تاریخیں بھی دی ہوئی ہیں ۔ مثلاً قطب الاقطاب شیخ داؤد نے ۱۹ ربیع الاول ۱۳۱۸ہجری (۱۹۰۲ عیسوی) کو انتقال کیا تو یہ قطعہ کہا گیا، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳۱۸ ہجری تک صلاقی حتماً زندہ تھے ۔

ور شانزدہ ربیع الاول | شد جانب خلد شاد و خوشنود

آن قدوۂ کشور سعادت | قطب الاقطاب شیخ داؤد

تاریخ وفات از صلاقی | جبینم ہزار و سیزدہ بود

اس قطعہ میں اول ماہ صفر میں کسی کی ولادت کا ذکر کیا گیا ہے۔ مگر پتہ نہیں چلتا کہ اس سے کون مراد ہے، نیز صرف مہینہ دیا ہوا ہے، سال بیان نہیں کیا گیا ہے:۔

اول ماہ صفر تازہ گلی روی بنمود ز بستانِ عدم

ممکن ہے کہ خود ان کے لڑکے کی ولادت کا ذکر ہو جو بعد میں شاید زندہ نہ رہ سکا۔

دیوان کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں صلائی زیادہ تر گجرات میں اقامت پذیر رہے ہیں، نیز اس قصیدہ میں انھوں نے خان اعظم کے وہاں جانے پر مسرت کا اظہار کیا، اس لئے کہ اس سے قبل وہاں کے اربابِ ظلم و ستم نے اسے ویران کر دیا تھا،

ملک گجرات کز اربابِ ستم ویرانست باد معمور زیمنِ قدم معدلتی

آنکہ در کشور او راک ز ممتازانست کیست آن باعث آسایش عالم دانی

کز شرف مرکز احساس ہنرمندانست خانِ اعظم کہ بود مصر عزیزش آباد

وہ دکن کے علاقے میں بھی رہے ہیں، جہاں کے قحط کا وہ اس طرح ذکر کرتے ہیں:۔

گویند کہ کم بنود باران عدل آثار بجو کن امسال

از غلہ اثر گران وارزان آیا شدہ اینکہ نیست پیدا

صلائی کے کلام میں بار بار انکی عسرت کا ذکر آتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ افلاس کی زندگی بسر کرتے رہے پھر بھی کسی احسان کے متمنی نہیں ہیں:۔

از منتِ خلق بی نیازم ہر چند کہ مفلسم و شاعر

متمول تر از اندیشہ صد قارونم مفلسم لیک صلائی صفت از گنج خرد

البتہ ممسک اور بخیل لوگوں کی مذمت ضرور کرتے ہیں:۔

فرمانِ بقتلِ والی امساک دادہ ایم در کشور سخا چو صلائی بدست جور

صلاتی کو حضرت علیؑ، اہل بیت اور ائمہ سے بڑی عقیدت تھی، نیز خراسان سے جہاں امام رضاؑ مدفون ہیں بڑا لگاؤ تھا :-

یا صلاتی بد رسرعت تسخیر وصال قرعۂ طوف نجف بر در بغداد زدیم

چوں صلاتی قدمی در روش سی نہ نہیم عہدی از رحمت ساقی کوثر گیریم

صلاتی شاعری میں اپنے کو فردوسی، انوری، اسمٰعیل اصفہانی، کمال خجندی سے کم نہیں سمجھتے تھے، اور ان کو اپنی شاعری پر فخر تھا، نیز ان کو شکایت تھی کہ انکی وہ قدر نہ ہوئی جسکے وہ مستحق تھے :-

شعر عنس کسادی بازار ست ورنہ بنود زبان ناطقہ لال

غوص بحر بیان خجندی دار می نمودم بہمرہی خیال

کردمی چارسوے معنی را زینتی بہ ز انوری و کمال

گفتمی ہمچو طوسی استاد قصہ بند نقل رستم و زال

عمریست کہ اقلیم سخن را صرف کاریم صرافت سر چارسوی ملک واقالیم

اس غزل میں کہتے ہیں :-

گفت صلاتی این غزل دوش بہدیہ نسیم شب لوح قلم بہ ثبت آن بردہ گواہ کردہ ام

اس قصیدہ میں شاعر نے ایک ہندی محاورہ "بات ٹالنا" فارسی میں استعمال کیا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کو یہاں کی مقامی زبان سے کافی آشنائی ہو گئی تھی۔

۱؎ شہادت۔ ۴۰ ہجری / ۶۶۱ عیسوی ۲؎ وفات ۲۰۳ ہجری / ۸۱۹ عیسوی

۳؎ وفات ۴۱۱ یا ۴۱۶ ہجری / ۱۰۲۰-۱۰۲۵ عیسوی ۴؎ وفات۔ ۵۸۳ ہجری / ۱۱۸۷ عیسوی۔

۵؎ وفات۔ ۶۳۵ ہجری / ۱۲۳۷ عیسوی ۶؎ وفات۔ ۸۰۳ ہجری / ۱۴۰۰ عیسوی

آمدہ با امید ہی پایاں — گرم افغان ہمی رسد بہ پایان
مشکل طرفہ فتاد ستش — بکرم کرد جواب آسان
داور را خود پسند احسانت — ناامیدی شاعر از احسان
باز از لطف چوں تو فتانی — کہ نداری قرینہ از اقران
ہیچگہ این شنیدہ گردیدت — کہ کند راہ باب راتا لان

صلائی کا کلام متوسط درجہ کا ہوتا ہے۔ ان کے قصیدوں کے بہت سے اشعار نقل کئے جا چکے ہیں، جن سے ان کی قصیدہ گوئی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، بدقسمتی سے اس ناقص نسخہ میں ان کی غزلیں بہت کم ہیں، اس لیے اس کے عمدہ نمونے نہیں دیے جا سکتے، آخر میں یہ کہنا ضروری ہے کہ اس دیوان کے دقیق مطالعہ سے ہمارے ہندوستان کی تاریخ کے بہت گوشوں پر روشنی پڑ سکے گی۔

تاریخِ جہانگیر

از

جناب عبدالروف خاں صاحب ایم اے ہسٹری اردو ٹونک راجستھان

ڈاکٹر بینی پرشاد نے جہانگیر پر ۱۹۲۲ء میں ایک بلند پایہ کتاب لکھی تھی جو ہسٹری آف جہانگیر کے نام سے آج تک ہمارے ملک کی اکثر یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے، اس کی اہمیت کے پیش نظر ترقی اردو بورڈ، وزارت تعلیم و سماجی بہبود، حکومت ہند نے اس کو جناب رحم علی الہاشمی صاحب سے اردو میں ترجمہ کروایا، اور ۱۹۷۶ء میں تاریخ جہانگیر کے نام سے شائع کیا،

راقم الحروف کو ترجمہ سے جو مایوسی ہوئی اس کا اندازہ قارئین یہ تبصرہ پڑھنے کے بعد ہی لگا سکتے ہیں، اس میں زبان و بیان کی خامیاں ہیں، اور بعض متعدد مقامات پر تاریخی واقعات و سنین کو صحت کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا اس سے کتاب کی تاریخی روح مجروح ہو گئی ہے، نیز بہت سے انگریزی فقروں کا ترجمہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی ہے،

اسی طرح کتاب کے ص ۷ پر مآثر جہانگیری، اور الفنسٹن کو دو دو دفعہ ماثر جہانگیری اور الفنٹن لکھا گیا ہے، ص ۸ پر سینٹ زیویر لائبریری کلکتہ کی بجائے سینٹ زیویرس کالج کلکتہ لکھنا چاہئے تھا، اور جین سدھانت بھون آرہ کے بعد انڈیا آفس لندن نیز لارڈ ہسری ہام کے بعد ام اے کتابت سے رہ گیا ہے، ص ۸ پر ہی اصل مقالہ کے دوسرے ایڈیشن کے

پیش لفظ کے خلاصہ کا اور تیسرے ایڈیشن کے پیش لفظ کے نوٹ کا ترجمہ جو صرف ایک جملہ کا تھا چھوڑ دیا گیا، غالباً فاضل مترجم نے صرف پہلے ایڈیشن کو سامنے رکھ کر ہی ترجمہ کیا ہے،

صفحہ ۹ پر تاریخوں کی تشریح کے عنوان کے تحت اسلامی مہینوں کے آگے قوسین میں مہینوں کے دنوں کی تعداد نہیں دی گئی جب کہ انگریزی زبان کے نسخہ میں موجود ہیں، اس نقص کو دیکھ کر بعض دیگر مشکوک مقامات پر ترجمہ کا اصل نسخہ سے مقابلہ کیا، تو معلوم ہوا کہ مختلف مقامات پر انگریزی کے کئی فقروں کا ترجمہ نہیں دیا گیا ہے، ممکن ہے ایسا سہواً ہوا ہو مگر ہم اسے بے توجہی پر محمول کرتے ہیں، مثال کے طور پر اسی صفحہ نمبر ۹ کے ایک ڈھائی سطر کے پیراگراف کا ترجمہ دینا ضروری نہیں سمجھا گیا، جو نہایت اہمیت کا حامل تھا، ص ۱۱ پر بیرم خاں کے بارے میں (۱۵۵۳ء تا ۱۵۶۰ء) کے بجائے (۱۵۵۵ء تا ۱۵۶۰ء) اور ہمایوں کے سلسلہ میں (۱۵۳۰ء تا ۱۵۴۰ء) نیز (۱۵۵۳ء تا ۱۵۵۶ء) کے بجائے (۱۵۳۰ء تا ۱۵۴۲ء) نیز (۱۵۵۵-۵۶ء) ہونا چاہئے، فاضل مترجم کے ذریعہ دی گئی مدت نہ اصل نسخہ کے سنہ و سال سے مطابقت رکھتی ہے اور نہ تاریخی حقیقت سے، اسی ص کے حاشیہ نمبر ا پر گلیڈون (ص ۱) نے ۱۵ اگست لکھا ہے، اور پرائس (ص ۲) نے ۲۰ ستمبر لکھا ہے،..... کی بجائے گلیڈون (ص ۱) نے ۲۹ اگست لکھا ہے، اور پرائس (ص ۴) نے ۸ شوال لکھا ہے،..... ہونا چاہئے تاریخ اور سال کا غلط یا خلاف واقعہ اندراج نہ صرف ص ۱۱ پر ہی ہوا ہے، بلکہ دیگر صفحات پر بھی ہے جس کا بیان حسب موقع آئے گا،

ص ۱۲ پر جنوری ۱۵۶۳ء کے بجائے جنوری ۱۵۶۲ء ہونا چاہئے، اسی صفحہ اور اس کے حاشیہ نمبر ۲ میں راجہ بہارمل د [illegible] (Bharmal) کو بھارامل اور انبیر کو امبیر لکھا ہے یعنی صحت املا کی طرف توجہ بالکل نہیں کی گئی، امراء کو جا بجا 'امرا' تحریر کیا ہے، اسی صفحہ ۱۲ پر ۱۵۶۳ء

تا سنہ ۱۰۱۹ھ کے بجائے سنہ ۹۶۲ھ تا سنہ ۱۰۱۶ھ لکھنا چاہیے تھا، ص ۱۳۱ پر حضرت خواجہ فضیل بن عیاض کا املا فضیل بن ایاز لکھا ہے، ص ۱۳۱ پر Sufism کا ترجمہ صوفیت کیا ہے جو غیر فصیح ہے، بجائے اس کے تصوف ہونا چاہیے تھا جو فصیح تر ہے، اسی صفحہ پر ایک فقرہ "دل کی دل کی راہ ہے" لکھا ہے، جو ناقابلِ فہم ہے، یہ Heart to heart کا ترجمہ ہے، یہاں "سینہ بہ سینہ" ہونا چاہیے تھا، جو سریع الفہم ہے، ص ۱۴۲ پر ہی "... واپس آئے تو مذہبی حلقوں میں جوش بھڑک اٹھا" کی بجائے "... واپس آئے تو علمی اور مذہبی حلقوں میں جوش بھڑک اٹھا" لکھنا چاہیے تھا، اسی صفحہ پر حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کی زندگی کے بارے میں ایک مہمل فقرہ اس طرح لکھا ہوا ہے "یہاں وہ سچے ولی اللہ کی طرح زہد و تقویٰ میں بسر کرتے تھے" سیاق و سباق پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فقرہ سے لفظ "زندگی" چھوڑ دیا گیا ہے، دراصل فقرہ یوں ہونا چاہیے تھا "یہاں وہ قرونِ وسطیٰ کے ایک سچے ولی اللہ کی طرح زہد و تقویٰ میں زندگی بسر کرتے تھے" یعنی لفظ Medieval کا ترجمہ بھی نہیں کیا گیا، ص ۱۴۲ پر ہی شیخ موصوفؒ کی کرامات کے ضمن میں یہ ملاحظہ فرمائیے، "عوام میں اُن کے بہت سے معجزے مشہور ہو گئے تھے"، اردو کا عام قاری بھی معجزے کی اصطلاح سے بخوبی واقف ہے کہ یہ صرف انبیائے کرامؑ کے ساتھ مخصوص ہے، اولیاء اللہؒ سے صادر ہونے والی خرقِ عادات کو کرامات کہا جاتا ہے، ص ۱۴۲ کے حاشیہ نمبر ۲ میں "بلوخ مین" کو "بلوک مین" لکھا ہے،

ص ۱۵۰ کے حاشیہ نمبر ۹ میں "سجان رائے" کو "سبحان رائے" لکھ کر کاتب نے اپنی جدت کا ثبوت دیا ہے، ص ۱۱۰ پر ایک فقرہ اس طرح ارقام فرمایا ہے "دی مستقبل کا بدانجام قطب الدین" یہ انگریزی کے حسبِ ذیل فقرہ کا ترجمہ ہے،

The future ill fated Qutbuddin

ص ۱۰ پر ۲۱ نومبر ۱۵۶۹ء سے پہلے on Sunday کا ترجمہ موصوف کی نظروں سے اوجھل ہو گیا، اسی صفحہ پر بی بی دولت شاد کو بی بی دولت شان لکھا ہے،

صفحہ ۲۴-۲۵ پر بابر کے علمی اوصاف کے سلسلہ میں ایک فقرہ یوں مندرج ہے "اس نے اصول قانون پر ایک نہایت ہی مفید کتاب تصنیف کی جو خوش اسلوبی میں اس فن کی دوسری کتابوں پر فوقیت رکھتی ہے" بادی النظر میں فقرہ صحیح ہے، لیکن اس کا موازنہ انگریزی کے اصل فقرہ سے کرکے دیکھئے، جو حسب ذیل ہے،

"....and was the author of a most useful treatise on Jurisprudence which has been adopted generally." P.14 Third Edition.

انگریزی کے مندرجۂ بالا فقرہ کے بعد حسب ذیل فقرہ کے ترجمہ کرنے کی زحمت نہیں کی گئی

"He also wrote a tract on Turki prosody, superior in elegance to any other, and put into verse the Risalah-i walidiah of His Holiness. (History of Jahangir p. 14. Third Edition.)

خط کشیدہ حصہ کا ترجمہ اردو کے صفحہ ۲۴-۲۵ کے فقرہ میں غیر ضروری طور پر شامل کر دیا ہے، لیکن انگریزی کے اس فقرہ کو عمداً نظر انداز کیا ہو، یہ فقرہ رسالۂ والدیہ حضرت خواجہ عبید کے ضمن میں ہے جو بابر نے ۹۳۵ھ میں اپنی علالت کے دوران میں صحت یابی کے لئے مولینا عبدالرحمٰن جامی کے سبحہ کی طرز پر لکھا تھا جس میں کل باون ۵۲ شعر ہیں، پورا رسالہ وزن رمل مسدس

و مغرب اور ابتر دونوں محذوف ہیں ہے،

صفحہ ۲۴ کے حاشیہ ۲۶ میں (ملیسن دراس) اور ص ۲۵ کے حاشیہ نمبر ۳۸ میں (ولیاس راس) تحریر کیا ہے، بہتر ہوتا کہ کوئی املا اختیار کر لیا جاتا، ص ۲۴ کے ہی حاشیہ ۳۸ میں آر سکائین ڈراس کی بجائے اسکراین اینڈ راس (Skrine and Ross.) ہونا چاہئے،

ص ۲۶ پر Kalhan's Rajatarangini کا ترجمہ عجیب انداز میں کیا ہے یعنی کلنس کی راج ترنگنی، کلن کو کلنس بنا کر اردو اور انگریزی کی اضافتوں کے حسین امتزاج کو اردو میں رائج کرنے کی جسارت کی گئی ہے، اسی صفحہ پر انگلش کے مندرجہ ذیل دو فقرے تشنۂ ترجمہ رہ گئے ہیں،

"The Ain-i-Akbari, a veritable Imperial Gazetteer was an absolutely unique administrative and statistical record till the nineteenth century

The Lilavati, famous Sanskrit work on mathematics, was translated into persian"

ibid P.15.

ص ۳۱ پر (بقیہ ح ص ۳۰) انندخان کو 'آنندن خان' لکھا ہے، ص ۳۵ کے بقیہ حاشیہ ص ۳۴ میں مانسراٹ کی کمینٹریس صفحات ۵۸ - ۲۴۲ و سمتھ (اکبر ص ۱۴) نے بھی یہی لکھا ہے، کی بجائے مانسراٹ کی کمینٹریس ص ۲۴۲ - ۵۵۸ - و سمتھ اے، اسمتھ (اکبر ص ۱۴) اور ربارٹولی (ص ۴۴ - ۵۹) نے بھی یہی لکھا ہے'

ہونا چاہئے، اسی حاشیہ میں ..... ۱۵۸۵ء ہوا، کی بجائے ۱۵۸۶ء میں ہوا، اور جس سے اس کی شادی بہت بعد میں ہوئی، کی بجائے جس سے اس کی شادی بہت بعد یعنی ۱۶۱۱ء میں ہوئی ہونا چاہئے تھا۔ ص ۳۰ پر ۱۳ فروری کو راجہ کے محل پر گیا کی بجائے ..... ۱۳ فروری ۱۵۸۵ء لکھنا چاہئے تھا، یہ شہزادہ سلیم اور مان بائی بنت راجہ بھگوان داس (امبیر) کی شادی کا سنہ ہے، ص ۳۷ کے حاشیہ ۳ میں جہانگیر (راجرس اور بیورج) ص ۱۵ جلد اول میں اُسے صرف اولادِ اکبر لکھا ہے۔" فقرہ سلطان النساء بیگم بنت جہانگیر کی پیدایش کے سلسلہ میں ہے، جو جہانگیر کی پہلی اولاد تھی، مگر فقرہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ اکبر کی اولاد تھی، لہٰذا فقرہ یوں ہونا چاہئے تھا، جہانگیر نے (راجرس اینڈ بیورج ص ۱۵ جلد اول میں) اسے صرف اولادِ اکبری لکھا ہے۔" ص ۳۰ پر ایک فقرہ اس طرح لکھا ہوا ہے "پھر بیکانیر کے رائے رائے سنگھ کی لڑکی اور سعید خاں گکھر کی لڑکی" سیاق وسباق پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس فقرہ کو اس طرح ہونا چاہئے تھا" پھر بیکانیر کے والی رائے سنگھ کی لڑکی اور سعید خاں گکھر کی لڑکی سے شادی کی"، اسی طرح ص ۳۹ پر اس فقرہ کی فصاحت غور طلب ہے "داشتہ عورتوں کو ملا کر حرم کی تعداد بے پناہ تین سو تک پہونچ جاتی ہے۔" عدد کے ساتھ بے پناہ کی صفت پہلی دفعہ نظر سے گذری ہے، فقرہ یوں ہونا چاہئے تھا "داشتہ عورتوں کو ملا کر حرم کی تعداد تین سو کے کثیر عدد تک پہونچ جاتی ہے"

ص ۴۴ پر شہزادہ مراد اور دانیال کے منصب کا ذکر یوں کیا گیا ہے "..... حا اس کے بھائی مراد اور دانیال کو سات سو اور چھ سو کے منصب دیئے گئے، اس مو پر شہزادہ سلیم کو دس ہزار کا منصب عطا ہوا تھا، حیرت ہے کہ پھر مراد اور دانیا کو نسبتاً نہایت حقیر منصب دیئے گئے، لہٰذا انگریزی نسخہ سے موازنہ کرنے پر معلوم

کہ مراد اور دانیال کو علی الترتیب سلطنت ہزاری اور چھ ہزار کے منصب عطا کئے گئے تھے جو شاہزادوں کے شایان شان تھے، فاضل مترجم نے دیگر صفحات پر بھی مناصب علی الخصوص ذات و سوار کے سلسلہ میں بھی، اعداد و شمار کو صحت کے ساتھ نہیں لکھا ہے جس کا ذکر حسب موقع آئے گا، اسی صفحہ کے حاشیہ نمبر ۱۸ میں ثمن تاغ کو ثمن باغ تحریر فرمایا ہے، ثمن باغ جیسی تاریخی اصطلاح ہمارے محدود مطالعہ میں نظر سے نہیں گذری ص ۴۴-۴۳ پر ابوالفضل کے اوصاف کے سلسلہ میں ایک جملہ اس طرح ہے، اس کے ذہن میں ہر مذہب کی کوئی نہ کوئی جاگزیں ہوگئی تھی، یہاں لفظ جاگزیں سے پہلے Good کا ترجمہ (خوبی) نہیں کیا گیا، اس طرح یہ جملہ مہمل ہو گیا ہے صفحہ ۴۸ پر... سارا قصہ غیر مذہبی تھا، غیر مذہبی بنیاد پر لڑا گیا کی بجائے..... سارا قصہ غیر مذہبی تھا، اور سراسر غیر مذہبی بنیاد پر ہی لڑا گیا، نیز اسی صفحہ پر اس سے اگلا ہی فقرہ جو کھچڑی اس سال پک رہی تھی کی بجائے "جو کھچڑی دس سال (For a decade) سے پک رہی تھی، لکھنا چاہئے تھا ص ۴۹ پر ۱۵۸۱ء کے بجائے ۱۵۸۰ء اور شیچی کی بجائے پرشچی (Peruschi) نیز بانسراٹ کی بجائے بانسراٹ، اور اسی صفحہ کے آخری فقرہ "سیاسی ماحول کو مختل کرنے کافی تھی" کی بجائے "سیاسی ماحول کو مختل کرنے کے لئے کافی تھی"، ہونا چاہئے تھا،

ص ۵۱ کے حاشیہ نمبر ۱۲ میں.... و ق کر دیا گیا، کی بجائے اور عاق کر دیا گیا" یعنی اور عاق، صحیح طور پر چھپنے سے رہ گیا ہے، ص ۵۳ پر مریم زمانی کو سلیم کی دادی بتلایا ہے، اور ص ۱۵ پر ماں۔ اصل میں ص ۵۳ پر مریم مکانی لکھنا چاہئے تھا، تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو علم رجال سے قدرے شغف رکھنا ضروری ہے، ص ۵۶ پر حاشیہ نمبر ۱۶ (حاشیہ نمبر ۲ درج نہیں کیا) میں مدھوکر ساہ کو مدھوکرہ تحریر کیا ہے،

ص ۵۹ پر جبار خاں کی بجائے جبار خاص خیل لکھنا چاہئے تھا، ص ۶۵ پر ...... اعاقبت اندیش ہم صحبتوں کے کٹ پتلی بنا ہوا تھا، کی بجائے ... ناعاقبت اندیش ہم صحبتوں کی کٹ پتلی بنا ہوا تھا، ہونا چاہئے تھا، اسی صفحہ پر ابوالفضل کا سنہ وفات خلاف واقعہ ۱۶۰۲ء لکھا ہے، جسے اگست ۱۶۰۲ء ہونا چاہئے تھا، خان اعظم مرزا عزیز کوکہ کو متعدد مقامات پر .... کوکا لکھا ہے، ص ۷۰ پر سلطان خسرو کے بارے میں ایک فقرہ یوں تحریر فرمایا ہے: .... جو سیاسی جھگڑے اس کے گرد پیش ہو رہے تھے، ان سے اس میں حصول اقتدار کے ذہ نخوشی اپنے چچا او رخسرو کی جماعت میں شامل ہوگیا۔" پورا فقرہ فصاحت سے عاری اور بعید از فہم ہے، قارئین لفظ چچا پر بھی غور فرمائیں، جو راجہ مان سنگھ کے لئے استعمال ہوا ہے، تاریخ کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ راجہ مان سنگھ شہزادہ کا چچا نہیں، ماموں تھا،

ص ۷۲ پر ایک حیرت انگیز فقرہ ملاحظہ ہو، ۱۶۰۰ء میں اکبر کے بھائی ابوالخیر کو بھی بھیجا۔" ابوالخیر فیضی وابوالفضل کا بھائی تھا، جو نسبتاً کم مشہور ہے، ص ۷۳ سے ص ۷۶ تک کے صفحات کی ترتیب معکوس ہوگئی ہے، یعنی ص ۷۳ کے بعد ص ۷۶ کا اور پھر ص ۷۴ کا، نیز ص ۷۵ کے بعد ص ۷۷ کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے، اسی طرح ص ۱۹۹ سے ص ۲۰۲ تک کے صفحات کی عبارت بے ربط ہوگئی ہے، دونوں مقامات پر قاری کو ترتیب قائم کرنے میں وقت اور جھنجھلاہٹ محسوس ہوتی ہے، ص ۷۴ پر ایک فقرہ یوں درج ہے "شہزادہ کی سوتیلی ماں، مائیں اور بہنیں اس سے ملیں، فقرہ سے صاف طور پر مترشح ہوتا ہے کہ شہزادہ کی کئی مائیں تھیں، فی الواقع یہاں فقرہ یوں ہونا چاہئے تھا "شہزادہ کی سوتیلی مائیں، ماں اور بہنیں اس سے ملیں،" ص ۱۰۹ پر بادشاہ کی مرضی کے کوئی شادی کا رشتہ قائم کریں کی بجائے بادشاہ کی مرضی کے خلاف کوئی شادی کا رشتہ قائم کریں، اور ص ۱۲۰ پر انل اے دلاق

کی بجائے انل ہوئے سنگھ، وان، نیز ہندو خاتون اور قانون والوں کی بجائے ہندو قانون اور قانون دانوں لکھنا چاہئے۔ ص ۱۳۰ پر ماوراء النہر ماورا البحر بنا دیا ہے، اسی صفحہ پر ایک بے معنی فقرہ یوں ملتا ہے، "مگر یہ طمطراق کا مراسلہ عالمگیر امن و صلح کا میڈرڈ تک کبھی نہ پہنچ سکا، اگر یہ فقرہ یوں ہوتا" مگر یہ طمطراق کا مراسلہ جو عالمگیر امن و صلح کا سفارشی تھا' میڈرڈ تک کبھی نہ پہنچ سکا، تو مفہوم واضح ہو جاتا، ص ۱۳۱ پر مورد شہنشاہوں کو مورد شہنشاہوں لکھا ہے، جو کاتب کی کارستانی معلوم ہوتی ہے، ص ۱۳۲ پر علم جغرافیہ کی بنیادی معلومات سے صرف نظر کرتے ہوئے بندھیاچل مشرقی گھاٹ کو بندھیاچل مغربی گھاٹ تحریر کیا ہے جو محل نظر ہے، نیز طاقتور متحدہ قدم کی بجائے طاقتور متحدہ قوم ہونا چاہئے، ص ۱۳۸ پر تمام اعلیٰ اور ادنے ..... "کی بجائے تمام اعلیٰ اور ادنیٰ .... صحیح ہے، ص ۱۴۱ پر شیخ فرید بخاری کی فیاضی کے سلسلے میں ایک فقرہ یوں سپرد قلم ہوا ہے، ...... اس نے محتاجی یا افلاس دیکھا ہو اور مدد نہ دی ہو، یہاں محتاجی یا افلاس کی بجائے محتاج اور مفلس ہونا چاہئے، اسی صفحہ پر کابل کے غیور بیگ کے لڑکے زمان بیگ کو کابل کے غیاث بیگ کا لڑکا زمانہ بیگ بتلایا ہے، اور ص ۱۴۲ پر بافراد فیاضی کی بجائے بافراط فیاضی لکھنا چاہئے تھا، ص ۱۴۶ پر خسرو کے فرار کے سلسلے میں جو تاریخ دی گئی ہے، اسے ۱۶ اپریل کے بجائے ۶ اپریل ہونا چاہئے، ص ۱۴۹ پر ۶ اپریل کے بعد سنہ ۱۶۰۶ء کتابت سے رہ گیا ہے، ص ۱۴۷ پر نرلہ کی سرائے اور ص ۱۵۰ پر بھیرووالی کی بجائے علی الترتیب نریلہ کی سرائے اور بھیروں والی ہونا چاہئے،

ص ۱۵۳ پر موصوف نے ایک نہایت ہی مضحکہ خیز فقرہ باغیوں کو وحشیانہ سزائیں عنوان کے تحت سپرد قلم کیا ہے، "حسین بیگ کو بیل کی تازہ کھال میں سی دیا گیا، اور

عبدالرحیم کو گدھے کی کھال میں جس کے سینگ اوپر کو نکلے ہوئے تھے، فقرے کی ساخت سے صاف معلوم ہوتا ہے یہاں سینگ کا تعلق گدھے سے ہے، ممکن ہے عہد جہانگیری میں گدھ کے سر پر سینگ ہوتے ہوں، ص ۱۵۴ پر گرو ارجن کا سنہ پیدائش ۱۵۶۵ء اور اُسے جانشین نامزد کرنے کا سنہ ۱۵۵۱ء تحریر کیا ہے یعنی گرو ارجن اپنی پیدائش سے چودہ سال قبل ہی جانشین بنائے جا چکے تھے سکھ اسے اپنے گرو رام داس کا چمتکار تسلیم کرتے ہوں گے، دراصل گرو ارجن کا سنہ پیدائش ۱۵۶۳ء اور انھیں جانشین نامزد کرنے کا سنہ ۱۵۸۱ء ہے اسی ص پر گرو ارجن کو چوتھے گرو رام داس کا چوتھا لڑکا بتلایا ہے جب کہ وہ سب سے چھوٹا لڑکا (The youngest son) تھا، ص ۱۵۴ پر ہی ترن تارن کا تعدد شہر آباد کیا، فقرہ کے بعد (established the Temple.....

of god (Harmandar)' ibid p. 128

کا ترجمہ سہواً چھوٹ گیا ہے ص ۱۵۵ پر ادی گرنتھ تیار کی، فقرہ میں آدی گرنتھ (आदि ग्रंथ) مؤنث نہیں ہے مذکر ہے،

ص ۱۶۴ پر ۱۵۸۰ء کی بجائے ۱۵۹۰ء اور شہرت اور ساری دنیا میں وقار حاصل کیا، کی بجائے شہرت اور ساری مشرقی دنیا میں وقار حاصل کیا، نیز یہ وہ فرمانروا تھا جس نے جہانگیر کو اپنی ساری مدت میں نباہنا پڑا، کی بجائے یہ وہ فرمانروا تھا جس سے جہانگیر کو اپنی ساری مدت نباہ کرنا پڑا، ہونا چاہئے، ص ۱۶۴ پر شاہ عباس ۱۵۸۶ء تا ۱۶۳۶ء کی بجائے شاہ عباس ۱۵۸۶ء تا ۱۶۲۹ء لکھنا چاہئے، ص ۱۶۵ پر..... اس کا کماندار مرزا جانی بیگ ترخان کا مرزا غازی تھا، اسے یوں لکھ کر اس کا کماندار مرزا غازی ابن مرزا جانی بیگ ترخان تھا، آسان کیا جا سکتا تھا، ص ۱۶۶ پر کابل میں

داخلہ کے عنوان کے تحت ، ۳۰ رجون کی بجائے ۳ رجون ، اور حاشیہ ۱۳ میں بختیار خاں کی بجائے بختاور خاں ہونا چاہئے، ص ۶۶ ، کے حاشیہ ۹ میں پہلا ہی فقرہ مہمل ہے جو اس طرح ہے، "میر شریف آملی اپنے زمانے میں ایک بڑا بیباک اور مشہور آزاد خیال اور ایک ملک سے دوسرے ملک میں فرار ہوتا رہا تھا" ص ۸۰ پر انھیں امتیاز کے لئے ایک ایک بلا دیا گیا، "فقرہ میں" بلا کی بجائے بلہ ہونا چاہئے ، اسی صفحہ پر مرزا محمد بیگ ازبیگ کو مرزا محمد بیگ ازبک ، بنا دیا ہے، ازبک آج کل احمق کو بھی کہتے ہیں ،

ص ۸۷ ، پر ڈو (DOW) کی ہسٹری آف اندوستان کو وارڈر کی ہسٹری آف ہندوستان لکھا ہے صفحہ ۸۷ پر ہی ایک فقرہ یوں لکھا ہوا ہے، "تین گھنٹے وہ اس کے منتظر رہے ، کہ شاید کسی زمیند رونده سے کوئی مدد مل جائے یہاں تین گھنٹے کی بجائے کچھ گھنٹے (Somehours . اور زمیند رونده کی بجائے راہرو (Passer-by) ہونا چاہئے، لفظ زمیند رونده ناقابلِ فہم ہے، اگر اسے اسم فاعل قیاسی ہی بنانا تھا، تو راہ رونده ہو سکتا تھا، ص ۱۰۷ کے حاشیہ ۱۵ میں شہزادوں کی تشخیص کے سلسلے میں ایک فقرہ قابل توجہ ہے "سترہویں صدی میں شہزادوں کی بالکل شکل نہ تھی" سترہویں صدی ہی کیا، ہر زمانہ میں شہزادے عیش و عشرت کی زندگی ہی بسر کرتے رہے ہیں، شکل کیا معنی اصل میں لفظ تشخص نہ لکھنے کے سبب فقرہ سے کچھ اور مفہوم واضح ہو رہا ہے، ص ۱۰۶ کے حاشیہ نمبر ۱ میں تصنیف کی آگرہ کے بجائے لطیف کی آگرہ اور ص ۱۷۰ کے آخر میں ۱۵۹۱ء کی بجائے ۱۵۹۲ء ہونا چاہئے، ص ۱۰۰ پر ایسے گندے جرم کا خیال نہ کرتا کی بجائے ایسے گندے جرم کا اقبال نہ کرتا اور ص ۱۱۱ پر اندرِ ملک کی بجائے اندرونِ ملک ، لکھنا چاہئے، ص ۱۸۱ پر ہی سرطامس ہربرٹ پیٹر ہی سال بعد آئے، کو فی الواقع یوں لکھنا چاہئے تھا "سرطامس ہربرٹ عہد جہانگیر

کے تقریباً اختتام پا اور پیٹر منڈی چند سال بعد ہندوستان آیا، اسی صفحہ کے حاشیہ ۳۵ میں میرہ (وواج لو ایسٹ انڈیا ص ۴۰۴) کی بجائے ٹیری (ویاج Voyage ٹو ایسٹ انڈیا ص ۴۰۴) نیز اسی حاشیہ میں بادشاہی کی بجائے بادشاہ سے شادی اور ۱۶۲۲ء سے پہلے ڈیلا ویلی ہونا چاہئے،

ص ۲۰۸ پر حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ میں (سفر ڈیلا ویل ....) کی بجائے (سفرنامہ پی ڈیلا ویل ....) بازاری افسانہ کی بجائے بازاری افسانہ' باندیوں کی طرح اس کے شایان شان نہیں ہے، کی بجائے باندیوں کی طرح رہنا اس کے شایانِ شان نہیں ہے نیز.... حلال خور سے جا دے کی بجائے حلال خور سے بیاہ دیا جا دے ہونا چاہئے، اسی حاشیہ میں ایک بے معنی طویل فقرہ یوں لکھا ہوا ہے.... تاہم بادشاہ کے دل میں پھر محبت نے زور کیا اور بعض لوگ کہتے ہیں جادو ٹونے سے (جس کا مجھے یقین نہیں ہے.) اور عورت کا حسن جو روز افزوں تھا، تو بالآخر بادشاہ نے اسے بطور ملکہ اور دوسری ملکاؤں سے بالاتر قبول کرنا منظور کر لیا، اسی حاشیہ کا ایک دوسرا فقرہ اس طرح ہے،...... اس لئے اُسے ہر جگہ نشت کر لیا جائے تاکہ اُسے گندی ملیں، نیز ٹیری ۱۹۲۹ء کی بجائے پیٹر منڈی ص ۲۰۳-۲۰۹ اور فرانکوسے برنیر کی بجائے فرانکوے برنیر، اور غیر معمولی کا ذکر کرتا ہے، کی بجائے غیر معمولی اثر کا ذکر کرتا ہے ہونا چاہئے، یہ پورا حاشیہ ص ۱۸۲ اغلاط و نقائص سے پُر ہے،

ص ۴۰۸ پر حاشیہ نمبر ۸ میں جھلودی کا راجپوتانہ جسے ایل پی سی نوری نے بار وک انڈیا ہلیل کی بجائے جھلودی کا راجپوتانہ کھیات (Khayata) جسے ایل پی سٹیفڈی نے بلد وک اینڈ ہسٹاریکل لکھنا چاہئے تھا، ص ۵۰۸ کے حاشیہ نمبر ۹ میں لطیف کی ہسٹری آف پنجاب کی بجائے لطیف کی ہسٹری آف پنجاب اور حاشیہ نمبر ۱۰ میں سدیال نے اپنی بعض شاعا شکر

میں اور بیکار اِلم ہتہ نے اس پر کڑی سلیم کی مہرالنسا کے محبت کے قصہ کو اور زیادہ رکیک باتیں ملا کر پیش کیا ہے، کی بجائے [illegible] ل نے اپنی بخش بجا سکر میں اور بتا رام ہتہ نے اپنی بپا کرمی اپ[illegible] او میں سلیم مہرالنساء کے قصہ کو اور زیادہ رکیک باتیں ملا کر پیش کیا ہے، ہونا چاہئے تھا، ص ۱۰۹ کی پہلی لائن میں لفظ جاپانی کے بعد ذوق کتابت سے رہ گیا ہے، ص ۱۰۹ پیرا اس کی دو دوامی پنج تولیہ کنا ری کی بجائے اس کی دو دوامی اور پنج تولیہ، بادشہ کناری ہونا چاہئے تھا اسی صفحہ کے دوسرے پیراگراف کے پہلے فقرہ کی فصاحت ملاحظہ فرمائیے، اس کا دل فیاضانہ تھا، اور آتنا معاشرت پسند تھا، فقرہ یوں ہونا چاہئے تھا، اس کا مزاج جتنا فیاض تھا، اتنا ہی متمدن بھی، اسی صفحہ کے حاشیہ نمبر ۱۲ میں ساٹھ سال کی عمر میں ہوا سے آگے جو نوٹ ہے، اور ہونا چاہئے تھا، اسی حاشیہ کے آخری فقرہ ..... اور قمری سال سے ۶۲ برس کی اس کے بعد انگریزی کے حسب ذیل فقرہ "She composed verses under the nom de plume of Makhfi p 156" کا ترجمہ وہ مخفی کے تخلص سے شعر کہتی تھی، نہیں دیا گیا، حیرت یہ ہے کہ اس فقرہ کو ص ۱۰۵ کے حاشیہ نمبر ۱۵ میں نورجہاں سے منسوب کر دیا گیا ہے، جبکہ یہ فقرہ سلطانہ سلیمہ بیگم کے بارہ میں ہے، حاشیہ نمبر ۱۲ میں ہی ۲۳ جنوری ۱۵۳۹ء کی بجائے ۲۳ فروری ۱۵۳۹ء ہونا چاہئے، ص ۱۰۶ کے ہی حاشیہ نمبر ۱۳ میں غیر ملکی کپڑے کی کا ہاتھی دیکھا جو چکیلے پھولوں اور شوخ رنگ درختوں سے کڑھی ہوئی تھی، بادشاہ نے خانساماں سے دریافت کیا ..... کی بجائے غیر ملکی کپڑے کی سنہری جھول کا ہاتھی دیکھا جو چکیلے اور پھولوں اور شوخ رنگ پتیوں سے کڑھی ہوئی تھی، بادشاہ نے خانساماں سے دریافت کیا ..... ہونا چاہئے تھا، ص ۱۱۰ پیرا ۱ اور پھر آصف خاں ہو گیا، کی بجائے اور پھر یہ

سال بعد آصف خاں ہو گیا، نیز اسی صفحہ پر ارجمند بانو بیگم کی شادی شہزادہ خرم سے ہو گئی جو اب دس سال کا ہو گیا تھا، کی بجائے ..... جو اب بیس سال کا ہو گیا تھا، ہونا چاہئے،

ص ۱۹۱ پر رقیہ سلطان بیگم کو صرف رقیہ بیگم، تحریر کیا ہے، اسی صفحہ پر شہزادہ خرم کے استادوں کے سلسلے میں یوں لکھا ہے، مذہبی اور غیر علوم کے استاد قاسم بیگ تبریزی اور ایک شیخ مبارک کے سچے جانشین ابو الخیر تھے،" گویا شیخ مبارک نامی مختلف اشخاص تھے، اُن میں سے ایک کے سچے جانشین (aZhnuoon) ابو الخیر بھی تھے، دراصل فقرہ یوں ہونا چاہئے" مذہبی اور غیر مذہبی علوم کے استاد قاسم بیگ تبریزی اور شیخ مبارک کے ایک سچے جانشین ابو الخیر تھے، اسی ابو الخیر کو ص ۲۰ پر فاضل مترجم اکبر کا بھائی بتلا چکے ہیں، ص ۱۹۳ پر حصار فیروزہ، کو حصار خیزہ، اور ص ۱۹۴ پر ..... ولیعہد سلطنت سے اتحاد نمایاں ہو گیا،" کو" ولیعہد سلطنت سے اختلاف نمایاں ہو گیا،" لکھا ہے، اسی ص ۱۹۴ پر چند ہی سال کے اندر خرم بیس ہزار ذات اور بیس ہزار سوار کے لئے بے نظیر منصب پر پہنچ گیا، کی بجائے چند ہی سال کے اندر خرم تیس ہزار ذات اور بیس ہزار سوار کے بے نظیر منصب پر پہنچ گیا، ہونا چاہئے، ص ۱۹۶ پر دبقیہ حاشیہ میں پی کا بیان ہے، جس نے ۱۶۲۹ء سے ۱۹۳۴ء تک ہندوستان کا دورہ کیا (سفرنامہ جلد دوم ص ۱۰۶) کی بجائے پیٹر منڈی کا بیان ہے، جس نے ۱۶۲۹ء سے ۱۶۳۴ء تک ہندوستان کا دورہ کیا، (سفرنامہ جلد دوم ص ۲۰۶) لکھنا چاہئے، اسی حاشیہ میں ایک جگہ پی ڈیلا ویل اور ایک جگہ دربار، کتابت سے رہ گیا ہے، اور نیز ص ۱۵ کی بجائے ص ۵ ہونا چاہئے، نیز نصاب جلد، کی بجائے سفرنامہ جلد اول ہونا چاہئے،

ص ۱۹۷ پر ۱۶۲۲ء کو ۱۶۲۳ء لکھا ہے، اسی صفحہ پر تحکم رشید کے بعد ملک کی تاہت سے رہ گیا ہے۔ ص ۱۹۷ پر ہی جہانگیر اس کی دلیل ہوا، کی بجائے جہانگیر اس کی دلیل سے متاثر ہوا، نیز چار ہزار ذات اور تین ہزار سوار کی بجائے چار ہزار ذات اور تین ہزار پانچسو سوار ہونا چاہئے۔

ص ۱۹۹ کے حاشیہ نمبر ۲۶ میں "... بڑے ممتاز اور معزز افراد شامل ہیں" کی بجائے "... بڑے ممتاز اور نہایت معزز (Most honourable) افراد شامل ہیں" اور "کہیں وہ نہ جائے" کے بجائے "کہیں وہ بھاگ نہ جائے" لکھنا چاہئے، ص ۲۰۲ پر "اور طرح کی افواہیں ..." کی بجائے "اور طرح طرح کی افواہیں ..." نیز ص ۲۰۳ پر ۱۶۲۳-۱۶۰۵ء کو ۱۶۲۲-۱۶۰۵ء لکھنا چاہئے، ص ۲۰۵ پر "اور جنھیں فوراً دیا گیا" کی بجائے "اور جنھیں فوراً واپس دیا گیا" ہونا چاہئے، ص ۲۰۶ پر "مگر ۱۶۱۱ء میں سورت کے قریب پرتگالیوں نے سارے ہی جہازوں پر قبضہ کر لیا" یہ انگریزی کے حسب ذیل فقرہ کا ترجمہ ہے:۔

"in 1613, however the Portuguese Seized Four imperial ships."

ibid. p. 175

مگر یہ واقعہ ۱۶۱۳ء کا ہے، نیز ترجمہ بھی محل نظر ہے۔ اسی صفحہ پر "پرتگالی" اور "پرتگالیوں" کا املا "پرتگال" اور "پرتگالیوں" ہونا چاہئے، ص ۲۱۰ کے حاشیہ نمبر ۲ میں راجرس و بیوریج جلد اول ص ۲۰۹ کی بجائے ... ص ۲۹ اور "۱۶۱۳ء تک برابر بنگال کا گورنر" کی بجائے "... بنگال کا گورنر رہا" ہونا چاہئے، ص ۲۲۷ پر دیگر ماتحت افسران کے زیر عنوان ایک فقرہ یوں ہے: "راجہ بھارمل کے لڑکے اور ایک پانچ ہزار منصب کے اعلیٰ امیر جگناتھ کو اپنی فوج میں شامل کرنے کا حکم دیا" گویا راجہ بھارامل کا لڑکا (Delete)

جگناتھ، راجہ بھارمل والیِ امبیر کا رشتہ دار نہ ہو کر کوئی دیگر شخص تھا جب کہ فی الواقع یہ فقرہ یوں ہونا چاہئے تھا، راجہ بھارمل کے لڑکے جگناتھ اور پانچ ہزار منصب کے ایک اور اعلیٰ امیر کو اپنی فوج میں شامل کرنے کا حکم دیا" اسی صفحہ پر اطاعت شعاری کو اشاعت شعاری لکھا ہے، ص ۲۲۸ پر حاشیہ نمبر ۱۶-۱۵ ..... رانا کے چچا بہادر کھیا تا کو حاصل ہوا جو ایک بڑے قبیلہ کا جدِ اعلیٰ ہے، جو اسی کے نام پر کھوات کہلاتا ہے" رانا کا بہادر چچا کانا تھا اور یہ جس قبیلے کا مورثِ اعلیٰ تھا، اس کے افراد آج تک کانادت کہلاتے ہیں، نہ کہ کھوات ص ۲۳۱ و ۲۳۲ کے حاشیہ ۲۶-۲۵ میں راجپوت سرداروں کے ناموں کو اکثر و بیشتر غلط لکھا ہے،

مشہور تاریخی کتاب "ہیر نبود" کا املا تقریباً ہر جگہ "ہبر نبود" لکھا ہے، ص ۲۳۸ پر حاشیہ نمبر ۴۵ کا اندراج غلط ہو گیا ہے، حاشیہ نمبر ۴۵ یوں ہونا چاہئے تھا، جہانگیر راجرس اینڈ بیورج جلد اول ص ۷۳-۲۵۹، اقبال نامہ ص ۳۷، خافی خان جلد اول (ص ۲۷۸-۲۸۰)، گلیڈون، ص ۳۰، ص ۲۴۳ پر ولیم فنچ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسمِ مبارک سے قبل جو گستاخانہ لفظ ملامتی لکھا ہے، اس کے آگے قوسین میں یہ تردیدی کلمات کا ہونا انتہائی ضروری تھا، گو نقلِ کفر کفر نہ باشد جناب رحم علی الہاشمی صاحب کو ہاشمی الاصل ہونے کے سبب یہ تردیدی نوٹ لکھنا اور بھی لازمی تھا،

ص ۲۵۱ پر ۱۳۱۷ھ کی بجائے ۱۳۴۷ھ اور (۱۴۸۹-۱۶۰۹ء) کی بجائے (۱۴۹۲-۱۶۰۹ء) نیز (۱۴۸۹-۱۶۵۶ء) کی بجائے (۱۴۸۹-۱۶۹۶ء) ہونا چاہئے، ص ۲۵۳ پر مغلوں کی ایک فتح کے زیرِ عنوان حسب ذیل دو انگریزی فقروں کا ترجمہ نہیں دیا گیا،

The incapable sultan Murad had-

to be superseded' p. 220, ibid
'Ahmednagar had fallen, but the Kingdom could not be annexed" ibid. p. 220

ص ۲۶۴ پر دوگنی رشوت کی بجائے دکنی رشوت (دکنی Deccan) اور ص ۳۰۴ پر کھمبیات کی بجائے کھمبائت ہونا چاہئے، ص ۳۱۷ پر ایک فقرہ نہایت پرلطف ہے جو اس طرح ہے "مگر یہ اگر سچ بھی ہے، تو اس سے کوئی مفید مطلب بات ثابت نہیں ہوتی"، اس فقرہ کو اگر یوں لکھ دیا جاتا "اگرچہ یہ واقعہ سچ بھی ہے تو اس سے کوئی مفید مطلب ثابت نہیں ہوتی" تو اسکی فصاحت میں کونسا فرق واقع ہو جاتا، ص ۳۱۹ پر دسمبر سنہ ۱۶۳۰ء کی بجائے دسمبر سنہ ۱۶۲۲ء اور ص ۳۲۰ پر سنہ ۲۱-۱۶۲۰ء کی بجائے سنہ ۲۲-۱۶۲۱ء ہونا چاہئے، ص ۳۲۰ پر اعتماد الدولہ کے انتقال کے سلسلے میں ایک فقرہ یوں لکھا ہوا ہے، "اپنے عہد کی ایک سب سے زیادہ نمایاں ہستیوں میں سے ایک کا اس طرح خاتمہ ہو گیا" بجائے اس کے فقرہ کو یوں لکھا جاتا تو بہتر تھا، "اپنے عہد کی نمایاں ترین ہستیوں میں سے ایک کا اس طرح خاتمہ ہو گیا" ص ۳۲۲ پر منصب بیس ہزار کی بجائے، منصب تیس ہزار اور ص ۳۲۳ کے آخر میں "اکبر سے حسن ابدال ۸، امیل تھا" کی بجائے "اکبر پور سے حسن ابدال ۸، امیل تھا" ہونا چاہئے
دیگر charts بھی بالعموم صحت کے ساتھ نہیں دیئے گئے،

ص ۳۲۷ پر پہلا ہی فقرہ محل نظر ہے، "جیسے ہی دکن میں جہانگیر اور شاہجہاں کا پیچھا ہوا" معلوم نہیں جہانگیر اور شاہجہاں کا دکن میں تعاقب کب اور کس نے کیا، فاضل مترجم نے (Turned Their backs) کا ترجمہ پیچھا ہوا کیا ہے جبکہ فقرہ یوں ہونا چاہئے تھا، جیسے ہی دکن سے جہانگیر اور شاہجہاں واپس (پیٹھ پھیری) ہوئے

صفحہ پر... جو بزور قوت اس پر عائد کیا گیا تھا، کی بجائے جو بزور قوت دو سال پہلے اس پر عائد کیا گیا تھا، ہونا چاہئے، ص ۳۲۹ پر یہ فقرہ غور طلب ہے "کہ اس کے دو رقیبوں میں سے ایک کا دوسرے کے ساتھ خاتمہ ہو جائے،" عبارت سے صاف طور پر مترشح ہے کہ دونوں (خسرو اور خرم) کا خاتمہ بیک وقت ہو جائے، درحقیقت فقرہ یوں ہونا چاہئے تھا کہ اس کے (نورجہاں) دو رقیبوں میں سے ایک کا دوسرے کے ہاتھ سے خاتمہ ہو جائے،" اس فقرہ کے بعد انگریزی کے حسب ذیل فقرہ کا ترجمہ نہیں کیا گیا،

The gravity of the Deccan situation at length decided Jahangir to comply with Shah Jahan's demand

ibid pp. 283. 84

سنہ ۱۶۲۰ء میں شاہجہاں دکن کی مہم پر جانے کے لئے اس شرط پر آمادہ ہوا تھا کہ خسرو کو (بطور یرغمال) اس کے ہمراہ کر دیا جائے، اس پس منظر میں مندرجہ بالا انگریزی فقرہ کا ترجمہ دینا انتہائی ضروری تھا، انگریزی فقروں کے ساتھ ایسا اغماض جا بجا برتا گیا ہے، اسی صفحہ پر.... اور عوام پر کتنا خوف طاری ہوا ہوگا، کی بجائے.... اور امرا اور عوام پر کتنا خوف طاری ہوا ہوگا، ہونا چاہئے، نیز آفواہیں' کی بجائے افواہیں لکھنا چاہئے، ص ۳۲۹-۳۰ پر.... شہر کو ان خوبصورت عمارتوں کے جو گذشتہ عمارتوں کے جو گذشتہ بیس سال میں تعمیر ہوئی تھیں، کی بجائے یوں لکھنا چاہئے تھا "شہر کو ان خوبصورت عمارتوں کے جو گذشتہ بیس سال میں تعمیر ہوئی تھیں" معلوم ہوتا ہے، پروف ریڈنگ کی زحمت بالکل نہیں فرمائی گئی،

ص ۳۳۹ پر شاہ عباس نے مغل کمانڈر کو رشوت دینے کی کوشش کی، یہاں مغل کمانڈر مرزا غازی بیگ کا نام نہیں لکھا، اسی طرح ص ۳۴۲ پر مغل سفیر خان عالم کا نام بھی نہیں لکھا ہے، اور صفحہ ۳۴۲ پر 'یادگار' (yadgar) کو 'یادگیر' لکھا ہے'

ص ۳۴۴ پر (بقیہ حاشیہ ص ۳۴۳) 'بنجاروں یا کھیلوں کو دیکھا'، پتہ نہیں کھیلوں سے فاضل مترجم کی کیا مراد ہے؛ ؟ اصل میں تو یہاں قافلوں ہونا چاہیئے، اسی صفحہ پر اور اسی حاشیہ میں مترجم موصوف یوں لکھتے ہیں "صبح ہیں بنجاروں کا ایک ٹنڈا ملا، بنجاروں کا 'ٹانڈا' تو مشہور ہے مگر 'ٹنڈا' پہلی دفعہ نظر سے گذرا ہے، ص ۳۴۵ پر دونوں فوجوں میں لڑائی کو زیادہ دیر ہوئی تھی، کی بجائے، دونوں فوجوں میں لڑائی کو زیادہ دیر نہ ہوئی تھی، اور ص ۳۵۵ کے حاشیہ ۱۳ میں نور الدین علی کی بجائے نور الدین قلی ہونا چاہیئے، ص ۳۵۶ کے حاشیہ ۲ میں ہر ایک منصبدار کے ذات و سوار منصب میں اعداد و شمار کا اندراج غلط کیا گیا ہے، یعنی سید ہتوا کو دو ہزار ذات اور ایک ہزار سوار کے منصب پر ترقی دی گئی، مکرم خاں کو پانچہزار و دو ہزار پر خواجہ قاسم کو ایکہزار چار سو پر..... کی بجائے سید ہتوا کو دو ہزار ذات اور ایک ہزار پانچ سو سوار کے منصب پر ترقی دی گئی، مکرم خاں کو تین ہزار و دو ہزار پر، خواجہ قاسم کو ایک ہزار چار سو پر.....' نیز اسی حاشیہ میں امان اللہ کو تین ہزار ذات و سوار پر ترقی دی گئی تھی، کی بجائے 'امان اللہ کو تین ہزار ذات و سوار اور پھر چار ہزار ذات و سوار پر ترقی دی گئی تھی' ہونا چاہیئے'

ص ۳۵۶ پر عنوان پرویز کی آمد کے تحت پہلا فقرہ یوں ہے "اار کو شہزادہ پرویز دریائے ہنڈن پر پہنچ گیا، بظاہر فقرہ صحیح ہے، مگر آپ اس کا انگریزی کے حسب ذیل فقرہ سے مقابلہ کیجئے:-

On the 11th at Hindaun arrived prince parvez" p. 309

تو معلوم ہوگا کہ فاضل مترجم کی نوکِ قلم نے ایک بڑے قصبہ (ہنڈون) کو دریا بنا دیا (ہنڈون ضلع سوائی مادھو پور میں دہلی بمبئی ریلوے لائن پر ایک اسٹیشن ہے، جو سلطنت اور مغل عہد میں بیانہ و ہنڈون کے نام سے ایک پرگنہ رہا تھا) اسی صفحہ پر اعتبار خاں کے منصب کو چھ ہزار ذات اور تین ہزار سوار کی بجائے، چھ ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار لکھنا چاہئے تھا،

ص ۳۵۹ پر "۱۶۱۲ء میں دکن روانہ ہوتے وقت ..." کی بجائے "۱۶۲۲ء میں دکن سے روانہ ہوتے وقت ..." نیز شاہجہاں کی بیگم ممتاز محل کی ایک بھتیجی کے شوہر دیوان صفی کے ساتھ کی بجائے شاہجہاں کی بیگم ممتاز محل کی ایک بہن کے شوہر دیوان صفی کے ساتھ ہونا چاہئے، دیوان صفی شاہجہاں کا ہم زلف تھا یعنی ممتاز محل کی ایک بہن کا شوہر تھا، بھتیجی کا شوہر میر جمال الدین تھا، ص ۳۶۲ پر مناسب اخراجات کو مناسب اعزازات اور ص ۳۷۷ پر مفرور باقی کو مفرور باغی لکھنا چاہئے تھا، ص ۳۷۶ پر ساری گذرگاہیں اُن کے قبضہ میں تھیں، فقرہ کے بعد حسب ذیل انگریزی فقرہ کا ترجمہ چھوڑ دیا گیا:-

Just as Bairam Beg had in 1623 held those on the Nar[illegible]da (P. 326)

صـ۳۸۳ پر احمد نگر نیز بیجا پور کا محاصرہ عنوان کو دو دو ٹکڑوں میں علیحدہ علیحدہ لکھا ہے۔ صـ۳۸۳ پر ہانسوید کے محاصرہ کے تحت ایک فقرہ اس طرح لکھا ہے:۔ "وہ لال قلعہ میں خیمہ زن ہو کر قلعہ کی تسخیر کا منصوبہ بنایا"، پتہ نہیں برہان پور کے آس پاس لال قلعہ کس نے اور کب تعمیر کرایا؟ دراصل یہاں لال قلعہ کی بجائے

لال باغ' ہونا چاہئے، ہم اسے تصحیف کاتب نہیں کہہ سکتے

ص ۳۴۱ پر ۳۰ رمضان ۱۰۳۵ھ کی بجائے، ۲ رمضان ۱۰۳۵ھ لکھنا چاہئے'

اسی صفحہ پر جو پورے طور دفاع کے لئے تیار تھے، فقرہ کے بعد انگریزی کے مندرجۂ ذیل فقرہ کا ترجمہ نہیں کیا گیا،۔

The Garrison Comprised Between 3,000 and 4,000 horseand 10,000 infantry' (PP. 362 Third Edition.)

ص ۳۴۴ پر بھی قلعہ تھٹہ کے سلسلہ میں نوٹ مدِ نہیں دیا گیا، ص ۳۴۷ پر ایک فقرہ ملاحظہ فرمایئے، کچھ دور تک تو حسب وعدہ تحفہ کا راستہ اختیار کیا، قارئین ہمارے ملک کی اٹلس (Atlas) میں تحفہ کا جائے وقوع دیکھنے کی خود ہی زحمت فرمائیں کاتب نے تھٹہ' کو تحفہ' بنا دیا، گو پوری کتاب بجائے خود تحفہ ہے،

ص ۳۴۶ پر شہزادہ پرویز کے انتقال کا سنہ خلافِ واقعہ ۱۶۳۶ء دیا ہے، اسے ۱۶۲۶ء ہونا چاہئے، ص ۳۴۲ پر بالسینغر کا املا بایسانغر تحریر کیا ہے، ص ۴۲۵ کے تینوں حاشیوں میں چند نقائص رہ گئے ہیں، ص ۴۲۰ پر تاریخ وسیہ کاریوں اور سیاحوں کی جعلسازیوں....." کی بجائے تاریخی وسیہ کاریوں اور سیاحوں کی حکایتوں ہونا چاہیے اسی صفحہ کے حاشیہ نمبر ۱ میں اچانک ایک سائیس اور دو میرے آگے کی بجائے "اچانک ایک سائیس اور دو کہار میرے آگے آگئے'"

اور اسی حاشیہ میں پیروں کے پیر کی نس کاٹ کر بجائے، کہاروں کے پاوں کی نس کاٹ کر ہونا چاہئے، ص ۴۲۹ کے حاشیہ ۲ میں محروم بھائی کو مرحوم بھائی لکھنا چاہئے تھا، ص ۴۳۰ پر بقیہ حاشیہ کے آخر میں جلد اول صفحات ۱۵۸ تا ۱۵۹ سے پہلے اشوری

ڈومو گرا ہونا چاہئے،

ص ۴۳۱ کے حاشیہ ۲ میں دربار میں شیخ احمد سرہندیؒ کی طلبی کا سنہ خلافِ واقعہ ۱۶۷۹ء دیا ہے، جبکہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کا زمانۂ حیات (۱۵۶۳ء تا ۱۶۲۴ء) ہے، در اصل دربار میں آپ کی طلبی اور اسیری کا واقعہ ۱۶۱۹ء میں ہوا، ص ۴۳۵ پر تین سال پہلے اس نے اور انسانی ہمدردی کا فرمان کی بجائے تین سال پہلے اس نے انسانی ہمدردی کا ایک اور فرمان ... لکھنا چاہئے اور اسی صفحہ پر قبیح رسم جو بگڑے ہوئے درباری بنو امیہ کے دربار میں آ گئی تھی کی بجائے قبیح رسم جو بگڑے ہوئے بازنطینی دربار سے بنو امیہ کے دربار میں آ گئی تھی نیز اسی صفحہ کے حاشیہ ۱۰ میں اورنگزیب نے بھی کرنے کی ممانعت کی بجائے اورنگزیب نے بھی نامزد کرنے کی ممانعت کر دی تھی ہونا چاہئے، ص ۴۴۰ پر حکومت کے مکتوب بنام سکریٹری صدر بورڈ آف ریونیو مورخہ ۱۴ اگست ۱۸۴۶ء میں درج ہیں، کی بجائے، حکومت کے مکتوب بنام قائم مقام سکریٹری صدر بورڈ آف ریونیو ۳۳۴۶ آف ۱۸۴۶ء مورخہ ۱۴ اگست ۱۸۴۶ء میں درج ہیں، لکھنا چاہئے تھا، ص ۴۴۵ پر آثر رحیمی، کو دو جگہ ماثر رحیمی لکھا ہے، جو کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے، صفحہ ۴۴۵ پر ہی ایک مکمل فقرہ اس طرح درج ہے کہ شاعروں کے حالاتِ زندگی اور اُن کی تحقیقات کے بکثرت نمونے جو خان خاناں کی سرپرستی میں فروغ پا رہے تھے، کی بجائے شاعروں کے حالاتِ زندگی اور اُن کی تخلیقات کے بکثرت نمونے دیئے ہیں، جو خانخاناں کی سرپرستی میں فروغ پا رہے تھے،" اور ص ۴۴۶ پر ... معتمد خاں کے بیانات پر مبنی ہے، کی بجائے ... معتمد خاں اور کامگار کے بیانات پر مبنی ہے، نیز ص ۴۴۰ پر گرانٹ ڈف، اور میجر بارڈن کی بجائے گرانٹ ڈف، اور میجر اے گارڈن، ہونا چاہئے، ص ۴۴۹ پر ... بہادروں کے نام بیان

کے گئے ہیں، کی بجائے ..... بہادروں کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں، اور ہ
بندیلیوں کی بجائے بندیلوں، اور ص ۵۸ پر سولینن میں پیدا ہوا، اور جولائی
..... کی بجائے لولیٹن (Lowley Ton) میں پیدا ہوا، اور ص
..... لکھنا چاہئے، ص ۵۴ پر سرطامس رو کے بارے میں ایک فقرہ یوں
نومبر ۱۶۱۶ء میں وہ بادشاہ کے ساتھ مانڈو گیا، اور وہاں ۱۶۱۸ء
احمد آباد "معلوم ہوا کہ سرطامس رو تقریباً دو تین سال تک بقید حیات رہا، ا
کا آخری حصہ یوں ہونا چاہئے تھا" اور وہاں سے ۱۶۱۹ء کے آخر میں احمد
رو کے بارے میں ہی پیراگراف کے آخر میں انگریزی کے اس فقرہ
Reached England in 1619.
کا ترجمہ چھوڑ دیا گیا، ص ۵۵ پر ہی ایک دوسرے انگریز سیاح ایڈورڈ ٹیر
پہونچنے کا سنہ خلاف واقعہ ۱۹۱۹ء تحریر کیا ہے، جبکہ فی الواقع ۱۶۱۹ء
ص ۵۶ پر سیاح پیٹرو ڈیلا ویل کے بارے میں اس طرح لکھا ہے "او
میں ایشیائے کوچک اور مصر کا ایران ہوتے ہوئے سفر کیا" یہ فقرہ یوں ہونا
۱۶۱۶ء میں ایشیائے کوچک ہوتے ہوئے مصر کا اور ایران ہوتے ہوئے فلسطین
ص ۶۱ پر اورنگ زیب علیہ الرحمہ کا عہد خلاف واقعہ ۱۶۱۶ء ۱۶۵۸ء
۱۶۵۸-۱۷۰۷ء ہونا چاہئے،

ص ۶۲-۶۳ پر بھی چند اغلاط ہیں، جو در خور اعتنا نہیں، ص ۶۶ پر
سیشن جج اور مورخ جناب عبداللطیف مرحوم کو لطیفہ بنا دیا، ویسے پورا
غلطیوں کے لطیفوں سے پر معلوم ہوتی ہے، اسی صفحہ پر نیشنز (ons

کو نیشنز اور جے ٹالبائے وہیلر کو جے ٹالبوائیر بنا دیا ہے (ص ۴۰۰) ص ۲۸۳ پر تمام مدت کو تجا،
مدت (ص ۴۰۰) ص ۲۸۳ پر جامی کی یوسف زلیخا کو حاجی کی یوسف زلیخا اور شیونکھ سنگر کو شیونکھ سید
لکھا ہے، بخوف طوالت دیگر صفحات کی بہت سی اغلاط کو عمداً نظر انداز کر دیا گیا ہے

کوتاہ نہ تواں کرد کہ ایں قصہ درازست

یہ ہے اس ترجمہ کا جائزہ جو جناب رحم علی الہاشمی صاحب کی محنت شاقہ کے
ہمارے سامنے آیا ہے، بڑی ناسپاسی ہوگی اگر ہم اُن کی اس خدمت کا شکریہ ادا نہ
مگر بڑی نافرض شناسی ہوتی اگر ہم اپنے تاثرات کو تاریخ کے ایک ادنیٰ طالب علم
حیثیت سے ان تک نہ پہنچاتے،

ہمیں توقع ہے کہ فاضل مترجم اور ترقی اردو بورڈ نئی دہلی کے ذمہ داران ا
نقد و تبصرہ میں جو باتیں صحیح پائیں آیندہ ایڈیشن میں بشرطیکہ اس کی نوبت آئ
اس کی تصحیح میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں فرمائیں گے،

مقالاتِ شبلی تنقیدی

(حصّہ چہارم)

یہ مولانا شبلی کے تنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے الندوہ لکھنؤ اور دوسرے
رسالوں میں عربی و فارسی کی بعض اہم کتابوں پر لکھے تھے، اس میں مغل شہنشاہ نورالد
کے روزنامچہ تزک جہانگیری پر بھی ایک پرمغز مقالہ ہے، جس کی قوتِ تحریر، زورِ
پردازی اور واقعہ نگاری سے مولانا بہت زیادہ متاثر تھے، اور اس کو فارسی ادب
بہترین کتابوں میں شمار کرتے تھے، قیمت ۹ روپئے "منیجر"

اسلام اور مستشرقین پر دارالمصنفین کے بین الاقوامی سیمینار

کے متعلق

پاکستانی اہلِ قلم کے تاثرات

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی ریڈر
اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اسلام آباد

چند ماہ پہلے دارالمصنفین اعظم گڈھ کی طرف سے اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر ایک بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کے دعوت نامے موصول ہوئے تو خواہش اور تمنا کے باوجود یہ بات ہم میں سے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ ہم لوگ واقعی ایک دن شدِّ رحال کر کے اعظم گڈھ جیسے دور افتادہ مقام تک پہنچیں گے۔ بعدِ مسافت اور دشواریٔ راہ کے علاوہ ایسا کوئی سامانِ کشش بھی نہ تھا جو بالعموم کانفرنسوں اور سیمیناروں میں مندوبین کو کشاں کشاں لئے جاتا ہے۔ ٹی اے ڈی اے کی چاٹ اور چاشنی یہاں سرے سے مفقود تھی۔ دارالمصنفین غریب مسلمانوں کا ایک علمی ادارہ ہے۔ جس کو نہ کسی حکومت کی سرپرستی حاصل ہے، نہ ہی اس کے پاس اپنے ایسے وسائل ہیں کہ وہ استحقاق اور مرتبے کے مطابق جاہ و منصب کے اعتبار سے اتنے بڑے بڑے لوگوں کے مصارفِ سفر کا بار اٹھا سکے۔ یہ بات ہمیں پہلے سے معلوم تھی اور شبلی اکیڈمی کے ناظم سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے بطائف الحیل اس کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔ اور جیسا کہ مشہور مقولہ ہے عقلمنداں را اشارہ کافی است ہماری فراست نے فوراً اس کو بھانپ لیا کہ دارالمصنفین سفر خرچ نہیں دے گا ہم پیشہ و ہم مشرب

وہم راز ہونے کا یہ اثر تھا یا اس خصوصی تعلق کا نتیجہ جو سید صاحب موصوف ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کے ساتھ مدت مدید سے رکھتے چلے آئے ہیں کہ انھوں نے دعوت ناموں کے اجرا میں انتہائی فیاضی سے کام لیا اور تھوک کے حساب سے بشمول ڈائرکٹر ادارے کے دس اسکالروں کو سمینار میں شرکت کی دعوت بھیج دی، ظاہر ہے ادارہ بھی اپنے قواعد وضوابط کے اندر اتنے ڈھیر سارے لوگوں کو خرچ دینے کا متحمل اور مجاز نہیں ہوسکتا تھا۔ کارپردازان ادارہ نے بھی اصولی طور پر یہ طے کر دیا کہ جو شخص شریک ہونا چاہے۔ وہ اپنا خرچ خود اٹھائے، مگر لطف کی بات یہ تھی کہ اس کے باوجود ہر شخص آمادہ وتیار نظر آیا۔ شبلی اکیڈمی کی شہرت، عزت ساکھ اور وقار عام حالات میں بھی اہل علم کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کے لیے کافی ہے لیکن خاص کر پاکستانی زائرین کے لیے ہندوستان کے وہ ادارے جو مسلمانوں کی عظمت کے نشان ہیں ان کی کشش انھیں دیوانہ وار کھینچتی ہے۔ اور ان کی زیارت کا کوئی موقع انھیں ملے تو وہ خرچ یا صعوبت سفر کی پروا نہیں کرتے۔ دارالمصنفین کے سفر میں یہ دونوں ہی رکاوٹیں موجود تھیں۔ راستہ دشوار اور سفر کی سہولتیں سرے سے مفقود۔ پھر بھی ہر پیر وجوان آمادۂ سفر، حد یہ کہ ہوائی جہازوں یا ایرکنڈیشنڈ گاڑیوں میں سفر کرنے والے بزرگ عام مسافر گاڑیوں میں سفر کرنے سے نہیں گھبرائے، ضعیف اور معمر ہونے کے باوجود انھوں نے عزم جواں کے ساتھ جوانوں کا ساتھ دیا۔ ہمارا وفد جو اسلام آباد سے جانے کے لیے آخری طور پر ترتیب پایا اس کے ارکان کی تعداد سات تھی، جس میں سے تین اشخاص ایسے تھے جن کی عمریں ۷۰ کے لگ بھگ ہونگی، ان کی ہمت کو داد دینی چاہئے۔ اور ان کے حوصلے کو آفریں کہنا چاہیے کہ انھوں نے ہم جوانوں کو مات دی۔ اور ان کے سن رسیدہ حوصلے نے ہماری ہمت بندھائی۔

دینے کے لیے سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب نے ہندوستان کی وزارت خارجہ کا

یک خاص عورت ممبر کے ساتھ منسلک کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے اطمینان تھا کہ ویزا ملنے میں
شواری نہیں ہوگی۔ اور جہاں تک کہ ویزا ملنے کا تعلق ہے، واقعی اسمیں کوئی دشواری نہیں ہوئی مگر یہ
ات شرکائے کانفرنس کے لیے بے حد حوصلہ فرسا اور مایوس کن ثابت ہوئی کہ ویزا صرف ایک
ہفتے کا اور صرف ایک جگہ کا دیا گیا۔

۱۰؍فروری کی سہ پہر یہ قافلہ علم و دانش اپنے مختصر ساز و سامان کے ساتھ دلوں میں امید و یقین
کی قندیلیں روشن کیے اسلام آباد سے لاہور روانہ ہوا۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں

اور اس کے کرشمے یہیں سے ظاہر ہونے شروع ہو گئے۔ اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے وائس
چانسلر ڈاکٹر این اے بلوچ نے از راہ کرم ہمارے آغاز سفر سے پہلے ہی مسافر نوازی کا عملی نمونہ
پیش کیا، وہ خود ایک اسکالر ہیں اور اسکالر نوازی ان کے اخلاق حسنہ کا ایک نمایاں وصف
ہے انھوں نے ادارے کے اسکالروں کی قدر افزائی کی۔ سرحد تک پہنچانے کے لیے یونیورسٹی کی دین مع
ڈرائیوروں کے بھیج کر ان کی دعائیں لیں۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی مدعو کیا گیا تھا، مگر وہ اپنی مصروفیات
اور کثرت کار کی وجہ سے شرکت کے لیے وقت نہ نکال سکے۔ ان کی طرف سے معذرت اور
مصباح الدین عبدالرحمن صاحب کے لیے نیک خواہشات کا پیغام ہم ساتھ لے گئے۔

نماز عصر سے پہلے تقریباً چار بجے جب یہ قافلہ علم و دانش ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتے کی جائے
قیام ایم۔ این اے ہوٹل اسلام آباد سے روانگی کیلئے ویگن میں سوار ہوا تو سب کی زبانوں پر بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا اور
سبحان الذی سخر لنا ھذا کا ورد جاری تھا، کہ مسلمانوں کا اصل زاد راہ یہی ہے۔

اور ساز و برگ قافلہ بیخود ہیں ہم بے نالۂ رود جرس کارواں ما

اس قافلے میں ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کے ڈائرکٹر عبدالواحد ہالے پوتا کے

علاوہ مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی سابق لائبریرین ادارہ تحقیقات اسلامی جو پروفیسر کی حیثیت میں دوبارہ ادارے سے منسلک ہوگئے ہیں اور مفتی مولانا سیاح الدین کاکاخیل رکن کونسل آف اسلامک آئیڈیولوجی دو قابل ذکر بزرگ ہستیاں شامل تھیں باقی ادارے کے ہم چند نوجوان اسکالر تھے جو خوردوں میں ہونے کے باعث گمنام رہنا ہی پسند کریں گے۔

ہم سا کوئی گمنام زمانے میں نہ ہوگا گم ہو وہ نگیں جس پہ کھدے نام ہمارا

مگر ایسا بھی نہیں کہ وہ پردے میں رہنا چاہتے ہوں، ان کے نام ظاہر کر دیئے جائیں، تو یہ پردہ دری نہیں ہوگی، محمود احمد غازی، احمد خان، حافظ محمد طفیل اور راقم الحروف۔

اس سفر میں ہاشمی صاحب کی رفاقت ایک نعمت غیر مترقبہ تھی، ان کی نسبت تجربے کے بعد ہر پڑھے لکھے آدمی کا تاثر یہی ہوگا کہ وہ اپنی ذات سے ایک لائبریری بلکہ ایک ادارہ (مجمع البحوث) ہیں۔

بہت لگتا ہے جی صحبت میں انکی وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہیں

وہ کسی مسئلے پر بند نہیں ع اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے

ادھر سفر شروع ہوا ادھر انھوں نے علوم و فنون کے دریا بہانے شروع کئے، وہ ایک عالم دین ہیں، علمی اور دینی مباحث پر ان کی عالمانہ گفتگو بھی انسان کو ورطۂ حیرت میں ڈالنے والی ہوتی ہے، لیکن زیادہ تعجب اس وقت ہوتا ہے جب وہ دنیا جہان کے مختلف موضوعات پر بولتے ہیں، فنون لطیفہ، تاریخ مذاہب، تقابل ادیان، علم الاصنام سے لیکر آجکل کے نام نہاد علوم جدیدہ پر جس علم و اعتماد کے ساتھ اظہار خیال کرتے ہیں اس کو دیکھ کر بس خدا کی شان نظر آتی ہے، کسی عربی شاعر نے درست ہی کہا تھا۔

ولیس علی اللہ بمستنکر ان یجمع العالم فی واحد

ان کی ایک ہفتہ کے سفر کی گفتگوئیں اور تقریریں قلمبند کرکے جمع کی جائیں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جاتی، اور اس میں ایسے ایسے مسائل اور نکتے ہوتے کہ شاید و باید ادارے کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ہاے پوتا صاحب بے خود ہو کر بار بار کہتے رہے کہ کاش مولانا کی باتیں ٹیپ رکارڈ میں محفوظ کرلی جاتیں، آغاز سفر میں مولانا کا زور طبیعت زیادہ تر ادب اور شعر و شاعری کی طرف رہا، انھوں نے امیر مینائی کو اردو کا سب سے بڑا شاعر قرار دیا جس سے میں نے اختلاف کیا، مولانا نے ان کے چیدہ چیدہ پسندیدہ اشعار سنائے اور کہا کہ اردو تو ایک طرف دنیا کی کسی زبان میں اس پایہ کا شعر پیش نہیں کیا جاسکتا، بقول ان کے موت پر امیر کے اس شعر سے بہتر شعر پیش کرنا ممکن نہیں۔

مدت سے امیر اس سے ملنے کی تمنا تھی آج اس نے بلایا ہے لینے کو قضا آئی

میں نے کہا یہ شعر ایک مسلمان شاعر ہی کہہ سکتا ہے، نام کا مسلمان نہیں، واقعی مسلمان، امیر مینائی کے اس شعر کو بھی مولانا نے دوران سفر متعدد بار دہرایا۔

کسی رئیس کی محفل کا ذکر کیا ہے امیر خدا کے گھر بھی نہ جائیں گے بے بلائے ہوئے

اردو ہندی فارسی کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں اشعار مولانا کی زبان سے نکل کر فضا میں تحلیل ہو گئے، اردو شعراء میں میر، سودا، غالب، مومن، داغ، امیر مینائی، اقبال، اور محسن کاکوروی کا ذکر زیادہ رہا۔

اعظم گڈھ شہر میں داخل ہوئے تو ہر طرف سناٹا تھا، چھوٹا سا شہر نہ کشادہ سڑکیں، نہ عالیشان عمارتیں۔ وہ بھی رات کے سناٹے میں سویا ہوا۔ دوکانیں بند۔ سڑکیں روشنی سے محروم، ابھی بارہ نہیں بجے تھے مگر ہر طرف ایک ہو کا عالم تھا۔ راستے میں نصب بعض

بتوں کے آستانے البتہ پجاریوں کے بغیر بھی زندگی کے آثار سے پُر تھے، یہ تھا وہ شہر جس میں ہزار میل کا سفر طے کر کے ہم پہنچے تھے، یہاں کون تھا، کیا تھا جس کی کشش ہمیں اور ہماری طرح اور بہت سے لوگوں کو دور دراز سے کھینچ کر لائی تھی، اور ہم کشاں کشاں چلے آئے تھے اس سوال کے جواب میں اس شہر کی سو سال کی تاریخ اپنی علمی اور دینی روایات کے ساتھ مجسم ہو کر ہمارے سامنے آکھڑی ہوتی ہے، اور اشارہ کر کے بتاتی ہے، یہ فاروقی چریا کوٹی ہیں، یہ شبلی نعمانی ہیں، یہ حمید الدین فراہی ہیں، یہ سلیمان ندوی ہیں، یہ عبد السلام ہیں، یہ شاہ معین الدین ہیں، یہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن ہیں۔ یہ دار المصنفین ہے، یہ سیرۃ النبی ہے، یہ معارف ہے، ان ہی کے دم سے یہ گمنام شہر شہرۂ آفاق بنا، ان ہی کی دعوت پر ہم آج یہاں آئے تھے، میں نے اعظم گڈھ شہر اور دار المصنفین کے ان پہلوؤں کے بارے میں جن کو دور دیس کے لوگ نہیں جانتے پہلے ہی اپنے ان ساتھیوں کو سب کچھ بتا دیا تھا، جو پہلی بار یہاں آرہے تھے، تاکہ اگر ان کے تصور اور تجربے میں کہیں فرق و اختلاف نظر آئے تو وہ پریشان نہ ہوں، مثلاً یہ کہ اعظم گڈھ ایک چھوٹا سا شہر ہے، ہندوستان یا پاکستان کے بڑے شہروں کی چمک دمک اور زندگی کی سہولتیں وہاں نہیں ملیں گی، وہاں کوئی بڑا کیا چھوٹا بھی ہوٹل ایسا نہیں ہے جس میں ٹھہرا جا سکے، اسی طرح بازار سے بستروں کے حصول کا رواج بھی وہاں نہیں ہے، کانفرنس کی طرف سے ہمیں بستر ساتھ لانے کو کہا گیا تھا جس سے ہمارے بعض ساتھیوں کو ایک گونا تردد سا تھا۔ اعظم گڈھ اور دار المصنفین سے میں اچھی طرح واقف تھا، اس علم و آگہی کی بنیاد پر میں نے پہلے سے اپنے ذہن میں کانفرنس اور اس کے انتظامات کے بارے میں ایک نقشہ بنا لیا تھا، لیکن یہاں جو نقشہ نظر آیا وہ یکسر مختلف تھا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے دار المصنفین کو کہیں سے الٰہ دین کا جادوئی چراغ ہاتھ آگیا ہے، اور کچھ جن ان کے قابو میں آگئے ہیں، جن کی مدد سے انھوں نے جنگل میں منگل کا وہ سماں

مدعا ہے کہ شاید د با یہ ، مجھے دوسروں کے رد عمل کا علم نہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ میں نے عقیدت و شعائر
اور فخر و انبساط کے ملے جلے جذبات کے ساتھ انتظامات کے مختلف پہلوؤں کو دیکھا۔ ہم جس وقت
کانفرنس کی حدود میں داخل ہوئے یہ قائل ہو گا۔ اعظم گڈھ شہر کی حدود میں داخل ہونے کے بعد
جو عالم نظر آیا تھا اس کے مقابل کانفرنس کے دنیوں کی دنیا اور ہی تھی۔ رات ہونے کی وجہ سے
یہ فرق اور بھی نمایاں ہو گیا تھا۔ دارالمصنفین کا اپنا رقبہ نسبۃً بہت محدود اور تھوڑا ہے، مگر
اس کے ساتھ شبلی ہائی اسکول اور شبلی کالج کے رقبے ملالیں تو پھر اس کی وسعت اتنی بڑھ جاتی ہے
کہ اس کی سمائی میں کئی گنا کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ شبلی ہائی اسکول شبلی کالج اور شبلی اکیڈمی کو شبلی کے
نام ہی نے تقسیم نہیں کر رکھا ہے، یہ تینوں ادارے اپنے محل وقوع کے اعتبار سے بھی باہم گر ملحق
و متصل ہیں، اعظم گڈھ شہر میں مسلمانوں کے یہ تینوں قومی ادارے اس طرح واقع ہیں کہ وہ
ایک مثلث کے تین زاویے ہیں۔ یوں وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کی یہ ایک
جلوہ گاہ ہے۔ ان کی عمارتیں اور احاطے ہی نہیں ان کے صدر دروازے بھی الگ الگ ہیں،
لیکن اندر سے راستے نکال کر ان کو ملا دیا گیا ہے، کانفرنس کی تاریخیں مقرر کرنے میں اس امر کا
خیال رکھا گیا تھا کہ شبلی اکیڈمی کی اس تقریب کے لیے ان تعلیمی اداروں سے کام لیا جا سکے اور
تعلیم کا زیادہ ہرج بھی نہ ہو۔ ہماری ٹیکسیاں شبلی کالج کے گیٹ سے اندر داخل ہو گئیں، گیٹ کے
اندر داخل ہوتے ہی ہم سب اتر گئے۔ جلسہ گاہ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی، شبلی کالج کے وسیع
و عریض گراؤنڈ میں خیموں، شامیانوں اور قناتوں کی ایک بستی آباد تھی، جس کی ایک ایک
چیز سے نفاست، خوش سلیقگی اور بلند معیاری نمایاں تھی۔ مجھے زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ
اتنا اعلیٰ درجے کا ساز و سامان آیا کہاں سے . . . . . صاف ستھرے نئے خوش رنگ شامیانے
عمدہ فرنیچر، فرش فروش جھاڑ فانوس ہر چیز سے امارت ٹپکتی تھی جیسے کسی بادشاہ نے سفر میں

پڑاؤ کیا ہو یا کسی امیر کبیر کے ہاں برات آنے والی ہو یا جشنِ طرب منایا جا رہا ہو۔ برقی قمقمے اور بجلی کے راڈ محض روشنی فراہم کرنے کے لیے نہیں لگائے تھے، بلکہ ان سے آرائش وزیبائش کا کام بھی لیا گیا تھا۔ آدھی رات کے وقت خیموں کی اس بستی میں کوئی مکین نظر نہیں آیا پھر بھی اس کی رونق دوچند تھی۔ اعظم گڑھ جیسی چھوٹی جگہ میں مادی وسائل سے محروم ایک ادارے کا یہ اہتمام دیکھ کر منتظمین کے عزم وحوصلہ کی داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا تھا۔ ہماری ٹیکسیاں شبلی کالج کے کمپاؤنڈ میں دارالمصنفین کو ملانے والے دروازے کے پاس کھڑی ہوئیں۔ ہم سیدھے صباح الدین صاحب کے دولت خانے کی طرف گئے۔ ان کی رہائش دارالمصنفین ہی کے ایک گوشے میں مہمان خانے کے ساتھ ہے، دارالمصنفین کو دلھن کی طرح سجایا گیا تھا شبلی منزل کی اپنی ایک شان ہو جو اس کے وجود کا ایک مستقل اور نمایاں وصف ہے، اور جس کو کسی وقت بھی آنے والا کوئی شخص دیکھ سکتا ہے لیکن آج کی سج دھج دیکھ کر یہی گمان گذرا کہ جیسے اس گھر میں آج کی رات کوئی بڑی برات آنے والی ہو، برات کے ٹھہرنے کی جگہ کے مقابل دلھن کے گھر کی سجاوٹ عموماً زیادہ ہوتی ہے کہ باہر سے آنے والے خود بخود پہچان لیں کہ دلھن کا گھر یہی ہے۔ میں نے اگر شبلی منزل کو پہلے نہ دیکھا ہوتا تو بھی مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگتی کہ آج ہم جس گھر کے مہمان ہو کر آئے ہیں وہ یہی ہے۔ دارالمصنفین کی ہر چیز تجدید کے عمل سے گذری تھی، روشیں اور راستے تک آراستہ وپیراستہ تھے، اصل عمارت رنگ روغن کے بعد برقی شعاعوں کی بارش میں نہائی ہوئی واقعی کسی نوعروس کا پیکر معلوم ہوتی تھی، اور دارالمصنفین کی ننھی منی خوبصورت مسجد کو تو رنگ برنگ برقی قلقلوں کی لڑیوں سے ڈھک دیا گیا تھا۔ اس پورے منظر میں مسجد کا نظارہ سب سے زیادہ جالب توجہ تھا۔ کہ تجدید وتزئین کے اس عمل میں سب سے زیادہ توجہ اسی پر صرف کی گئی تھی۔ اس سے شبلی اکیڈمی میں مسجد کے مقام کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، اپنا گھر سجانے میں دنیا جہان کا

[illegible] کرنے والے عموماً خدا کے گھر کو بھول جاتے ہیں۔ مسجد کے پاس ہی پائینتی میں ایک طرف مرقد شبلی ہے، جس پر کتبہ لگا ہوا۔ قبر کے چاروں طرف ڈیڑھ دو فٹ کی پختہ دیوار اٹھا کر بکس بنا دیا گیا ہے اور اوپر کا حصہ کھلا رکھا گیا ہے، جس میں مٹی بھری ہوئی ہے، اعظم گڑھ ضلع میں علمائے اعظم گڑھ خصوصاً شبلی اور فراہی کی علمی اور فکری تحریک کے اثر سے شرک و بدعت اور قبر پرستی وغیرہ کی خرافات بہت کم نظر آتی ہیں۔ ورنہ آج کے دن سب سے زیادہ بناؤ سنگھار کی مستحق یہ قبر ہوتی جو بالکل ویران و سنسان پڑی زبان حال سے زیب النساء مخفی کا یہ شعر دہرا رہی تھی،

بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے	نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

لیکن نہیں۔ یہ کون کہہ سکتا ہے کہ آج کا یہ سارا ہنگامہ یہ تمام رونق اور چہل پہل اس شخص کے دم قدم سے نہیں تھی جو اس قبر کہنہ میں مدفون ہے۔ یہ شبلی ہی کا جشن تھا، یہ شبلی ہی کا عرس تھا، یہ شبلی ہی کا میلہ تھا، یہ شبلی ہی کا چراغاں تھا۔ لیکن اہل شرک و بدعت کے طریق پر نہیں بلکہ اس طریقے پر جو قاطع شرک و بدعت اور علمبردار علم و حکمت ہونے کی حیثیت سے شبلی کے شایانِ شان تھا۔ شبلی اکیڈمی کے رہائشی حصے میں داخل ہونے سے پہلے ہمارا قافلہ تھوڑی دیر کے لیے رکا شاید اس لئے کہ یہاں کئی چیزیں ایسی تھیں جو نوواردوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں۔ میری زبان سے یوں ہی نکل گیا، یہ سامنے مرقد شبلی ہے، پہلے چل کر فاتحہ پڑھ لیں۔ ہم نوجوان جن کا علم اور مطالعہ ابھی تشنۂ تکمیل ہے، قدم اٹھا کر چلنے والے ہی تھے کہ مولانا ہاشمی نے ایک فقرہ کہہ کر بریک لگا دی۔ قبر پر جا کر فاتحہ پڑھنا بھی گویا ان بدعات سیئات میں سے ہے جو ناواقف لوگ دین کا حصہ سمجھ کر کرتے ہیں۔

سید صاحب کے در دولت پر دستک دی گئی۔ ان کے صاحبزادے ابھی سوئے نہیں تھے، معلوم ہوا کہ وہ نیند کا ٹیکہ لگوا کر ابھی سوئے ہیں۔ صاحبزادے ان کو جگانے

کے لیے جانے لگے مگر ہم نے بہ تاکید منع کیا اور ان سے درخواست کی کہ ہمیں ہماری جائے قیام تک پہنچا دیں۔ اس دوران کانفرنس کے کچھ کارکن اپنی صوابدید کے مطابق ٹیکسیاں ان خیموں کی طرف لے جا چکے تھے، جو ابھی تک خالی تھے۔ اور ہماری آمد کے منتظر تھے۔ شبلی کالج کے گراؤنڈ میں خاص مندوبین کے لیے خیموں کی ایک بستی بسائی گئی تھی۔ جس کے چاروں طرف قناتیں کھڑی کر کے حصار سا بنا دیا گیا تھا، ترتیب سے لگے ہوئے ایک ہی طرز کے خیمے دیکھنے میں بہت بھلے معلوم ہوتے تھے مجھے ایام حج میں عرفات اور منا کا نقشہ یاد آگیا۔ اس میں اسلامیت، عربیت اور مشرقیت ہی نہیں بدویت اور صحرائیت کا بھی مزہ تھا۔ جو شہروں کی بناوٹی اور مشینی زندگی کی نسبت فطرت سے بہت قریب تھا۔ اس میں فطرت کی سادگی اور بے تکلفی تھی۔ مجھے خیمے دیکھ کر بدو اور اونٹ کی مشہور حکایت یاد آئی حالانکہ یہاں ان دونوں میں سے کوئی بھی نہ تھا۔ کچھ عرب مندوب بھی مدعو تھے، اور غالباً انہی کی رعایت سے کانفرنس کے منتظمین نے اسکول اور کالج کے بے شمار کمروں کو نظر انداز کر کے صرف کثیر سے صحرا میں شہر نہیں جو آسان کام ہے۔ شہر میں صحرا بنانے کا تکلف کیا تھا، اس کے لیے اہل کانفرنس کو کیا پاپڑ بیلنے پڑے اور مصارف کا کتنا بڑا بوجھ اٹھانا پڑا۔ میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ اعظم گڑھ قصبے کے معیار کا ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ یہاں کسی کے گھر سے تو ڈھنگ کی چارپائی بستر مل سکتا ہے مگر بازار سے اس کا حصول ممکن نہیں۔ میں حیران اور متجسس تھا کہ کانفرنس کے لیے اس معیار کے اتنے وسیع انتظامات کیسے کیے گئے۔ کسی متعلق ذمہ دار آدمی سے اس پر گفتگو کا موقع نہ ملا، کچھ باتیں جو ادھر ادھر سے کانوں میں پڑیں ان سے معلوم ہوا کہ اس کے پیچھے بے ستون دکوہکن کی ایک پوری داستان ہے۔ پہاڑوں کی سخت چٹانیں کاٹ کر یہ جوئے شیر لائی گئی ہے۔ اس خیال سے کہ مہمانوں کو تکلیف اور شکایت نہ ہو۔ ہر چیز لکھنؤ سے

منگوائی گئی۔ کانفرنس کی سج دھج اور ساز و سامان کی بلند معیاری کی نسبت میرے ذہن میں جو سوالیہ نشان تھا لکھنؤ کا نام سن کر مجھے میرے ہر سوال کا جواب اس طرح مل گیا تھا کہ استفہام کا کوئی شوشہ باقی نہ رہا۔ لکھنؤ اور اعظم گڑھ کا فاصلہ دو سو میل سے کم نہ ہوگا حمل و نقل کے مصارف ہی اتنے اٹھے ہونگے کہ ان کا اندازہ مشکل ہے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ سامان سے لدے ہوئے ۱۴ ٹرک تو میں نے گنے جو میرے سامنے آئے معلوم نہیں ان خیموں کا کرایہ کتنا دیا گیا ہوگا۔ باقی شامیانوں، قناتوں، دریوں، قالینوں، چارپائیوں، بستروں، میزوں، کرسیوں اور صوفوں، کھانے پینے کے برتنوں، بجلی کے سامانوں اور دیگر ضروریات، حاجیات و کمالیات پر جو رقم خرچ ہوئی ہوگی وہ علیحدہ ہے۔ یہ اہتمام دارالمصنفین کے غریب میزبانوں نے اپنے عزیز مہمانوں کے آرام و آسائش اور اعزاز و اکرام کے لیے نہیں تو اور کس لیے کیا۔ اس پر بھی کسی کو شکایت رہ گئی ہو جو بالکل فطری بات ہے تو اس کے لیے شریفانہ طرز عمل یہی ہے کہ وہ درگذر سے کام لیں۔ اور دوست کی طرح خود اس کی طرف سے بہتر عذر تلاش کرے۔ حکومتوں کی طرف سے منعقد ہونے والے سمیناروں یا حکومتوں کی سرپرستی میں قائم اداروں کی طرف سے منعقد ہونے والی کانفرنسوں میں جس طرح بے دریغ روپیہ خرچ کیا جاتا ہے معلوم ہے پھر بھی شکایات رہ جاتی ہیں۔ دارالمصنفین کے سفرۂ علم و ادب سے زلہ ربائی کرنے والے کسی شخص کو اس سے یہ شکایت نہیں ہو سکتی کہ اس کو ہوائی جہاز کا کرایہ نہیں دیا گیا یا فائیو سٹار ہوٹل میں ٹھہرنے کی عیاشی فراہم نہیں کی گئی، دارالمصنفین نے اپنے مہمان مندوبین کے عافیت و آرام کے لیے جو کچھ کیا اپنی بساط اور حیثیت سے بڑھ کر کیا۔

ہمارے قافلے کے سات ارکان کو شمال مغربی کونے کے چار خیموں ۱۱۔۱۲۔۱۳۔۱۴ میں ٹھہرایا گیا۔ ڈاکٹر رانے پوتا کے لیے ایک خیمہ مخصوص کر دیا گیا۔ باقی ہم دو دو کر کے

ٹھہر گئے۔ ہر خیمہ جملہ ضروریات زندگی کے لیے خود مکتفی تھا سوائے کھانے کی جگہ کے کہ اس کا انتظام اجتماعی تھا جس کے لیے خیموں کی اس بستی کے وسط میں شامیانے لگا کر ڈائننگ اور ڈرائنگ کی اکٹھی جگہیں بنائی گئی تھیں، ہر خیمہ تین حصوں پر مشتمل تھا۔ پہلے حصے کو ڈرائنگ روم بیٹھک یا دالان کہہ لیجیے جس میں دو چھوٹی میزیں اور دو آرام کرسیاں، دری کا فرش بچھا کر رکھ دی گئی تھیں۔ اس کے بعد کا حصہ بیڈ روم یعنی سونے کا کمرہ تھا جس میں برابر سے لوہے اور نواڑ کی دو چارپائیاں نیچے دری کا فرش بچھا کر ڈال دی گئی تھیں۔ یہ کمرہ مربع اور اتنا کشادہ تھا کہ دو چارپائیوں کے بعد بھی سامان اور چلنے پھرنے کے لیے کافی گنجایش تھی، اس کے بعد کا حصہ لیٹرن باتھ اور ڈریسنگ کی ضرورتوں کے لیے تھا۔ پانی کے لیے بالٹیاں اور حاجت کے لیے کموڈ اور نہانے کے لیے چوکی موجود تھی۔ مہتر اور بھشتی کی آمد و رفت کے لیے اس میں ایک دروازہ باہر سے بھی تھا۔ پانی کے نکاس کے لیے خیمے کے باہر گڑھا کھود کر نالی بنا دی گئی تھی۔ یہ خیمہ گویا دو آدمیوں کی رہایش کے لیے ایک مکمل یونٹ تھا۔ روشنی کے لیے بجلی کے تار لگا دیے گئے تھے۔ اور اس کا کنٹرول خیمے کے اندر ہی تھا۔ اعظم گڈھ میں بجلی کا نظم بہت اچھا نہیں۔ خیمے میں کھڑکیاں یا روشندان جیسی کوئی چیز نہیں تھی اس لیے جب وقت بجلی نہیں ہوتی تھی خیمے کے اندرون میں بھی بلیک آؤٹ ہوتا تھا جب کہ باہر سورج کی روشنی سے نگاہیں خیرہ ہوتی تھیں۔

موسم ابھی سرد تھا کھلے میدان میں خیموں کے اندر سردی غیر متوقع نہ تھی ہلکے پھلکے بستر کانفرنس کی طرف سے بھی مہیا کیے گئے اور کچھ ہم بھی ساتھ لائے تھے۔ یوں گذارے کی صورت نکالی گئی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ جلد بستروں میں گھس کر دراز ہو گئے، جگہ کی معمولی تبدیلی نیند میں خلل کا باعث ہوتی ہے۔ یہاں تو زمین و آسمان بدلے ہوئے تھے۔

نہیں معلوم کب اور کیسے نیند آئی۔ اور آئی بھی یا نہیں۔ رات دیر سے سونے کے باوجود صبح جلد ہی بستر چھوڑ دیا گیا۔ رات تو بسر ہو گئی، مگر کہ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا۔ اب صبح کے مسائل کا چیلنج تھا۔ الانسان عبید العادات۔ ہم ان طریقوں کے عادی نہ تھے۔ بالآخر ورڈس ورتھ کے فلسفہ رجوع الی الفطرۃ کو کام میں لانا پڑا۔ ضروریات سے فراغت کے بعد دارالمصنفین کی مسجد جاکر فجر کی نماز ادا کی۔ تینوں اداروں کے درمیان یہی ایک مسجد ہے۔ اسکول اور کالج کے لوگ بھی نماز کے لیے یہیں آتے ہیں۔ رات ہم نے دور سے اس کا نظارہ کیا تھا۔ اس کا چراغاں جاذب نظر تھا۔ صبح اندر کی حالت سے بھی ہمارے اس خیال کی تائید ہوئی کہ مسجد کو خصوصی توجہ سے نوازا گیا ہے۔ گویا

ع آباد ایک گھر ہے جہان خراب میں

جو لوگ اللہ کے گھر کی آبادی کا خیال رکھتے ہیں اللہ انھیں اپنی رحمت سے نوازتا ہے۔

صبح پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ ہم نہانا چاہتے تھے پر ہمت نہ ہوئی۔ شہر کے بارے میں مجھے پہلے ہی اندازہ تھا۔ مگر پھر بھی حمام کی تلاش میں نکلے جس میں ناکامی ہوئی۔ بالآخر ہاتھ منہ دھونے پر اکتفا کیا گیا۔ صبح سویرے صباح الدین صاحب ہم پاکستانیوں کے استمزاج کے لیے تشریف لائے معذرت اور عفو خواہی سے شرمندہ کیا۔ مجھے تاکید کی کہ ان کی طرف سے پاکستانی مہمانوں کا خیال رکھوں جستجو ہوئی کہ سندھ وہیں میں کہاں کہاں کون کون آیا ہے۔ اتنا وقت نہ تھا کہ ایک ایک خیمے کی تلاشی لی جاتی، صحبت غیر میں گاہے سرراہے گاہے۔ جس سے جہاں ملاقات ہو گئی ہو گئی کسی سے کھانے کی میز پر کسی سے کمرہ انتظار میں کسی سے مسجد میں، کسی سے جلسہ گاہ میں، کسی سے آتے جاتے راستے میں، اس طرح جو مل گیا سو مل گیا۔ جو رہ گیا سو رہ گیا۔ کسی سے ملاقات اور علیک سلیک ہوئی کسی کی شکل دیکھی کسی کا نام سنا۔ باقاعدہ ملنا کسی سے نہ ہوا حتیٰ کہ خود

صباح الدین صاحب کی ملاقات اور دارالمصنفین کی زیارت بھی ایسی ہی رہی جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے۔

بامن آویزش او الفت موج است وکنار دمبدم بامن و ہر لحظہ گریزان از من

ایک خوشگوار حادثہ یہ پیش آیا کہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ ان کے ارتحال کی خبر پاکستان میں ایک نہیں متعدد ذریعوں سے سنی جا چکی تھی۔ اور بعض ذریعے تو ایسے مستند تھے کہ ایمان نہ لاتے تو کافر قرار پاتے یقین کرتے ہی بنی۔ تو ہم پرست یا ضعیف الاعتقاد ہوتے تو انکو دیکھ کر بھاگتے ڈر کر شور مچاتے مل کر خوشی ہوئی۔ شکر ادا کیا کہ خبر غلط نکلی۔ میں نے مولانا کو قصہ سنایا تو ہنسے اور خود ہی اس کی توجیہہ فرمائی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کانفرنس میں قیام کے بعد طعام بھی ایک ایسا مسئلہ ہوتا ہے جس سے دلچسپی ہوتی ہے۔ اور اس کے حسن و قبح سے پوری کانفرنس متاثر ہوتی ہے۔ لذت کام و دہن کا خاطر خواہ انتظام نہ ہو تو سب کئے کرائے پر پانی پھر جاتا ہے معلوم ہوتا ہے منتظمین اس نکتے سے بخوبی آگاہ تھے۔ اعظم گڈھ کی روایات میں ہے کہ جب کہیں بہت عمدہ کھانا کھاتے ہیں تو کہتے ہیں شادی جیسا کھانا تھا۔ کانفرنس میں شروع سے آخر تک اسی قسم کا ناشتا کھانا سرو کیا جاتا رہا۔ صباح الدین صاحب اور علی میاں کے اشتراکِ عمل نے جہاں کانفرنس کو دوسرے پہلوؤں سے کامیاب بنانے میں اہم کردار ادا کیا وہاں اس پہلو کو تشنۂ تکمیل نہ چھوڑا۔ عمدہ سے عمدہ کھانے کھلائے۔ دورانِ سفر دال اور سبزی کھا کھا کے ہم لوگ بور اور بیزار ہو چکے تھے۔ گوشت کی اشیا کے لیے ترس گئے تھے۔ لہٰذا کھانا کیسا بھی ہوتا اس کی پذیرائی ہوتی اور قدر کی جاتی لیکن یہاں روایتی انداز کا اہتمام کر کے جس طرح کھانے تیار کرائے جاتے رہے اہل ذوق نے اس کی داد دی اور میں نے تو یوں محسوس کیا جیسے ایک مدت کے بعد اتنے عمدہ کھانے کھائے ہوں۔ باورچی

لکھنؤ سے لایا گیا تھا۔ اور اس کے انتخاب میں یقیناً علی میاں کی پسند کو دخل رہا ہوگا۔ جو یوں تو درویش صفت انسان ہیں لیکن کھانے کے باب میں ذوق شاہانہ رکھتے ہیں۔ شبلی کالج کے وسیع گراؤنڈ میں چاروں طرف جہاں رہائشی خیمے نصب تھے گراؤنڈ کے بیچ میں کھانے کا انتظام تھا۔ شامیانوں اور قناتوں کی مدد سے دو وسیع اور رفیع ہال تعمیر کیے گیے تھے ایک بیٹھنے کے لیے، دوسرا کھانے کے لیے۔ ڈائنگ ہال میں کھانے کے لیے میز کرسی رکھی گئی تھی، ڈرائنگ روم میں قالین کے فرش پر صوفے اور آرام کرسی کی قطاریں قرینے سے آراستہ تھیں، چھت اتنی بلند تھی کہ اس کو دیکھنے کے لئے ارادہ کو کام میں لانا پڑتا تھا۔ نظر اٹھی تو دیکھا کہ چھت جھاڑ فانوس سے مزین ہے۔ میں نے اسے بطور تائید مزید کے نوٹ کیا کہ سارا ٹھاٹ شادی یا جشن کا ہے۔ اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر منعقد ہونے والے اس سمینار میں شادی یا جشن کا پہلو تلاش کرنا شاید انمل اور بے جوڑ سی بات ہو مگر یہ بات منطقی کم اور ذوقی زیادہ ہے۔

وللناس فیما یعشقون مذاھب

۱۷ فروری کو صبح ساڑھے نو بجے سمینار کے افتتاحی اجلاس کا پروگرام تھا۔ ناشتے سے فارغ ہوکر اجلاس میں شرکت کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ اتنے میں پتہ چلا کہ عرب مہمان جو بنارس میں رک گئے تھے نہیں پہنچے۔ ان میں ایک صاحب صدر بھی تھے، ساڑھے دس بجے کارروائی کا آغاز ہوگیا۔ باہر سے آئے ہوئے مندوبین کو اسٹیج پر جگہ دی گئی۔ کرسی صدارت پر جامعہ قطر میں شعبۂ دینیات کے صدر ڈاکٹر یوسف قرضاوی متمکن ہوئے۔ ان کے دائیں صباح الدین عبدالرحمن صاحب اور بائیں علی میاں رونق افروز رہے۔ ندوہ کے انڈونیشی طالب علم فہمی زمزم نے تلاوت کی۔ تلاوت میں قرآن مجید کے ٹکڑے شامل تھے۔ ایک واعتصموا بحبل اللہ جمیعا

اور دوسرا اَنّ اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ تلاوت کے بعد پیغامات پڑھ کر سنائے گئے۔
شیخ عبدالعزیز آل مبارک، ڈاکٹر عبدالسلام حارس، ڈاکٹر معروف دوالبی کے خطوط جو علی میاں کے نام تھے پڑھے گئے۔ ان خطوط کا اردو ترجمہ بھی پیش کیا گیا۔ ۱۱ بجے مولانا صباح الدین عبدالرحمن نے اردو میں خطبۂ استقبالیہ پڑھ کر سنایا اُس کا عربی ترجمہ اجمل اصلاحی استاذ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے پیش کیا۔ اس کے بعد علی میاں نے اپنا کلمۃ الترحیب اردو میں پیش کیا۔ عرب مندوبین کے لیے اس کا عربی ترجمہ کیا گیا۔ علی میاں نے اپنی تقریر میں کہا مستشرقین کی مساعی کا اعتراف کیا جانا چاہئے۔ اسلامی علوم وفنون کی طباعت واشاعت کے سلسلے میں انھوں نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کا احسان ماننا چاہئے لیکن ہمیں یہ بھی نظر میں رکھنا چاہیے کہ اسلامی علوم کے مطالعہ سے ان کا ایک خاص مقصد تھا۔ اور وہ یہ کہ لوگوں کو اسلام اور اسلامی علوم وفنون سے گھن آئے۔ انھوں نے خوردبین لے کر نقائص اور معائب تلاش کرنے کی دانستہ کوشش کی ہے۔ کسی کام کا حسن وقبح نیت پر موقوف ہوتا ہے۔ مستشرق فضلاء میں سلبی ذہانت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اسلام کی تاریک تصویر پیش کی ہے۔ افسوس کہ ہمارے بہت سے مستشرقین نے سینیٹری انسپکٹر کا کردار ادا کیا ہے۔ ہمیں ان سے شکوہ ہے کہ انھوں نے اپنی صلاحیتوں سے صحیح کام نہیں لیا۔ علم وتحقیق کے صحرا میں وہ یقیناً ہمارے شریکِ سفر ہیں لیکن انھوں نے اسلام کے چمنستان میں چن چن کر کانٹے تلاش کئے۔ تاریخ اسلام، سیرت نبوی اور ہمارے علوم کا انھوں نے نکتہ چیں نگاہ سے مطالعہ کیا، اسلامی تمدن میں انھیں صرف دو باتیں نظر آئیں حرم سرا اور راونٹ۔ امریکن اسکالرز نے اپنے عوام کو مسلمانوں کے بارے میں یہی تصور دیا ہے۔

علی میاں کی تقریر کے بعد پاکستانی مندوبین میں سے حکیم محمد سعید، مولانا عبدالقدوس ہاشمی اور مفتی سیاح الدین کاکاخیل نے مختصراً اظہار خیال کیا۔ مولانا ہاشمی نے اسلامی یونیورسٹی

اسلام آباد کے وائس چانسلر ڈاکٹر بلوچ کی طرف سے پیغام تہنیت بھی پیش کیا۔ ڈربن یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر سلمان ندوی ۵۰ سال کے بعد یہاں آئے تھے۔ انھوں نے اپنے والد بزرگوار مولانا سید سلیمان ندوی کے لگائے ہوئے اس چمن میں آکر پرانی یادیں تازہ کیں۔ انھوں نے اپنی مختصر گفتگو میں کہا کہ دارالمصنفین کی تاسیس کا مقصد ہی مستشرقین کے حملوں کا دفاع تھا، یہ سمینار اب سے بہت پہلے ہونا چاہیے تھا۔ سلمان صاحب نے بھی اردو میں باتیں کیں۔ تھائی لینڈ بنکاک کی جمعیت اسلامی کے مندوب ابراہیم قریشی نے انگریزی میں اپنے احساسات کی ترجمانی کی، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے وائس چانسلر جناب سید حامد، صدر شعبۂ تاریخ پروفیسر خلیق احمد نظامی، شبلی کالج کے سابق پرنسپل شوکت سلطان اور طہران یونیورسٹی کے استاذ ظفر اسحاق انصاری نے پانچ پانچ منٹ میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ ایک بج کر ۴۵ منٹ پر ڈاکٹر یوسف قرضاوی خطبۂ صدارت کے لیے کھڑے ہوئے۔ پندرہ منٹ انھوں نے عربی میں تقریر کی، ٹھیک دو بجے جلسے کے اختتام کا اعلان ہوا۔ تقریباً چار گھنٹے کی نشست کے بعد ہم جلسہ گاہ سے اٹھے اور طعام گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ لذت طعام کی کیفیت ہمیں یاد رہے گی "مکان ظرف اور مظروف ہر شئی لاجواب تھی۔ دارالمصنفین کا مہمان ہونے کا شرف مجھے پہلے بھی بارہا حاصل ہوا ہے، خواندہ کم ناخواندہ زیادہ۔ اور سچ پوچھئے تو میرے لیے دارالمصنفین کے ساتھ خواندہ یا ناخواندہ مہمان ہونے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ مصنف نہ ہونے کے باوجود دارالمصنفین شروع ہی سے ہمارا گھر رہا ہے۔ مدرسۃ الاصلاح کی طالب علمی کے زمانے میں بھی ہم لوگ کبھی کبھی یہاں آدھمکتے تھے۔ اس وقت بھی یاد ہے کہ سفرۂ دارالمصنفین کا روزمرہ کا معمولی کھانا بھی لذیذ ہی ہوتا تھا۔ اس وقت تو صرف کھانے ہی کے حوالے سے دارالمصنفین ہمیں یاد رہ سکتا تھا کہ اس سے آگے کسی بات کا ہمیں شعور ہی نہ تھا۔ اس سے پہلے دو سفروں میں

میں نے مولانا فراہی پر کام کے سلسلے میں اچھا خاصا وقت دارالمصنفین میں گذرا۔ صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے شاید پاکستانی ہونے کے ناطے کچھ زیادہ ہی خیال کیا۔ انواع واقسام کے کھانے کھلا کر شاد کام کیا۔ ایک آدھ رسمی دعوتیں بھی کھانے کو ملیں۔ مارچ ۱۹۸۲ء میں مولانا سعید اکبر آبادی کی آمد کے موقع پر ایک پرتکلف دعوت میں شرکت کا موقع ملا۔ ان یادگار لمحات کی کیفیت بھلائی نہیں جا سکتی۔ مگر اب جس تقریب سے آنا ہوا تھا اسکی بات ہی اور ہے۔ اس نادر موقع کی یاد برسوں تازہ رہے گی۔ یہ موقع ہی ایسا تھا۔ اس میں ایسی کئی باتیں ہیں جو مدتوں یاد رہیں گی۔ ان ہی میں ایک دو پرتکلف کھانے بھی ہیں جو آنکھ کو نور اور دل کو سرور سے معمور کرتے رہے۔

افتتاحی اجلاس کے بعد کی بہت سی کارروائیوں میں میں شریک نہیں ہو سکا۔ خاص کر میرے لیے یہاں صرف یہی ایک مصروفیت نہ تھی۔ کانفرنس کے پروگراموں کے علاوہ مجھے کھینچنے والے ایک دو نہیں وہ بے شمار علائق تھے جو پورے ضلع میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور میں بالکل اس صورت حال سے دوچار تھا۔ جس کا نقشہ غالب نے اپنے شعر میں کھینچا ہے۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر   کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

افتتاحی اجلاس کے بعد ۳ بجے شبلی نیشنل کالج کا معاینہ تھا۔ چار بجے دارالمصنفین کے سبزہ زار میں شبلی اکیڈمی کی طرف سے عصرانہ تھا۔ ۵ بجے شام کتب خانہ دارالمصنفین میں نوادرات کی نمایش تھی۔ افتتاح کے بعد معمول کے اجلاس شبلی کالج کے کانووکیشن ہال میں ہوئے۔ ہال میں بڑی گنجایش تھی۔ اتنا بڑا ہال بڑی بڑی یونیورسیٹوں میں بھی کم ہی نظر آئے گا۔ خاص مندوبین کے بیچ کشادہ میزوں کی طویل قطار کے چاروں طرف نشستیں تھیں۔ اطراف وجوانب میں دیگر شرکاء اور سامعین کے لیے بھی خاص جگہ تھی۔ ہال کے باہر طویل برآمدے میں

اسلام آباد کے وائس چانسلر ڈاکٹر بلوچ کی طرف سے پیغام تہنیت بھی پیش کیا۔ ڈربن یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر سلمان ندوی ۵۲ سال کے بعد یہاں آئے تھے، انھوں نے اپنے والد بزرگوار مولانا سید سلیمان ندوی کے لگائے ہوئے اس چمن میں آکر پرانی یادیں تازہ کیں۔ انھوں نے اپنی مختصر گفتگو میں کہا کہ دارالمصنفین کی تاسیس کا مقصد ہی مستشرقین کے حملوں کا دفاع تھا، یہ سمینار اب سے بہت پہلے ہونا چاہئے تھا۔ سلمان صاحب نے بھی اردو میں باتیں کیں۔ تھائی لینڈ بنکاک کی جمعیت اسلامی کے مندوب ابراہم قریشی نے انگریزی میں اپنے احساسات کی ترجمانی کی، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے وائس چانسر جناب سید حامد، صدر شعبۂ تاریخ پروفیسر خلیق احمد نظامی، شبلی کالج کے سابق پرنسپل شوکت سلطان اور طہران یونیورسٹی کے استاذ ظفر اسحاق انصاری نے پانچ پانچ منٹ میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ ایک بج کر ۴۵ منٹ پر ڈاکٹر یوسف قرضاوی خطبۂ صدارت کے لیے کھڑے ہوئے۔ پندرہ منٹ انھوں نے عربی میں تقریر کی، ٹھیک دو بجے جلسے کے اختتام کا اعلان ہوا۔ تقریباً چار گھنٹے کی نشست کے بعد ہم جلسہ گاہ سے اٹھے اور طعام گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ لذت طعام کی کیفیت ہمیں یاد رہے گی، مکان ظرف اور مظروف ہر شئی لاجواب تھی۔ دارالمصنفین کا مہمان ہونے کا شرف مجھے پہلے بھی بارہا حاصل ہوا ہے، خوانده نہ کم ناخوانده زیاده۔ اور سچ پوچھئے تو میرے لیے دارالمصنفین کے ساتھ خوانده یا ناخوانده مہمان ہونے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے، مصنف نہ ہونے کے باوجود دارالمصنفین شروع ہی سے ہمارا گھر رہا ہے۔ مدرسۃ الاصلاح کی طالب علمی کے زمانے میں بھی ہم لوگ کبھی کبھی یہاں آدھمکتے تھے۔ اس وقت بھی یاد ہے کہ سفرۂ دارالمصنفین کا روزمرہ کا معمولی کھانا بھی لذیذ ہی ہوتا تھا۔ اس وقت تو صرف کھانے ہی کے حوالہ سے دارالمصنفین ہمیں یاد رہ سکتا تھا کہ اس سے آگے کسی بات کا ہم میں شعور ہی نہ تھا۔ اس سے پہلے دو سفر دارالمصنفین

میں مولانا فراہی پر کام کے سلسلے میں اچھا خاصا وقت دارالمصنفین میں گذرا۔ صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے شاید پاکستانی ہونے کے ناطے کچھ زیادہ ہی خیال کیا۔ انواع واقسام کے کھانے کھلا کر شاد کام کیا۔ ایک آدھ رسمی دعوتیں بھی کھانے کو ملیں۔ مارچ ۱۹۸۳ء میں مولانا سعید اکبرآبادی کی آمد کے موقع پر ایک پرتکلف دعوت میں شرکت کا موقع ملا۔ ان یادگار لمحات کی کیفیت بھلائی نہیں جاسکتی۔ مگر اب جس تقریب سے آنا ہوا تھا اسکی بات ہی اور ہے۔ اس نادر موقع کی یاد برسوں تازہ رہے گی۔ یہ موقع ہی ایسا تھا۔ اس میں ایسی کتنی باتیں ہیں جو مدتوں یاد رہیں گی۔ ان ہی میں ایک وہ پرتکلف کھانے بھی ہیں جو آنکھ کو نور اور دل کو سرور سے معمور کرتے رہے۔

افتتاحی اجلاس کے بعد کی بہت سی کارروائیوں میں میں شریک نہیں ہوسکا۔ خاص کر میرے لیے یہاں صرف یہی ایک مصروفیت نہ تھی۔ کانفرنس کے پروگراموں کے علاوہ مجھے کھینچنے والے ایک دو نہیں وہ بے شمار علائق تھے جو پورے ضلع میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور میں بالکل اس صورت حال سے دوچار تھا۔ جس کا نقشہ غالب نے اپنے شعر میں کھینچا ہے۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر   کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

افتتاحی اجلاس کے بعد ۳ بجے شبلی نیشنل کالج کا معاینہ تھا۔ چار بجے دارالمصنفین کے سبزہ زار میں شبلی اکیڈمی کی طرف سے عصرانہ تھا۔ ۵ بجے شام کتب خانہ دارالمصنفین میں نوادرات کی نمایش تھی۔ افتتاح کے بعد معمول کے اجلاس شبلی کالج کے کانووکیشن ہال میں ہوئے۔ ہال میں بڑی گنجایش تھی۔ اتنا بڑا ہال بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں بھی کم ہی نظر آئے گا۔ خاص مندوبین کے لیے کشادہ میزوں کی طویل قطار کے چاروں طرف نشستیں تھیں۔ اطراف وجوانب میں دیگر شرکاء اور سامعین کے لیے بھی خاص جگہ تھی۔ ہال کے باہر طویل برآمدے میں

کرسیاں اور صوفے ڈال دیئے گئے تھے۔ اس پر بھی کھڑے ہونے والوں کی تعداد بیٹھنے والوں سے کم نہ ہوتی تھی۔ اعظم گڈھ کی تاریخ میں غالباً اپنی نوعیت کا یہ پہلا اجتماع تھا۔ ویسے بھی اس دیار کے لوگ اس طرح کے مشاغل میں زیادہ ہی دلچسپی لیتے ہیں۔ دینی جلسے اور مشاعرے یہاں کی زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ مگر اس طرح کی کسی علمی اور دینی کانفرنس اور سیمینار کا انعقاد اس ضلع کے لیے ایک یادگار واقعہ تھا۔ دور دور سے لوگ محض سننے اور دیکھنے کے لیے کثیر تعداد میں آئے تھے۔ اور ان سب کا تعلق شہر یا قصبات سے نہیں اعظم گڈھ کے دیہات سے تھا۔ دور دراز کے گاؤں سے لوگ محض شرکت اور تسکین ذوق کے لیے آئے تھے۔ یہ لوگ دارالمصنفین کے مہمان نہ تھے۔ انھیں قیام و طعام کے مسائل سے دوچار ہونا پڑا ہوگا۔ سیشن کے دوران برقعہ پوش خواتین کی ٹولیاں نظر آئیں۔ اعظم گڈھ میں میرے لیے یہ نئی بات تھی۔ یہاں کے رہنے والے ایک صاحب سے میں نے ذکر کیا تو کہنے لگے۔ جب سے شبلی کالج میں بی اے، ایم اے کی کلاسیں ہونے لگی ہیں لڑکیوں کے لیے آسانی ہو گئی ہے۔ طبقہ اناث میں کثرت سے گریجویٹ اور ماسٹر پیدا ہو رہے ہیں۔ مگر پردے کی پابندی بدستور ہے۔ پھر بھی اتنی تبدیلی یا ترقی تو ہوئی ہے کہ عورتیں مردوں کے جلسے میں آسکتی ہیں۔ مگر دوش بدوش یا شانہ بشانہ نہیں اپنی زنانہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ خانہ بخانہ۔ عورتوں کی جگہ مردوں سے الگ تھی۔ مخلوط سوسائٹی کی لعنت ابھی یہاں نہیں پہنچی ہے۔ معلوم نہیں تعلیمی درسگاہوں میں کیا حال ہے۔ یہاں ہندوؤں میں ہے۔ کانفرنس کی کارروائی قلمبند کرنا میرے دائرۂ کار سے باہر ہے۔ یہ کام جیسا کہ مولانا صباح الدین عبدالرحمن نے اختتامی اجلاس میں اعلان کیا دارالمصنفین خود انجام دے گا۔ اور ظاہر ہے وہ زیادہ شرح و بسط اور استقصاء کے ساتھ یہ کام کرسکیں گے۔ میرا مقصد کانفرنس کے بعض خاص دلچسپی کے امور کا ذکرہ و بیان ہے۔ کانفرنس کی اہم اور نمایاں خصوصیات میں ایک

ـــ قابلِ ذکر خصوصیت پاکستان سے اتنی بڑی تعداد میں اسکالروں کی شرکت تھی۔ سات تو
یں لوگ تھے۔ ہمارے علاوہ کراچی سے حکیم سعید ہمدرد اکیڈمی کے بعض ارکان کے ساتھ شریک
ہے۔ لاہور سے اردو دائرۂ معارف اسلامیہ جامعۂ پنجاب کے نذیر حسین صاحب بھی بعد میں
نچ گئے تھے۔ یوں گویا "تلک عشرۃ کاملۃ" نے پاکستان کی نمایندگی کی۔ ایک سیشن کی صدارت
، پاکستان سے کرائی گئی۔ اور یہ اعزاز حکیم سعید صاحب کو ملا۔ ایک امتیاز پاکستان کو یہ بھی
اصل ہوا کہ پاکستان کے اسکالروں کے لیے ایک سیشن مخصوص کر دیا گیا۔ اور ان سے وقت
، پابندی بھی اٹھالی گئی تھی۔ اس سیشن کی صدارت علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر
امدنے کی۔ مولانا امین احسن اصلاحی اور ڈاکٹر جاوید اقبال کے لیے لوگ شدت سے منتظر تھے ان کی
رکت کی تشہیر ہوئی۔ مگر یہ حضرات شریک نہیں ہوئے۔ جاوید اقبال صاحب کے متعلق نہیں
ہا جاسکتا لیکن مولانا اصلاحی سے ذکر آیا تو انھوں نے بتایا کہ انھیں تو دعوت ہی نہیں ملی یہ الگ
سوال ہے کہ دعوت ملتی تو وہ شریک ہوتے یا نہ ہوتے۔ اس کانفرنس کے طفیل ڈاکٹر سلمان ندوی
خلف الصدق علامہ سید سلیمان ندوی سے ملاقات ہوئی۔ وہ ڈربن یونیورسٹی سے آئے تھے۔ کم و بیش
تیس برس کے بعد ملنا ہوا۔ سندھ یونیورسٹی میں ہمارا ساتھ تھا۔ کسی پرانے ساتھی کا اتنے طویل
وصے کے بعد ملنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اہل نظر سمجھ سکتے ہیں۔ اور ایک شاعر کے نقطۂ نظر سے تو یہ مسیحا
و خضر کی ملاقات سے بھی بہتر ہے۔

اے ذوقؔ کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور اداروں سے جو اصحاب شریک ہوئے انکی فہرست
بہت طویل ہے۔ ان میں خورد و بزرگ اور برابر کی حیثیت کے نجانے کتنے ہی نام ہیں۔ ان کے
ذکر سے اس لیے صرف نظر کرتا ہوں کہ اگر کوئی نام رہ گیا جس کا قوی احتمال ہے تو بجا طور پر

شکایت ہوگی۔

سمینار کے آخری اجلاس میں چھپے ہوئے پروگرام کے مطابق دو اجلاس ہونے تھے۔ ۹ تا ۱ بجے دوپہر، ۳ تا ۴ بجے شام۔ پہلے اجلاس میں حسب معمول مقالات پڑھے گئے اور بحثیں ہوئیں، اختتامی اجلاس جو وقفے کے بغیر جاری رہا تجاویز قرار دادوں، کانفرنس کے نتائج کے جائزہ، شکریہ اور الوداعی کلمات کے لئے وقف رہا۔

اختتام سے پہلے ایک اہم فیصلہ کانفرنس نے یہ کیا کہ یہ سلسلہ جس کی ابتدا دار المصنفین نے کی ہے آئندہ بھی جاری رکھا جائے۔ حکیم محمد سعید نے اگلی کانفرنس پاکستان میں منعقد کرنے کی پیش کش کی۔ ڈاکٹر یوسف قرضاوی نے قطر کا نام تجویز کیا۔ یہ بھی تجویز کیا گیا کہ کانفرنس کو مستقل حیثیت دینے کے لیے اس کا صدر دفتر دار المصنفین میں قائم کر دیا جائے۔ سب سے آخر میں سید صباح الدین عبد الرحمٰن ناظم دار المصنفین شبلی اکیڈمی نے جذبات سے مملو اور پر اثر تقریر کی وفورِ جذبات میں ان کی آنکھوں سے پیمانے چھلک گئے تقریباً ۲ بجے مولانا علی میاں کے دعائیہ کلمات کے ساتھ اسلام اور مستشرقین پر یہ تاریخی سمینار ختم ہوا۔

سمینار کے متعلق عام تاثر یہی تھا کہ بہت کامیاب رہا۔ توقع سے کہیں زیادہ کامیاب، خود دار المصنفین کے لیے بھی اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا کوئی مشکل بات نہ تھی دار المصنفین پہلے بھی اس قسم کے تجربے سے گذر چکا ہے لیکن ندوہ کے تعاون اور اشتراک عمل نے اسے چار چاند لگا دیئے۔ جو بات ہوئی خوب سے خوب تر ہوئی۔ علی میاں کے ذاتی تعلقات اور وسیع تجربات نے سمینار کو کامیاب بنانے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ وہ خود مسلسل شریک و موجود رہے۔ ندوہ کے اساتذہ اور طلبہ کی ایک پوری ٹیم شروع سے آخر تک مصروف کار رہی۔ جو سوجھ بوجھ علمی لیاقت اور انتظامی صلاحیت کے اعتبار سے ہی فائق نہ تھے بلکہ امانت!

ن شناسی اور احساس ذمہ داری کے لحاظ سے بھی نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ آج کے زمانے
، جہاں پہلی جنس عام ہے دوسری جنس کی کمیابی کا کوئی حل نہیں۔ جہاں تک کہ کانفرنس کے ظاہری
مقالات کا تعلق ہے اول درجے کا اور اعلیٰ ہی نہیں اسے مافوق کہنا بھی مبالغہ نہ ہوگا۔ علمی لحاظ
، بھی کانفرنس کا معیار بحیثیت مجموعی بلند تھا۔ مقالات محنت سے اور تیاری کے بعد لکھے گئے تھے
دلی، اردو، انگریزی تینوں زبانوں میں مقالے پڑھے گئے۔ جن مندوبین نے مقالے پڑھے یا تقریریں
یں ان کی تفصیل باعث تطویل ہوگی۔

ان میں ایک کثیر تعداد ان فضلاء کی تھی جو مبصر کی حیثیت سے کانفرنس میں شریک ہوئے انھوں نے مقالہ پڑھا نہ
زیر کی مگر انکی شرکت سے کانفرنس کی رونق دوبالا ہوئی اور افادیت میں اضافہ ہوا۔ انکے وجود میں کانفرنس کو سخن شناس سامعین
، جو اکثر کانفرنسوں کا مقدر نہیں ہوتا، انہیں جہاں ایک معتد بہ تعداد جدید یونیورسٹیوں اور اداروں کے فضلاء
کی تھی۔ وہاں خاصی بڑی تعداد قدیم طرز کے ان عربی مدارس کے تعلیم یافتہ علماء کی تھی جو اعظم گڑھ
اور دوسرے اضلاع میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دیوبندی، ندوی، اصلاحی، فلاحی سبھی تھے، ان کی ظاہری
وضع ایک سادہ مسلمان کی تھی۔ وہ آئے بھی تھے مضافاتی بستیوں سے مگر ان کا علمی ذوق کسی
طور سے مقالہ پڑھنے والوں سے کمتر نہ تھا۔ یہ غیر معروف گمنام اسکالر اعظم گڑھ کے گاؤں گاؤں
بلکہ بقول ہمارے ایک ساتھی احمد خاں کے یہاں کے چپے چپے پر بکھرے ہوئے ہیں۔ ان میں سے
بہتوں کو میں ذاتی طور پر جانتا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر دکھ ہوتا تھا کہ نیرنگی سیاست دوراں نے انھیں
وہ مقام نہ دیا جس کے وہ مستحق تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ علم و فضل کے دربار میں سب سے زیادہ داد
و تحسین کے حقدار وہ ہیں۔ میں ان کو غائبانہ سلام کرتا ہوں۔

ع سلام ما برسانید ہر کجا ہستند

اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر یہ تاریخ کا پہلا سمینار تھا۔ استشراق ایک اسلام

دشمن تحریک ہے جو مدت سے سرگرم عمل ہے مگر اس کے جواب میں دفاعی تحریک بوجوہ شروع نہ ہو سکی۔ اس کانفرنس میں شرکاء کے خیالات و جذبات کو دیکھنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے، کہ اب اس دفاعی تحریک کی داغ بیل پڑ چکی ہے اگر خدا کی تائید و نصرت شامل حال رہی تو یہ تحریک استشراق کا موثر جواب ثابت ہوگی۔ اسلام اور مستشرقین کے اس سمینار میں کوئی مستشرق شریک نہیں ہوا۔ جہاں یہ امر بہتوں کے لیے موجب حیرت ہوگا۔ میرے نزدیک یہی اس تحریک کے کھرا ہونے کی ضمانت ہے۔ مسلمانوں کی بہت سی تحریکیں اپنے انجام اتمام تک پہنچنے سے اس لیے قاصر رہ جاتی ہیں کہ یا تو ان کے شروع کرنے والے ہی غلط لوگ ہوتے ہیں یا بعد میں وہ غلط ہاتھوں میں چلی جاتی ہیں جن کا مقصد ہی اس تحریک کو کامیاب نہیں ناکام بنانا ہوتا ہے۔ سمینار میں مسائل پر بحث و نظر کا سلسلہ بھی ساتھ چلتا رہا۔ مخالف و موافق ہر طرح کے خیالات آزادی کے ساتھ پیش کئے جاتے رہے کہ علمی مجالس کا دستور یہی ہے۔ مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی کو بھی سمینار کے اصل اغراض و مقاصد سے اختلاف تھا۔ اس موضوع پر یہ پہلا سمینار تھا۔ آئندہ جو سمینار ہوں گے وہ یقیناً اس سے بہتر ہوں گے۔ نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول۔

اس جگہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مستشرقین اور اسلام کے موضوع پر آواز راولپنڈی میں شام ہمدرد کے ایک اجتماع میں مولانا ہاشمی نے اٹھائی تھی۔ پھر یہ تقریر ادارۂ تحقیقات اسلامی کے اردو رسالہ فکر و نظر میں شائع ہوئی۔ رسالہ معارف دار المصنفین اعظم گڈھ نے بھی شائع کیا۔ دوسری زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ اور تقریباً چالیس رسائل نے اسے شائع کیا۔ بالکل اسی عنوان اور اسی موضوع پر دار المصنفین میں یہ بین الاقوامی سمینار منعقد ہوا تھا۔

اختتامی اجلاس سے فارغ ہو کر دارالمصنفین کی کانفرنس کا ولیمہ کھایا گیا۔ ولیمہ کسی کی شادی کا ہوتا ہے۔ آغاز کلام ہی میں جہاں میں نے کانفرنس کے انتظامات کا ذکر کیا ہے اپنے اس تاثر کو ظاہر کر دیا ہے۔ کہ سب ٹھاٹ شادی کا نظر آیا۔ دوپہر کے کھانے سے میرے اس تاثر کو تقویت ہوئی۔ کھانا اس طرح پر تکلف تھا جس طرح شادی کا آخری کھانا پر تکلف ہوتا ہے۔ اس کانفرنس کی ایک ایک ادا سے بھی ظاہر ہوتا تھا جیسے کوئی چاہنے والا باپ اپنے لڑکے یا لڑکی کی شادی میں اپنے دل کے تمام ارمان پورے کرنے پر کمربستہ ہو۔ تین دن پلک جھپکتے گزر گئے۔ ہر روز روز عید، ہر شب شب برات ہو تو وقت کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔

۲۔ جناب شیخ نذیر حسین مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ لاہور

ہندوستان کے بعض علمی و دینی اداروں خصوصاً دارالمصنفین اعظم گڈھ اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کو دیکھنے کی ایک مدت سے آرزو تھی، الحمد للہ کہ دارالمصنفین کے ایک سمینار نے یہ آرزو پوری کر دی، جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے جنوری ۸۲ء کے اوائل میں مجھے دعوت دی کہ میں دارالمصنفین اعظم گڈھ کے زیر انتظام ایک سمینار میں شرکت کروں جو کہ "اسلام اور مستشرقین" کے موضوع پر ۲۱/۲۲/۲۳/ فروری ۸۲ء کو منعقد ہو رہا ہے۔ پاسپورٹ اور ویزا کے حصول اور دوسرے موانع و مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے بعد راقم السطور ۲۰ فروری کو اعظم گڈھ پہنچ گیا۔ اعظم گڈھ بنارس سے ستر اسی میل دور مشرقی یوپی کے آخری کونے پر واقع ہے۔ اعظم گڈھ کے نواحی قصبات ہمیشہ سے علوم دینیہ کے مرکز رہے ہیں۔ اور ان کی خاک سے علما اور صلحا اٹھے ہیں، میری آمد سے دو روز قبل پاکستان سے جناب حکیم محمد سعید (ہمدرد دواخانہ) طبی مشیر صدر پاکستان، ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا ڈائریکٹر ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد اور ان کے چار رفقاء اور مفتی سیاح الدین کاکا خیل (فیصل آباد) اعظم گڈھ پہونچ چکے تھے، مہمانوں کے لیے

علیٰحدہ علیٰحدہ خیموں کا بہت اچھا انتظام تھا۔

شب بسری کے بعد نماز فجر سے فارغ ہوتے ہی مجھے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ) کی قیام گاہ کی تلاش ہوئی، پتہ چلا کہ موصوف دارالمصنفین کے مہمان خانہ میں مقیم ہیں۔ ملاقات پر مولانا موصوف نے حسب معمول محبت و گرم جوشی کا اظہار فرمایا۔ حاضرین مجلس سے میرا تعارف کرایا اور فرمایا کہ اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی ترتیب و تدوین جیسا عظیم الشان علمی کام نہ تو مصر میں ہو رہا ہے۔ اور نہ شام میں۔ انسائیکلوپیڈیا کی پیش رفت کے بارے میں بھی سوالات کرتے رہے آخر میں مجھے لکھنؤ آنے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ایک دو روز قیام کرنے کی نہایت محبت سے دعوت دی، اس کے بعد میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدیر برہان (دہلی) کی خدمت میں حاضر ہوا، مولانا نے میرا تعارف مہمانان کرام مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی (ندوۃ المصنفین دہلی) قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی اور قاضی سجاد حسین (صدر مدرس مدرسۂ عربیہ فتح پوری دہلی و مترجم مثنوی مولانا روم) سے کرایا، قاضی زین العابدین آج سے ۴۵، ۴۶ برس قبل مولانا تاجور کے ساتھ رسالہ ادبی دنیا میں بطور مدیر معاون کام کرتے رہے ہیں، قاضی زین العابدین کے بیٹے زین الساجدین مسلم یونیورسٹی میں دینیات کے لکچرر ہیں۔ اور نہایت سعادت مند اور خدمت گزار نوجوان ہیں۔ مجھے پروفیسر خلیق احمد نظامی (علی گڑھ) مصنف مشائخ چشت سے بھی ملنے کا شوق تھا جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب مجھے ان کے پاس لے گئے، خلیق صاحب نہایت محبت و تپاک سے ملے اور فرمایا کہ انھوں نے مشائخِ چشت کا تذکرہ سات جلدوں میں لکھا ہے ان میں سے ایک جلد شائع ہو چکا ہے۔ دوسری زیر طبع ہے۔ اور باقی بھی وقفہ وقفہ سے شائع ہوتی رہیں گی۔ جناب خواجہ احمد فاروقی صاحب صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے اپنا تعارف خود کرایا، فاروقی صاحب اردو کے مشہور ادیب

ونقاد ہیں۔ مگر میرے نزدیک وہ نہایت غیرت مند اور دردمند مسلمان بھی ہیں۔ مولانا عمران خان ندوی (بھوپال) سے بھی پرلطف ملاقات ہوئی۔ مولانا ابواللیث اصلاحی (امیر جماعت اسلامی ہند) کے بھی نیاز حاصل ہوئے۔

سیمینار | سیمینار کا افتتاح ۱۲/ فروری کو ہوا۔ افتتاحی تقریروں کے بعد مولانا شبلی اور اور مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف کے مسودوں اور قلمی کتابوں کی نمائش ہوئی۔ جو قابل دید تھی۔ دوسرے دن پاکستانی فضلاء نے مقالے پیش کیے۔ افسوس کہ راقم الحروف دیر سے پہونچنے کی وجہ سے ان اجلاسوں میں شرکت سے محروم رہا۔ تیسرے دن سمینار نو بجے صبح ہوا۔ اس نشست کے صدر ڈاکٹر سید سلمان ندوی تھے۔ جو مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم ومغفور کے فرزند ارجمند اور ڈربن یونی ورسٹی (افریقہ) میں شعبۂ اسلامیات کے صدر ہیں، مقالات چوں کہ زیادہ تھے۔ لہذا ہر مقالہ نگار کو پانچ پانچ منٹ تقریر کے لیے دیے گئے۔ ان مقالات میں ڈاکٹر اوصاف علی (ہمدرد فاونڈیشن دہلی) کا مقالہ معاصر مستشرقین پر تھا اور خاصا معلومات افزا تھا۔ دوسرا اہم مقالہ خواجہ احمد فاروقی کا تھا جس میں اُن ہندی علماء کا ذکر خیر تھا، جنھوں نے عیسائی مشنریوں کے مقابلہ میں اسلام کا دفاع کیا۔ اس کے بعد مشہور مصری فاضل اور مفکر جناب یوسف القرضاوی نے فصیح وبلیغ عربی میں تقریر کی۔ ان کی تقریر میں آبشار کا زور تھا۔ تقریر کا ماحصل یہ تھا کہ صحیح اسلام وہی ہے جو قرآن وسنت سے ماخوذ ہے۔ اور جس پر صحابۂ کرام نے عمل کرکے دکھایا۔ افسوس کہ راقم الحروف کا مقالہ بعنوان "مستشرقین اور علوم اسلامیہ" سمینار کے اختتام کے بعد دوسرے دن پہونچا، اب یہ مقالہ مجموعۂ مقالات میں شامل ہوگا۔ آخر میں مولانا سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب ناظم دارالمصنفین نے سب مہمانوں خصوصاً راقم السطور، اور جناب عبدالرحمن صاحب کوندو کا گلوگیر آواز میں شکریہ ادا کیا،

جب [illegible] اور مشکلات کے باوجود لاہور اور سری نگر سے آکر شریک ہوئے تھے۔

اس سیمینار کے ذکر میں مولوی سید سلمان حسنی ندوی کا بھی ذکر ضروری ہے۔ جو اردو اور انگریزی تقریروں کا عربی میں اور عربی تقریروں کا اردو میں خلاصہ بیان کر رہے تھے، یہ سیمینار ہر طرح سے کامیاب رہا، سیمینار کو کامیاب بنانے اور مہمانوں کو راحت و احترام پہنچانے کے لیے جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب، ان کے رفقاء اور شبلی نیشنل کالج کے طلبہ نے بڑی محنت کی جس کے تمام لوگ معترف تھے۔ شام کو بیشتر مہمان رخصت ہو گئے۔ اور راقم السطور مولانا سعید احمد اکبر آبادی اور جناب عبدالرحمٰن کوندو صاحب خیموں سے اٹھ کر دارالمصنفین کے مہمان خانہ میں آگئے جہاں ہر طرح کی سہولت اور آرام میسر تھا۔ عبدالرحمٰن کوندو صاحب سری نگر کی ذی علم شخصیت ہیں، انھوں نے مولانا انور شاہ مرحوم کے حالات میں حیات انور لکھی ہے۔ جس کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

دارالمصنفین دارالمصنفین یا شبلی اکاڈمی مولانا شبلی مرحوم و مغفور کے علمی خوابوں کی تعبیر ہے۔ اسکی تعمیر و ترقی میں مولانا سید سلیمان ندوی کی علمی خدمات اور مولانا مسعود علی ندوی مرحوم کی انتظامی صلاحیتوں کو بڑا دخل ہے۔ سیرۃ النبیؐ کی تالیف و اشاعت کے سلسلہ میں یہ ادارہ ملک گیر شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اور سیرت کے علاوہ گزشتہ چھیاسٹھ برسوں میں مختلف علمی و دینی موضوعات پر تقریباً دوسو دس (۲۱۰) کتابیں شائع کر چکا ہے۔ دارالمصنفین شہر اعظم گڈھ سے ایک میل باہر ایک پُر فضا باغ میں واقع ہے، جس کا رقبہ پنجاب یونیورسٹی کے اولڈ کیمپس کے برابر ہے۔ دفتر، کتب خانے، پریس اور مہمان خانے کی عمارتیں پختہ اور شاندار ہیں رفقاء کے لیے بھی آرام دہ مکانات ہیں۔ ان سب عمارتوں میں دارالمصنفین کی چھوٹی مگر خوب صورت اور نازک سی مسجد جاذبِ توجہ ہے۔ جو نواب مزمل اللہ خاں (علی گڑھ) کی فیاضی اور مولانا مسعود علی ندوی

کے عمارتی ذوق کی مظہر ہے۔ مسجد کے صدر دروازہ سے کچھ فاصلہ پر مولانا شبلیؒ اور ان کے بیٹے حامد نعمانی کی قبریں ہیں جو کچی ہیں۔ ایک کونے میں مولانا عبدالسلام ندویؒ اور مولانا مسعود علی ندویؒ سابق منیجر دارالمصنفین محو خوابِ ابدی ہیں۔ اب دارالمصنفین کے ناظم یا روحِ رواں مولانا سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ہیں جو اردو کے صاحبِ طرز انشاپرداز، فارسی زبان کے ادیب و محقق اور تاریخ اسلام کے صاحبِ بصیرت عالم ہیں، موصوف سراپا شفقت و محبت اور پیکر مروت و شرافت ہیں۔ دوسری علمی شخصیت مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی ہیں۔ موصوف تواضع و انکسار کا نمونہ ہیں، اصلاحی صاحب کی تذکرۃ المحدثین کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں تیسری جلد طباعت کے مرحلہ میں ہے۔

دوسرے دن ناشتہ کے بعد ہم محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی سے ملنے مؤ گئے۔ شام کے چھ بجے ہم واپس دارالمصنفین پہونچ گئے۔ رات مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ہمارے کمرہ میں تشریف لائے اور دیر تک دارالمصنفین کے آئندہ اشاعتی پروگرام کے بارہ میں گفتگو کرتے رہے۔ میں نے عرض کیا کہ اب اسلام کی اقتصادیات، اسلام کی معاشیات اور اسلام کے نظام حکومت پر کتابوں کی ترتیب و تدوین کی زیادہ ضرورت ہے، اسکے علاوہ عالم اسلام کی اہم ترین ضرورت فقہ اسلامی کی تدوین جدید ہے، مولانا نے میری گزارشات کو بڑے غور سے سنا۔

دارالمصنفین کی ادبی خدمات

دارالمصنفین کی ادبی خدمات پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا ایک پرمغز مقالہ جس کو کتابی شکل میں لانے کے بعد، فاضل مصنف نے اپنے مربی مولانا شاہ معین الدین ندوی کے نام معنون کیا ہے، از ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولوی۔ قیمت۔ ۲۰ روپیے۔

مطبوعات جدیدہ

رسالوں کے خاص نمبر

جامعہ مولانا محمد اسلم جیراجپوری نمبر — مرتبہ جناب ضیاء الحسن فاروقی و عبداللطیف اعظمی صاحبان، سائز ۲۰×۲۶ کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۱۸۴، قیمت چھ روپیہ پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی۔

مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری مرحوم جامعہ کی ابتدا و تاسیس ہی سے اس کے علمی و تعلیمی کاموں میں شریک تھے۔ انھوں نے "مجلس ملی" کے دوسرے ارکان کی طرح تنگی و ترشی کے ساتھ ہر حال میں اس کی خدمت کرتے رہنے کا عہد کیا تھا۔ وہ عرصہ تک جامعہ ملیہ کے آرگن ماہنامہ "جامعہ" کے اڈیٹر بھی رہے۔ علاوہ ازیں وہ اردو کے مشہور مصنف تھے، اسلامی علوم اور فارسی زبان و ادب پر انکی نظر وسیع تھی، ان کی وفات کو مدت ہوئی مگر ابھی تک ان پر کوئی کام نہ ہوا تھا۔ اس لیے جامعہ کے موجودہ مرتبین نے انکی یادگار میں یہ خاص نمبر شائع کیا ہے۔ اس کی ابتدا خود مولانا ہی کے ایک مضمون "میری طالب علمی" سے کی گئی ہے، اس کی حیثیت خود نوشت حالات کی ہے، اس میں انھوں نے اپنی ابتدائی نیز تعلیمی و تصنیفی زندگی، خاندانی حالات، ملازمت، اساتذہ، رفقا اور اپنے والد ماجد مولانا سلامت اللہ جیراجپوری کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کے ریاست بھوپال سے تعلق اور نواب صدیق حسن خان اور ان کے بعد کے دور کے وہاں کے دینی و علمی ماحول اور متعدد حنفی و اہلحدیث علماء کا ذکر بھی آگیا ہے جس سے بہت مفید اور دلچسپ معلومات حاصل ہوتے ہیں۔ ان کے صاحبزادہ ڈاکٹر محمد معظم کا مضمون بھی قابل ذکر ہے وہ ایک اچھے اور کامیاب ڈاکٹر ہیں

لیا نھوں نے اپنے کو اہل قلم کے زمرہ میں شامل کر لیا ہے۔ اس سے مولانا کی زندگی کے بعض ایسے
آگئے ہیں جن کو وہی لکھ سکتے تھے۔ چودھری غلام احمد پرویز مولانا کے خاص تربیت یافتہ اور
ان کی نشیب و فراز سے واقف تھے۔ ان کے مضمون "مرد درویش" میں مولانا کی سادگی، قناعت
ن کے علمی تبحر، ذہانت، نکتہ سنجی اور قرآن مجید سے شغف وغیرہ کا حال بھی تحریر کیا ہے
ید انصاری کو بھی ان سے براہ راست واقفیت رہی۔ انھوں نے جامعہ سے انکی وابستگی،
ر تعلیم کے بارہ میں ان کے خیالات اور مجتہدانہ بصیرت کا ذکر کیا ہے، اس ضمن میں یتیم پوتے
ثت کے سلسلہ میں ان کے نقطۂ نظر کی تحسین کی ہے۔ حالانکہ ان کی یہ رائے جمہور امت
ہے۔ جناب عبداللطیف اعظمی کا مضمون "مولانا اسلم کی اقبال شناسی" دلچسپی سے پڑھا جائیگا، اسمیں
انکے تعلقات کا ذکر ہے، اس ضمن میں دونوں کی باہمی خط و کتابت اور اقبال کی کتابوں پر انکے تبصرے
ہیں، اس سے انکی ادبی خوش مذاقی اور تصوف کے بارہ میں انکی مبصرانہ نظر اور متوازن رائے بھی معلوم
ور اقبال کی نگاہ میں انکی اہمیت کا پتہ بھی چلتا ہے۔ انھوں نے ایک مضمون میں مولانا کی کتابوں
ببلیوگرافی اور دوسرے میں انکی زندگی کی اہم تاریخیں دی ہیں، پروفیسر مشیر الحق نے مولانا کی مشہور کتاب
قرآن کا جائزہ بلکہ خصوصیت سے دیتی۔ قرآن میں نسخ اور اسکی جمع و ترتیب کے متعلق ان کے
اضح کیے ہیں۔ ڈاکٹر اطہر پرویز نے بچوں کے ساتھ ان کے شفقت آمیز برتاؤ کا آنکھوں دیکھا حال
ہے اور ڈاکٹر شعیب اعظمی نے انکی فارسی زبان و ادب میں مہارت دکھائی ہے۔ ان سے تربیت
وں میں پروفیسر محمد مجیب، مولانا عبدالسلام قدوائی، رئیس احمد جعفری اور معین الدین حارث کی
بھی اس نمبر کی زینت ہیں جن سے انکی سیرت و شخصیت کے خط و خال نمایاں ہوتے ہیں، شروع میں جامعہ کے
جناب ضیاء الحسن فاروقی نے انکی شخصیت پر بڑی خوش مذاقی سے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور
اطہر پرویز نے لکھا ہے کہ مولانا اسلم نے علم و تدبر کو اپنا پیشوا بنایا تھا اور اس بات کو وہ پسند کرتے تھے کہ انکی

تقلید بھی بے سوچے سمجھے نہ کی جائے، انکی علمی زندگی کا یہی طرۂ امتیاز تھا اور یہی پیغام وہ ہمیں دے گئے ہیں"۔ یہ نمبر مولانا کی سیرت و شخصیت اور انکی علمی، ادبی اور دینی خدمات کو سمجھنے کیلئے بہت مفید ہے مگر افسوس ہے ان پر کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی، مگر اس نمبر میں مولانا کی قرآنی خدمات پر سیر حاصل بحث رہ گئی ہے، نیز انکے بعض تفردات خصوصاً احادیث اور بعض تفسیری مسائل سے اہل علم کے بڑے طبقہ کو جو اختلاف تھا اس پر بھی مبسوط گفتگو کی ضرورت تھی۔

نیا دور منشی نولکشور نمبر ۱۔ مرتبہ جناب امیر احمد صدیقی و شاہ نواز قریشی صاحبان، سائز لمبا، کاغذ معمولی کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۳۶ قیمت ایک روپیہ، پتہ محکمۂ اطلاعات و رابطہ عامہ اتر پردیش۔

اردو کے ہندو محسنین میں آنجہانی منشی نولکشور کا نام سر فہرست ہے، ان کے مطبع کی ملک کے کئی بڑے شہروں میں شاخیں تھیں اور اسکی بدولت اردو اور ہندی ہی نہیں فارسی و عربی کی بھی بیشمار نادر و نایاب کتابیں شائع ہوئیں جسکی وجہ سے اسلامی علوم و فنون کا بیش قیمت ذخیرہ دستبرد حوادث سے محفوظ رہا، اتر پردیش کی حکومت کا رسالہ ماہنامہ نیا دور کو معیاری، بلند پایہ اور ضخیم نمبروں کی اشاعت کیلئے نیک نامی اور بڑی شہرت حاصل ہے، جشنۂ میں اس نے اردو کے اس محسن اور اسلامی علوم کے خدمت گزار کی قدردانی کی غرض سے یہ خاص نمبر شائع کیا ہے جو منشی جی کی سیرت، شخصیت و کمالات اور ان کے مطبع کی شاندار خدمات پر مضامین و منظومات پر مشتمل ہے، مضمون نگاروں میں ڈاکٹر نور الحسن، ڈاکٹر اکبر حیدری، ڈاکٹر انوار الحسن، ڈاکٹر امیر حسن عابدی، ڈاکٹر عبد الاحد خلیل، امیر حسن نورانی، جناب امین سلونوی، مرزا جعفر حسین، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، کنور مہندر سنگھ بیدی، حکیم عبد القوی دریابادی، ضیاء الدین اصلاحی، ڈاکٹر حنیف نقوی، ڈاکٹر نیر مسعود، مولوی شمس تبریز خان، ڈاکٹر رنجیت کمار بھارگو وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، مضامین میں منشی جی کے حالات و سوانح طباعت و اشاعت میں انکے غیر معمولی اہتمام اور مطبع کی عظیم الشان خدمات نیز منشی جی کے جاری کردہ اودھ اخبار وغیرہ کے بارہ میں بھی بڑے معلومات اکٹھا کیے گئے ہیں، بعض مضامین میں منشی جی کے ہم عصر معاصرین سے انکے تعلقات کا ذکر بھی ہے، منظومات کا حصہ بھی معیاری ہے، علم و فن کے اس خادم پر یہ نمبر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔

"ع، پ"

مولانا سید سلیمان ندوی کی چند کتابوں کے جدید ایڈیشن

نقوشِ سلیمانی

سید صاحب کے ہندوستانی، اردو زبان و ادب سے متعلق مختلف ادبی کانفرنسوں کے خطبۂ صدارت اور دوسری تقریروں، تحریروں، تبصروں اور مقدموں کا مجموعہ، جن کا انتخاب خود فاضل مصنف نے اپنی زندگی میں کیا تھا، اور نہایت اہتمام سے معارف پریس میں چھپوایا تھا، وہ اردو کو ہندوستان کی نسبت سے ہندوستانی کا نام دیکر ملک کی مشترکہ زبان بنانا چاہتے تھے، افسوس کہ ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، اور ہندی ملک کی سرکاری زبان قرار پاگئی، طبع دوم عکسی،

قیمت:- ۲۵ روپے،

خیام

خیام کو فارسی کے ایک باکمال رُباعی گو شاعر کی حیثیت سے عالمی شہرت حاصل ہے، اور اس کی رباعیات کا یورپ اور ایشیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو گیا ہے، لیکن اس کے علاوہ وہ بھی بہت کچھ تھا، وہ فلسفی تھا، منجم تھا، ریاضی داں تھا، ہیئت داں تھا، اور حکیم و طبیب تھا، اس کی طرف شعر العجم میں خیام کے تذکرہ میں مولانا شبلیؒ نے بھی اشارہ کیا ہے، اس کتاب میں پہلی بار اس کے سوانح و حالات کے ساتھ اس کی ان ہی حیثیات پر بہت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، آخر میں اس کے چند نایاب فارسی و عربی کے فلسفیانہ رسائل اور اس کی مستند رباعیات شامل کر دی گئی ہیں، طبع دوم عکسی، قیمت: ۲۵ روپے،

عرب و ہند کے تعلقات

سید صاحب نے عرب و ہند کے تعلقات پر ہندوستانی اکاڈمی الٰہ آباد میں چند خطبے دیے تھے، ان کا مجموعہ، طبع دوم عکسی، قیمت ۳۰ روپے

منیجر

[illegible]

[illegible] سلسلہ [illegible] جس میں [illegible]

[illegible] علمی ذوق [illegible]

[illegible] علمی ذوق [illegible] مشاہیر [illegible]

[illegible] کی مدد سے ان [illegible] علمی ذوق اور [illegible] تصنیفات [illegible]

اور دلپذیر [illegible]

[illegible] کے سامنے آتا ہے۔ پہلی جلد میں

بابر [illegible] اکبر کے علمی ذوق [illegible] کے دربار کے امراء، شعراء اور

فضلاء کے تذکرے کے ساتھ ان کے علمی کمالات [illegible] پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسری جلد [illegible]

[illegible]

[illegible] تیسری جلد [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

جلد ۱۳۰ ماہ دسمبر ۱۹۸۲ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمٰن

قیمت بیس ۲۰ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

جلد ۱۳۰ ماہ صفر المظفر ۱۴۰۳ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۸۲ء عدد ۶

مضامین

شذرات

۱۱ر نومبر ۱۹۸۲ء کو دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ اس مرتبہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی صدارت میں ہوا،

اس میں کرنل بشیر حسین زیدی (دہلی) جناب اطہر حسین آئی۔اے۔ایس (لکھنؤ) جناب ضیاء الحسن فاروقی (دہلی) جناب سید شہاب الدین دسنوی (دہلی) افضل العلماء مولانا حافظ محمد یوسف کوکن (مدراس) اور مولانا محمد رابع ندوی (لکھنؤ) شریک ہوئے ۱۹۸۳ء کا بجٹ منظور ہوا، مختلف تجویزوں میں یہ یاد زور اس پر دیا گیا کہ فروری ۱۹۸۲ء میں دارالمصنفین کے بین الاقوامی سمینار میں جو تجویزیں منظور ہوئی ہیں ان کو عمل میں لانے کی کیا صورتیں اختیار کی جائیں، ان تجویزوں کا ذکر معارف کے صفحات میں آچکا ہے، ناظرین کو پھر یاد دلا دیا جائے۔ ان تجویزوں میں ایک اہم تجویز یہ ہے کہ اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر جو لٹریچر موجود ہے، اور آئندہ بھی جو لٹریچر سامنے آئے، اس کا علمی مطالعہ اور تجزیہ کیا جائے، اور علمی و معیاری بنیاد پر مستشرقین کی غلطیوں کو واشگاف کرنے کے لئے ایک واضح تصنیفی و تالیفی پروگرام مرتب کیا جائے، اسلام، تاریخ اسلام، سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور تاریخ اسلام کی اہم شخصیتوں، اور ان کے فکری، علمی اور ادبی کارناموں سے متعلق اسکول سے لیکر یونیورسٹیوں کی سطح کے طلبہ کے لئے جدید مذاق کے مطابق ایسی کتابیں تیار کرائی جائیں، جو ان کے تعلیمی نصاب کا حصہ بن سکیں، اور جن سے تعلیم و تدریس کی ہر سطح پر بچوں اور نوجوانوں کے ذہن کی تربیت کا کام لیا جا سکے،

یہ تجویز بھی منظور ہوئی تھی کہ اسلامی موضوعات پر حوالہ جات کی معیاری کتابیں تیار کی جائیں، اسلام سے متعلق علم و تحقیق کے جو ادارے پہلے سے موجود ہیں، ان کی علمی و تحقیقی سرگرمیوں سے واقفیت

حاصل کی جائے، اور ان کے یہاں جو کام ہو رہا ہے اسے موجودہ علمی تحقیقی معیار کے مطابق مفید تر بنانے کی کوشش کی جائے، تصنیف وتالیف کے اس تمام کام کا علمی معیار اور تعلیمی مرتبہ دنیا کے موجودہ معیار تحقیق اور جدید اصولِ تعلیم کے مطابق ہو تاکہ ان کتابوں کا مطالعہ مسلم اور غیر مسلم سب ہی لوگ دلچسپی سے کریں اور مستشرقین کی کتابوں سے مستغنی ہو سکیں، دارالمصنفین نے اسلامی موضوعات پر جو گراں قدر مطبوعات پیش کی ہیں ان کو عربی زبان اور آج کی زندہ یورپین زبانوں خصوصاً انگریزی میں منتقل کیا جائے تاکہ ان سے بڑے معیار پر استفادہ کیا جا سکے۔

اس طویل المدت کام کو انجام دینے کے لئے ایک مشاورتی مجلس کی تشکیل بھی کی گئی تھی جس کے ارکین ہندوستان کے علاوہ سعودی عرب، پاکستان، ایران، انگلستان، انڈونیشیا، مراکش، ملیشیا اور جنوبی افریقہ کے ہیں، ضرورت اس کی ہے کہ ان اراکین کا اجتماع کہیں ایک بار ہو جائے تاکہ مذکورہ بالا تجویزوں کو عمل میں لانے کی تدابیر پر غور کیا جا سکے، ان کو کسی ایک جگہ جمع کرنے میں کافی اخراجات کی ضرورت ہوگی، اس لئے سردست ان سے خط وکتابت جاری ہے مگر بعض اراکین کے یہاں سے جوابات موصول نہیں ہو رہے ہیں، شاید صحیح پتہ کے نہ ہونے کی وجہ سے ان کو خطوط نہ مل رہے ہوں، لندن کے پندرہ روزہ اخبار امپیکٹ میں ان کے اسمائے گرامی شائع کئے جا رہے ہیں کہ وہ اپنے صحیح پتوں سے مطلع کر کے اس کام کو آگے بڑھانے میں مدد دیں۔

سردست ہم کو دو ایسے اچھے اہل قلم کی ضرورت ہے جو انگریزی اور عربی میں اچھی صلاحیت رکھتے ہوں، وہ اچھی انگریزی اور عربی میں خط وکتابت کرنے کے علاوہ اسلام اور مستشرقین کے سلسلہ میں تصنیف اور ترجمہ کا کام بھی کر سکیں، اس کار خیر میں مدد دینے کے لئے جو اہل علم تیار ہوں وہ راقم کو مطلع کریں، ان کی خدمات بالمعاوضہ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

علامہ شبلی نعمانیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ نے مستشرقین پر جو کچھ لکھا ہے، وہ دو جلدوں

میں جمع کر دیا گیا ہے، ان کی کتابت و طباعت کا سامان کیا جا رہا ہے، سیمینار میں عربی اور اردو میں جو مضامین پڑھے گئے تھے، ان کی طباعت بھی جلد ہو جائے گی، اس سیمینار سے جو جذباتی اور علمی فضا قائم ہو گئی ہے، اس کو ہر حال میں باقی رکھنے کی ضرورت ہے،

راقم نے علامہ شبلی نعمانیؒ کی مشہور کتاب اورنگزیب عالمگیر کا انگریزی ترجمہ کیا ہے اور انگریزی میں ایک کتاب امیر خسرو اینا سے جینیس (AMIR KHUSRAU AS A GENIUS) کے عنوان سے لکھی ہے، یہ دونوں کتابیں ادارۂ ادبیات دلی، ۲۰۰۹ قاسم جان اسٹریٹ دلی سے بہت ہی دیدہ زیب طباعت کے ساتھ شائع ہوئی ہیں، پہلی کتاب کی قیمت بیس روپیہ اور دوسری کی پچاس روپیہ ہے، ادارۂ ادبیات دہلی یا دار المصنفین سے منگائی جا سکتی ہیں،

جناب سید اطہر حسین صاحب آئی۔ اے۔ ایس نے استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کی مقبول کتاب سیرۃ عائشہؓ کا ترجمہ بہت ہی سلیس اور رواں انگریزی میں کیا ہے، یہ اسلامک بک پبلشرز پوسٹ بکس ۲۰۰، صفحات، کویت سے شائع ہوئی ہے، اس کے نسخے دار المصنفین کے دار الاشاعت سے بھی مل سکتے ہیں،

۳ دسمبر سے ۹ دسمبر تک انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز تغلق آباد نئی دہلی میں قرآن مجید پر دوسری بین الاقوامی کانگریس ہو رہی ہے، اس تحریر کے لکھتے وقت خبریں ملی ہیں کہ اس میں بیرونی ممالک سے کثیر تعداد میں مندوبین شریک ہو رہے ہیں، دعا ہے کہ اس اجتماع میں نزول قرآن کا جو اصلی مقصد ہے، وہ حاصل ہو، اس کے مذاکرہ میں یہ اچھی طرح واضح کر دیا جائے کہ یہ ام الکتاب ہے، اس میں انسانیت کو سنوارنے کے لئے آخری پیام الٰہی ہے جس میں ابدیت ہے اور اس شخص سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو باطل کے ہتھیار سے اس حق کو نیچا دکھانے کی کوشش کرے اور جب اس کے رب کی آیات سنا کر نصیحت کی جائے اور وہ ان سے منہ پھیر لے،

••••••<>••••••

مقالات

مستشرقین اور اسلام

از

الاستاذ انور الجندی، قاہرہ، مترجمہ عمیر الصدیق ندوی دریابادی رفیق دار المصنفین

قرآن کریم، سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور سنت نبوی سے متعلق مستشرقین کے افکار کا تجزیہ کرنے سے پہلے ایک مختصر جائزہ اس لئے پیش کرنا ضروری ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ اسلام کے بارہ میں وہ کس انداز سے سوچتے ہیں،

بنیادی طور پر اسلام کے بارہ میں مستشرقین کا موقف ان کے مغربی طرز کے مذہبی فہم و ادراک سے ماخوذ و مستعار ہے، یہ فہم بیک وقت کوتاہ، محدود اور گنجلک ہے، کیونکہ اس کی بنیاد اسلام کی وہ تشریحیں اور تعبیریں ہیں، جن کو یہودی عالموں اور پادریوں نے پیش کیا، اسلام اپنے آپ کو تمام آسمانی مذاہب کا خاتم کہتا ہے اور ان سابقہ مذہبوں کی تصدیق کرتا ہے، لیکن یہودیوں اور عیسائیوں کی تشریحیں، اسلام سے کسی قسم کا تعلق پسند نہیں کرتیں، اور یہیں سے وہ اسلام کو صحیح طور سے سمجھنے میں رکاوٹیں پیدا کر دیتے ہیں، حالانکہ یہ امر واقعہ ہے کہ گذشتہ الہامی کتابوں میں اسلام اور پیغمبر اسلام سے متعلق خوش خبریاں اور پیشین گوئیاں موجود تھیں، لیکن یہودی اور عیسائی علماء کی کوتاہ نظری اور بے بصیرتی نے اس آئینۂ حق کو ہمیشہ گرد آلود

ہی دیکھنا پسند کیا، انھوں نے اسلام پر اگر نظر بھی ڈالی تو اس طرح کہ گویا اسلام ان لوگوں کے اعتقادات وخیالات سے مخالف کوئی چیز ہے، یا پھر ان کی مذہبی کتابوں سے ماخوذ و مسخ شدہ کوئی مذہب ہے، حق یہ ہے کہ سارے مذاہب خدا کی جانب سے ہی تھے، اور ان مذہبوں کا سلسلۂ ارتقا تکمیل کے مراحل میں تھا، اسلام سے اس سلسلہ کی تکمیل ہوئی دیکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ ان مختلف مذہبوں اور شریعتوں میں عقیدہ سے متعلق خدا کے دین کے تمام اصول تقریباً یکساں ہیں، اور یہ قطعاً حیرت انگیز بات نہیں لیکن اصولوں میں اس اشتراک کی وجہ سے شبہات پیدا کردینا یا موازنہ کرنے کی کوشش بھی کرنا صحیح نہیں، جیسا کہ مستشرقین کرتے ہیں، دوسری الہامی کتابوں میں تحریف وترمیم کا عمل ایک تاریخی حقیقت ہے، اور یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر ہے کہ صرف قرآن ہی وہ الہامی کتاب ہے جو آج تک بعینہٖ نصِ ربانی کے مطابق اپنی اصلی شکل میں محفوظ وموجود ہو، مستشرقین کے رُخ کو سمجھنے کے لئے حسب ذیل چند نکات بھی نہایت اہم ہیں۔

۱۔ مستشرقین نے اسلام کو سمجھنے کے لئے روحانیات سے صرف نظر کرکے خالص مادی نقطۂ نظر سے بحث کی ہے، وہ نہیں تسلیم کرتے کہ وحی، نبوت اور قرآن پاک کا سرچشمۂ ذاتِ باری تعالیٰ ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دوسرے مذہبوں کے بارہ میں بھی ان کا دائرۂ نظر محدود ہے، یہاں تک کہ وہ انجیل کو کلامِ الٰہی نہیں مانتے، بلکہ اس کو کلام الرسل ہی کہتے ہیں، اور اس طرح وہ الوہیت اور نبوت کے درجات میں خلط مبحث کردیتے ہیں۔

۲۔ اسلام کو جس طرح اچانک اور وسیع پیمانہ پر فروغ ہوا، اور جزیرۂ عرب میں وہ جس طرح بآسانی برسر اقتدار ہوا، مستشرقین اس کا بھی جائزہ لیتے ہیں، لیکن ان کا تجزیہ صرف حقیقت کے برعکس ہی نہیں ہوتا، بلکہ وہ اس جوہر خاص کی قدر وقیمت کو بھی کم کرکے پیش کرتے ہیں جس کو اسلام نے انسانیت کے لئے عموماً ان قوموں میں پیش کیا، جو عرصہ سے رومیوں کے پنجۂ استبداد

میں جکڑی ہوئی تھیں، ان مستشرقین کا حاصل مطالعہ یہ ہے کہ عرب ایک ابھرتی ہوئی قوم تھی، اُن کی اپنی تہذیب تھی، وہ ترقی کی صلاحیت رکھتی تھی، ایسے میں نبی کریمؐ کا ظہور ہوا، آپ نے صرف یہ کیا کہ اس ابھرتی ہوئی قوم کی قیادت کی، اور اس طرح عرب شاہراہ ترقی پر گامزن ہوگئے، یہ تجزیہ بنیادی طور پر حقیقت کی تصویر کشی نہیں کرتا، بلکہ اس اسلامی دعوت کی اہمیت کو کم کر دیتا ہے، جو واضح طور پر انسانیت کو تاریکی سے روشنی میں لانے کا سبب بنی، اسلام کی تاریخ شاہد ہے کہ عرب کس طرح شروع کے تیرہ برسوں میں، اس دعوت کے ساتھ پیش آئے، اہل مکہ کے سخت عناد اور انتہائی مخالفت کے بعد نبی کریمؐ ایک ایسے دوسرے ماحول و معاشرہ کی تلاش کرنے پر مجبور ہوئے، جو خدا کی دعوت کو قبول کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتا تھا، آپ نے یہ مطلوبہ معیار یثرب کی بستی میں پایا، اور اس طرح ہجرت کا تاریخی عمل وجود میں آیا، پھر یہ دعوی کرنا تو نری جہالت ہے کہ عرب ایک ترقی پذیر قوم تھی؟ عرب عروج اور ترقی کی سمتوں اور جہتوں سے بالکل ناآشنا تھے، وہ بتوں کے پجاری، مردار کھانے والے بچیوں کو زندہ درگور کر دینے والے، شراب نوشی کے عادی قتل و غارت گری اور زنا کے خوگر تھے، تمدنی ترقی کی کوئی رمق اُن میں موجود نہ تھی، یہ صرف اسلام تھا جس نے حیرت انگیز تیزی کے ساتھ ان کو خدائے واحد پر ایمان لانے اور اپنے رب کے لئے جانی و مالی قربانیاں دینے کے لئے تیار کیا، ان اخلاقی کمالات سے آراستہ ہو کر جب وہ آگے بڑھے، تو غیر قوموں اور غیر ملکوں نے خود اپنے دروازوں کے کواڑ وا کر دیئے اور مسرت کے جذبات کے ساتھ ان کا استقبال کرکے ان کی عدل گستری اور رحم دلی پر اعتماد کیا،

۳۔ مستشرقین نے اسلام سے پہلے کے زمانہ جاہلیت اور عربوں کی بت پرستی کے مطالعہ

پر خصوصی توجہ دی، اور کوشش کی کہ ان مجبوروں سے عرب اور اسلام کے مختلف گوشوں کا جائزہ لیں۔ زمانہ جاہلیت کے وحشیانہ افعال و اعمال میں ان مستشرقین کو زیادہ دلکشی نظر آئی، چنانچہ اس دور کو عہد شجاعت قرار دیا۔ ہیملٹن گب نے دور جاہلیت میں قوت و ثروت کے بعض مظاہر کو نمایاں کر کے یہی ثابت کرنا چاہا ہے، یہ صحیح ہے کہ اس بدترین معاشرہ میں کہیں کہیں قوت، حمیت اور سخاوت کی ایسی چنگاریاں بھی تھیں، جو دین ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ کے خاکستر میں کبھی کبھی چمک اٹھتی تھیں، لیکن ان جزئی و لمحاتی خوبیوں کو ایک پورے عہد کی خوبی قرار دینا صرف مستشرقین کا کارنامہ ہے جن کا مقصد عربوں کی مدح نہیں بلکہ وہ تحسین نا شناس ہے جس کے ذریعہ دور جاہلیت کو سربلند قرار دیا جاتا ہے، اور اسلام کو اس سربلندی کا محض ایک خوشہ چین ثابت کیا جاتا ہے، مدینہ میں مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات میں اسی قسم کے سلسلے قائم کئے گئے، اسلام سے پہلے کے مذاہب اور عرب کی پڑوسی حکومتوں اور غسان و مناذرہ کی سلطنتوں کو بھی ان مستشرقین نے اسی لئے زیادہ اہمیت دی تاکہ کسی طرح یہ ثابت کیا جا سکے کہ انہی سارے پس منظروں میں مسلمانوں نے اپنی راہ کا تعین کیا۔

۴۔ واقعات کے استنباط میں مستشرقین کا طرز استدلال واضح طور پر ان کی بدنیتی کی غمازی کرتا ہے، مثلاً ہیملٹن گب اپنی کتاب بنیۃ الفکر الدینی فی الاسلام میں لکھتے ہیں، حالات و ماحول کے ماتحت قدیم عربی تہذیب کا احیاء ہو رہا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق اسی ماحول سے تھا، طبعاً آپ پر اس ماحول کے اثرات مترتب ہوئے، آپ نے اس قدیم عربی تہذیب میں چند مذہبی عقائد کا اضافہ کر کے اسے اسلام کی صورت میں پیش کر دیا۔ گب قدیم عربی تہذیب کے احیاء سے توہم پرستی اور جاہلانہ اعتقادات مراد لیتے ہیں، مثلاً جادو، ٹونا، ستارہ پرستی، اور کہانت وغیرہ، گب کی اس رائے کو بیان نقل کرنے کا مقصد

یہ ہے کہ اس سے مستشرقین کے اس رویہ کی وضاحت کی جائے کہ یہ لوگ اول تو چند مفروضات قائم کرتے ہیں، پھر وہ واقعات اور قرائن سے ان مفروضات کو قطعی اور یقینی بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کوشش میں وہ واقعات کو گھڑنے میں یا ان میں کتر بیونت کرنے میں یا تحریف و تغییر میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتے ہیں، گب نے مندرجۂ بالا رائے کی تائید میں حجۃ اللہ البالغہ سے شاہ ولی اللہ دہلوی کا ایک قول نقل کیا ہے، حالانکہ چند ہی سطروں کے بعد ان کی رائے کی نفی میں شاہ صاحب کا قول موجود ہے، گب صاحب ایسے ہی مفروضات قائم کر کے یہ فیصلے کرتے ہیں کہ حضرت محمدؐ نبی نہیں تھے، عربوں کے وہ رسم و رواج جن کو عہد ابراہیمی کا ورثہ سمجھا جاتا تھا، دراصل ان عربوں کے اپنے قائم کئے ہوئے تھے، حضرت ابراہیمؑ سے ان رسموں اور رواجوں کا تعلق نہیں تھا، خود کعبہ کے تقدس میں دعائے ابراہیمی کا کوئی اثر نہیں تھا، کعبہ کی حرمت، عرب ماحول کی ایک رسمی سی چیز تھی، گب یہ بھی کہتے ہیں کہ جنات محض ایک وہمی مخلوق ہیں، اور ان کے بارے میں قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے، یا دوسرے واقعات میں ان کا جو ذکر آتا ہے، وہ بھی نرا وہم ہے، گب ان تمام مفروضات کو ثابت کرنے میں جملوں کے ہیر پھیر اور عبارت کو معمہ بنانے میں سارا زور صرف کرتے ہیں،

۴۔ مستشرقین جب واضح اور اہم حقیقتوں کا معروضی مطالعہ کرتے ہیں، اس وقت بھی وہ عصبیت بلکہ اپنے نفس کے اسیر و مرید نظر آتے ہیں، مثلاً تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ مسلمان کثرت سے جنگوں میں فتح یاب ہوئے، اور ان معرکوں میں ان کی عددی و عددی قوت ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں کمزور و کمتر ہی رہی، لیکن تعداد میں کم ہونے کے باوجود وہ فتح مند اور غالب رہے لیکن جنرل گلوب اپنی کتاب الفتوحات العربیۃ الکبریٰ میں ایسا پیرایۂ بیان اختیار کرتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان فن حرب سے ناآشنا یا اس فن میں پس ماندہ تھے، حالانکہ

فوجی صلاحیتوں اور جنگ کے حربوں میں مسلمانوں کی برتری ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ انصاف پسند مورخوں نے مسلمانوں کی ترقی یافتہ صلاحیتِ جنگ، موقع و محل کے انتخاب اور تکنیکی اعتبار سے اُن کی قائدانہ مہارت کی برتری کا اعتراف کیا ہے، اسلام کے آغاز میں جو جنگیں ہوئیں اور جو اسلامی فتوحات حاصل ہوئیں، وہ تو اپنے امتیاز کی وجہ سے صدیوں اپنی مثال آپ رہیں۔ (علم الحرب۔ منیر شفیق)

عصرِ اول میں مسلمانوں نے جنگ کے میدانوں میں ساری بلندیوں سے برتر بلندی پہ اپنا علم نصب کیا، اور نپولین کے دور تک کوئی بھی اس چوٹی کو سر نہ کر سکا۔ اس کے علاوہ اسلامی جہاد کا مقصد صرف جنگ ہی تو نہیں ہے، بلکہ اس کے جلو میں خدا پر ایمان، اس کی راہ میں جان و مال کی قربانی اور وہ جذبۂ حمیت بھی جلوہ گر رہتا ہے جو شوقِ شہادت کا سامان فراہم کرتا ہے۔

۵ اسلام میں دنیا و آخرت کا جو تصور پیش کیا گیا ہے، ان مستشرقین نے اس کا بھی جائزہ لیا، اور نتیجہ یہ پیش کیا کہ اسلام کا تصورِ حیات، دنیا سے روگردانی کی تعلیم دیتا ہے۔ ایک مستشرق فون د ربناؤم کا خیال ہے کہ اسلام مسلمانوں کو دنیا اور دنیا کے مظاہر سے کنارہ کش رہنے کی تعلیم دیتا ہے، وہ مسلمانوں کو صرف آخرت اور اس کی ابدی نعمتوں کی تحصیل کی ترغیب دیتا ہے۔ زندگی کے بارہ میں اسلام کے اس نقطۂ نظر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ علم، ادب، سیاست اور اقتصادیات وغیرہ ثانوی علوم ہیں، جو سرحیات تو صرف نماز، روزہ جیسی عبادتیں ہیں، گویا موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی پسماندگی اور زندگی کی جمود اُن کی رہبانیت ہے۔ اس غلط طرزِ فکر کا جواب ایک عرب اہلِ قلم ڈاکٹر ابراہیم محمد رقا نے یہ کہکر دیا کہ مسلمانوں کی موجودہ خستہ حالی کی یہ تعبیر اسلام کی روح کے ساتھ میل نہیں کھاتی

اسلام عبادت کو عمل پر غالب نہیں کرتا، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ عمل ہی عبادت پر حاوی ہے۔ یہ تو سب پر روشن ہے کہ مسلمان صدیوں تک علم کے علمبردار رہے، یورپ کی موجودہ نشاۃ ثانیہ اور اس کے علمی عروج کے اسباب انہی مسلمانوں ہی کے توفراہم کردہ تھے، مسلمانوں نے یہ مہیا نہ کیے ہوتے تو شاید یورپ ابھی محوِ خواب ہی رہتا۔ مسلمانوں کی خستہ حالی کی وجہ اسلام کا تصورِ حیات نہیں ہے، یورپ نے مسلمانوں پر سیاسی بالادستی حاصل کی تو انکی سامراجیت نے عالمِ اسلام کو منظم طریقہ سے علمی، معاشی اور فوجی لحاظ سے مفلوج بنا کر رکھ دیا کہ پھر مسلمان ان میدانوں میں پیش قدمی نہ کر سکیں۔ مسلمانوں کی موجودہ پس ماندگی ان کے دشمنوں کی وجہ سے ہے، اس میں اُن کے مذہب کی تعلیمات کی مطلق کارفرمائی نہیں ہے، اور عجب کیا کہ مستقبل قریب میں مسلمان پھر یہ ثابت کر دکھائیں کہ ان کا دین کبھی پس ماندگی کی تعلیم نہیں دیتا، بلکہ یہ تو اسلام ہے جو ہر ترقی کا باعث و محرک اور سبب بنا رہا ہے۔ اسلام نے دین و دنیا میں ہمیشہ ایک مضبوط ربط قائم کر رکھا ہے۔ مذہب کی صحیح روح کو سمجھنے کا فطری ثمرہ علم و عمل، سیاست و معاشیات میں ترقی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، دین و دنیا میں اگر صحیح مطابقت قائم نہ ہو سکی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ عیب خود مسلمانوں میں ہے، یا دنیاوی پس ماندگی مسلمانوں کی تہذیب کا ایک لازمہ ہے۔ مسلمانوں کی پس ماندگی کے اسباب تاریخی ہیں، اُن کے ازالہ کے ساتھ یہ پس ماندگی خود بخود ختم ہو جائے گی، پھر مسلمانوں کو بھی اس بات کا احساس ہے کہ وہ پس ماندہ ہیں، اگر یہ پس ماندگی ان کی تہذیب کا جزو ہوتی، تو پھر یہ احساس ہی کیوں پیدا ہوتا، ؟ آج مسلمان اپنی زبوں حالی کا تجزیہ کر رہے ہیں، اور تقریباً سارے مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اُن کی خستگی کا سبب یہ ہے کہ وہ اسلام سے روگرداں ہو گئے، اور اس روگردانی میں سامراج کا بڑا ہاتھ ہے، جس نے مغربی ادبیات اور نظریات سے ان کو ایک عرصہ تک مسحور کیے رکھا، مغربی اہلِ قلم

نے سارا زور اس پر صرف کیا کہ وہ مسلمانوں کو اپنی تہذیب سے بیگانہ کرکے دوسری شاہراہ نازک پر آشیانہ بنانے کی ترغیب دیں،

۲۔ مستشرقین نے اپنی خواہشات اور جذباتِ تعصب کی بنا پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ اسلام کا کوئی مستقبل ہی نہیں، مارگولیوتھ نے ۱۹۰۲ء میں اپنے اسی نتیجۂ فکر سے دنیا کو باخبر کیا، لامنس نے ۱۹۳۰ء میں یہی نعرہ بلند کیا، اور دوسرے مستشرقین اسی قسم کی گفتگو کرتے رہے، مگر حالات، واقعات اور اسلام کی روز افزوں اشاعت، زبان حال سے ان کے اقوال کی تردید کرتی رہی، پاکستان اور انڈونیشیا کی صورتوں میں نئی اسلامی مملکتیں وجود میں آئیں، خلافت ختم ہوئی لیکن اسلام زندہ رہا، حالانکہ یہی مستشرقین کہا کرتے تھے کہ خلافتِ عثمانیہ کے سقوط کے بعد اسلام کا بھی سقوط ہو جائے گا، نئے تمدن کے ساتھ جب اسلام دوچار ہوگا، تو لامحالہ پاش پاش ہو جائے گا لیکن مغربی تہذیب کا سامنا اسلام نے کیا، اور بجائے مرعوب و مغلوب ہونے کے اس نے جرات کے ساتھ مغربی تہذیب کے ناسور کی نشاندہی کی، اس کے طوفان کا مقابلہ پامردی سے کیا، اور اس کے غلبہ سے خود کو آزاد رکھا، اور فکر اسلامی ازسرِ نو اپنے اولین سرچشموں سے سرسبز اور شاداب ہو رہی ہے، مستشرقین کا خیال تھا کہ مغرب کی مسیحی مشنریاں، اسلام کا خاتمہ کر دیں گی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپنی ساری قوت، ثروت اور وسائل کے باوجود یہ مشنریاں مسلمانوں کو اپنے مذہب سے برگشتہ نہ کر سکیں، ان ملکوں میں جہاں اسلام کا سیاسی اثر و نفوذ نہیں ہے، اور جہاں مسیحی مشنریاں لاکھوں کی رقم خرچ کرکے فلاحی ادارے قائم کر رہی ہیں، وہاں اسلام اپنی فطری سادگی، آسانی، درد مندی کی وجہ سے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہو رہا ہے،

گب کو غرہ تھا کہ مغرب زدگی سے اس وقت سارا عالم اسلام متاثر ہے لیکن اب جدید

کا یہ طلسم ٹوٹ رہا ہے مسلمانوں کو اپنی متاعِ گم گشتہ کا احساس ہو چلا ہے، وہ اپنے دین
سرچشموں کے آب نشاط انگیز کی افادیت سے باخبر ہو رہے ہیں، وہ اپنی زندگی میں شریعت
کے نظام کو پھر سے جاری وساری رکھنا چاہتے ہیں، اقتصادیات، سیاسیات، سماجیات
کے میدانوں میں اسلام کا جوہر کھل رہا ہے، گو خود شناسی کا یہ جوہر بعد از خرابی بسیار
آشکارا ہوا ہے،

مارگولیوتھ جب اسلام کے بارہ میں گفتگو کرتے تو وہ ایک سیاسی مورخ ریمی کا
یہ قول بار بار دہراتے، کہ اسلام کی زندگی اب صرف دو صدی اور ہے، اور مسلمانوں کی انتہائی تعداد
تو کروڑ سے زیادہ نہ ہو سکے گی لیکن آج مستند اعداد و شمار کے مطابق مسلمانوں کی تعداد
ایک ارب تک پہونچ چکی ہے، اور اسلام کی وسعت اور فروغ کا عالم یہ ہے کہ وہ استعمار
کے گھر اور اس کی توپوں کے پیچھے یورپ تک جا پہونچا ہے، امریکہ میں وہ ایک مانوس حقیقت
ہے، اور پانچوں براعظموں میں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں کسی نہ کسی مینارہ سے اللہ اکبر کی
صدائیں نہ بلند ہوتی ہوں، انہی یہودی مارگیولیوتھ نے بعد میں کہا کہ یہ کہنا کہ اسلام
جلد ہی ختم ہو جائے گا، غور طلب مسئلہ ہے، اسلام روے زمین پر ایک زندہ حقیقت ہے جس کا
نتیجہ یہ ہوا کہ انسانیت روز بروز سائنس کی مدد سے اپنے رب کو پہچان رہی ہے، اور سارے
وہموں اور غلط تعبیروں کو ختم کرتی جاتی ہے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام بڑی
سیاسی اور فوجی حکومتوں کے اثر و نفوذ سے آزاد ہوتا جا رہا ہے، اور ان حکومتوں کے اقتصادی
اور ثقافتی اثرات سے نبرد آزما ہے،

مستشرق لانس کا خیال تھا کہ خلافت اسلامیہ کے سقوط کے اثرات یقینی طور پر اسلام
کے مستقبل پر پڑیں گے لیکن حالات نے دوسرا ہی رُخ دکھایا مسلمانوں نے سقوطِ خلافت کے

بعد وحدت کی بنیاد پر پھر سے استوار کیں، مسلمانوں کے مسائل کو متفقہ طور پر حل کرنے کے لئے اجتماعات اور مشاورتی جلسے منعقد ہوتے رہے، خیر سگالی ہم آہنگی نے ان مفروضوں کو غلط ٹھہرایا، جو یہ دعویٰ کرتے تھے کہ وطنی تحریکیں، محدود قومیتیں، اور نسلی تفریقیں مسلمانوں کی فکری وحدت کا خاتمہ کر دیں گی، اور ان کے عقائد اور ان کی ثقافت کو قصۂ پارینہ بنا دیں گی، اس عرصہ میں عرب قوم پرستی، فرعونی تہذیب کا احیاء اور فینیقیت جیسے وقتی رجحانات ابھرے ضرور لیکن مسلمانوں کا اسلام پر اعتقاد ایسا راسخ رہا کہ یہ رجحانات زیادہ موثر نہ ہو سکے،

موجودہ دور میں مسلمانوں کی آبادی میں جس قدر اضافہ ہو رہا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ عددی تفوق مستقبل میں مسلمانوں کی طاقت میں بہت موثر ثابت ہوگا،

اسی طرح مغربی اور لا مذہبی اثرات سے چھٹکارا پانے کی کوشش کے ساتھ اب قرآن کی تعلیم از سر نو عام ہو رہی ہے، اور مسلمان بجا طور پر یہ یقین کرنے لگے ہیں، کہ عالم اسلام کی ترقی اور کامرانی صرف ایسی شریعت کے زیر سایہ ممکن ہے جس میں علم، دین، روح، مادہ دنیا اور آخرت کی جامعیت ہو،

مستشرقین کی نسبت سے اسلام کے بارہ میں یہ ایک عمومی جائزہ تھا، اب ہم پہلے قرآن کریم اور مستشرقین سے متعلق علاحدہ گفتگو کریں گے،

مستشرقین اور قرآن کریم اسلام کے بارہ میں مستشرقین کا رویہ خصومت اور انکار کا ہے، اور یہی سلوک ان مستشرقین کا قرآن کریم سے ہے، اور جو ان مستشرقین کی فطرت کا عین غماز ہے، کیونکہ قرآن کریم، موجودہ توریت و انجیل کے متعلق صاف کہتا ہے کہ یہ دونوں تحریف شدہ کتابیں ہیں، یہ وہ نہیں ہیں جنکو ...... خدا تعالیٰ نے آسمان سے

اتارا تھا، قرآن نے موجودہ توریت وانجیل کی پیش کردہ خرافات کی صحیح نقاب کشائی کی، عقیدۂ توحید سے متعلق قرآن نے صراحت سے کہا کہ توحید ہی دین حق کی روح ہے، عقیدۂ تعدد الٰہ اور عقیدۂ تثلیث اس روح کے منافی عقائد ہیں، حضرت عیسیٰؑ کے بارہ میں قرآن نے کہا کہ وہ خدا کے پیغمبر تھے، خدا نہ تھے، عیسائیوں کے عقیدہ کے برخلاف ان کو نہ قتل کیا گیا، نہ سولی دی گئی، بلکہ انھیں آسمان پر اٹھالیا گیا، قرآن نے اس مضحکہ خیز عقیدہ کی بھی تردید کی کہ حضرت عیسیٰؑ نے مصلوب ہو کر ساری قوم کے لئے نجات کا سامان فراہم کر دیا، قرآن نے اس تصور کو بھی باطل قرار دیا کہ کوئی خاص قوم خدا کی محبوب قوم ہے، ان کے علاوہ دوسرے کئی متنازعہ مسائل ہیں جن کے متعلق قرآن نے قطعیت سے اپنی رائے کا اظہار کیا، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، حضرت لوط اور داؤد حضرت علیہم السلام جیسے انبیاء معصومین سے متعلق توریت وانجیل میں بہت سی روایتیں ایسی داخل کر دی گئی تھیں، جن سے ان انبیائے معصومین کا مرتبۂ نبوت فروتر نظر آتا تھا، قرآن نے ان روایتوں کو باطل ٹھہرایا، قرآن کریم کی اس صدق بیانی کو مستشرقین کیسے گوارا کر سکتے ہیں، چنانچہ ان مستشرقین کی کتابوں میں اس خیال پر عام اتفاق ہے کہ قرآن کا سرچشمہ وحی الٰہی نہیں، بلکہ وہ حضرت محمدؐ کا اپنا کارنامہ ہے، مستشرقین کے دوسرے دعووں کی طرح یہ دعویٰ بھی بے دلیل اور بے سند ہے، اس دعویٰ کی تہ میں یا تو قرآن دشمنی کا جذبہ کارفرما ہے، یا پھر وہ وحی کی فہم سے ناآشنا ہیں، یا ان کے پیمانے ایسے لوگوں کے قائم کردہ ہیں، جو صرف مادی نظریہ پر یقین رکھتے ہیں، ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انجیل کے بارہ میں انکا اعتقاد ہے، کہ وہ کلام الٰہی نہیں، بلکہ نتیجۂ فکر مسیح ہے، اسی لئے وہ قرآن کو بھی اسی حیثیت سے جانچتے ہیں، قرآن کا کلام الٰہی ہونا ان مستشرقین کی سمجھ میں نہیں آتا، وہ باربار اس سے متعلق اپنے شکوک وشبہات کی تکرار کرتے رہتے ہیں، اس شک کا اظہار اس کثرت سے ہوا کہ طٰہٰ حسین افندی مبارک وغیرہ جیسے عربی انشاپردازو

دانشور بھی اس سے کس حد تک متاثر ہو گئے ۔

قرآن کریم کے مضامین اور خاص طور سے قرآنی قصوں کے بارہ میں ان مستشرقین کی رائے یہ ہے کہ نبی کریمؐ مکہ میں عیسائی اور یہودی علماء سے ربط ضبط رکھتے تھے، اُن سے یہ قصے سُن کر آپ نے اُن کو قرآن میں پیش کر دیا لیکن مستشرقین کے اس شبہ کا ازالہ اسی وقت ہو جاتا ہے جب توریت و انجیل کے روایت کردہ افسانوں اور قرآن کے پیش کردہ قصوں کا موازنہ کیا جاتا ہے ، قرآنی اسلوب ، بلاغت و حکمت کے اعلیٰ معیار اور وسیع و دقیق معلومات کی بدولت یہ بات خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے کہ کلام ربانی اور کلام انسانی میں کس قدر فرق ہے، صدق معانی، عبرت، نغزی، سادگی و پرکاری، حکمت و دانائی، افسانوی تفصیلات سے دوری، اور ایک مرتب ہم آہنگی قرآنی امتیازات ہیں، اور یہ وہ اسلوب ہے جس کے ذریعہ عالم انسانیت، سلامت فکر کے نئے دور، اور ایک زندہ و پائندہ پیغام کے عہد میں داخل ہوا، لیکن اس کے ادراک کے لئے نگاہ بصیرت کی ضرورت ہے، مستشرقین کا اعتراض کوئی نئی بات نہیں، ہر دور میں اسلام کے دشمنوں کی زبان سے ایسے ہی کلمات سرزد ہوئے، نبی کریمؐ کے دور میں مشرکینِ مکہ کا الزام یہی تھا کہ آپ نے یہ حکایتیں، مکہ میں مقیم ایک غیر عرب زبان داں سے سُن کر بیان کی ہیں،

مستشرقین میں گولڈ زیہر اور اسپرنگر نے انہی اندیشوں کا اظہار کیا کہ نبی کریمؐ نے شام کے سفر میں عہد نامۂ عتیق کی روایتیں سنیں، اور پھر ان کو قرآن میں دہرا دیا، گولڈ زیہر اور فولد کی نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ نبی کریمؐ کی وفات کے بعد قرآن میں تحریف کی گئی، وہ مثال دیتے ہیں کہ آپ کا نام قثم یا قاسم تھا، لیکن جب آیت و مبشراً برسول یاتی من بعدہ اسمہ احمد (اور خوش خبری دینے والے ایک ایسے پیغمبر کی جو ان کے بعد آئے گا اس کا

نام احمد ہوگا) اتری تو اس آیت کو منطبق کرنے کے لئے آپ کا نام بدل دیا گیا اور بجائے قثم کے محمد نام رکھا گیا، اس تحقیق نبی کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ آپکے بہت سے صفاتی نام ہیں آپکے دادا عبدالمطلب نے محمد نام رکھنے سے پہلے قثم نام تجویز کیا تھا، اس روایت کو ان مستشرقین نے کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

حالتِ وحی میں نبی کریمؐ کے چہرۂ مبارک سے گراں باری اور شدت کی کیفیت کا اظہار ہوتا تھا، مستشرقین نے اپنی تحقیق کے ذریعہ اس کیفیت کو نعوذ باللہ مرگی کے دورے سے تعبیر کیا، وہ کہتے ہیں کہ نبی کریمؐ اپنا ہوش کھو بیٹھتے تھے، پسینہ جاری ہو جاتا، تشنجی کیفیت طاری ہوتی، منھ سے جھاگ نکلنے لگتا، اور جب آپ کو افاقہ ہوتا، تو آپ فرماتے کہ مجھ پر وحی آئی تھی، اور پھر آپ اپنے اصحاب کے سامنے آیاتِ قرآنی تلاوت کرتے، رسول اللہؐ کی بشری حالت میں حضرت جبرئیل کے ملکوتی وجود سے ہم دمی وہم رازی، اور اظہار وحی ایسے اہم مسائل میں سے ہیں، جن کے بارہ میں علماء و محققین نے دادِ تحقیق دی، اور جس کے صحیح ادراک سے مادی علم و فہم عاجز و قاصر ہیں لیکن مستشرقین کی تحریروں میں تعصب، عیب جوئی اور الزام تراشی کی کارفرمائی کے بعد یہ تحقیق ننگ تحقیق بن جاتی ہے، جس پر ناطقہ سر بگریباں ہونے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا،

قرآن کی بعض سورتوں کا آغاز حروفِ مقطعات سے ہوتا ہے، مستشرقین نے یہاں بھی دادِ تحقیق دی ہے، نولدکی اس نتیجہ پر پہنچے کہ حضرت زید بن ثابتؓ کاتبِ وحی نے قرآن کے متعدد نسخوں کو ایک مصحف میں جمع کرنا چاہا، اس سلسلہ میں قرآن کے متعدد نسخوں کے مالکوں سے انھوں نے مدد لی، چنانچہ یہ حروفِ مقطعات، ان مالکوں کے مخفف نام ہیں، یہ تحقیق بعید از قیاس بلکہ مضحکہ ہے۔

ایک مستشرق بلانشہ جو نسز کا خیال ہے کہ یہ حروفِ مقطعات سورتوں کے

قدیم ناموں کا اختصار ہیں، یہ خیال یوں خام نظر آتا ہے کہ اگر یہ حروف سورتوں کے نام تھے تو ان کو بسم اللہ سے پہلے لکھا جاتا، نہ کہ بعد میں، اور اگر ایسا ہوتا، تو قدیم مفسرین کو اس کا علم ضرور ہوتا، اور وہ اس کی جانب اشارہ کرتے، اصل بات یہاں بھی وہی ہے کہ مقصد علمی موشگافی نہیں ہے، صرف ثابت یہ کرنا ہے کہ یہ حروف مقطعات، وحی کے کلمات نہیں ہیں، بلکہ ان کو نبی کریم کے بعد قرآن میں داخل کیا گیا ہے، حالانکہ یہ حروف نبی کریم کی زبان مبارک سے ادا ہوئے، اور آپ نے اُن کو اصل قرآن میں ہی شمار کیا۔

مستشرق لوئیس جارڈیہ اور پادری قنواتی نے اپنی کتاب فلسفۃ الفکر الدینی بین المسیحیۃ والاسلام میں یہ دعویٰ کیا کہ قرآن کی ترتیب اور سورتوں اور آیتوں کی تقسیم حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں ہوئی، حالانکہ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی سورتوں اور آیتوں کی ترتیب نبی کریمؐ کے عہد ہی میں مکمل ہو چکی تھی، حضرت عثمانؓ کے دور خلافت تک مختلف لوگوں کے پاس نامکمل مصاحف موجود تھے، حضرت عثمانؓ کے دور میں صرف یہ ہوا کہ ان نامکمل مصحفوں کے بجائے قرآن کے مصحف کامل کا رواج عام ہوا،

بعض مستشرقین نے قرآن کریم کی موجودہ اور اصل ترتیب سے ہٹ کر اپنے طور پر ایک نئی ترتیب قائم کرنے کی کوشش کی، ان مستشرقین میں ولیم موبیر، ویل، روڈویل وغیرہ کے نام آتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ یہ سعی لاحاصل تھی، چنانچہ کچھ حاصل نہ ہوا بعض مستشرقین نے چند ضعیف بلکہ موضوع حدیثوں کی بنیاد پر قرآن کی زبان میں شکوک وشبہات کا اظہار کیا کہ بعض صحابۂ کرام کو قرآن کریم کے بعض جملوں کی ساخت و ترکیب سے اتفاق نہیں تھا، لیکن مستشرقین کی اس کوشش کو طفلانہ کوشش کے سوا کچھ نہیں سمجھا گیا،

۴۔ مستشرقین نے زبان و بیان کی غلطیاں دکھانے کے چند معنوی اعتبار سے بھی

قرآن کا مرتبہ کم ثابت کرنے کی کوشش کی، ان کا خیال ہے کہ قرآن کوئی مکمل نظام نہیں ہے، اصلاحِ معاشرہ کی ایک وقتی کوشش ہے، نبی کریمؐ نے اپنی قوم کے طبقاتی نظام کی خرابیوں کو دیکھا تو اس کی جانب اس قرآن میں توجہ دلائی، اسی لئے آپ نے روزِ قیامت کے خوف کو نمایاں کیا، کم تولنے اور ناپنے والوں سے متعلق، اور یتیم پر ظلم ڈھانے سے متعلق اور سائل کو دھتکارنے اور ڈانٹنے کے بارہ میں آیتیں پیش کیں، گویا قرآن بجائے ایک ضابطۂ حیات کے صرف وقتی مسائل کے حل کرنے کی حد تک محدود تھا، حالانکہ ہر غیر متعصب اور انصاف پسند انسان قرآن کے مطالعہ کے بعد اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے گا، کہ قرآن کی صورت میں خدائے تعالیٰ نے ایک مکمل و جامع، ضابطۂ حیات پیش کر دیا ہے، جو ہر زمان اور ہر مکان کے لئے سامانِ ہدایت ہے، خواہ حالات اور واقعات کتنے رنگ بدلیں، قرآن کی تعلیمات کی جامعیت ہمیشہ موثر رہے گی، قرآن کی یہ جامعیت خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ کوئی انسانی کارنامہ نہیں ہے، بلکہ اس کا سرچشمہ ذاتِ ربانی ہے۔

مستشرقین کا دعویٰ ہے کہ نبی کریمؐ یہودی اور نصرانی عالموں کی تعلیمات سے متاثر ہوئے تھے، (حالانکہ نبی کریمؐ کا امی ہونا ہی اس دعویٰ کی تردید کرتا ہے،) لیکن قرآن کے نظامِ حیات، معرفتِ کائنات، قوانینِ فطرت، تہذیبوں اور قوموں کے عروج و زوال کے اسباب جیسے قرآنی مضامین کی ایک جھلک بھی توریت و انجیل میں نہیں پائی جاتی، حد تو یہ ہے کہ اولین مسئلہ یعنی مسئلۂ توحید ہی میں ان کے درمیان شدید اختلاف ہے، لیکن مستشرقین پھر بھی یہی دہراتے جاتے ہیں، کہ نبی کریمؐ کی تعلیمات کے اصل ماخذ یہودی اور عیسائی علماء تھے،

۵۔ قرآن پر ایک اعتراض یہ ہے کہ وہ اپنے اسلوب میں سجع اور قوافی کا پابند ہے

لوئی ماسینیوں، ایسے ہی مستشرقین کی نمائندگی کرتے ہیں، حالانکہ واقعہ صرف یہ ہے کہ قرآن کے متعدد اسالیب ہیں، ان میں سے ایک سجع کا اسلوب بھی ہے، مگر یہ عام سجع سے منفرد اور انتہائی اثر آفریں ہے، اور کاہنوں کے سجع سے بالکل جدا اور کہیں برتر ہے، اسی لئے ایک اہل زبان نے کہا تھا، کہ بخدا یہ قرآن نہ تو شعر ہے، نہ سحر ہے، اور نہ ہی محض کہانت ہے، یہ تو کچھ اور ہی شے ہے،

مغربی زبانوں میں قرآن کریم کے ترجمے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ تاریخ اس سوال کا دلچسپ جواب پیش کرتی ہے، صلیبی جنگوں کے خاتمہ کے بعد جب عیسائی فوجی اپنے وطن میں واپس آئے تو اپنے ساتھ مسلمانوں کے حسن سلوک اسلام کی تہذیب اور اس کی خوبیوں کی داستانیں بھی ساتھ لائے، چنانچہ یورپ میں اسلام کے خلاف نفرت اور دشمنی کے بجائے قربت اور دوستی کا سازگار ماحول بننا شروع ہو گیا، اس نئی رائے عامہ سے ارباب اقتدار کا پریشان ہونا فطری امر تھا، چنانچہ پولس نہم کی تجویز یہ ہوئی کہ قرآن کریم اور اس کی تشریح اس انداز سے کی جائے جو صاحب قرآن کی تکذیب اور خود قرآن کی سلامتی و عظمت میں شکوک پیدا کر دے، ایک محقق کے قول کے مطابق صلیبی جنگوں کے بعد ارباب کلیسا نے یہ تلخ حقیقت محسوس کی کہ ان جنگوں کے بعد نہ تو عیسائیوں کو ارض مقدس پر کامل فتح نصیب ہوئی، اور نہ مسلمانوں نے مسیحیت کو گلے لگایا، بلکہ اس کے برعکس یہ ہوا کہ اسلامی تہذیب اور طرز معاشرت نے صلیبیوں پر قابل لحاظ اثر چھوڑا، اور اسی وقت سے یہ منصوبے بننا شروع ہو گئے، کہ اسلام کا مقابلہ میدان جنگ کے بجائے فکر و نظر کے میدان میں کیا جائے، جو زیادہ با مقصد اور کارآمد ثابت ہو گا، اس سلسلہ میں اولین نام ایک صاحب طبری (۱۱۶۵ء) کا آتا ہے، ان کو اسپین بھیجا گیا، انھوں

ن مسلمانوں اور عیسائیوں کی باہمی آویزش اور مناظروں کا بغور جائزہ لیا، اور اسپین کے ان تعلیمی
طریق کار سے بھی واقف ہوئے، جن کا خیال تھا کہ اسلام کا مقابلہ صرف عقلی اور منطقی دلائل
ہی کیا جا سکتا ہے، عیسائیوں کی ان کوششوں کا ثمرہ اس وقت حاصل ہوا، جب لاطینی
ان میں قرآن کا ترجمہ مکمل ہوا، اس ترجمہ کا پہلا اڈیشن پاگانینی نے ۱۵۳۰ء میں بندوقیہ
شائع کیا، لیکن اس وقت کے پوپ پال سوم نے اس کے تمام نسخے جلوا دیئے،
ں کے بعد پوپ الیگزنڈر چہارم نے ایک حکم نامہ کے ذریعہ قرآن اور اس کے ترجمہ
اشاعت ممنوع قرار دی، ۱۶۹۴ء میں ایک جرمن بشپ ابراہام ہنکلمان نے قرآن
ترجمہ شائع کیا، گو یہ ترجمہ ۱۶۹۰ء میں تیار ہو چکا تھا، لیکن اس وقت اس کو اسے شائع کرنے کی ہمت
ہیں ہوئی، اپنے اس ترجمۂ قرآن کے مقدمہ میں وہ لکھتا ہے کہ اگر ہم اسلام کا مقابلہ کرنا
چاہتے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ قرآن کریم کا گہرا مطالعہ کیا جائے، اس کے بعد ہی
مشرق میں دین مسیحی کے فروغ کی راہیں ہموار ہو سکتی ہیں، گویا قرآن کا مطالعہ اور
اس کے علوم کی معرفت حاصل کرنے کی نیت روز اوّل سے یہ تھی کہ اسلام کا مقابلہ کیسے
کیا جائے، اور اس کی تعلیمات کو کن کن طریقوں سے باطل ٹھہرایا جائے، خشت اول
کی اس کجی کے بعد پوری عمارت کے ناقص ہونے پر اس کے بعد زیادہ تعجب نہیں ہوتا،
تعجب تو اس وقت ہوتا ہے جب مستشرقین اپنے مطالعہ کو معروضی تحقیقی، اور خالص علمی تجزیہ
کا نام دیتے ہیں، ان مستشرقین نے اپنے علمی کاموں یا کارناموں میں اپنے اسلاف کے طرز فکر
کو راہ نما بنایا، اور ان سب کی تحقیقات کا ماحصل یہ رہا کہ قرآن کریم یا تو نصرانیت سے ماخوذ
یا یہودی تعلیمات سے نبی کریم نے استفادہ کیا ہے،
انسائیکلوپیڈیا آف اسلام نے لفظ محمد کی تشریح میں ان ہی خیالات کو جگہ دی ہے،

تاریخ کی بحث میں تائن بی نے ایسے ہی مفروضات کو داخل کیا، اور واٹ، ویلز، جارج، بُجر
اور لوری وغیرہ سارے مستشرقین کی تحقیقات کا لب لباب یہ ہے
کہ قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تالیف ہے اور اس کے مصادر و مراجع توریت
وانجیل ہیں، سارے مستشرقین کا ایک نتیجہ پر متفق ہو جانا محض اتفاقی بات نہیں ہے،
اصل یہ ہے کہ وہ تعصب اور نفسانی خواہشات میں متفق ہیں، اس کے بعد کسی علمی مسئلہ
کسی آزادانہ اظہار رائے کی توقع ہی کیوں کر کی جا سکتی ہے، محمد اسد کے قول کے مطابق
مستشرقین کی تحقیقات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گویا اسلام ایک علمی مباحثہ کا موضوع
بننے کا اہل ہی نہیں، بلکہ وہ ایک مجرم ہے، اور اپنے منصفوں کے سامنے فیصلہ کے لئے
دست بستہ کھڑا ہے،

مستشرقین کے اعتراضات کا جواب مسلمان اہل قلم نے بار بار دیا ہے کہ اگر قرآن نے
توریت وانجیل سے استفادہ کیا ہوتا تو سب سے پہلے یہود ہی اس کا اعتراف کرتے اور
قرآن کو تسلیم کرتے لیکن یہود تو کسی نبی اور پیغمبر کے نہ ہوئے سب کے ساتھ ان کا رد
بغض وکینہ اور خبث باطن کا رہا، نبی کریمؐ کی مخالفت میں بھی انھوں نے مشرکین مکہ کے
ساتھ ساز باز کی، مقصد یہی تھا کہ قرآن کریم کے وحی الٰہی ہونے پر طعن وطنز کا موقع ملے اگر
توریت وانجیل کی تعلیمات قرآن نے پیش کی ہوتیں تو یہودیوں کو تو سب سے پہلے قرآن
کو تسلیم کرنا چاہئے تھا، مستشرقین کے اعتراضات کے جواب میں چند مغربی اہل قلم مثلاً ارنسٹ
نے بھی اظہار خیال کیا ہے، وہ اپنی کتاب الاسلام والمسیحیۃ الحقیقیۃ میں لکھتے ہیں، کہ انجیل کے
صحیفوں میں جس عقیدہ اور دینی نظام کو پیش کیا گیا ہے، اسے حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات
قرار نہیں دیا جا سکتا، آج مسیحیت اور اسلام کے درمیان موجودہ نزاع کا تعلق حضرت عیسیٰؑ

کی انجیل سے نہیں بلکہ پال کی انجیل سے ہے جس نے انجیل کی غلط تشریح کی، اور متضاد قصوں اور افسانوں کو باہم خلط ملط کر دیا، اس کے علاوہ انجیل میں اسلوب کے لحاظ سے بھی بنیادی اختلاف موجود ہے، کیونکہ انجیل کے صحیفوں لوقا، متی، یوحنا، مرقس اور برنابا کے کاتب الگ الگ ہیں، اس لئے یہ قرآن معنی اور اسلوب دونوں طرح سے توریت و انجیل سے ممتاز ہے،

(مستشرقین کے نام عربی میں جس طرح لکھے ہیں، اسی طرح اس ترجمہ میں لکھ دیئے گئے ہیں)

(باقی)

دار المصنفین کی بعض عربی مطبوعات

الانتقاد علی التمدن الاسلامی :۔ مصر کے مشہور مورخ اور صحافی اور الہلال مصر کے اڈیٹر جرجی زیدان کے سلسلۂ تاریخ تمدن اسلامی پر مولانا شبلی کے قلم سے عربی میں تنقید،

الجزیہ — تنگ نظر ہندو مورخین کے جزیہ پر اعتراض کا جواب، قیمت

بدء الاسلام — مولانا شبلیؒ کے زمانۂ قیام علی گڈھ کا سیرت پر عربی میں ایک مختصر رسالہ،

الرسالۃ المحمدیہ — مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے خطبات مدراس کا عربی میں ترجمہ،

دروس الادب جزء اول } عربی کے ابتدائی درجوں کے لئے صرف و نحو میں
" " جزء ثانی } دو ریڈریں، قیمت ۲/۳ روپیہ

لغات جدیدہ (زیر طبع) — جدید عربی کے نئے الفاظ کی مکمل ڈکشنری
(مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی)

"منیجر"

علامہ سید سلیمان ندویؒ کا علمی کارنامہ

از

پروفیسر عبد المغنی شعبۂ انگریزی پٹنہ یونیورسٹی

علامہ سید سلیمان ندویؒ غیر منقسم ہندوستان کے اُن معدودے چند عظیم ترین علماے کرام میں ایک تھے جنھوں نے عصر حاضر کی علمی زندگی پر اپنا نقش دوام ثبت کیا ہے، شبلی، حالی، سرسید اور نذیر احمد کے بعد جن چار اہم ترین علماء نے دنیا میں ہندوستان کا نام روشن کیا وہ یہ ہیں: علامہ اقبال، علامہ ابوالکلام آزاد، علامہ سید سلیمان ندوی اور علامہ ابوالاعلیٰ مودودی، ان چاروں نے اپنا امتیاز وقت کے بہت بڑے بڑے ان علماء کے درمیان قائم کیا جو ہندوستان کے اندر اور باہر اپنی بصیرت اور خدمت کے لیے نمایاں ہوئے اور اپنی اپنی جگہ پورے پورے ادارے کا کام کیا، نئی نسلوں کو متاثر کیا اور ایک ذہنی فضا قائم کی ان کے پیش روؤں میں شبلی اور سرسید نے انیسویں صدی کے اواخر میں ملک و ملت پر مغربی علوم کے بڑھتے ہوئے تسلط کا زبردست مقابلہ کیا تھا اور مشرقی تہذیب کے خلاف مستشرقین کی سازشوں کا پردہ چاک کرنے میں بڑی موثر کوشش کی تھی، خاص کر شبلی نے اپنے علمی کارناموں سے ثابت کر دیا تھا کہ اہل مغرب تاریخ کے مطالعہ میں کم علم بھی ہیں اور بددیانت بھی، لہٰذا اہل مشرق کو ان سے مرعوب ہونے کے بجائے محنت و قابلیت کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنا چاہیے، اسی مقصد کے لیے شبلی نے دارالمصنفین کا خاکہ مرتب کیا اور ندوۃ العلماء کی تشکیل کی، لیکن تحقیق و تصنیف کی جو شاہراہ انھوں نے روشن کی تھی

تعبیر مکمل کرنے کا انھیں موقع ملا اور نہ وہ اس پر کوئی کارواں لے کر چل سکے، ان کی وفات نے ان کے منصوبہ کو صرف ایک خوش آیند خواب بنا دیا، یہ خواب اقبال نے بھی اپنے طور پر دیکھا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ شبلی اس میں رنگ بھریں، مگر ان کی موت نے اس خواب کو ادھورا چھوڑ دیا، ابوالکلام آزاد کے اپنے علمی اجتہادات کے خواب بھی ان کی سیاسی سرگرمیوں اور تحریک آزادی کی مشغولیتوں کے سبب بکھر گئے، ابوالاعلیٰ مودودی بھی افق پر ابھرے نہ تھے۔

چنانچہ بقول اقبال جسے اسلام کے چمن فرہاد نے شبلی، اقبال اور ابوالکلام آزاد سبھی کے خواب شیریں کی تعبیر نکالی اور اس کو پورا کرنے کے لیے تحقیق و تصنیف کی ایک شاہراہ تعمیر کی، نیز اس پر گامزن ہونے کے لیے ایک پورا قافلہ مرتب کیا اور اس کو منزل کی طرف رواں دواں کر دیا، اس کا نام سید سلیمان ندوی ہے، اس فرہاد علم و تحقیق نے اعظم گڈھ میں دارالمصنفین کو پروان چڑھایا، اور ندوۃ العلماء کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لیا، دارالمصنفین کے ترجمان کی حیثیت سے ماہنامہ "معارف" جاری کیا، سیرۃ النبیؐ کی تکمیل کی، سیرت عائشہؓ مرتب کی، عرب و ہند کے تعلقات کا سراغ لگایا، خطبات مدراس دیئے، نقوش سلیمانی تحریر کیے، عمر خیام کی حقیقت و اہمیت واضح کی اور تاریخ اسلام سے لیکر سیرالصحابہ اور بزم صوفیہ تک تصنیف کرائی، اس کے علاوہ سید سلیمان ندویؒ نے وفد خلافت سے عالم اسلامی تک بین الاقوامی اور بین الملکی سطح پر ملک و ملت کی یادگار خدمات انجام دیں، واقعہ یہ ہے کہ تقسیم ہند سے قبل کے ہندوستان میں سید صاحب کے زیر قیادت ادارے علمائے وقت کے مراکز ہو گئے اور علمی و تحقیقی کاموں کے لیے ان کے تمام ہمعصر علماء؛ اقبال؛ ابوالکلام آزاد اور ابوالاعلیٰ مودودی وغیرہ نے ان اداروں کے ساتھ ہر طرح سے تعاون کیا۔

سیرۃ النبیؐ علامہ سید سلیمان ندویؒ کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اسکی سات عظیم الشان جلدوں میں پانچ ان کی ہی لکھی ہوئی ہیں، اس کتاب میں پہلی بار دنیا کی کسی زبان میں سیرت رسولؐ کے موضوع پر تمام ضروری مضامین و مضمرات کا احاطہ جدید ترین معلومات کی روشنی میں کیا گیا، چنانچہ سیرت پر کوئی اتنی جامع کتاب

آج تک نہ تو اس سے قبل تحریر کی گئی نہ اس کے بعد۔ یہ کتاب وہ تاریخی دستاویز ہے جس کے ذریعہ مستشرقین کہلانے والے علمائے مغرب کی ان جہالتوں کا پردہ چاک کر دیا گیا جو وہ سیرت رسولؐ پر اپنے متعصبانہ حملوں میں ظاہر کرتے رہتے تھے، واقعہ یہ ہے کہ سیرۃ النبیؐ کے ذریعہ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اسلام کے اس نظام حیات کا مکمل نقشہ پیش کرنے کی کوشش کی جو شارع اسلامؐ نے خود اپنی زندگی میں احکام وحی کے تحت مرتب کر دیا تھا اور اس کے ہر پہلو پر عمل کر کے بھی دکھا دیا تھا، سیرۃ النبیؐ میں قرآن و حدیث کے علاوہ سیرت کے تمام قدیم مآخذ کا عطر پیش کر دیا گیا اور اس سلسلہ میں جدید مباحث کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے اب یہ کتاب بجائے خود سیرت نبویؐ کا ایک اہم ترین ماخذ بن گئی ہے اور سیرت پر کوئی علمی کام اس سے بے نیاز ہو کر نہیں کیا جاسکتا، واقعہ یہ ہے کہ اس ایک کتاب نے اپنے مواد و اثر دونوں سے سیرت کی بے شمار کتابیں اور مضامین و مقالات پیدا کر دیے، نیز لاتعداد خطیبوں کو مستند مقرر بنا دیا، پوری دنیا میں اس کتاب کے علمی معیار و وقار کو تسلیم کیا جاچکا ہے اور متعدد زبانوں میں اس کے تراجم کی کوششیں کی گئی ہیں جو ابھی تک شاید کتاب کے وزن و حجم کے سبب جزوی ہی طور پر کامیاب ہوسکی ہیں، کتاب کے مباحث سید صاحب کو بیک وقت سیرت نگار، محدث، مفسر، فقیہ، متکلم اور ادیب کی اعلیٰ حیثیتوں میں پیش کرتے ہیں۔

سیرت نبویؐ کے ساتھ اسی شغف نے علامہ سید سلیمان ندویؒ سے تین اور زبردست علمی کام کرائے، جن میں ایک "ارض القرآن" ہے، جو دراصل سیرۃ النبیؐ کے دیباچہ کے طور پر ایک مبسوط مقالہ کی شکل میں تصنیف کی گئی تھی اور اس میں قرآن حکیم کی تاریخی و جغرافیائی تفسیر کے طور پر ان مقامات و اقوام کی تفصیل بیان کی گئی ہے، جن کا ذکر اور حوالہ قرآن کریم میں آیا ہے اس کا کچھ حصہ سیرۃ النبیؐ میں شامل کیا گیا، پھر پورے مواد کو زیادہ شرح و بسط کے ساتھ ایک مستقل کتاب کی صورت دے دی گئی، اس طرح ایک دوسری کتاب کے مقدمہ سے بڑھ کر جو چیز بجائے خود ایک مستقل کتاب بن گئی، وہ قرآن کے مباحث اور شارع اسلامؑ کی

سیرت کا مکمل جغرافیائی و تاریخی پس منظر پیش کرتی ہے اور اس کے مطالعہ سے آشکارا ہوتا ہے کہ اصولی طور پر کتاب اللہ میں اور عملی طور پر سنت رسولؐ کے نمونہ میں نظام اسلام کا جو بنیادی خاکہ مرتب ہوا وہ تاریخ کے کن احوال اور روئے زمین کے کن مقامات کے پس منظر میں رونما ہوا، یہ کتاب ابھی تک اپنے موضوع پر سب سے اہم علمی تصنیف ہے اور اس سے بہتر کوئی تصنیف دنیا کی کسی زبان میں مرتب نہیں ہوئی ہے۔

اس سلسلہ کی دوسری چیز "خطبات مدراس" ہے جس میں سیرت رسولؐ کی جامعیت کو بڑے جامع مختصر اور دلنشین انداز میں نمایاں کیا گیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب سیرت رسولؐ کا عطر ہے اور صد درجہ موثر ہے، سیرت کے موضوع پر یہ عالمانہ و محققانہ خطبات اپنے مواد و انداز دونوں کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہیں مساجد کے منبروں اور جلسۂ سیرت کی محفلوں میں ان خطبات کی گونج آج بھی سنائی دیتی ہے، نئی نسلوں نے سیرت اور سنجیدہ خطبات کے کتنے ہی سبق ان خطبات سے لیے، کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب سیرت رسولؐ کا بہترین خلاصہ پیش کرتی ہے۔

تیسری سیرت رسولؐ جو سید صاحبؒ کے قلم سے نکلی، رحمت عالمؐ ہے، جو نوجوانوں اور عام طالب علموں کے لیے مختصر پیمانے پر اور سادہ انداز میں تحریر کی گئی ہے، یہ کتاب متعدد درسگاہوں کے نصاب میں داخل رہی ہے، یہ اپنے موضوع پر سب سے آسان اور عام فہم تصنیف ہے، جس کا مطالعہ کر کے معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی سیرت رسولؐ کی مستند واقفیت حاصل کر سکتا ہے، اور اس کی روشنی میں اپنی زندگی سنوار سکتا ہے۔

سیرت عائشہؓ اپنے موضوع پر ایک نادر تصنیف ہے، جس میں ام المومنین کی زبردست شخصیت کا مکمل و موثر خاکہ پیش کیا گیا ہے، اس کتاب کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کی مثالی عورت کیا اور کیسی ہو سکتی ہے اور کس طرح وہ پردے کی شرعی حدود میں رہتے ہوئے سماج کی بہترین علمی و عملی خدمات انجام دے سکتی ہے نیز بحیثیت عورت اپنی شخصیت کے تمام امکانات کو بروئے عمل لا سکتی ہے، یہ کتاب بھی

اعلیٰ تحقیق کا نمونہ ہے اور اپنے موضوع کے جدید و قدیم ماٰخذ کا احاطہ کرتی ہے، اس کے صفحات میں رسول کریمؐ کے اہل بیت کا ایک مستند نقشہ ملتا ہے اور دنیا کے سب سے بڑے انسان کی پاکیزہ خلوت کا ایمان افروز جلوہ نظر آتا ہے۔

اسلام کی ان خالص دینی خدمات کے علاوہ علامہ سید سلیمان ندویؒ ملت اسلامیہ کی تاریخ اور مسلمانوں کے کارناموں کی تحقیق سے بھی حد درجہ شغف رکھتے تھے، اس سلسلہ میں متعصب انگریز مورخین اور ان کے مقلد فرقہ پرست ہندو تاریخ نویسوں کی طرف سے آئے دن جو فتنے جاہلانہ و وحشیانہ انداز میں اٹھائے جاتے تھے، ان کا مسکت و موثر جواب دینے کے لیے سید صاحب کے زیرِ قیادت پورا دارالمصنفین اور اس کا رسالہ معارف تو سرگرم تھا ہی، خود سید صاحبؒ نے ایک بہت ہی وسیع اور اہم موضوع "عرب و ہند کے تعلقات" کو ایک بسوط محققانہ تصنیف کے لیے منتخب کیا اور اپنی معلومات و دلائل سے ثابت کر دیا کہ ہندوستان کے ساتھ عربوں کے تعلقات اس ملک پر مسلمانوں کی فوج کشی کے بہت قبل اور قدیم ترین ادوار سے تجارتی، ثقافتی اور علمی سطحوں پر رہے تھے، لہٰذا ہندوستان میں مسلمان اجنبی حملہ آوروں کی طرح نہیں داخل ہوئے، نہ انھوں نے اپنے مفتوحین کے ساتھ جاہل وحشیوں جیسا سلوک کیا، بلکہ وہ اس ملک میں ایک ایسے زبردست تہذیبی و اصلاحی عنصر کی طرح داخل ہوئے، جس نے اپنی سیاسی و عسکری طاقت سے بھی زیادہ اپنے علمی و اخلاقی کمالات سے پورے ملکی سماج کی نشاۃِ ثانیہ کا سامان کیا۔

عرب دنیا میں اسلام کے پیغام کے اولین علمبردار تھے اور انھوں نے آج کی نئی دنیا کی بنیاد رکھی تھی، دورِ جدید کے علوم و فنون کی بیشتر ایجادات و انکشافات کی راہیں عربوں نے ہی ہموار کی تھیں، انھوں نے اپنی تحقیق و تفتیش کے ذریعہ مشرق و مغرب کی طنابیں کھینچ کر ملا دیں اور عہدِ وسطیٰ میں سائنسی آلات کے ساتھ ساتھ حکیمانہ نقشے بنا کر پوری دنیا کی سیر و سیاحت کی، نئی دنیاؤں کی دریافت میں واسکوڈی گاما اور کولمبس کی

ہنمائی و رہبری عربوں ہی نے کی، لیکن احسان فراموش اہل مغرب اپنے جاہلانہ تعصبات کی بنا پر ہوں عربوں
کے کارناموں کو نہ صرف یہ کہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے، بلکہ انھیں دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ
رکھنا چاہتے تھے، تاکہ ایک طرف اپنی ذہنی برتری کا سکہ عالم انسانیت پر جمائے رکھیں، اور دوسری طرف
مسلمانوں کو احساسِ کمتری میں مبتلا رکھیں، علامہ سید سلیمان ندوی نے اس سلسلہ میں ایک اہم موضوع
"عربوں کی جہاز رانی" پر صرف چار خطبات میں علمائے مغرب کے فریب کا پردہ چاک کر دیا، اور واضح
کیا کہ دورِ حاضر کی جہاز رانی کے استاد اول عرب ہی ہیں۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے ہندوستان میں عربی زبان و ادب کی اشاعت کی طرف بھی توجہ
کی، وہ عربی کے عالم اور ادا شناس تھے، انھوں نے اس زبان کی ترویج کے لیے ایک طرف
"دروس الادب" لکھی، جو عربی دانی کے ابتدائی نصاب کے طور پر درسگاہوں میں تجویز کی گئی، اور
دوسری طرف ایک "لغات جدیدہ" کی تالیف کر کے جدید عربی صحافت و ادب کے تمام مروجہ الفاظ
اور اصطلاحات کی تشریح کی، اس کے علاوہ اپنی نگرانی میں عربی رسالہ "الضیاء" کا اجرا کیا
جو ایسا رسالہ ہے جس نے پہلی بار ہندوستان کے ساتھ عالم عربی کا براہ راست رابطہ قائم کرایا، اور
دار المصنفین ندوی نیز ابو الحسن علی ندوی جیسے عربی کے ادیب پیدا کیے، مسعود عالم ندوی نے اپنے
قلم کے ذریعہ اور خصوصاً مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کے اردو لٹریچر کا ترجمہ کر کے اسے عالم عربی کا
علمی اثاثہ بنا دیا، ابو الحسن علی ندوی کے عربی خطبات دنیائے عرب میں نشر ہوئے، اور ان کے
ذریعہ سے اقبال کے کلام و پیام کی تفہیم کا بھی کچھ کام عربی زبان میں ہوا۔

سید صاحبؒ فارسی ادب کا بھی نہایت عمدہ ذوق رکھتے تھے، اور اس زبان کے محاورات پر ان کی
نظر اتنی وسیع تھی کہ بعض وقت علامہ اقبالؒ جیسے فارسی کے عظیم ترین شاعر کو انھوں نے زبان و بیان
کی غلطیوں کی طرف متوجہ کیا اور اقبالؒ نے نہایت خوش دلی اور احترام کے ساتھ اس سلسلہ میں سید صاحبؒ

تبادلہ خیال کیا، جس کا ثبوت مکاتیب اقبال میں موجود ہے، سب سے بڑھ کر عمر خیام پر سید صاحبؒ کی معرکہ آرا کتاب عصر حاضر کے ہندوستان میں شعر العجم کے بعد فارسی تنقید کا سب سے بڑا کارنامہ ہے اور اس کی بہت ہی شاندار پذیرائی ایران و افغانستان اور دوسرے ممالک کے فارسی داں طبقوں میں ہوئی، یہاں تک کہ علامہ اقبالؒ نے یہ داد دی کہ خیام پر سید صاحب نے جو کچھ لکھ دیا ہے وہ نہ صرف یہ کہ ماضی میں خیام پر کی ہوئی تمام تحقیق و تنقید میں زبردست اضافہ ہے، بلکہ آیندہ بھی کوئی اضافہ خیام کے متعلق سید صاحبؒ کی تصنیف پر متوقع نہیں ہے، یہ نادر کتاب اس مقالہ پر مبنی ہے جو سید صاحب نے دسمبر ۱۹۲۳ء میں آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے اجلاس پٹنہ میں پیش کیا تھا، یہی وہ تصنیف ہے جس میں پہلی بار خیام کے بارے میں کم علم مستشرقین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ کرکے قطعی طور پر ثابت کر دیا گیا ہے کہ فارسی کا یہ مشہور ترین رباعی گو کوئی رند شاہد باز نہیں، اپنے وقت کا ایک عظیم فلسفی اسکالر اور سائنس داں تھا۔ اردو زبان و ادب کے تو سید صاحبؒ ایک عظیم محقق، عالم، ادیب اور خطیب تھے ہی، زبان کے سلسلہ میں ان کی تحقیق اور ادب پر ان کی تنقید کا اعلیٰ نمونہ ان کے مجموعۂ مضامین، نقوش سلیمانی میں موجود ہے، انھوں نے اردو زبان کی ابتدا اور نشو و نما کے متعلق جو تحقیق کی ہے، وہ ان کو ایک اہم ماہر لسانیات ثابت کرنے کے لیے کافی ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں ان کی کاوشوں کے حوالے لسانیات پر لکھنے والے دیتے رہتے ہیں، ادب پر ان کی تنقیدوں کی مثال ان کے ذوق کی پختگی اور ذہن کی رسائی پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہے، جگر مرادآبادی کے کلام کی تحسین سید صاحبؒ نے اس وقت کی جب نیاز فتحپوری جیسے لوگ اس کی تنقیص کیا کرتے تھے، آج نیاز فتحپوری کو نقاد کی حیثیت سے جاننے اور ماننے والے خال خال ہی ہیں، جب کہ جگر کی جگہ شعرائے اردو کی صف اول میں محفوظ ہو چکی ہے، کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح آسی گونڈوی کی شاعرانہ اہمیت علامہ ابوالکلام آزاد نے اس وقت واضح کی جب کم لوگ ان کے مرتبہ شناس تھے، اسی طرح علامہ سید سلیمان ندوی نے جگر کی قدر شناسی اس وقت کی جب ناقدین ان کے مرتبہ

تعین نہ کرسکے تھے، دوسری مثال کلامِ شاد کے ایک مجموعہ پر سید صاحبؒ کا وہ معرکۃ الآرا تنقیدی مقدمہ ہے، جس میں انھوں نے شاد کی شاعرانہ عظمت کی تعیین کرتے ہوئے دنیائے ادب میں پہلی بار دلّی اور لکھنؤ کے مقابلہ میں عظیم آباد کے مکتبِ شاعری کی یہ خصوصیت واضح کی کہ اس میں لکھنؤ کی خارجیت اور دلّی کی داخلیت کا متوازن امتزاج ہے، بعد میں بہار کے کئی ادیبوں اور ناقدوں نے سید صاحبؒ کے دریافت کردہ اس تنقیدی نکتے کی اشاعت اپنے متعدد مضامین میں اپنے طور پر کی، یہاں تک کہ جناب کلیم الدین احمد جیسے نکتہ چین اور عیب جو نقاد نے اپنی کتاب "اردو شاعری پر ایک نظر" میں شاد کو شاعر نہ تسلیم کرنے کے باوجود "کلیاتِ شاد" کی ترتیب کر کے اس کے مبسوط مقدمہ میں خواہ مخواہ غلط ہی طور پر سہی شاد کو میر و غالب کے ساتھ تثلیثِ تغزل کا ایک رکن قرار دے کر اپنی پچھلی تنقیدی غلطی کا سجدہ سہو کر لیا،

زبان کے مسئلہ پر سب سے پہلے علامہ سید سلیمان ندویؒ ہی نے مارچ ۱۹۳۳ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی انجمن اردوئے معلی کے جلسہ میں "ہندوستان میں ہندوستانی" کے عنوان سے ایک مبسوط مقالہ پڑھ کر واضح کیا کہ اردو کا صحیح نام "ہندوستانی" ہونا چاہیئے جو دسویں صدی عیسوی سے تاریخوں میں اردو کے لیے مستعمل بھی ہے اور یہی لفظ پورے ہندوستان کی حقیقی قومی زبان کی حیثیت سے اردو کا صحیح اور موزوں نام بھی ہے، (اس سے بہت قبل ۱۹۱۷ء میں بھی وہ اس مسئلہ پر اظہارِ خیال کر چکے تھے) اس تجویز نے ہندی کے اردو دشمن فرقہ پرستوں کے قدموں تلے سے زمین نکال لی اور انھوں نے بڑی ہٹ دھرمی اور ڈھٹائی سے بالکل ناجائز طور پر "ہندی اتھوا ہندوستانی" کی رٹ لگانی شروع کر دی، بعد میں جب عبدالحق راجندر پرشاد پیکٹ کے ذریعہ ۱۹۳۸ء میں زبان کے قومی مسئلہ کا حل پٹنہ میں ایک میثاق پر فریقین کے دستخط سے نکالا گیا تو پورے ملک کی قومی زبان کا نام "ہندوستانی" رکھا گیا اور اس کے لیے اردو اور دیوناگری دونوں رسوم خط تجویز کیے گئے۔

ہندوستان کی تاریخ اور ملک میں تعلیم کے مسائل پر علامہ سید سلیمان ندویؒ کی کاوشیں بے حد اہم ہیں، انھوں نے تاریخ ہند کا ایک مکمل خاکہ مرتب کیا تھا اور اس کے مطابق اپنے رفقاء سے تالیف و تصنیف کے

کام اپنی نگرانی میں کراتے رہے، چنانچہ سید صاحب کے مضامین کے علاوہ دارالمصنفین کی کتابوں نے عہدِ اسلامی
کی تاریخ ہند کے کتنے ہی تاریک گوشے روشن کر کے ملک میں مسلمانوں کے ماضی کی سچی اور تابناک تصویریں پیش کیں،
جب کہ متعصب و عیار انگریز اور ان کے فرقہ پرست ہندو شاگرد تاریخ نویسی کے نام پر مسلم حکمرانوں کی جھوٹی اور
گڑھی ہوئی تصویریں پیش کرنے میں لگے ہوئے تھے، یہاں تک کہ اسکولوں اور کالجوں کی درسیات میں تاریخ کے نام سے افسانے
پڑھا پڑھا کر نئی نسلوں کو گمراہ کر رہے تھے، اور واقعہ یہ ہے کہ سیاست میں فرقہ وارانہ تفریق و تقسیم کا زہر یا بیج انہی
بے ضمیر اور سیہ کردار انگریز اور ہندو مورخوں کا بویا ہوا ہے، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اس قسم کی جاہلانہ تاریخ نویسی
کو مورخانہ شتر مرغ کا نام دیا اور بتایا کہ جب غلط اندیش مورخوں کی جہالت کا پردہ چاک کیا جاتا ہے تو وہ
اسے تاریخی افسانہ کہہ کر پہلو بچاتے ہیں، ورنہ اپنے افسانوں ہی کو تاریخ بنا کر پیش کرتے ہیں، خاص کر
اورنگ زیب کے سلسلہ میں تو ان افسانہ نگار مورخوں نے جہالت اور شرارت کی انتہا کر دی ہے، اور ایک
صالح و مصلح، پرہیزگار اور رعایا پرور بادشاہ کو جابر و متعصب حکمراں کی شکل میں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ
اس کی زندگی کے کسی دور میں بوالہوسی اور اس کے حرم میں عشق بازی تک کا سراغ لگا لیا ہے۔

جس طرح صحیح تاریخ نویسی کے ذریعہ سید صاحبؒ ماضی کا ریکارڈ درست کرانا چاہتے تھے، تاکہ
حال کی درستگی کا سامان ہو، اسی طرح نصاب تعلیم کی اصلاح کر کے وہ مستقبل کی بہتری اور آیندہ نسلوں کی رہنمائی
کا انتظام بھی کرنا چاہتے تھے، اس سلسلہ میں مختلف مواقع پر انھوں نے متعدد اہم تجویزیں پیش کیں اور
کثرت کے ساتھ تعلیمی اجتماعات سے خطاب کیا، چنانچہ نہ صرف پورے ملک میں بلکہ بیرون ملک بھی انھیں
مشرقی تعلیمات پر ایک سند تسلیم کیا گیا اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے درسیات کی ترتیب میں ان کی خدمات
حاصل کی گئیں، اس سلسلہ میں قدیم علماء کے ساتھ ساتھ جدید فضلاء کو بھی علوم مشرقیہ میں ان کی مہارت پر
کامل اعتماد تھا، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے بعض صوبوں کی حکومتوں سے لے کر حکومت افغانستان
تک نے اپنی درسگاہوں کے نصاب تعلیم و تشکیل جدید کے لیے سید صاحبؒ کو دعوت دی اور انھوں نے

بڑی خوبی کے ساتھ یہ مشکل کام انجام دیا۔

سید صاحبؒ نے "حیات شبلی" لکھ کر سوانح نگاری کے فن میں ایک بیش بہا اضافہ کیا، یہ تصنیف نہ صرف یہ کہ اردو کے سب سے بڑے سیرت نگار، عظیم مورخ، بہت بڑے محقق، زبردست قائد، وسیع النظر عالم، صاحب طرز ادیب، خطیب اور فارسی کے سب سے بڑے ہندوستانی نقاد، نیز منفرد شاعر کی سوانح حیات ہے، بلکہ ہندوستان کی قومی و ملی نشاۃ ثانیہ کے سب سے اہم معمار اور اس کے پورے عہد کی اجتماعی سرگرمیوں کی سرگذشت ہے، دنیا میں مغرب کے علمی و فکری غلبہ کے بعد مشرق کی ذہنی و علمی نشاۃ ثانیہ کی راہ ہموار کرنے کے لیے انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں جن علماء و فضلاء نے تاریخ ساز کارنامے انجام دیئے، ان میں سب سے بڑا نام علامہ شبلیؒ کا ہے، جنھوں نے ایک ایسا دبستان فکر ترتیب دیا جس کا ہر رکن اپنی جگہ ایک دبستان بن گیا اور جس سے اثر قبول کرنے والوں نے زمانہ کا رخ بدل دیا، خواہ وہ اقبال ہوں، ابوالکلام ہوں، سید سلیمان ہوں یا ابوالاعلیٰ، ایسی ہمہ گیر شخصیت کی کامیاب سوانح نگاری بجائے خود ایک کار عظیم ہے اور علامہ سید سلیمان ندویؒ نے یہ کار عظیم کر دکھایا، "حیات شبلی" اردو کی سب سے بڑی سوانح عمری ہے۔

بات یہ ہے کہ شبلی اپنی ذات میں ایک دائرۃ المعارف تھے، ان کا علم بھی قاموسی تھا اور عمل بھی ہمہ جہت، یہی قاموسیت اور ہمہ جہتی خود علامہ سید سلیمان ندویؒ کی شخصیت میں رونما ہوئی اور انھوں نے مختلف علوم و فنون کا دائرۃ المعارف بن کر ہی وہ اہم کمالات دکھائے اور عظیم کارنامے انجام دیے جن کا ذکر گذشتہ سطور میں بہت ہی مختصر طور پر کیا گیا، واقعہ یہ ہے کہ سید صاحبؒ نے ایک اردو انسائیکلوپیڈیا کی تحریک بھی زور و شور سے کی، مگر اس سلسلہ میں ان کو کافی اور موثر تعاون نہ ملا، بہر حال ان کی اپنی علمی کاوشیں اور دارالمصنفین کی کوششیں بجائے خود ایک قاموسی تحریک اردو زبان و ادب میں ثابت ہوئیں اور ان کے نتیجے میں بے شمار ادیب، محقق اور مصنف مختلف علوم و فنون میں پیدا ہوئے، یہی وجہ ہے کہ اب تک

دنیائے اردو یا عالم اسلام کا کوئی علمی ادارہ دارالمصنفین سے بڑھ کر گہوارۂ علم و ادب ثابت نہیں ہوا ہے۔

تقسیم ہند سے قبل تقریباً نصف صدی تک علامہ سید سلیمان ندویؒ کی ذات ہندوستان میں علوم مشرقی کا مرکز و مرجع تھی اور ملک کے تمام علمی ادارے خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید، اپنے اہم ترین امور میں ان کی طرف رہنمائی کے لیے دیکھتے تھے، شاید ہی کوئی تعلیمی یا تہذیبی سرگرمی ہو جس میں سید صاحبؒ کے مشورے شامل نہ ہوں۔ مختلف مذہبی، سماجی اور سیاسی تحریکوں میں بھی ان کی شمولیت اور ہدایت ضروری سمجھی جاتی تھی عالم اسلام کے مسائل میں بھی ہندوستانی مسلمانوں کی جو اعلیٰ قیادت دلچسپی لیتی اور بین الاقوامی سطح پر کام کرتی تھی اس کے ایک اہم ترین رکن سید صاحبؒ بھی تھے، ان کے زیر ادارت دارالمصنفین کا ترجمان ماہنامہ "معارف" ہندوستانی مسلمانوں کا سب سے بڑا علمی ترجمان تھا اور اس دور ادارت کا شاید ہی کوئی واقعہ، قومی یا بین الاقوامی دائرے میں ایسا ہو جس پر محکم اور موثر تبصرہ "معارف" میں نہ ہوتا ہو، ملک کی تحریک آزادی ہو یا مشرق کی نشاۃ ثانیہ یا مغرب کی دو عظیم جنگوں کے اثرات، یا عالم اسلام کے واقعات، سبھی کے تاریخ ساز مسائل پر مدیر معارف کی عالمانہ و عاقلانہ رائے کا وزن محسوس کیا جاتا تھا۔

لیکن اپنے تمام علمی کمالات اور عملی مجاہدات کے باوجود علامہ سید سلیمان ندویؒ نے عصر حاضر کے اجتماعی مسائل کے حل کے لیے نہ تو کوئی باضابطہ تحریک چلائی نہ مستقل تنظیم قائم کی، صرف ندوۃ العلماء کے تعلیمی، دارالمصنفین کے تصنیفی اور معارف کے علمی اداروں سے کام لیتے رہے، ایسا اس لیے ہوا کہ وہ بڑے پیمانے پر منظم اقدام اور پیہم جد وجہد کے لیے آمادہ نہ تھے، خاص کر کسی سیاسی کش مکش کی قیادت قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے، ان کی شخصیت کا یہی وہ میلان تھا جو انھیں تصوف کی طرف لے گیا اور وہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔

عہد عباسی میں کتبخانوں کی ترویج و اشاعت کے اسباب

از

ڈاکٹر محمد عبدالسلیم چشتی سینیئر لائبریرین، بیرو یونیورسٹی، کانو، نائجیریا،

حکم اقرأ اور قیدوا العلم بالکتاب نے اہل علم کو علمی ذخیرہ کی کتابت، قرأت، جمع و تحفظ نشر و ابلاغ کا گرویدہ بنایا اور اس طرح انفرادی ذخائر سے کتب خانوں کا آغاز ہوا دوسری صدی ہجری میں انفرادی و عمومی اور فنی و خصوصی ذخائر کا اس تیزی سے ارتقاء ہوا کہ گھر گھر کتب خانے قائم ہوئے

عصر حاضر میں انفرادی کتب خانوں کو اہمیت حاصل نہ ہونے کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ خصائص سے خالی ہوتے ہیں لیکن عہد عباسی میں انفرادی کتب خانوں کی نوعیت اس سے یکسر مختلف تھی، وہ علمی ذخائر کا سرچشمہ تھے، تہذیبی و تمدنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے عوام و خواص کے ذہنوں کو مصفا و مجلا کرتے اور کتابی تہذیب کے ارتقاء میں مدد و معاون تھے، وہ بجا طور پر اپنی خدمات کے اعتبار سے ادارہ جاتی کتب خانے کہے جانے کے مستحق تھے، ان کی طلب و رسد سے سوق الکتب آباد تھے، جگہ جگہ پڑھنے لکھنے کا چرچا تھا، اور کتابوں کے ملنے اور ان کے ابلاغ کی سہولت حاصل تھی۔

اس مقالہ میں ہم نے عہد عباسی میں کتب خانوں کی ترویج و اشاعت کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے، انکی عددی حیثیت سے بحث کی ہے اور عہد عباسی میں شناخت کتب خانہ کے رہنما اصول کی نشاندہی کی ہے علاوہ عہد اسلامی میں کتب خانوں کی تاریخ کو سمجھنے میں مدد ملے گی، مسلمانوں کے کتب و کتب خانوں سے شغف، انکی حفاظت و اشاعت کا اور اس باب میں انکی سرگرمیوں کا نقشہ واضح ہو سکے گا نیز عالمگیر تحریک کتب خانہ سازی میں انکی مساعی کا علم بھی،

عہد عباسی میں کتب خانوں کی ترویج و اشاعت کے اسباب

عہد اسلامی میں عباسی دور کو یہ امتیاز حاصل رہا ہے کہ اس دور کے اوائل ہی میں کتابوں اور کتب خانوں کا رواج ہو چکا تھا کم و بیش ہر نامور عالم کے پاس ذاتی کتب خانہ ہوتا تھا، ہمارے اس خیال کی تائید حسب ذیل امور سے ہوتی ہے۔

(۱) اس دور کے ائمہ فن ایک دوسرے کی کتابوں کا تنقیدی نگاہ سے مطالعہ کرتے اور ایک دوسرے کی تردید میں کتابیں لکھتے تھے، یہ امر ان کے پاس ذاتی کتب خانہ ہونے کی نشاندہی کرتا ہے، چنانچہ عبداللہ بن نافع کا بیان ہے۔

"ابن ابی ذئب (۸۰ – ۱۵۸ھ / ۶۹۹ – ۷۷۵ء) عبدالعزیز ماجشون (د ۱۶۴ھ / ۷۸۰ء) ابن ابی حازم (۱۰۷ – ۱۸۴ھ / ۷۲۵ – ۸۰۰ء) محمد بن اسحاق (د ۱۵۱ھ / ۷۶۸ء) امام مالک بن انس (۹۳ – ۱۷۹ھ / ۷۱۲ – ۷۹۵ء) پر تنقید کرتے تھے ان میں زیادہ سخت محمد بن اسحاق تھا، وہ کہتا تھا میرے پاس ان کی کتابیں لاؤ میں ان کی خامیاں بتاؤں، میں ان کی کتابوں کا سالوتری ہوں"[۱]

امام اوزاعیؒ (۸۸ – ۱۵۷ھ / ۷۰۷ – ۷۷۴ء) نے امام اعظم ابو حنیفہ (۸۰ – ۱۵۰ھ / ۶۹۹ – ۷۶۷ء) کی کتاب السیر (جنگی قوانین) کی تردید میں کتاب لکھی تو امام ابو یوسفؒ المتوفی ۱۸۲ھ نے ان کی تردید میں الرد علی سیر الاوزاعی لکھی[۲] پھر امام ابو یوسفؒ نے امام اعظم ابو حنیفہؒ اور ابن ابی لیلیٰؒ (۷۴ – ۱۴۸ھ / ۶۹۳ – ۷۶۵ء) کے اختلافات فقہی پر اختلاف ابی حنیفہ و ابن ابی لیلیٰ لکھی[۳]، امام محمد المتوفی ۱۸۹ھ نے امام مالکؒ کی تردید میں کتاب الحجۃ تصنیف کی۔[۴] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک عالم کا ذخیرہ کتب دوسرے عالم کے پیش نظر رہتا تھا۔

---

۱ تاریخ بغداد ج ۱ ص ۲۲۴۔ ۲ الرد علی سیر الاوزاعی از ابو یوسف یعقوب تحقیق ابی الوفاء الافغانی مصر لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد الدکن ۱۳۵۷ھ ص ۴ مقدمۃ المحقق ۳ اختلاف ابی حنیفہ و ابن ابی لیلیٰ، از امام ابو یوسف القاضی تحقیق ابی الوفاء الافغانی لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد ۱۳۵۷ھ ص ۳ مقدمۃ المحقق ۴ الحجۃ علی اہل المدینۃ لمحمد بن الحسن الشیبانی تحقیق مہدی حسن الکیلانی مطبعۃ المعارف الشرقیہ ۱۳۸۵ھ

(۲) یہ ائمہ فن اور علماء ایک دوسرے سے کتابیں مستعار لیتے تھے، چنانچہ امام احمدؒ ابن حنبل مورخ ابن سعد کاتب واقدی المتوفی سنہ ۲۳۰ھ سے مورخ واقدی المتوفی سنہ ۲۰۷ھ کی تصانیف مستعار لے کر مطالعہ کرتے تھے[1]، امام شافعیؒ امام محمدؒ سے کتابیں لے کر پڑھتے تھے[2]، امام مالکؒ امام ابوحنیفہؒ کی کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے[3]۔

(۳) ائمہ فن اور اکابر علماء اہل علم کو دوسرے ائمہ فن کے ذخیرۂ علمی کو پیش نظر رکھنے، حاصل کرنے اور اسکی نشر و اشاعت کرنے کی ترغیب دیتے اور تاکید کرتے تھے، چنانچہ امام شافعی امام اعظمؒ کے سرمایۂ علمی کے متعلق فرمایا کرتے تھے[4]۔

الناس عیال علی ابی حنیفۃ فی الفقہ فقہ میں لوگ امام ابوحنیفہ کے محتاج ہیں۔

(۴) رحلہ (Travel for Research Work) علمی تاسیس اور ترویج و اشاعت کا سہرا مسلمانوں کے سر ہے، تمام علوم خاص طور پر تین اسلامی علوم تفسیر، حدیث، فقہ وہ علوم تھے اور ہیں، جن میں استنباط مسائل و استخراج معانی کا سلسلہ برابر قائم ہے، اور اس کا میدان بھی بہت وسیع ہے۔ عہد عباسی میں ہر بڑا عالم اپنی زندگی کا قیمتی حصہ اس کے معانی پر غور کرنے، سمجھنے اور ان سے مسائل استنباط کرنے میں صرف کرتا تھا، ان کے علمی ذخائر کو حاصل کرنے کے لیے سفر نہایت ضروری تھا، اسی لیے عہد عباسی میں مفسرین، محدثین، و فقہاء مشرق و مغرب کے دور دراز ممالک کا سفر کرتے تھے، پھر دوسرے علوم کی تکمیل و تحصیل کتب کے لیے بھی اسی طرح سفر کیا جانے لگا تھا، اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس سفر (رحلہ) کی غرض و غایت علوم و فنون میں

---

[1] تاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۲۲ [2] البدایہ والنہایہ لابن کثیر، ج ۱۰ ص ۲۰۲ - ۲۰۳ [3] تالیف الخطیب تالیف محمد زاہد الکوثری ص ۳۔ [4] مناقب الامام ابی حنیفہ و صاحبیہ ابی یوسف و محمد بن الحسن للذہبی حیدرآباد الدکن لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ سنہ ۱۳۶۶ھ ص ۱۹۔

تحقیق و تدقیق، اساتذہ فن کے ذخیرۂ کتب و کتب خانوں کی تحصیل اور ان کی نشر و اشاعت بھی اسی مقصد سے کیا جاتا تھا، چنانچہ ابو سفیان محمد لشکری معری المتوفی ۱۸۲ھ کے متعلق علامہ سمعانی رقمطراز ہیں۔

انما اشتهر بهذه النسبة رحلته الى معمر بن راشد الصنعانی لتحصیل کتبه وحدیثه[1]

موصوف کو معمر بن راشد صنعانی کی طرف نسبت سے شہرت حاصل ہے، موصوف نے سفر میں ان کی کتابیں اور حدیثیں جمع کرنے کے لیے کیا تھا، اور خزار ایلی کا بیان ہے۔

رحلت لکتب ابن جریج سنة خمسین ومائتین فوجدته قد مات[2]

میں نے ابن جریج کی طرف ۱۵۰ھ میں سفر کیا جب ان کے پاس پہنچا تو اس وقت ان کا انتقال ہو چکا تھا۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مقدس سفر علوم و فنون میں اختصاص حاصل کرنے، اساتذۂ فن کے فیوض علمی، ان کی کتابوں اور ان کے کتب خانوں کی ترویج و اشاعت کے لیے کیا جاتا۔

(۵) عہد عباسی میں ہر طالب علم اپنے استادوں کی امالی (Lectures) قلمبند کرتا، ان کی کتابیں جمع کرتا، انھیں جی جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا، اس لیے انہی کتابوں کے نسخے اس کے لیے سند ہوتے تھے، اکثر ان پر اس کے شیوخ و اساتذہ کے دستخط ہوتے یا ان سے پڑھنے کی صراحت ہوتی تھی، اس قسم کے نسخوں کو "الاصول" کہا جاتا تھا، اس دور میں ہر فن کا طالب علم اس نوع کا ذخیرۂ کتب دور طالب علمی ہی سے جمع کرنے لگتا تھا، جو اس کے پاس تحصیل علوم کے زمانے تک بہت بڑی تعداد میں جمع ہو جاتا تھا اور آیندہ اہل علم کو نقل کرنے پڑتے۔

---

[1] الانساب سمعانی، ورق ۵۳۳ ب ۳۰۶ [2] العبر ج ۱ ص ۲۲۱

مطالعہ کرنے کے لیے عاریۃً دیا جاتا تھا، جیسا کہ مورخ ابن سعد کاتب واقدی کے مذکورۂ بالا واقعہ سے ثابت ہے کہ یہ علماء "الاصول" کو اشاعت کے لیے اپنے پاس رکھتے تھے، چنانچہ نامور محدث ابو سہل ہارون بن احمد استرابادی المتوفی ۳۶۲ھ جن کے متعلق حاکم نیشاپوری نے لکھا ہے،
کان صحیح الاصول، کثیر الحدیث[1] موصوف کے پاس کتابوں کے اصل صحیح نسخے اور بہت حدیثیں تھیں۔

اور مورخ مستغفری نے "تاریخ نسف" میں لکھا ہے کہ

روزانہ ظہر کی نماز کے بعد باب مقصورہ پر املا کراتے تھے جن میں عامہ اہل علم اور امیر زادے شرکت کرتے تھے میں بھی اپنے بھائی، چچا، خدام اور اتالیق ابو علی منصور بن محمد کے ہمراہ ان کی کئی مجلسوں میں شریک ہوا تھا، اس وقت میری عمر دس برس کی تھی، میرے سماع احادیث کا آغاز انہی کی مجالس املا سے ہوا تھا، موصوف جامع مسجد اور ابو القاسم عبد اللہ کے محل سرا میں جو انھیں اپنے فرزند ابو نصر کی تعلیم کے لیے بخارا میں لایا تھا، "احادیث ابی حنیفہ عن ابی الولید الطیالسی وابراہیم بن بشار وغیرہما" نیز "اخبار مکہ" اور اپنے فوائد پڑھاتے تھے جو کچھ لوگوں نے ان سے سنا اور حاصل کیا تھا وہ "خانہ بزازین" کے فتنہ صفر ۳۶۰ھ میں برباد ہوا، اور ان کے مسموعات میں لوگوں کے پاس بہت تھوڑا رہا تھا[2]۔

اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ عامۂ اہل علم استاد سے جو پڑھتے وہ لکھ لیتے تھے، ان کا ذخیرۂ علمی کتابوں کی صورت میں ان کے پاس محفوظ ہوتا تھا، وہ گاہ بگاہ حوادثِ روزگار سے

---

[1] الانساب للسمعانی تحقیق عبد الرحمن الیمانی، حیدرآباد الدکن مطبعۃ مجلس دائرۃ المعارف العثمانیہ ۱۳۸۲ھ ج ۱ ص ۲۰۲ [2] ایضاً ج ۱ ص ۲۰۳۔

ضائع ہو جاتا تھا جیسا کہ ابو سہیل کا املا کرایا ہوا ذخیرۂ کتب بلوے میں برباد ہو گیا تھا۔ ابو موسیٰ ہارون بن محمد ازاذ داری جوینی المتوفی ۳۱۳ھ بلند پایہ ادیب و فقیہ تھے، نیشاپور میں پڑھا اور بغداد میں لکھا تھا، موصوف کے متعلق حاکم نیشاپوری کا بیان ہے۔

افرادہ دالبلد یحش مشائخنا[1] — موصوف کا جب نیشاپور میں ورود ہوتا تو ہمارے مشائخ کو ان کی آمد سے خوشی ہوتی تھی۔

موصوف کی آمد سے خوشی کا اصل سبب ان کا علم اور ان کا وہ علمی ذخیرہ تھا جو عامۃ الناس کے علم میں اضافہ کا سبب ہوتا تھا۔

(۶) اساتذہ کا اپنے شاگردوں کو کتابوں کی روایت کی اجازت دینے کا رواج شروع سے تھا، ان اقسام اجازت میں سے جن کا رواج فروغ علم کی وجہ سے عہد عباسیہ میں زیادہ تھا، چوتھی قسم "مناولہ" بھی ہے، اس میں شیخ اپنا اصلی نسخہ یا اسکی نقل شاگرد کو دیتا خواہ مالک بنا دیتا، خواہ عاریۃً دیتا تاکہ طالب علم اس کو نقل کر کے اس کا مقابلہ کرے[2]۔ اس سے بھی استاد، شاگردوں کے ذخیرۂ علمی میں اضافہ کرتا تھا، دستور کے مطابق ہر پڑھا لکھا ذخیرۂ کتب رکھنے کا پابند ہوتا تھا۔

(۷) عہد عباسی میں اپنے نوشتہ کے علاوہ بیان کرنا بھی عالم کی غلطی سمجھی جاتی تھی[3]، اس لیے بھی ذاتی کتب خانوں کا اس دور میں بکثرت قیام عمل میں آیا اور انھیں غیر معمولی فروغ حاصل رہا۔

---

[1] کتاب الانساب للسمعانی، ج ۱ ص ۷۱ [2] الالماع الی معرفۃ اصول الروایۃ و تقیید السماع بعیاض بن موسیٰ الیحصبی تحقیق احمد صقر القاہرہ، دار التراث ۱۳۸۹ھ ص ۸۰۔ الکفایۃ فی علم الروایۃ للخطیب، حیدرآباد الدکن، مطبعۃ جمعیۃ دائرۃ المعارف العثمانیہ ۱۳۵۷ھ ص ۳۰۔ علوم الحدیث لابن الصلاح تحقیق نور الدین عتر، حلب مطبعۃ الاصیل ۱۳۸۶ھ ص ۱۴۶، ۱۴۷ [3] عیون الاخبار لابن قتیبہ القاہرۃ مطبعۃ دار الکتب المصریہ، ۱۳۴۳ھ ج ۲ ص ۱۲۰۔

(۸) یہ بھی حقیقت ہے کہ عہد عباسی میں تاریخ، تذکرہ اور طبقات کی کتابوں میں بلند پایہ شخصیتوں، اصحاب فن اور مشہور و معروف عالموں کا تذکرہ ہی قلمبند کیا جاتا تھا جن کے علم کا دریائے فیض کتابی و تدریسی خدمات کی صورت میں رواں رہتا تھا چنانچہ ابوالطیب عبدالواحد لغوی المتوفی ۳۵۱ھ مراتب النحویین میں رقمطراز ہیں:-

ہم نے کتاب میں جس ترتیب پر اہل عراق کا ذکر کیا ہے، ان پر علم اعراب ختم ہو گیا ہے۔ اور یہ وہ اصحاب کتب و مرجع علم و فن تھے جن سے علم اعراب میں رجوع کیا جاتا اور مشکل مسائل کو حل کیا جاتا تھا۔ اس سلسلہ کے علماء میں ہم نے اگر یحییٰ کو چھوڑا ہے تو اس کی حسب ذیل تین وجوہ ہیں۔

۱۔ یا تو وہ امام فن نہیں تھا اس کے قول پر اعتماد نہیں کیا جاتا تھا۔

۲۔ یا اس کا کوئی ایسا شاگرد نہیں نکلا جو اس کے نام کو زندہ رکھتا۔

۳۔ یا اس نے کوئی ایسی تالیف نہیں چھوڑی جس کی نشر و اشاعت اہل علم ضروری سمجھتے ہوں جیسا کہ ہمارا یزیدیوں کے تذکرہ سے صرف نظر کرنا حالانکہ ان کا گھرانہ ایک علمی خانوادہ تھا، یہ سب اپنے جد امجد یحییٰ بن مبارک یزیدی سے نسبت رکھتے ہیں اور وہ ابوزید اصمعی، ابوعبیدہ اور کسائی کے طبقہ کا تھا اس نے علوم کی تحصیل ابوعمرو عیسیٰ بن عمر، یونس اور ابوالخطاب اکبر سے کی تھی، اس نے ابوعمرو سے قرأت مشہورہ روایت کی ہے جو لوگوں میں متداول ہے مگر اس کا علم رواۃ کے بارہ میں قلیل ہے۔ البتہ اس کی اولاد اور اس کے خانوادہ میں اس کا چرچا زیادہ ہے، وہ ثقہ، امین اور قدیم بلند رتبہ عالم تھا۔[1]

---

[1] مراتب النحویین تالیف ابوالطیب عبدالواحد اللغوی بتحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم القاہرہ مکتبہ نہضۃ مصر ۱۳۷۵ھ ص ۵۵

موصوف نے ایک اور مقام پر لکھا ہے :۔

تعاظمت شھرۃ العالم بمصنفاتہ و الروایۃ عنہ[1] — عالم کی شہرت اس کی تصانیف اور اس سے روایات کرنے والوں سے ہوتی ہے۔

اس سے حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ عہد عباسی میں کسی عالم کی شہرت کی بنیادی وجہیں دو ہی تھیں، ایک تصنیف و تالیف کے ذریعہ کتابی سرمایہ میں اضافہ اور دوسری روایت کے ذریعہ علم کی نشر و اشاعت، دور عباسی میں تذکرہ نگاری کے اندر کم و بیش انہی اصولوں کو پیش نظر رکھا جاتا تھا، اس لیے تذکرہ نگار جب کسی عالم کا تذکرہ لکھتے ہیں تو اس کے حالات میں تصریح کرتے ہیں کہ اس نے کن سے پڑھا، کہاں پڑھا، کن فنون میں کمال پیدا کیا، کہاں املا کرایا، کہاں وعظ کہا، کہاں مناظرہ کیا، کیا کیا لکھا، کن اہل علم اور ارباب فن کو اس سے تلمذ کا فخر حاصل رہا، کن مسجدوں، مدرسوں، سرایوں، تکیوں میں پڑھایا، کن خانقاہوں اور مشہدوں میں فروکش رہا، کن اہم مقامات میں وہ سفر کرتے ہوئے ٹھہرا، یہ وہ مقامات تھے جہاں عموماً کتب خانے قائم کیے جاتے تھے چنانچہ ابو سلمہ نصر شاشی ایلاقی المتوفی سنہ ۳۹۰ھ جو ایلاق کے قائدین میں سے تھے شاش میں رہتے تھے ہیثم بن کلیب شاشی سے پڑھا تھا، امام بخاری سے بیک واسطہ حدیث روایت کرتے تھے۔ لوگوں نے ان سے بہت حدیثیں لکھی ہیں[2]، مورخ ابو سعد ادریسی کا بیان ہے موصوف حج کے لیے جاتے ہوئے سمرقند آئے اور باب دستان کے پاس رباط الامیر میں اترے تو ہمارے اصحاب نے ان سے لکھا اور میں نے موصوف سے شاش میں سنہ ۳۰۰ھ سے قبل لکھا تھا[3]

---

[1] مراتب النحویین تالیف ابوالطیب عبد الواحد اللغوی تحقیق محمد ابو الفضل ابراہیم القاہرہ۔ مکتبہ نہضۃ مصر ۱۹۵۵ء ص ۸۰ [2] کتاب الانساب ج ۱، ص ۱۳۴ [3] ایضاً

عہد عباسی میں کم و بیش ہر عالم کے پاس ذاتی کتب خانہ ہونا مبالغہ نہیں حقیقت ہے، کیونکہ اوائل عہد عباسی میں ایسے ایسے ائمہ فقہ، ائمہ حدیث، ائمہ لغت، ائمہ نحو و ادب کے پاس ذاتی کتب خانوں کا سراغ ملا ہے جن کے کتب خانوں کا نام سن کر لوگوں کو تعجب ہوگا۔[1] چنانچہ امام اعظم ابو حنیفہؒ (۸۰ھ – ۱۵۰ھ / ۶۹۹ء – ۷۶۷ء) امام مالکؒ (۹۳ھ – ۱۷۹ھ / ۷۱۲ء – ۷۹۵ء) امام اوزاعیؒ (۸۸ھ – ۱۵۷ھ / ۷۰۷ء – ۷۷۴ء) امام ابو یوسفؒ (۱۱۳ھ – ۱۸۲ھ / ۷۳۱ء – ۷۹۸ء) امام محمدؒ (۱۳۱ھ – ۱۸۹ھ / ۷۴۸ء – ۸۰۴ء) امام شافعیؒ (۱۵۰ھ – ۲۰۴ھ / ۷۶۷ء – ۸۲۰ء) امام احمدؒ (۱۶۴ھ – ۲۴۱ھ / ۷۸۰ء – ۸۵۵ء) امام بخاریؒ (۱۹۴ھ – ۲۵۶ھ / ۸۱۰ء – ۸۷۰ء) امام مسلمؒ (۲۰۴ھ – ۲۶۱ھ / ۸۲۰ء – ۸۷۵ء) امام فن جرح و تعدیل ابو زرعہ عبید اللہ رازیؒ (۲۰۰ھ – ۲۶۴ھ / ۸۱۵ء – ۸۷۸ء) امام لغت و ادب خلیل بن احمد بصری (۱۰۰ھ – ۱۷۰ھ / ۷۱۸ء – ۷۸۶ء) امام نحو ثعلب (۲۰۰ھ – ۲۹۱ھ / ۸۱۶ء – ۹۰۴ء) وغیرہ کے پاس ذاتی کتب خانے موجود تھے، یہ ائمہ فن اپنی خداداد و مجتہدانہ صلاحیتوں کی وجہ سے سرچشمۂ علوم تھے ان کی مہارت فن، جلالت شان اور زبردست حافظے کے پیش نظر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس ابتدائی دور میں یہ اپنے ذاتی کتب خانوں کے ذریعہ علوم و فنون کی تدوین کرتے، انھیں فروغ دیتے، کتب اور کتب خانوں کے ترقی پذیر سلسلہ کو پروان چڑھانے کی سعی پیہم کر رہے تھے، ان میں بعض ائمہ فن ایسے بھی تھے مثلاً ثعلب جن کے متعلق ان کے معاصرین نے تصریح کی ہے کہ درس اور ملاقات کے وقت ان کے ہاتھ میں کبھی کوئی کتاب نہیں دیکھی گئی، بایں ہمہ ان کے پاس کتب خانہ تھا، یعنی بظاہر ذاتی کتب خانہ نہ ہونے کی دلیل کے باوجود ان کے پاس ذاتی کتب خانہ موجود تھا۔[2] ابوبکر محمد بن قاسم انباری نحوی (۲۷۱ھ – ۳۲۸ھ / ۸۸۴ء – ۹۴۰ء) جن کے متعلق تذکرہ نگاروں کا بیان ہے۔

كان يملي من حفظه وما كتب موصوف اپنے حافظے سے املا کراتے تھے ان سے

---

[1] کتاب الانباہ للقفطی ج ۱ ص ۱۴۰ [2] طبقات النحویین واللغویین تالیف محمد بن الحسن الزبیدی تحقیق محمد ابوالفضل ابراہیم مصر، محمد سامی امین الخانجی ۱۳۷۳ھ ص ۱۴۲، کتاب الانباہ ج ۱ ص ۱۴۰، معجم الادباء ج ۲ ص ۱۴۴ – ۱۴۵

عنه الاملاء قائلا عن حفظه[1] — املا زبانی ہی لکھی گئی ہے۔

یہ مذکورۂ بالا بیان موصوف کے پاس کتب خانہ نہ ہونے کی دلیل ہے حالانکہ ان کے پاس وہ بردست کتب خانہ تھا[2]۔ ان حقائق کی روشنی میں مذکورۂ بالا دعوی کہ عہد عباسی میں کم وبیش ہر عالم کے پاس نجی کتب خانہ تھا، کہا جائے تو کچھ بیجا نہیں۔

امام ثعلب کے مذکورۂ بالا واقعہ سے یہ امر بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ دوسری تیسری صدی ہجری میں درس اور ملاقات کے موقعہ پر کسی عالم کے ہاتھ میں کتاب کا نہ ہونا موجب حیرت و تعجب تھا۔ یہ اس حقیقت کا نہایت بین ثبوت ہے کہ اس دور میں اہل علم کا اپنے پاس کتابیں اور کتب خانہ رکھنا معمول سا بن گیا تھا، اور ان کو کتابوں سے ایسا شغف ہو گیا تھا کہ درس کے وقت ہی نہیں ملاقات کے وقت بھی ان کے ہاتھ سے کتاب نہیں چھوٹتی تھی، یہ تاریخی شہادتیں ذاتی کتب خانوں کے وجود ہی کو ثابت نہیں کرتیں بلکہ ذاتی کتب خانوں کی کثرت کی بھی شاہد عدل ہیں۔

مشہور مورخ محمد بن عمر واقدی (۱۳۰ھ - ۲۰۷ھ / ۷۴۷ء - ۸۲۳ء) جن کے ذاتی کتب خانہ میں ایک سو بیس بار شتر کتابیں تھیں، مورخین اور تذکرہ نگاروں نے صرف واقدی کے کتب خانے کا ذکر بھی ایک خاص واقعہ کی وجہ سے کیا ہے کہ انھیں بغداد کے مغربی حصہ سے مشرقی حصہ میں مکان تبدیل کرنا پڑا تو کتابیں ایک سو بیس اونٹوں پر لے جانی پڑی تھیں ورنہ ان کے معاصرین میں سے ہر ایک کے پاس اس سے بھی زیادہ کتابوں پر مشتمل کتب خانہ موجود تھا چنانچہ مورخ واقدی کا بیان ہے۔

ما من احد الا وكتبه اكثر من حفظه وحفظى اكثر من كتبى[3]	میرے معاصرین میں کوئی ایسا نہیں ہے جسکی کتابیں اس کے حفظ سے زیادہ نہ ہوں البتہ میرا حفظ میری کتابوں سے زیادہ ہے۔

---

[1] کتاب بلاذانب ج ۱ ص ۳۵۳ [2] تاریخ بغداد ج ۳ ص ۱۸۲ [3] تاریخ بغداد ج ۳ ص ۔ وعیون الاثر فی فنون المغازی والشمائل والسیر تالیف محمد بن محمد ابن سید الناس، القاہرۃ مکتبۃ القدسی ۱۳۵۶ھ ج ۱ ص ۱۸۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ تیسری صدی ہجری کے اہل علم کا ذخیرۂ علمی اتنی وسعت
یار کر گیا تھا کہ اتفاق سے اگر کسی نامور عالم یا اہل فن کے یہاں گھر کے کسی کونے میں رکھا ہوا ذخیرۂ
ب دکھائی دیتا تو اہل علم کی نظروں میں سماتا نہیں تھا حیرت و تعجب سے پوچھا جاتا تھا
لیا جناب کے پاس کل اتنا ہی کتابوں کا ذخیرہ ہے، چنانچہ ابراہیم بن سفیان زیادی المتوفی ۲۴۹ھ
بیان ہے۔

"ایک شخص خراسان سے اصمعی المتوفی ۲۱۶ھ کے پاس آیا جب وہ اصمعی سے مانوس
ہو گیا تو اس نے ان سے ایسے موقعہ پر پوچھا جب وہ گھر میں تشریف فرما تھے کہ جناب
کی کتابیں کہاں ہیں، اصمعی نے زاویۂ بیت (گھر کے ایک گوشہ) کی طرف اشارہ کیا
اس نے اسے بہت تھوڑا سمجھا اور کہا بس اتنا ہی ہے، اصمعی نے کہا حقیقت میں یہ بھی
اپنی ندرت کے اعتبار سے بہت ہے۔"[1]

مورخ واقدی کے مذکورۂ بالا بیان میں مامن احد کے الفاظ عام میں جو شاہان عباسی کے دور
ہیں پورے اسلامی قلمرو کے معاصر علماء پر یکساں صادق آتے اور منطبق ہوتے ہیں، لیکن کسی وجہ سے
اگر اس کا دائرہ خاص علماء اور نامور ارباب فن تک محدود رکھا جائے تو بھی دوسری تیسری صدی
ہجری میں بغداد کے اندر ذاتی بڑے کتب خانوں کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہو تو چنداں
مستبعد نہیں۔

مورخین اور تذکرہ نگاروں نے مورخ واقدی کے تمام مشہور معاصرین کا تذکرہ قلمبند کیا ہے
لیکن معدودے چند کے سوا کسی کے کتب خانے کا ذکر ان کے یہاں نہیں ملتا جو ہمارے اس دعوے کی
نہایت قوی دلیل ہے کہ عہد عباسی میں کتب خانے مسلم معاشرے کے لوازم زندگی بن چکے تھے، اور

---

[1] مراتب النحویین، ص ۴۹-۵۰۔

کم و بیش ہر ایک عالم کے پاس ذاتی کتب خانہ ہوتا تھا، اس لیے ہر ایک کے تذکرہ میں اسکے کتب خانے کے ذکر کرنے کا چنداں اہتمام نہیں کیا جاتا تھا۔

اس دور میں ارباب کمال کی اسلامی قلمرو میں جیسی کثرت تھی اسکا اندازہ صرف بصرہ میں ارباب فن کی تعداد سے کیا جا سکتا ہے، چنانچہ واقدی کے معاصر اور خلیل بن احمد بصری کے نامور شاگرد نضر بن شمیل (۱۲۲ھ–۲۰۳ھ / ۷۴۰ء–۸۱۹ء) نے اپنی تنگ دستی کی وجہ سے جب بصرہ کو خیرآباد کہا اور خراسان کا رخ کیا تو تین ہزار اہل علم انھیں رخصت کرنے مربد تک گئے تھے، انکے متعلق ابو عبیدہ کا بیان ہے کہ نضر بن شمیل کو رخصت کرنے والوں میں کوئی جلیل القدر محدث، کوئی نحوی، کوئی لغوی، کوئی عروضی اور کوئی اخباری تھا۔[1]

مربد میں نضر نے ان ارباب کمال سے کہا تھا کہ مجھے بصرہ میں ایک یا دو کلچے بھی پیٹ بھر کھانے کو مل جاتے تو میں بصرہ کو چھوڑ کر نہ جاتا، نضر بن شمیل کا کتب خانہ تھا اور جو علماء علم و کتب اور کتب خانوں کے فروغ و ترقی میں سرگرم عمل تھے انھیں وطن سے نکلنے نہیں دیا جاتا تھا، اسی لیے نضر بن شمیل کو اہل بصرہ سے یہ بات کہنی پڑی تھی۔

اس سے معلوم ہوا کہ کوئی نامور عالم کسی شہر میں اقامت پذیر ہوتا اور اس کی مساعی جمیلہ سے اس بستی یا شہر میں علم اور کتابوں کو فروغ و ترقی ہوتی تو اس کا وہاں سے نکلنا اہل شہر کو گوارا نہیں ہوتا تھا، چنانچہ معمر بن راشد صنعانی المتوفی سنہ ۱۵۳ھ نے جو بصری تھے، صنعاء کو چھوڑ کر بصرہ آنا چاہا تو اہل صنعاء نے صنعاء میں ان کی شادی کر دی اور پھر ان کا صنعاء سے نکلنا نہ ہو سکا۔[2] اس سے یہ حقیقت بھی عیاں ہو گئی کہ جن ارباب فن سے شہر، بستی اور کوچہ کو فخر حاصل ہوتا تھا

۱؎ طبقات النحویین واللغویین للزبیدی، ص ۵۳، ۱۱ انباہ الرواۃ للقفطی ج ۳ ص ۳۴۹، ابن خلکان ج ۲ ص ۱۶۱، ۲؎ تہذیب التہذیب لابن حجر حیدرآباد الدکن مطبعۃ دائرۃ المعارف النظامیہ ۱۳۲۶ھ ج ۱۰ ص ۲۴۵

ان کو شہر اور بستی میں رکھنے کی ہر تدبیر کی جاتی تھی انھیں جمالیاتی اور سماجی بندھنوں میں باندھا جاتا تھا، تاکہ رفاقت کی وجہ سے داغ مفارقت نہ دے سکیں۔

ابو عبیدہ نے نضر بن شمیل کا مذکورۂ بالا واقعہ کتاب مثالب اہل البصرہ میں اہل بصرہ کی مذمت بیان کرتے ہوئے نقل کیا ہے جس سے یہ حقیقت بھی آشکار ہوئی ورنہ پتہ بھی نہ چلتا کہ بصرہ جیسا چھوٹا سا شہر تین ہزار ایسے گوناگوں باکمال علماء سے آباد تھا۔ وہ علماء جو نضر بن شمیل کو رخصت کرنے نہیں گئے یا نہیں جا سکے تھے ان کی تعداد کا تو کوئی علم نہیں، ظاہر ہے ایسے علم دوست اور علم کے قدر دانوں کے متعلق واقدی کی مذکورۂ بالا شہادت کی موجودگی میں یہ کہنا درست ہے کہ ان تین ہزار علماء و فضلاء کے پاس نجی کتب خانوں کا ہونا ظاہر و باہر ہے۔

علماء اور ارباب کمال کی اتنی بڑی تعداد جہاں آباد ہوتی تھی ایسے شہر اور ایسی بستی کے لیے بلاد اسلامی کے جغرافیہ نویس علامہ سمعانی لکھتے ہیں۔

ھذہ النسبۃ الی البصرۃ وشھرتھا اغنتنی عن ذکرھا لکن ذکرتھا لکی لایخلو الکتاب عنھا۔[1]	یہ بصرہ کی طرف نسبت ہے اور اس کی شہرت نے مجھے اس کے ذکر سے مستغنی کر دیا ہے، لیکن میں نے اس کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ کتاب اس کے ذکر سے خالی نہ رہے۔

یاقوت کا بیان ہے:۔

والمنسوبون الیھا من اھل العلم لایحصون[2]	اور بصرہ کی طرف اہل علم کی اتنی بڑی تعداد منسوب ہے کہ شمار نہیں کی جا سکتی۔

اسی علمی ثروت کی وجہ سے بصرہ کو "خزانۃ العرب" کہا جاتا تھا۔[3]

---

[1] کتاب الانساب ج ۲ ص ۲۵۳ [2] معجم البلدان ج ۱ ص ۶۴۰ [3] کتاب الانساب ج ۲ ص ۲۵۳

اس قسم کی معلومات تذکرہ، تاریخ و طبقات کی کتابوں کے علاوہ انساب و جغرافیہ وغیرہ کی کتابوں میں بھی بکثرت ملتی ہیں ان کی اصل غایت اس عالم کے حدود استفادہ و افادہ علمی کو بیان کرنا اس کے حلقۂ اثر کو بتانا، اشاعت علم، کتابوں اور کتب خانوں کے فروغ و ترقی میں اس کی مساعی جمیلہ کو بیان کرنا، اس کے ذخیرۂ کتب سے اس خطہ کے اہل علم کے استفادہ و فیض عام کی صراحت کرنا ہوتا تھا اسی لئے تذکرہ نگار اس عالم کا جو پہلی مرتبہ کسی امام فن کے ذخیرہ سے کسی خاص خطۂ ارضی اور کسی خاص اسلامی شہر کو روشناس کراتا تھا اس کا تعارف اول من ادخل کتب فلان[1] (موصوف سب سے پہلے فلاں کی کتابیں لے کر پہنچے تھے) کے شاندار الفاظ سے کراتے تھے۔

عہد عباسی میں مورخین اور تذکرہ نگاروں کا طبقات[2]، مکاتیب فکر[3]، ادوار[4]، اقالیم و ممالک[5]، انساب[6]، والقاب[7] اور کنی[8] پر کتابیں لکھنے، کتب تاریخ میں ہر سنہ کے بعد مشاہیر کی وفیات ذکر کرنے کی غرض و غایت ہی مشاہیر عصر، نامور ارباب فن، اہل علم و اہل قلم کے فیضان و اثر کو بیان کرنا اور ان کی تحقیقات سے علمی دنیا کو متعارف کرانا ہوتا تھا[9] جس سے

۱۔ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۸۰۰، ۲۔ المذاہب الفقہیۃ الاربعۃ الحنفی، المالکی، الشافعی، الحنبلی و انتشارہا عند جمہور المسلمین لاحمد تیمور باشا مع دراسۃ تحلیلیۃ لمحمد ابی زہرۃ، القاہرۃ لجنۃ نشر المؤلفات التیموریۃ، ۱۳۶۳ھ ص ۵۵، ۸۲، ۸۳۔ ۳۔ کتاب مشاہیر علماء الامصار تالیف محمد بن حبان البستی تحقیق فلایشہر القاہرۃ مطبعۃ لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر ۱۳۷۹ھ ص ۔ ۴۔ طبقات الفقہاء لابی اسحاق ابراہیم الشیرازی تحقیق احسان عباس، بیروت، دار الرائد العربی سنہ ۱۹۷۰ء ص ۳۱ ۵۔ مراتب النحویین ص ۳ مقدمۃ المحقق طبقات النحویین واللغویین ص ۳ مقدمۃ المحقق ۶۔ العبر فی خبر من غبر ج ۱ ص ۰ ۷۔ مروج الذہب و معادن الجوہر للمسعودی تحقیق محمد محی الدین عبد الحمید ج ۱، مصر مطبعۃ السعادۃ ۱۳۶۷ھ ج ۱ ص ۔ ۸۔ یتیمۃ الدہر فی محاسن اہل العصر للثعالبی تحقیق محمد محی الدین عبد الحمید القاہرۃ، مطبعۃ حجازی ۱۳۶۶ھ ج ۱ ص ۳ ۹۔ تلخیص مجمع الآداب فی معجم الالقاب تالیف عبد الرزاق ابن الفوطی تحقیق مصطفی جواد دمشق المطبعۃ الہاشمیۃ ۱۹۶۲ء، ۱۰۔ تاریخ بغداد ج ۳ ص ۲۲۲ ۱۱۔ اللباب ج ۱ ص ۔ ۱۲۔ المؤتلف والمختلف تالیف الحسن بن بشر الآمدی تحقیق عبد الستار احمد فراج القاہرۃ مکتبۃ الحلبی ۱۳۸۱ھ ص ۳ ۱۳۔ وفیات الاعیان لابن خلکان تحقیق احسان عباس، بیروت دار الثقافۃ ۱۹۶۹ء ج ۵ ص ۔

سوانح حیات وکتابیات کو بھی تنوع، وسعت اور فروغ حاصل ہوتا رہا۔

یہاں یہ امر بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ مورخ ابوعبداللہ ابن سعد کاتب واقدی (۱۶۸-۲۳۰ھ) نے الطبقات الکبیر کو اسلامی صوبوں پر مرتب کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مقصد پہلی، دوسری اور تیسری صدی میں اسلامی قلمرو کے مختلف صوبوں اور شہروں کی علمی ترقی، علماء و اہل فن کی علمی وفنی سرگرمیوں کو بیان کرنا ذخائر علمی اور کتب خانوں کی طرف رہنمائی کرتا تھا۔

انہی حقائق کی وجہ سے علامہ سمعانی اور یاقوت رومی وغیرہ اسلامی قلمرو کے ایک ایک کوچے، بستی، قصبے، شہر، صوبے اور ملک کے متعلق اس امر کی صراحت کرتے ہیں کہ یہ بستی محدثین سے آباد تھی، اس محلے میں ادباء رہتے تھے، یہ بڑا مردم خیز خطہ تھا، یہاں سے ہر فن میں ارباب کمال نکلے ہیں، اس سرزمین سے گذشتہ و موجودہ ہر دور میں علماء و فضلاء نکلتے رہے ہیں، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس خطہ کو فروغ علم، فروغ کتب اور کتب خانوں کی ترویج واشاعت میں امتیاز حاصل رہا ہے، کتاب الانساب سمعانی اور معجم البلدان یاقوت سے بطور نمونہ حرف الف کی تقطیع سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں، اس سے حقیقت حال واضح ہو جائے گی، علامہ سمعانی اصفہان کی ایک بستی آبی کے متعلق رقمطراز ہیں "خرج منها جماعة من المشاہیر"[1] اس بستی سے نامور اہل علم کی ایک جماعت نکلی ہے، آجری جو بغداد کے غربی گوشہ میں نہر طابق کا ایک محلہ ہے، اس کے متعلق یاقوت لکھتے ہیں "اس میں بہت سے علماء رہتے ہیں"[2] اسکاف کے متعلق موصوف کا بیان ہے "نامور علماء ادباء حکام، محدثین کی بہت بڑی تعداد یہاں سے نکلی ہے"[3] آمد، ایک بہت پرانا چھوٹا مضبوط شہر تھا، اس کے متعلق سمعانی فرماتے ہیں یہاں سے ہر فن کے علماء نکلے ہیں،[4]

---

[1] کتاب الانساب، ج ۱ ص ۴۸ [2] معجم البلدان ج ۱ ص ۵۰ [3] ایضاً ج ۱ ص ۱۸۱

[4] کتاب الانساب ج ۱ ص ۸۲،

اور آل طبرستان کے متعلق لکھتے ہیں، قدیم و جدید اہل علم کی ایک جماعت اس کی طرف منسوب ہے، یہاں سے ہر فن کے علماء نکلے ہیں[1]

علامہ سمعانی نے کتاب الانساب میں (۴۵۲۶) مشہور نسبتوں کا ذکر کیا ہے جن میں ابتدائی (۴۰) نسبتوں میں دو سو نامور علماء کا تذکرہ کیا ہے، اس حساب سے صرف کتاب الانساب میں تقریباً چودہ پندرہ ہزار نامور علماء و فضلاء کے حالات قلمبند کئے گئے ہیں[2] اگر ہر ایک نسبت میں صرف ایک ہی قابل قدر کتب خانہ شمار کیا جائے تو چھٹی صدی ہجری میں اسلامی دنیا میں کم از کم ساڑھے چار ہزار عوامی، شاہی اور ذاتی کتب خانوں کی تعداد پہنچتی ہے ورنہ دس بارہ ہزار سے کسی طرح کم نہیں قرار دی جا سکتی، تاہم اس تعداد سے کتب خانوں کی کثرت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور مسلم معاشرہ میں کتب خانوں سے عام دلچسپی کا بھی پتہ چلتا ہے یہ بھی دراصل عہد عباسی میں کتب خانہ سازی کی عالمگیر تحریک کا اثر تھا، اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ کتابی سرگرمی اور کتب خانوں کی ترقی میں عہد عباسی کو خصوصیت خاص حاصل ہے لیکن افسوس ہے کہ اس دور کے کتب خانوں کی تاریخ پر علمی اور تحقیقی انداز میں اب تک ایسا کام نہیں ہوا، جس میں اصل ماخذوں کو زیادہ سے زیادہ کھنگالا گیا ہو، فنی نقطۂ نگاہ سے ان کے اسباب و علل کا کھوج لگایا گیا ہو اور ان کے ارتقاء کو عہد بعہد بتایا گیا ہو۔

(د) عہد عباسی میں کتب خانوں کی نشاندہی کے اسباب مورخین اور تذکرہ نگاروں نے طبقات و سیر کی کتابوں میں حسب ذیل تین اہم اسباب کی وجہ سے کتب خانوں کا ذکر کیا ہے۔

---

[1] کتاب الانساب ج ۱ ص ۴۰۔ [2] سمعانی اور ان کی کتاب الانساب مقالات عرشی، از امتیاز علی عرشی، لاہور مجلس ترقی ادب ۱۹۷۰ء) ص ۲۳۰

(۱) نہایت غیر معمولی کتب خانوں کو بیان کیا ہے۔[1]

(۲) کسی خاص واقعہ کے ضمن میں اتفاقاً کتابوں اور کتب خانوں کا ذکر ان کے زبان وقلم پر آگیا جیسا کہ مورخ واقدی کے بغداد میں نقل مکانی کی وجہ سے اس کی کتابوں اور اس کے کتبخانوں کا ذکر تاریخ و تذکرہ کی کتابوں میں آگیا ہے[2]

(۳) کسی عالم، بادشاہ، امیر، وزیر وغیرہ کی کتابوں سے غیر معمولی شغف کی وجہ سے ضمنی طور پر اس کے کتب خانہ کا تذکرہ کیا ہے[3]

ان ہی تینوں اسباب کی روشنی میں اس موضوع پر لکھنے والوں نے کتب خانوں کا ذکر کیا[4]

(ز) عہد عباسی میں کتب خانوں کی شناخت کے رہنما اصول ..... | عہد عباسی کے مورخین و تذکرہ نگاروں نے کتب خانوں کی رہنمائی اور نشاندہی جن اشاروں اور فقروں سے کی ہے وہ

کتب خانوں کی شناخت کے اساسی اصول کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کی روشنی میں عہد عباسی کے کتب خانوں کی تعیین کی گئی ہے وہ رہنما اساسی اصول حسب ذیل ہیں۔

(۱) کسی خاص نام سے کتب خانہ قائم کرنا یا کسی کے ذخیرۂ کتب کے لیے خزانہ کا لفظ لکھا جاتا مثلاً۔

الف:۔	خزانہ[5]	ب:۔	خزانۂ کتب[6]
ج:۔	خزائن الکتب[7]	د:۔	خزانۃ الحکمۃ[8]

[1] کتاب صبح الاعشیٰ فی صناعۃ الانشاء، تالیف احمد بن علی، القاہرہ دار الکتب المصریہ ۱۳۳۱ھ ج ۱ ص ۴۶۶ [2] تاریخ بغداد ج ۳ ص ۵ معجم الادباء ج ۷ ص ۵۰ [3] کتاب الفہرست لابن الندیم ص ۱۶۹، ۲۰۵، ۳۸۲ یعنی معجم الادباء ج ۵ ص ۱۵۹ [4] کتاب الفہرست ص ۲۰ [5] آثار البلاد واخبار العباد تالیف ذکریا بن محمد بن محمود القزوینی بیروت دار صادر للطباعۃ والنشر ۱۳۸۰ھ ص ۲۸۰ [6] فقہ اللغۃ وسر العربیہ تالیف عبد الملک الثعالبی تحقیق مصطفیٰ السقا ابراہیم الابیاری عبد الحفیظ شلبی، ط ۳۔ ۲ مصر مطبعۃ مصطفیٰ البابی ۱۳۹۲ھ ص ۹ [7] کتاب المنتظم ج ۸ ص ۱۱۳

[8] کتاب الفہرست لابن الندیم ص ۳۰۲

ہ:۔ خزانة العلوم[1]	و:۔ بيت الحكمة[2]
ز:۔ دار الحكمة[3]	ح:۔ صوان الحكمة[4]
ط:۔ بيت الكتب[5]	ي:۔ بيوت الكتب[6]
ك:۔ دار الكتب[7]	ل:۔ مكتب[8]
م:۔ دار العلم[9]	ن:۔ دار المعرفة[10]

(۲) کتابیں جمع کرنا، مثلاً یہ کہنا۔

الف۔ اقتنى كتباً كثيرة[11] — اس نے بہت کتابیں حاصل کی تھیں۔

جمع ما لم يجمعه احد من اقرانه[12] — موصوف نے اتنی کتابیں جمع کیں جو ان کے معاصرین میں سے کسی نے جمع نہیں کی تھیں

د۔ جمع من الحديث ما لم يجمعه احد[13] — موصوف نے حدیث کا اتنا ذخیرہ جمع کیا تھا کہ

---

[1] جمهرة انساب العرب تالیف ابن حزم تحقیق عبد السلام محمد ہارون، مصر، دار المعارف ۱۳۸۲ھ [2] کتاب الفہرست لابن الندیم، ص ۳۰۵۔ معجم الادباء ج ۵ ص ۶۶ [3] کتاب المواعظ والاعتبار بذکر الخطط والآثار بالخطط المقریزیہ، القاہرہ، دار الطباعة المصریہ ببولاق ۱۲۷۰ھ ج ۱ ص ۴۴۴ [4] کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون تالیف حاجی خلیفہ، استانبول، مطبعة المعارف ۱۳۶۰ھ ج ۱ ص ۶۰۳ [5] کتاب تتمة صوان الحکمة تالیف ... تحقیق محمد شفیع، لاہور، پنجاب یونیورسٹی ۱۳۵۱ھ ص ۴۴، ۵۶، ۱۲۸، [6] ایضاً ص ۴۴ [7] النجوم الزاہرة فی ملوک مصر والقاہرة، تالیف یوسف ابن تغری بردی، القاہرة، مطبعة دار الکتب المصریہ ۱۳۴۲ھ [8] کتاب الانساب ج ۵ ص ۴۰۵ [9] کتاب الخطط المقریزیہ ج ۱ ص ۴۵۸ [10] تاریخ ابن خلدون، بیروت، دار الکتاب اللبنانی ۱۹۵۶ء ج ۴ ص ۹۰ [11] تاریخ الحکماء للقفطی تحقیق جولیس لیپرٹ، ... ۱۹۰۳ء ص ۴۶۲ [12] تذکرة الحفاظ ج ۳ ص ۱۲۶۵، النجوم الزاہرة ... [13] کتاب الانساب ج ۱ ص ۳۲۳۔

معاصرین میں سے کسی نے نہیں کیا تھا۔

ج۔ جمع من الکتب مالم یجمعہ غیرہ[1] — موصوف نے اتنی کتابیں جمع کی تھیں کہ ان کے معاصرین میں سے کسی نے نہیں کی تھیں۔

د۔ جمع من الکتب مالم یجمعہ احد[2] — اس نے اتنی کتابیں جمع کی تھیں کہ کسی نے نہیں کی تھیں۔

ہ۔ جمع کتباً عظیمۃ[3] — موصوف نے بڑی کتابیں جمع کی تھیں۔

و۔ جمع کتباً کثیرۃ[4] — اس نے بہت کتابیں جمع کی تھیں۔

ز۔ جمع الکتب الحسان[5] — اس نے عمدہ عمدہ کتابیں جمع کی تھیں۔

ح۔ جمع و کتب مالا ینحصر[6] — اس نے اتنی کتابیں جمع کی اور لکھی ہیں کہ شمار نہیں کی جاسکتیں۔

ط۔ جمع من الکتب کثیرا و کان شدید الشغف بھا[7] — اس نے بہت کتابیں جمع کی تھیں، اور اسے ان سے بہت شغف تھا۔

پانچویں صدی ہجری میں اس فقرہ کا یہ مطلب تھا کہ اس نے ہزاروں کتابیں جمع کی تھیں، اس کا بہت بڑا کتب خانہ تھا، چنانچہ مرہف بن اسامہ المتوفی ۶۱۳ھ کے متعلق منذری نے یہی الفاظ لکھے ہیں، یاقوت نے موصوف کا جو بیان نقل کیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے

---

[1] الکامل فی التاریخ لابن الاثیر، ج ۹ ص ۱۱۰۔ المختصر فی اخبار البشر تالیف ابو الفداء اسماعیل مصر المطبعۃ الحسینیہ المصریہ ۱۳۲۵ھ ج ۲ ص ۱۳۰۔ [2] تاریخ ابن خلدون ج ۴ ص ۴۹۹۔ [3] کتاب المنتظم ج ۹ ص ۱۰۰۔ [4] البدایہ والنہایہ لابن کثیر ج ۱۲ ص ۶۳۔ [5] المنتظم ج ۱۰ ص ۱۲۱۔ [6] کتاب المنتظم ج ۱۰ ص ۱۲۲۔ کتاب العبر ج ۳ ص ۵۹۔ [7] التکملۃ لوفیات النقلۃ لعبد العظیم المنذری تحقیق بشار عواد معروف النجف مطبعۃ الآداب ۱۳۹۱ھ ج ۴ ص ۲۱۰

کتب خانہ میں کتابوں کی اتنی بڑی تعداد موجود تھی کہ انھیں بھی اس کا صحیح علم نہ تھا، ایک افتاد میں موصوف نے چار ہزار کتابیں فروخت کیں تو بھی پتہ نہ چلا کہ کتب خانہ سے کچھ نکلا ہے[1]

ی ۔ رحل وجمع وصنف[2]	موصوف نے سفر کیا، کتابیں جمع کیں اور تصنیف کیں
ک ۔ سمع وجمع وصنف[3]	اس نے احادیث کا سماع کیا، انھیں جمع کیا اور تصنیف کی
ل ۔ تعب فی جمعہ وجمع المجموع[4]	موصوف نے جمع حدیث میں بہت مشقت برداشت کی اور مجموعے جمع کیے ۔
م ۔ حصل الاصول الثمینۃ[5]	اس نے اصل قیمتی نسخے حاصل کیے تھے ۔
ن ۔ حصل الاصول وجمع الکتب[6]	اس نے اصل نسخے حاصل کیے اور کتابیں جمع کیں ۔
س ۔ حصل اصولا کثیرۃ[7]	اس نے بہت سے اصل نسخے جمع کیے تھے ۔
ع ۔ حصل عندہ من الاصول والاجزاء مالا یوصف کثیرۃ[8]	موصوف نے اصل نسخے اور اجزاء اتنے جمع کیے تھے کہ ان کی تعداد حیطۂ بیان سے باہر ہے ۔
ف ۔ حصل کتبا کثیرۃ[9]	موصوف نے بہت کتابیں جمع کی تھیں ۔
ص ۔ حصل ... الکتب الجیدۃ[10]	اس نے بہت عمدہ کتابیں جمع کی تھیں ۔
ق ۔ حصل کتبا نفیسۃ[11]	اس نے نفیس کتابیں فراہم کی تھیں ۔
ر ۔ حصل من الکتب الطبیۃ	اس نے طب وغیرہ کی اتنی کتابیں جمع کی تھیں جو

---

[1] معجم الادباء ج ۲ ص ۱۹۶ [2] الانساب ورق ۱۳۳ ب [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۳۱۲ ۔ [4] الانساب ورق ۱۰۴ ب [5] تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۳۰۴ [6] التکملہ لوفیات النقلہ ج ۳، ص ۲۵۵ [7] تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۳۰۵ [8] ایضاً ج ۳ ص ۱۱۹۲ [9] البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۱۰۹ [10] تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۳۶۲ [11] کتاب المنتظم ج ۱۰ ص ۱۲۱ ۔

وغيرها مما لا يكاد يوجد عند غيره [1]	اس کے معاصرین میں سے کسی کے پاس مشکل ہی سے مل سکتی تھیں۔
مز:۔ صرف فيها زائدا عن خمسين الف دينار في تحصيل الكتب اشتراءً ونقلاً وكتابةً [2]	موصوف نے پچاس ہزار دینار سے زیادہ رقم کتابوں کی خریداری اور نقل وکتابت کرانے پر خرچ کی تھی۔
ش:۔ كان حريصاً على طلب الكتب [3]	وہ کتابیں جمع کرنے کا دلدادہ تھا۔
س:۔ كان حريصاً على كتابته [4]	وہ حدیثیں لکھنے کا شوقین تھا۔
ث:۔ كان حريصاً على نقل الكتب وتحصيلها [5]	وہ کتابیں نقل کرنے اور حاصل کرنے کا دلدادہ تھا۔
ت:۔ (الف) ابو بشر نفضل حريص على اقتناء الكتب [6]	ابو بشر نفضل کتابیں جمع کرنے کا دلدادہ تھا۔
ث:۔ خلف ما جمعه في طول عمره [7] من الكتب [8]	عمر بھر جو کتابیں جمع کی تھیں وہ چھوڑ گئے۔
ث (الف) كان كثير العناية بتحصيل الكتب	موصوف کو کتابیں حاصل کرنے کی بہت لگن تھی
خ:۔ كان كثير الكتب [9]	وہ کتابیں بہت رکھتا تھا۔

---

[1] عیون الانباء فی طبقات الاطباء لابن ابی اصیبعہ، ج ۲ ص ۳۵۰-۳۵۱ [2] الانباہ الرواۃ ج ۲ ص ۳۰۵

[3] عیون الانباء جلد ۲ صفحہ ۱۷۰ [4] المعجم الکبیر

[5] عیون الانباء، ج ۲ ص ۱۰۷ [6] یتیمۃ الدہر ج ۴ ص ۲۴ [7] التاریخ الکبیر لابن عساکر بترتیب تہذیب عبد القادر آفندی بدران، دمشق طبعہ روضۃ الشام ۱۳۲۹-۱۳۵۱ھ ج ۳ ص ۲۶ [8] الجواہر المضیہ فی طبقات الحنفیہ تالیف عبد القادر ابن ابی الوفا محمد القرشی حیدرآباد الدکن مطبعہ دائرۃ المعارف النظامیہ ۱۳۳۲ھ ج ۲ ص ۱۵۷ [9] کتاب الانساب ج ۱ ص ۲۲۳ [10] وفیات الاعیان ج ۱ ص ۲۲

خ (الف) کان من المکثرین فی الحدیث کتابۃ وسماعاً۔[1] — موصوف حدیث کی بکثرت کتابت وسماعت کرنے والوں میں سے تھے۔

ذ :۔ کتب بخطہ الکثیر وحصل الاصول[2] — اس نے اپنے قلم سے بہت لکھا اور اصل نسخے جمع کیے تھے۔

ض :۔ کتب وحصل الاصول الکثیرۃ[3] — موصوف نے لکھا اور بہت زیادہ اصل نسخے جمع کیے تھے۔

ض (الف) کتبت وکتب لی عشر رواحل[4] — میں نے لکھا اور میرے واسطے دس بار شتر کتابیں لکھی گئیں۔

ظ :۔ ما رأیت فیمن رأیت اکثر کتباً ... منہ[5] — میں نے جن اہل علم کو دیکھا ہے ان میں موصوف سے زیادہ کتابیں کسی کے پاس نہیں دیکھیں۔

ع :۔ نسخ الکثیر وحصل الاصول[6] — اس نے بہت نقل کیا اور اصل نسخے فراہم کیے تھے۔

(۳) علمی ذخیرہ بنانے اور اس میں اضافہ کرنے کے لئے خود کتابیں نقل کرنا یا اجرت پر نقل کرانا۔ مثلاً یہ کہنا۔

الف۔ کتب الکثیر وجمع ما لم یجمعہ احد من اقرانہ[7] — اس نے بہت لکھا اور اتنا علمی ذخیرہ جمع کیا کہ اس کے معصروں میں سے کسی نے نہیں کیا تھا۔

حافظ ابن الفرات المتوفی سنہ ۳۸۴ھ کے عظیم کتب خانہ کے متعلق اسی قسم کے فقرے لکھے گئے ہیں جس میں ایک ہزار جزء تو صرف علی بن محمد مصری کی روایت سے موجود تھے [illegible]

---

[1] المنتظم ج ۷ ص ۲۰۰ [2] الوافی بالوفیات، ج ۲ ص ۳۳۲، الجامع المختصر فی عنوان التواریخ وعیون السیر تالیف علی بن انجب الساعی تحقیق مصطفیٰ جواد، بغداد، المطبعۃ السریانیہ الکاثولیکیۃ سنہ ۱۹۳۴ء ج ۹ ص ۲۱۳۔ [3] تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۳۶۱-۱۳۶۲۔ [4] ایضاً ص ۱۳۳۱۔ [5] ایضاً ج ۴ ص ۱۳۲۳ [6] ایضاً ص ۱۲۱۳؛ [7] تاریخ بغداد ج ۳ ص ۱۲۳ الانساب ورق ۴۲۰ ب کتاب المنتظم ج ۷ ص ۷۷، الکامل فی التاریخ ج ۹ ص ۱۰۶، البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۳۱۴ تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۰۲۵

ستر تاریخیں موصوف کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی محفوظ تھیں، جب مرے تو اٹھارہ صندوق کتابوں سے بھرے ہوئے تھے اور یہ وہ کتابیں تھیں جو چوری سے بچ رہی تھیں، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس مختصر جملہ میں کتنی وسعت مضمر ہے۔

ب ۔ کتب بخطہ مالا یوصف کثرۃً[۱]	اس نے اتنا زیادہ لکھا کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔
ج ۔ کتب مالا یوصف کثرۃ و مازال ینسخ و یصنف[۲]	اس نے اتنا زیادہ لکھا کہ اس کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ اور وہ برابر نقل کرتا اور تصنیف کرتا رہا ہے۔
د ۔ کتب بخطہ الملیح الرشیق مالا یوصف کثرۃ[۳]	موصوف نے اپنے عمدہ و خوبصورت خط سے اتنا زیادہ لکھا ہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔
ہ ۔ کتب بخطہ السریع الرفیع مالا یوصف کثرۃ۔[۴]	اس نے اعلیٰ و تیز خط میں اتنا زیادہ لکھا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔
و ۔ کتب بخطہ شیئاً کثیراً۔[۵]	اس نے اپنے قلم سے بہت کچھ لکھا ہے۔
ز ۔ کتب الکتب و نسخ الکتب الکبار[۶]	اس نے کتابیں لکھیں اور بڑی بڑی کتابیں نقل کیں۔
ح ۔ کتب الکتب الطوال[۷]	اس نے لمبی لمبی کتابیں لکھیں۔
ط ۔ کتب بخطہ کثیراً و استنسخ و حصل الاصول۔[۸]	موصوف نے اپنے قلم سے بہت زیادہ لکھا، نقل کرایا اور اصل نسخے حاصل کئے۔
ی ۔ کتب بید لا عدۃ احمال۔[۹]	اس نے اپنے ہاتھ سے کئی بار شتر کتابیں نقل کی تھیں۔

---

[۱] العبر الذہبی ج ۴ ص ۲۰۸ [۲] تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۳۷۳ [۳] ایضاً ص ۱۴۰۳ [۴] ایضاً ص ۱۲۵۲ [۵] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۰۸۰ [۶] ایضاً ص ۱۲۸۳ [۷] العبر ج ۳ ص ۱۰۶ [۸] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۰۸۰ [۹] میزان الاعتدال للذہبی ج ۳ ص ۴۶۵۔

ی ۔ کتب الکثیر وصنف وجمع [1]	اس نے بہت نقل کیا، تصنیف اور کتابیں جمع کیں ۔
ک ۔ سمع مالا یوصف کثرۃ و نسخ بخطہ الصحیح السریع [2]	موصوف نے اتنا سماع کیا کہ بیان نہیں کیا جا سکتا اور اپنے قلم سے صحیح اور جلدی نقل کیا ۔
ل ۔ نقل بخطہ الملیح مالا یدخل تحت الحصر [3]	اس نے اپنے پاکیزہ خط سے اتنا لکھا ہے کہ شمار سے باہر ہے ۔
م ۔ نسخ واستکتب وصنف وجمع [4]	اس نے کتابیں نقل کیں، کرائیں، تصنیفات کیں اور جمع کیں
ن ۔ نسخ لنفسہ ولغیرہ [5]	اس نے اپنے لیے اور غیروں کے لیے کتابیں نقل کی تھیں ۔
س ۔ کانت النقلۃ یحصلون من جاہہ ویستازون من فضلہ [6]	نقل نویسوں کو اس کی طرف سے اجرت ملتی اور وہ اسکے لطف وکرم سے بہرہ مند ہوتے تھے ۔
ع ۔ کان یصل الی النقلۃ من مالہ و افضالہ شئ کثیر جداً [7]	کتابیں نقل کرنے والوں کو مال بھی ملتا اور اسکی بے پایاں عنایتوں سے بھی سرفراز ہوتے تھے ۔
ف ۔ کان یقارب عطاؤہ للنقلۃ و النساخ فی کل شھر الفی دینار [8]	وہ کتابیں نقل کرنے اور لکھنے والوں کو ہر مہینہ تقریباً دو ہزار دینار دیتا تھا ۔
ق ۔ کان الوراقون یکتبون لہ [9]	وراق اس کے لیے کتابیں لکھتے تھے ۔ (باقی)

[1] البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۹ ۳ ۱۱ الطبقات السنیہ فی تراجم الحنفیہ ج ۱ ص ۲۶۹-۲۸۰ [2] تذکرۃ الحفاظ ج ۴ ص ۱۲۹۹ [3] ایضاً ص ۱۴۱۱ [4] ایضاً ص ۱۲۳۵ [5] ایضاً ص ۱۳۱۲ [6] عیون الانباء ج ۲ ص ۱۶۰ [7] ایضاً [8] ایضاً [9] تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۲۰۴ ، تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۴۴ ۳-۴۴۵ ۔

اسلام اور مستشرقین پر دارالمصنفین کے بین الاقوامی سمینار کے متعلق بعض اہل قلم کے تاثرات

(۲)

۱۔ ڈاکٹر عبد الصبور مرزوق ڈائرکٹر جنرل، رابطۂ عالم اسلامی، مکہ،

دارالمصنفین میں "اسلام اور مستشرقین" کے سمینار میں شریک ہوا تھا، اس موقع پر میں نے اس ادارہ کی زیارت کی اور وہاں کتابوں کی تصنیف و تالیف میں غیر معمولی علمی جہد و کاوش، وقت نظر اور دیدہ ریزی کا بچشم خود مشاہدہ کیا۔ مجھے دارالمصنفین کے کتبخانہ کو بھی گھوم پھر کر دیکھنے کا موقع ملا اس میں نادر اور ضخیم مخطوطات کا بھی بڑا ذخیرہ ہے۔

یہ حقیقت ہے جیسا کہ وہاں کے علما نے بھی مجھے بتایا کہ یہ برصغیر میں سب سے بڑا علمی و تصنیفی ادارہ ہے جسکو علامہ شبلیؒ نے قائم کیا، اور ان کے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندویؒ نے بڑھایا، اس ادارہ نے اسلامی و دینی موضوعات پر سو سے زیادہ اہم بالشان کتابیں شائع کی ہیں، یہاں کے علماء و مصنفین نے فارغین کی تربیت بھی کرتے ہیں، اور جدید انداز پر بحث و تحقیق، تالیف و تصنیف اور علمی مقالات و رسائل کی تحریر و ترتیب کی انھیں مشق بھی کراتے ہیں، اس کی حیثیت معنوی تلمذ اور تحریری درس کی ہے۔

اسی ادارہ نے "اسلام اور مستشرقین" کے موضوع پر ایک انوکھے طرز کا بے مثال سمینار منعقد کیا تھا اس موقع پر میں بھی وہاں موجود تھا، سمینار کی کامیابی کے لیے اس ادارہ کے منتظمین نے بغیر کسی امداد کے

اور بہ نفس نفیس اور ذاتی جدوجہد سے جو انتظام کیا تھا وہ خوش سلیقگی اور حسن انتظام کے لیے بے مثال اور قابل تقلید ہے۔

۲۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی علی گڈھ | ۲۱ تا ۲۳ فروری ۱۹۸۲ء تین روز "اسلام اور مستشرقین" کے موضوع پر ایک سمینار بڑے طمطراق اور تزک و احتشام کے ساتھ دار المصنفین اعظم گڈھ میں منعقد ہوا جس میں برصغیر کے نامور علما و فضلا اور اساتذۂ جامعات کے علاوہ عرب اور دوسرے ممالک کے ممتاز ارباب علم و قلم نے بھی شرکت کی، ان حضرات نے مقالے پڑھے، اور بحث و گفتگو میں حصہ لیا، دار المصنفین کے ارباب حل و عقد نے اس عظیم بین الاقوامی سمینار کو خاطر خواہ طور پر صوری اور معنوی اعتبار سے کامیاب بنانے کے لیے جو اہتمام و انتظام کیا اور مہمان نوازی جس دل سوزی، محبت اور توجہ سے کی وہ بے شبہ دار المصنفین کی روایات کے شایان شان اور ان کے عین مطابق تھا، اس اجتماع کی نہایت مفصل روداد حسن بیان و زور خطابت کی گل کاریوں کے ساتھ ناظم دار المصنفین جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن کے قلم سے معارف میں مسلسل شائع ہو رہی ہے، اس لیے ہمیں اس سلسلہ میں مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے، البتہ چند گزارشات ہیں جن کا اس موقع پر پیش کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔

سمینار میں جو تقریریں ہوئیں اور مقالات پڑھے گئے اگرچہ ان میں بحیثیت مجموعی مستشرقین پر نکتہ چینی اور ان کی مذمت کے ساتھ ان کی خدمات کا بھی اعتراف کیا گیا لیکن ہمارا احساس یہ ہے کہ خدمات کا اعتراف دبی زبان اور ہلکے لب و لہجہ میں کیا گیا اور تنقیص و تہجین کا اظہار بڑے زور و شور اور جوش و خروش سے ہوا، ہمارے نزدیک یہ انداز گفتگو اس جیسے اہم علمی اجتماع کے شایان شان نہیں تھا، مستشرقین کا معروضی مطالعہ کرنے کے لیے ضروری تھا کہ مستشرقین کی ایک فہرست بنائی جاتی، اور جن حضرات کو مدعو کیا جاتا ان سے درخواست کی جاتی کہ جس مستشرق کے کاموں کا انھوں نے جامع اور تحلیلی و تنقیدی مطالعہ کیا ہے، اس کو اس فہرست میں سے منتخب کر لیں اور سمینار میں اس پر ایک

ایسا مقالہ پیش کریں جس میں مستشرق کی علمی وتحقیقی کاوشوں کے ساتھ اس کی غلط یا لغو بیانیاں ب۔ بھی دہی کی گئی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو مستشرقین کے محاسن اور معائب دونوں بیک وقت اہل نظم کے سامنے آجاتے اور اس کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا آسان ہوتا کہ فلاں مستشرق سے فائدہ کتنا پہونچا اور نقصان کس درجہ کا اور کتنا ہوا

جن مغربی مصنفین نے اسلام پر لکھا ہے ہمارے خیال میں ان کو دو طبقوں میں تقسیم کرنا چاہیئے۔ (۱) مشنریز یا مبلغین عیسائیت، اور (۲) مستشرقین، استشراق ایک تحریک تھی جو اٹلی میں پیدا ہوئی، وہاں سے جرمنی میں پھلی پھولی اور پھر فرانس، برطانیہ، ہنگری، ہولینڈ، امریکہ اور روس تک میں پھیل گئی، جرمنی میں اس تحریک استشراق کا ذکر علامہ اقبال نے پیام مشرق کے مقدمہ میں جس انداز سے کیا ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ مذکورہ بالا دو گروہوں میں سے پہلا گروہ یعنی مشنریز! یہ کھلا ہوا اسلام دشمن طبقہ ہے، اس بناء پر اس کا مقصد ہی اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے خلاف زہر چکانی اور دشنام طرازی ہے، ہمارے زمانہ کے مشہور مستشرق پروفیسر گب اور پروفیسر آربیری نے بڑی ندامت اور افسوس کے ساتھ اس کا اعتراف اور ان سے اپنی براءت کا اظہار کیا ہے، اب رہے مستشرقین! تو ان لوگوں کے کام کس درجہ متنوع اور کس کثرت سے ہیں؟ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کناڈا کے قیام کے زمانہ میں میں نے مستشرقین پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تو ایک دن اپنے انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری گیا وہاں اور چند کتابوں کے ساتھ جرمن زبان میں ایک کتاب ملی، جو دو جلدوں میں تھی اور اس میں صرف ان مستشرقین کا تذکرہ تھا جنہوں نے جرمن زبان میں اسلامیات کے کسی موضوع پر لکھا ہے یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا، اور میں نے قلم رکھ دیا، جو حال جرمن زبان کا ہے کم وبیش فرانسیسی اور انگریزی زبان کا ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ کارنامے اس کثرت سے ہیں کہ فرد واحد کا ان سب پر حاوی ہونا ناممکن ہے موضوعات کے اعتبار سے یہ کارنامے حد درجہ متنوع ہیں لیکن بنیادی طور پر ان کو مندرجہ ذیل

خود بہ نفس نفیس اور ذاتی جد و جہد سے جو انتظام کیا تھا وہ خوش سلیقگی اور حسنِ انتظام کے لیے بے مثال اور قابلِ تقلید ہے۔

۲۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی علی گڈھ: ۲۱ تا ۲۳ فروری ۱۹۸۲ء تین روز "اسلام اور مستشرقین" کے موضوع پر ایک سمینار بڑے طمطراق اور تزک و احتشام کے ساتھ دار المصنفین اعظم گڈھ میں منعقد ہوا جس میں برصغیر کے نامور علما و فضلا اور اساتذۂ جامعات کے علاوہ عرب اور دوسرے ممالک کے ممتاز اربابِ علم و قلم نے بھی شرکت کی، ان حضرات نے مقالے پڑھے اور بحث و گفتگو میں حصہ لیا، دار المصنفین کے اربابِ حل و عقد نے اس عظیم بین الاقوامی سمینار کو خاطر خواہ طور پر صوری اور معنوی اعتبار سے کامیاب بنانے کے لیے جو اہتمام و انتظام کیا اور مہمان نوازی جس دل سوزی، محبت اور توجہ سے کی وہ بے شبہ دار المصنفین کی روایات کے شایانِ شان اور ان کے عین مطابق تھا، اس اجتماع کی نہایت مفصل روئداد حسنِ بیان و زورِ خطابت کی گل کاریوں کے ساتھ ناظم دار المصنفین جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن کے قلم سے معارف میں مسلسل شائع ہو رہی ہے، اس لیے ہمیں اس سلسلہ میں مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے، البتہ چند گزارشات ہیں جن کا اس موقع پر پیش کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔

سمینار میں جو تقریریں ہوئیں اور مقالات پڑھے گئے اگرچہ ان میں بحیثیت مجموعی مستشرقین پر نکتہ چینی اور ان کی مذمت کے ساتھ ان کی خدمات کا بھی اعتراف کیا گیا لیکن ہمارا احساس یہ ہے کہ خدمات کا اعتراف دبی زبان اور ہلکے لب و لہجہ میں کیا گیا اور تنقیص و تہجین کا اظہار بڑے زور و شور اور جوش و خروش سے ہوا، ہمارے نزدیک یہ انداز گفتگو اس جیسے اہم علمی اجتماع کے شایانِ شان نہیں تھا، مستشرقین کا معروضی مطالعہ کرنے کے لیے ضروری تھا کہ مستشرقین کی ایک فہرست بنائی جاتی، اور جن حضرات کو مدعو کیا جاتا ان سے درخواست کی جاتی کہ جس مستشرق کے کاموں کا انھوں نے جامع اور تحقیقی و تنقیدی مطالعہ کیا ہے، اس کو اس فہرست میں سے منتخب کر لیں اور سمینار میں اس پر ایک

ایسا مقالہ پیش کریں جس میں مستشرق کی علمی و تحقیقی کاوشوں کے ساتھ اس کی غلط یا لغو بیانی کی بھی نشان دہی کی گئی ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو مستشرقین کے محاسن اور معائب دونوں بیک وقت اہل بزم کے سامنے آجاتے اور اس کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا آسان ہوتا کہ فلاں مستشرق سے فائدہ کتنا پہونچا اور نقصان کس درجہ کا اور کتنا ہوا

جن مغربی مصنفین نے اسلام پر لکھا ہے ہمارے خیال میں ان کو دو طبقوں میں تقسیم کرنا چاہیئے۔ (۱) مشنریز یا مبلغین عیسائیت، اور (۲) مستشرقین، استشراق ایک تحریک تھی جو اٹلی میں پیدا ہوئی، وہاں سے جرمنی میں پھلی پھولی اور پھر فرانس، برطانیہ، ہنگری، ہولینڈ، امریکہ اور روس تک میں پھیل گئی، جرمنی میں اس تحریک استشراق کا ذکر علامہ اقبال نے پیام مشرق کے مقدمہ میں جس انداز سے کیا ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ مذکورۂ بالا دو گروہوں میں سے پہلا گروہ یعنی مشنریز! یہ کھلا ہوا اسلام دشمن طبقہ ہے، اس بنا پر اس کا مقصد ہی اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے خلاف زہر چکانی اور دشنام طرازی ہے، ہمارے زمانہ کے مشہور مستشرق پروفیسر گب اور پروفیسر آربری نے بڑی ندامت اور افسوس کے ساتھ اس کا اعتراف اور ان سے اپنی براءت کا اظہار کیا ہے، اب رہے مستشرقین! تو ان لوگوں کے کام کس درجہ متنوع اور کس کثرت سے ہیں؟ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کناڈا کے قیام کے زمانہ میں میں نے مستشرقین پر ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تو ایک دن اپنے انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری گیا وہاں اور چند کتابوں کے ساتھ جرمن زبان میں ایک کتاب ملی، جو دو جلدوں میں تھی اور اس میں صرف ان مستشرقین کا تذکرہ تھا جنہوں نے جرمن زبان میں اسلامیات کے کسی موضوع پر لکھا ہے یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا، اور میں نے قلم رکھ دیا۔ جو حال جرمن زبان کا ہے کم و بیش فرانسیسی اور انگریزی زبان کا ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ کارنامے اس کثرت سے ہیں کہ فرد واحد کا ان سب پر حاوی ہونا ناممکن ہے موضوعات کے اعتبار سے یہ کارنامے حد درجہ متنوع ہیں لیکن بنیادی طور پر ان کو مندرجہ ذیل

اقسام پر تقسیم کیا جاسکتا ہے! (۱) مستشرقین نے مختلف موضوعات پر سینکڑوں نادر و نایاب مخطوطات کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر بڑی کاوش اور محنت سے اڈٹ کر کے چھاپا اور پورا عالم اسلام ان سے استفادہ کر رہا ہے! (۲) مستشرقین نے عربی زبان کی لغت لکھی۔ (۳) عربی کتابوں کا ترجمہ کیا (۴) اسلامی علوم و فنون کی تاریخ پر کتابیں لکھیں، (۵) اسلامی تہذیب و تمدن کی تاریخ، (۶) عرب و ایران کی تاریخ (۷) اسلام کے مختلف نظام مثلاً معاشرتی نظام، اقتصادی نظام سیاسی نظام، اسلام کے فنون لطیفہ مثلاً فن تعمیر فن خطاطی مصوری، برتن سازی وغیرہ ان پر کتابیں لکھیں، (۸) قرآن و حدیث کا انڈکس تیار کیا، (۹) انسائکلوپیڈیا کے دو دو اڈیشن، قدیم اور جدید تیار کئے (۱۰) عربی زبان کا علم الالسنہ کی روشنی میں مطالعہ کیا، (۱۱) یورپ پر مسلمانوں کے علمی اور اور تہذیبی احسانات پر کتابیں لکھیں، (۱۲) سیرت نبوی، اس کے ماخذ و مصادر اور اسلام کی تعلیمات پر کتابیں لکھیں، اب غور کیجئے یہ تمام موضوعات و عنوانات خالص علمی اور ان میں سے اکثر سیکولر ہیں یعنی ان پر بحث و گفتگو کے سلسلہ میں مذہب کا کہیں ذکر ہی نہیں آتا اور اگر آتا بھی ہے تو ضمناً اور برائے نام، ان پر مستشرقین نے جو داد تحقیق دی ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ عرب و ایران میں مستشرقین کی ان کتابوں کا ترجمہ ہوا، یہ گویا اس بات کا اعتراف تھا کہ خود عرب و ایران کے علما و فضلا اب تک ان موضوعات پر جو خود ان کے گھر کی چیز تھے، اس درجہ محققانہ سرمایۂ علم پیش نہیں کر سکے تھے، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مستشرقین کے ان کارناموں سے اسلامی لٹریچر کے سرمایہ میں غیر معمولی اور نہایت وسیع اضافہ ہوا ہے، تحقیق کی نئی راہیں کھلی ہیں اور ان علوم و فنون کے بہت سے پوشیدہ و غیر واضح گوشے سامنے آئے ہیں، پھر مسلمان طلبہ کو مغربی طرز تحقیق سے آشنا کر کے ان لوگوں نے عالم اسلام میں مسلمان محققین کی ایک ایسی نسل پیدا کی ہے جو اپنے اپنے ملکوں میں آج نہایت عظیم الشان تحقیقی کام اسلامیات کے مختلف موضوعات پر کر رہے ہیں، بے شبہ مستشرقین کی یہ خدمات علمی حیثیت سے مسلمانوں پر احسان ہیں۔

احسان ہے کہ اس سے صرف نظر کرنا یا منکر ہونا خود اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے۔

ہمارے علماء کی جو عام ذہنیت مستشرقین کے بارہ میں ہے، وہ غالب کے اس شعر کے مصداق ہے:

محفل کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ واقعہ سنیے، مولانا ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوری نے سیرت نبویؐ پر اپنی وقیع کتاب اصح السیر کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ چونکہ طبقات ابن سعد کو ایک عیسائی نے اڈٹ کیا اور چھاپا ہے اور اس نے ضرور کتاب کے اصل مخطوط میں رد و بدل کیا ہوگا اس لیے میرے نزدیک وہ معتبر اور قابل استناد نہیں ہے، مجھ کو یہ پڑھ کر سخت تعجب اور افسوس ہوا اور میں نے اپنے مخدوم مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کی طرف رجوع کیا جو اس زمانہ میں نہایت بلند پایہ محقق ہیں اور ان مخطوطات پر جن کی نظر بڑی وسیع اور عمیق ہے، مولانا نے حسب معمول ازرا شفقت بزرگانہ فوراً جواب دیا اور تحریر فرمایا!

" طبقات ابن سعد کا اڈیشن، جس مخطوطہ پر مبنی ہے، میں نے اسے دیکھا اور مطبوعہ اڈیشن اور مخطوطہ دونوں کا حرفاً حرفاً مقابلہ کیا ہے اور کہیں ایک حرف کا فرق بھی نہیں پایا"

اس خط سے اندازہ ہوگا کہ مستشرقین نے اڈیٹنگ کا کام کس دیانت داری سے کیا ہے

بہرحال مستشرقین کے کارناموں کا یہ ایک نہایت اہم پہلو ہے، جو اُن پر گفتگو کرتے وقت کبھی نظر انداز نہیں ہونا چاہیے لیکن یہ ان کی تصویر کا صرف ایک رخ ہے، دوسرا رخ، افسوس کی بات ہے کہیں داغ دار ہے کہیں بالکل تاریک ہے، اور یہ وہ موقع ہے جب وہ آنحضرتؐ، قرآن و حدیث اور تاریخ و تصوف اسلام کے بعض مباحث و مسائل پر بحث و گفتگو کے بعد نتائج اخذ کرتے اور ان کے متعلق اپنی آراء کا اظہار کرتے ہیں لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ اس سلسلہ میں ہم امور ذیل پیش نظر رکھیں۔ (۱) پہلی بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے یہ ہے کہ تمام مستشرقین اس باب میں متفق نہیں

اور سب کا نقطۂ نظر اس معاملہ میں ایک نہیں ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ (قاہرہ) جنھوں نے اپنے دو رفقائے کار کی معیت میں پروفیسر گولڈ زیہر کی ایک نہایت اہم کتاب کا ترجمہ جرمن زبان سے عربی میں "العقیدۃ والشریعۃ فی الاسلام" کے نام سے کیا ہے، کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

(۱) مستشرقین میں جہاں ایسے لوگ ہیں جو من مانی بات کرتے ہیں اور اس لیے خود گمراہ ہوتے اور دوسروں کو بربنائے جہالت یا علم کے باوجود گمراہ کرتے ہیں تو دوسری طرف اس - - - - - - طبقہ میں ایسے حضرات بھی ہیں جو حق بات واشگاف طریقہ پر کہتے ہیں، چنانچہ آگے چل کر گولڈ زیہر کے فضائل و مناقب بیان کرنے کے بعد رقم طراز ہیں "اپنے ان کمالات و اکتسابات کے باعث ہی گولڈ زیہر کا شمار ان اکابر مستشرقین میں ہوتا ہے جنھوں نے بقدر استطاعت، اسلام کو اس کی روح، اس کی تعلیمات اور اس کے مذہب کو اور ان عوامل کو جو ان مذاہب (فقہیہ و کلامیہ) کی ایجاد اور ان میں اختلافات کا باعث ہوئے ہیں، سمجھا ہے"۔ (۲) دوسری بات یہ ہے کہ مستشرقین کے لیے نبوت اور وحی کی حقیقت جو اسلام میں ہے وہ عموماً ناقابل فہم ہے کیونکہ اگر وہ سمجھ میں آجائے تو پھر وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو جائیں، اس بناء پر وہ آنحضرتؐ کا مطالعہ دنیا کے ایک عظیم ریفارمر اور ایک عظیم انقلابی شخصیت کی حیثیت سے کرتے ہیں اسلیے ایک متعصب اور ایک کوتاہ اندیش ہیں، ان دونوں میں فرق کرنا چاہیئے۔ (۳) پھر تیسری بات جو نہایت اہم اور ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہمیں تاریخ اسلام اور اپنے ادبی مآخذ و مصادر کا تنقیدی جائزہ لینا چاہیئے۔ کون نہیں جانتا کہ تاریخ کے قدیم مآخذ میں رطب و یابس اور صحیح و غلط ہر قسم کی روایات بھری پڑی ہیں، ایک مسلمان اغانی میں غلمان و جواری اور محلات شاہی میں عیش و عشرت کے واقعات پڑھتا یا ابونواس کے دیوان کا مطالعہ کرتا ہے تو شرم سے گردن خم ہو جاتی ہے، علاوہ ازیں واقدی، ابن اسحٰق اور طبری اور یعقوبی وغیرہ کا کیا ذکر، خود احادیث اور بعض تفاسیر میں خصوصاً تفسیر درمنثور (جلال الدین سیوطی)

بعض ایسی روایات ملتی ہیں جو ہرگز قابل قبول نہیں ہیں اور جن سے اسلام کی تعلیمات مجروح ہوتی ہیں امام بخاری نے الجامع الصحیح میں صحت کا التزام کیا ہے لیکن ادب المفرد میں نہیں کیا، اس لیے اس میں بھی بعض اس قسم کی روایات نے جگہ پالی ہے، حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں بعض روایات کو محض یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ یہ روایت آنحضرت صلعم کے شان نبوت کے منافی ہیں، پھر تصوف کی کتابیں اور صوفیہ کے تذکرے بھی ایسے اقوال و ملفوظات اور ایسے احوال و مقامات کے ذکر سے محفوظ نہیں ہیں جن کی زد شریعت پر پڑتی ہے، مستشرقین جب ہرزہ سرائی پر آتے ہیں تو یہی روایات ان کا سہارا بنتی ہیں، خوب اچھی طرح یاد ہے جس زمانہ میں ہم لوگ ڈابھیل ضلع سورت گجرات میں مقیم تھے سورت کے گجراتی زبان کے ایک ہندو اخبار نے اسلام کے خلاف زہریلے مضامین کا ایک سلسلہ وار قسط شائع کرنا شروع کیا، جب اس مضمون کی سترہ قسطیں شائع ہو چکیں اور حضرت الاستاذ مولانا انور شاہ الکشمیری مرحوم کو اسکی اطلاع ہوئی تو ایک طرف آپ نے حکومت کو ادھر متوجہ کر کے اخبار پر مقدمہ دائر کرایا اور دوسری جانب اس مضمون کا اردو میں ترجمہ کرانے کے بعد مولانا بدر عالم میرٹھی مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاروی اور خاکسار راقم الحروف ہم تین پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی، جس کا کام اخبار مذکور کے مضمون کو از اول تا آخر پڑھنا اور پھر اس کا جواب تیار کرنا تھا، اب اس تقریب سے یہ رسوائے زمانہ مضمون پڑھنے کا اتفاق ہوا تو یہ دیکھ کر سخت افسوس اور صدمہ ہوا کہ مضمون میں اسلام کے متعلق جو باتیں کہی گئی تھیں ان میں سے اکثر باتیں کسی نہ کسی روایت کے حوالہ سے کہی گئی تھیں اور نہ وہ حوالے درست تھے،

بہرحال اس گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ اب جبکہ دارالمصنفین کے سمینار میں ایک منظور کردہ تجویز کے مطابق اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر مستقل کام کرنے کی غرض سے ایک عالمی ادارہ قائم ہو رہا ہے جس کا سکریٹریٹ دارالمصنفین اعظم گڈھ ہوگا، اور ہر دو برس کے بعد اس ادارہ کی

طرف سے ایک بین الاقوامی سمینار بھی ایک نئے ملک میں منعقد ہو رہا ہے گا، چنانچہ اجلاس دوم کیلئے قطر سے اور اجلاس سوم کے لیے پاکستان کی جانب سے دعوت آچکی ہے اور وہ منظور بھی ہو گئی ہے، ہم مندرجہ ذیل گزارش کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

(۱) ایک وسیع لائبریری قائم کی جائے جو دنیا بھر کے تمام مستشرقین کی کتابوں اور ان کے مقالات نیز ان کے مصادر و مراجع پر مشتمل ہو۔ (۲) ادارہ کے کارکنوں کے دو سکشن ہونے چاہئیں، ایک سکشن کا کام ہوگا مستشرقین کی کتابوں کا پڑھنا اور ان میں جو قابل گرفت چیزیں ہیں انکی نشان دہی کرنا، اور دوسرے سکشن کا کام ہوگا مراجع و مصادر کا مطالعہ کر کے خالص علمی اور تحقیقی بنیادوں پر روایات متعلقہ کا تنقیدی جائزہ لینا اور صحت و عدم صحت کے اعتبار سے ان کی حیثیت و نوعیت متعین کرنا، (۳) آئندہ جو سمینار ہو اس میں شرکاء کو الگ الگ کسی ایک خاص مستشرق پر مقالہ لکھنے کی دعوت دی جائے، یہ کام جزوی طور پر مصر میں ہوا ہے، اس سے روشنی حاصل کی جا سکتی ہے۔

۳۔ پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی جامعہ ملیہ، نئی دہلی، فروری ۸۲ء کے آخری ہفتہ میں (۲۱ تا ۲۳ فروری) دارالمصنفین (شبلی اکاڈمی) اعظم گڈھ میں ایک بین الاقوامی سمینار منعقد ہوا، اس علمی اجتماع میں بحث کا موضوع "اسلام اور مستشرقین" تھا اس میں ہندوستان کی عربی درسگاہوں اور یونیورسٹیوں کے عالموں اور دانش وروں کے علاوہ سعودی عرب، قطر، پاکستان، تھائی لینڈ، جاپان اور ڈربن (جنوبی افریقہ) کے عالم اور دانشور شریک ہوئے، افتتاحی اور اختتامی اجلاس دونوں کی صدارت قطر کے علامہ یوسف القرضاوی نے کی، دونوں اجلاسوں میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی بھی تقریریں ہوئیں، جو ان کے خاص اسلوب بیان اور فکر انگیز مواد کی وجہ سے اس مجمع علمی میں بہت پسند کی گئیں، صدر جلسہ کی فصیح و بلیغ عربی نے موضوع کی اہمیت کو اور بھی اجاگر کیا، تینوں دن مقالہ خوانی کی نشستیں، مقالات کی علمی متانت، تبادلۂ خیال کے معیار اور شرکاء کی کثرت کے اعتبار سے بڑی

پر رونق تھیں اس سے ضلع اعظم گڈھ کے پڑھے لکھے طبقہ کے علمی و دینی مذاق کا بھی اندازہ ہوا، اور دارالمصنفین کے علمی کاموں کی قدر و اہمیت کا بھی، اور اس بات کا بھی کہ اس ضلع کے تعلیمی و علمی حلقہ کو دارالمصنفین کے وجود اور اس کی تصنیفی سرگرمیوں سے کتنی دلچسپی ہے۔

شبلی اکاڈمی کے ناظم سید صباح الدین عبدالرحمٰن ہیں، سمینار کے موقع پر ان کے حسن انتظام میں سوز و ساز کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی، اکاڈمی کی عمارتیں خوب سجی تھیں، ان عمارتوں کے چھوٹے سے مجموعہ میں اکاڈمی کی مسجد دلہن بنی ہوئی تھی، شب میں بجلی کے روشن قمقموں میں اکاڈمی کا پورا احاطہ ایک عجیب پُراسرار حسن کا سماں پیش کرتا تھا، یہ سماں اتنا دلکش اور سحرانگیز تھا کہ شہر کے لوگ خصوصاً برقعہ پوش عورتیں اس طرح اسے دیکھنے آتی تھیں جیسے کسی مقدس مقام کی زیارت کرنے آئی ہوں، رات ہو کہ دن، اس کے احاطہ کے حسن اور دلکشی کا راز بھی درحقیقت اس بات میں ہے کہ یہاں سیرۃ النبیؐ لکھی گئی جس کے عظیم المرتبت مصنف علامہ شبلی اس کی خوبصورت مسجد کے پائیں ابدی نیند سو رہے ہیں، سیرۃ النبیؐ کے سلسلہ کا آغاز حضرت علامہ کا توشۂ آخرت تھا، آنحضرتؐ سے تعلق قلبی رکھنے والے اور آپؐ سے محبت کرنے والے ان کے مندرجۂ ذیل اشعار کو پڑھتے ہیں، تو دل کی عجیب کیفیت ہو جاتی ہے، نہ معلوم ان اشعار کی آمد کے وقت خود علامہ پر کیا گزری ہوگی۔

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتمؐ خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کا خطبۂ استقبالیہ بڑا پُرمغز تھا، جس میں جہاں ایک طرف اس بات پر روشنی ڈالی گئی تھی کہ دارالمصنفین کے قیام کا کیا مقصد تھا، وہیں ایسے اشارات بھی تھے کہ اس علمی ادارے نے اس مقصد کو کہاں تک پورا کیا اور چونکہ یہ مقصد ایک پیغام بھی تھا، اس لئے دارالمصنفین اس علمی اجتماع کے ذریعہ اپنے مقصد اور پیغام کو گزشتہ اڑسٹھ سال کی طرح ہمیشہ زندہ

و متحرک رکھنے کا عزم رکھتا ہے، اور دنیا کے تمام عالموں اور دانشوروں کو اپنے اس علمی سفر میں شریک ہونے کی دعوت دیتا ہے، سمینار اور اس ادارہ کے بانی علامہ شبلی مرحوم اور ان کے شاگرد رشید اور جانشین مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے خیالات بیان کر کے عام کرنا چاہتے ہیں، بالآخر حضرات جانتے ہیں کہ جن مقاصد کے تحت دارالمصنفین کا قیام عمل میں آیا ان میں ایک مقصد یہ بھی تھا کہ دین اسلام سیرت نبوی اور اسلامی علوم و فنون سے متعلق جو تحقیقات ہوتی رہتی ہیں ان کا جائزہ لیا جاتا رہے، جہاں جو کام اچھا دکھائی دے اس کی داد دی جائے اور جہاں دانستہ یا غیر دانستہ طور پر کوئی غلطی نظر آئے اس کی نشان دہی خالص علمی اور تحقیقی رنگ میں کی جائے، جہاں تک مستشرقین کا تعلق ہے تو ان کے بارے میں علامہ شبلی نے لکھا تھا۔

'.... مصنفین یورپ تین قسموں میں منقسم کیے جا سکتے ہیں (۱) جو عربی زبان اور اصل ماخذوں سے واقف نہیں، ان لوگوں کا سرمایہ معلومات اوروں کی تصنیفات اور تراجم ہیں، ان کا کام صرف یہ ہے کہ مشتبہ اور ناتمکل مواد کو قیاس اور میلان طبع کے قالب میں ڈھال کر دکھائیں...... (۲) (جو) عربی زبان، علم و ادب، تاریخ و فلسفہ اسلام کے بہت بڑے ماہر ہیں لیکن مذہبی لٹریچر اور سیرت کے فن سے ناآشنا ہیں، ان لوگوں نے سیرت یا مذہب اسلام پر کوئی مستقل تصنیف نہیں لکھی لیکن ضمنی موقعوں پر عربی دانی کے زعم میں اسلام پر یا شارع اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق نہایت دلیری سے جو کچھ چاہتے ہیں، لکھ جاتے ہیں، مثلاً جرمنی کا مشہور فاضل ساخو نے طبقات ابن سعد شائع کی ہے، تو اس کی وسعت معلومات اور عربی دانی سے کون انکار کر سکتا ہے، بیرونی کی کتاب الہند کا دیباچہ اس نے جس تحقیق سے لکھا ہے، رشک کے قابل ہے، لیکن اسی دیباچہ میں جب وہ اسلامی امور کے متعلق ایسی باتیں لکھ جاتا ہے، جس کو پڑھ کر بھول

جاتا ہے کہ وہ وہی محترم شخص ہے جس کو ابھی ہم نے دیکھا تھا، نولدیکے (جرمنی) نے قرآن مجید کا خاص مطالعہ کیا ہے لیکن انسائیکلوپیڈیا (جلد ۱۶) میں قرآن پر اس کا جو آرٹیکل ہے، جابجا نہ صرف اس کے تعصب بلکہ اس کی جہالت کے رازِ نہاں کی بھی پردہ دری کرتا ہے۔ (۳) وہ مستشرقین جنھوں نے خاص اسلامی اور مذہبی لٹریچر کا کافی مطالعہ کیا ہے، مثلاً ہامر صاحب یا مارگولیوس صاحب، ان سے ہم بہت کچھ امید کر سکتے تھے لیکن باوجود عربی دانی، کثرت مطالعہ اور تفحص کتب کے ان کا یہ حال ہے کہ۔ ع

دیکھتا سب کچھ ہوں لیکن سمجھتا کچھ بھی نہیں۔

" مارگولیوس نے مسند امام احمد بن حنبل کی چھ ضخیم جلدوں کا ایک ایک حرف پڑھا ہے اور ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے زمانہ کے کسی مسلمان کو بھی اس وصف میں اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا لیکن پروفیسر موصوف نے آنحضرتؐ کی سوانح عمری پر جو کتاب لکھی ہے، دنیا کی تاریخ میں اس سے زیادہ کوئی کتاب، کذب و افترا اور تاویل و تعصب کی مثال کیلئے پیش نہیں کی جا سکتی، اس کا اگر کوئی کمال ہے تو یہ ہے کہ سادہ سے سادہ اور معمولی سے معمولی واقعہ کو جس میں برائی کا کوئی پہلو پیدا نہیں ہو سکتا، صرف اپنی طباعی کے زور سے بدمنظر بنا دیتا ہے۔

" یورپین مصنفین کی غلط کاریوں کی بڑی وجہ ان کا مذہبی اور سیاسی تعصب ہے لیکن بعض وجوہ اور بھی ہیں جن کی وجہ سے ہم ان کو معذور سمجھ سکتے ہیں، (۱) سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا تمام سرمایۂ استناد صرف سیرت و تاریخ کی کتابیں ہیں، مغازی واقدی، سیرت ابن ہشام، سیرت محمد بن اسحاق، تاریخ طبری وغیرہ وغیرہ ... لیکن واقعہ یہ ہے کہ سیرت کی تصنیفات میں سے ایک بھی نہیں جو استناد کے اعتبار سے بلند رتبہ ہو ... "آنحضرتؐ کی سوانح عمری

کے لیکن واقعات وہ ہیں جو حدیث کی کتابوں میں بروایات صحیحہ منقول ہیں، یورپین مصنفین اس سرمایہ سے بالکل بے خبر ہیں اور ایک آدھ کوئی ہے، مثلاً (مارگولیس) تو اول تو وہ اس فن کا ماہر نہیں اور ہو بھی تو تعصب کی ایک چنگاری سیکڑوں خرمن معلومات کو جلانے کے لیے کافی ہے۔ (۲) دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ یورپ کے اصول تنقیح شہادت اور ہمارے اصول تنقیح میں سخت اختلاف ہے، یورپ اس بات کو بالکل نہیں دیکھتا کہ راوی صادق ہے یا کاذب . . . . فرض کرو ایک جھوٹے سے جھوٹا راوی ایک واقعہ بیان کرتا ہے جو قرائن موجودہ اور گردوپیش کے لحاظ سے صحیح واقعہ معلوم ہوتا ہے بیان بالکل مسلسل ہے اور کہیں سے بے نہیں الحرم تا تو یورپ کے مذاق کے موافق واقعہ کی صورت تسلیم کر لی جائے گی۔"

مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے مستشرقین کی جماعت سے متعلق لکھا تھا۔

" یورپ کے اہل علم نے جہاں علوم جدیدہ کا سرمایہ فراہم کیا اور اپنے یوروپین لٹریچر کو نئے نئے اسلوب میں شائع کیا وہاں علوم اسلامیہ کی اہمیت نے بھی ان کے علمی شغف کو اپنی طرف مائل کیا اور مستشرقین کے نام سے ایک مستقل گروہ نے عربی علوم و آداب کی حفاظت و اشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا، ان کی یہ قابل قدر سرگرمیاں ہمارے شکریہ کی مستحق ہیں، لیکن ظاہر ہے یہ علوم ان کے نہ تھے، اس لیے وہ ہمدردی و محبت جو مسلمانوں کو اپنی چیزوں سے ہو سکتی ہے، ان کو نہیں ہے، اس لیے ان کی تحقیق و تدقیق سے جہاں فائدہ ہو رہا ہے سخت نقصان بھی پہونچ رہا ہے، جس کی تلافی آج مسلمان اہل علم کا فرض ہے، ان میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اپنے مسیحی اور مغربی نقطۂ نظر سے اسلامی علوم پر نظر ڈالکر تحقیق و ریسرچ کے نام سے ایک نیا محاذ جنگ بنا کر اسلام مخالف اسلام

اور اسلامی علوم و آداب اور اسلامی تہذیب و تمدن پر بے پناہ حملے کر رہا ہے، قرآن مجید حدیث، تصوف، سیر، رجال، کلام و فقہ، سب اس کی زد میں ہے، نہیں کہا جا سکتا کہ یورپ کے اس رنگ کے لٹریچر سے اسلام کو کس قدر شدید نقصان پہنچ رہا ہے، اور پہونچے گا، اگر یہ زہر اسی طرح پھیلتا رہا اور اس کا تریاق نہیں تیار کیا گیا تو معلوم نہیں کس حد تک نوجوان مسلمان دماغوں میں سمیت سرایت کر جائے گی۔"

حقیقت یہ ہے کہ علامہ شبلیؒ اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کے یہ خیالات پورے سمینار پر چھائے رہے، مقالہ نگاروں میں سے کئی نے مستشرقین کے کام میں جو اچھے پہلو تھے، انہیں سراہا لیکن بعض پہلوؤں کی مضرت رسانی اور غلط کاریوں کی نشان دہی بھی علمی انداز میں کی اور یہی متوازن انداز فکر بھی ہے، مولانا علی میاں کی تقریروں میں بھی یہی متین اور متوازن زاویۂ نظر نمایاں تھا، لیکن مقالہ نگاروں میں ایسے یک رخے بھی تھے جو "صراط مستقیم" سے ہٹے ہوئے تھے اور جو تمام مستشرقین کی پوری پوری خبر لینے ہی میں اسلام کی خدمت تصور کرتے تھے، یہاں تک کہ ان کے غیظ و غضب کا نشانہ وہ لوگ بھی بنے جو یورپ یا امریکہ کی کسی یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ہیں اور جن کی بدبختی سے ان کے اساتذہ میں کوئی مستشرق بھی ہے، ایسے لوگوں کو ہم یک رخا اس لیے کہتے ہیں کہ ان کے اسلام اور ایمان کا پیمانہ نہایت محدود اور بہت تنگ ہے، اور یہی وجہ ہے کہ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ مستشرقین کے شاگردوں میں ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ اپنی خاص رحمت سے نواز سکتا ہے، کیا خبر کہ ایسے مسلمانوں کو طوفان مغرب نے بہتر مسلمان بنا دیا ہو اور جس محاذ پر وہ خود دیر تک نہیں ٹھہر سکتے وہاں ان مسلمانوں کے قدم مضبوطی سے جمے ہوئے ہوں، اللہ کی رحمت ہر شے پر چھائی ہے، نہ معلوم اس خزانۂ غیبی سے کسے کس وقت کیا مل جائے۔

انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے پہلے تین دہوں میں علم الاستشراق کی جو صورت تھی وہ آج

نہیں ہے، آج مستشرقین کا وہ علمی معیار نہیں رہا ہے جو پہلے تھا، دوسرے یہ کہ اب خاص طور پر دوسری جنگ عظیم کے بعد، مسلم ممالک کی آزادی، قرول کی حکمرانی اور مسلمانوں کی عام بیداری نے مغرب و مشرق دونوں کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اسلام اور اسلامی تمدن کو لاشۂ بے جان تصور کر کے ان کا پوسٹ مارٹم نہیں کیا جا سکتا، وہ زندہ حقیقتیں ہیں، وہ فنا کبھی نہیں ہوئی تھیں، ہاں دب گئی تھیں اور اب پھر ابھر کر سامنے آگئی ہیں، اس لیے آج مستشرقین باوجود اپنے سیاسی و مذہبی تعصب کے خالص علمی سطح پر اسلام، پیغمبر اسلام اور اسلامی علوم و آداب اور تہذیب و تمدن پر اس قسم کے حملے کر کے جیسا کہ پہلے ہوا کرتے تھے، بچ کر نکل نہیں سکتے۔ اب خود ان ہی سے استفادہ کیے ہوئے ایسے مسلمان عالموں اور دانشوروں کی ایک جماعت دنیائے اسلام میں پیدا ہو چکی ہے جو ان کی غلط اندیشیوں کی نشان دہی کر سکتی ہے اور جو تحقیق و ریسرچ کے جدید اصولوں سے نہ صرف واقف ہے بلکہ انہیں برتنے کا سلیقہ بھی رکھتی ہے، ابھی حال میں طیبا وی مرحوم نے جو چند مہینے ہوئے لندن میں ایک حادثہ میں اللہ کو پیارے ہو گئے، اپنے چند ہم عصر مستشرقین کی علمی کارگیری کا پردہ فاش کیا تھا جس کا جواب اگرچہ مستشرقین کے حلقے سے دینے کی کوشش کی گئی، لیکن مغرب اور مشرق دونوں جگہ اہل نظر نے دیکھا کہ ان کی بات کچھ یوں ہی سی رہی۔

ایسا نہیں ہے کہ پہلے ایسے خود دار اور با حمیت عالم اور دانشور نہ تھے جو مستشرقین کو چیلنج کر سکتے، سید جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ، سر سید، امیر علی، اقبال سب نے اپنے اپنے طور پر یہ خدمت انجام دی لیکن اب پہلے کے مقابلہ میں دنیائے اسلام ہر لحاظ سے بہتر حالت میں ہے، اس لیے اب ہمیں مستشرقین کے رویے میں خاصی تبدیلی ملتی ہے، اب مسیحی دنیا کو خود الحاد کی جس سے خطرہ ہے جس نے اسی کی کوکھ سے جنم لیا ہے، اس لیے وہ مشترک روحانی و اخلاقی اقدار کے فروغ و استحکام کے لیے دنیائے اسلام سے تعاون کی خواہاں ہے اور رومن کیتھولک چرچ نے تو یہاں تک تسلیم کر لیا ہے کہ

حضرت محمد خدا کے پیغمبر تھے، پروٹسٹنٹ عیسائیوں میں پروفیسر گب جیسے مستشرق گزرے ہیں جو اسلام کا مطالعہ ایک ایسے عیسائی کی حیثیت سے کرتے تھے جو دونوں مذاہب میں مشترک روحانی اقدار کی تلاش میں رہتے ہیں لیکن اس تلاش وجستجو کی راہ میں پہلا قدم یہ غلط اٹھاتے جو انھیں مسلمانوں سے دور کر دیتا ہے، اور مسلمانوں کے نزدیک روحانی اقدار کا جو سرچشمہ ہے اس کی ماہیت وکیفیت سے متعلق بحث چھڑ جاتی ہے، مثلاً ایسے عیسائی بھی جو مشترک روحانی اقدار کی تلاش میں ہیں، قرآن کو وحی الٰہی تسلیم کرنے سے کتراتے ہیں اور اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ قرآن کی اساس یہودی ونصرانی روایات ہیں، حالانکہ جب سے مغرب کی علمی دنیا میں سائنٹیفک تاریخی اصول تنقید کا چرچا ہوا، اس وقت سے لے کر آج تک یہ دعوی پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچ سکا اور صرف ایک مفروضہ ہی رہا۔

کیسی عجیب بات ہے کہ ایک طویل عرصہ تک تمام ذہنی و مادی وسائل کے ساتھ تاریخی تنقید وتحقیق کے جدید اصولوں کو برت کر عیسائی ویہودی دنیا اس بات کا کوئی قطعی اور فیصلہ کن ثبوت فراہم نہ کر سکی کہ قرآن کریم پیغمبر اسلامؐ کی تالیف ہے۔ جسے آپؐ نے یہودی وعیسائی روایات سے استفادہ کرکے اور تورات اور انجیل مقدس سے بہت کچھ مستعار لے کر مرتب کیا ہے، اس سلسلہ میں اگر کوئی معاصر اور زندہ شہادت ہے تو وہ خود قرآن ہے، جس سے اس طرح کا کوئی امکان خارج از بحث قرار پاتا ہے، تاریخی تنقید وتحقیق کے مستند اور جدید اصول کے مطابق اس بولتی ہوئی معاصر دستاویزی شہادت کو جس کے علاوہ کوئی اور شہادت موجود نہیں، تمام ناگفتنی قیاس آرائیوں سے بالاتر اور یقینی سمجھنا چاہئے لیکن آج بڑے اور سنجیدہ مستشرقین بھی اس انداز حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں، ان مستشرقین کے اس رویہ کی توجیہ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کے مذہبی عقائد اور اس سلسلہ میں تعصب اور جانبداری کی وہ روایات جو انھیں اپنے علمی ماحول اور

اپنے پیش رووں سے ورثہ میں ملی ہیں ان کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہیں، اور ہدایت کی طرف بڑھنے نہیں دیتیں۔

دوسروں کے مذہبی عقائد اور دینی روایات کے موضوع پر لکھنے کی آزادی ہے، کسی ایک خاص مذہب کا پیرو دوسرے مذاہب کا مطالعہ کر سکتا ہے اور اپنے مطالعہ کے نتائج شائع بھی کر سکتا ہے، لیکن اس سلسلہ میں تصنیف و تالیف کا اولین و بنیادی اصول یہ ہونا چاہئے کہ پہلے زیر مطالعہ مذہب کے پیرووں کے عقائد پوری وضاحت کے ساتھ، مکمل طور پر اس طرح بیان کر دیئے جائیں کہ اس شکایت کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے کہ ان کے عقائد کو غلط طور پر یا توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے، اب اگر لکھنے والا کسی اور نظریہ یا عقیدہ کا حامل ہے اور وہ اپنے نظریہ یا کسی نظریہ کا ذکر کرنا چاہتا ہے تو اسے اس کا حق حاصل ہے لیکن اسے چاہئے کہ وہ اپنے یا کسی دوسرے کے نظریہ کو الگ سے پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرے۔

افسوس ہے کہ سنجیدہ اور وسیع النظر مستشرقین بھی قرآن پاک اور سیرت اقدس پر لکھتے وقت اس بنیادی اصول کو عام طور پر فراموش کر دیتے ہیں اور کچھ اس طرح کا خلط مبحث کرتے ہیں کہ صرف وہی لوگ جن کا اسلام کا مطالعہ اچھا ہے، یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ لکھنے والا اپنے ذاتی خیال اور عقیدہ کو اپنے قاریوں کے ذہن میں اتار دینا چاہتا ہے، تاریخی معروضیت اور مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے چند بنیادی تقاضے ہیں، لیکن عام طور پر مستشرقین کا حال یہ ہے کہ ان کی یہودیت، یا مسیحیت، ان بنیادی تقاضوں پر غالب آجاتی ہے، تاریخی معروضیت کے بلند و بانگ دعووں کے باوجود مغربی مصنفین، دوسرے مذاہب اور تمدنوں کے بارے میں اتنے بھی معروضی نہیں جتنا کہ آج سے صدیوں پہلے ابوریحان البیرونی نام کا وہ مسلمان عالم اور دانشور تھا جس نے الآثار الباقیہ اور کتاب الہند لکھ کر تاریخی معروضیت اور مذاہب کے تقابلی مطالعہ کی صحیح راہ متعین کر دی تھی،

مولوی محمد فاروق میر واعظ کشمیر | مخلص و محترم   زید مجدکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ !

خیریت ہے، خدا کرے مزاج گرامی بعافیت ہو،

"معارف" ہر ماہ پابندی سے خاکسار کے نام آرہا ہے، شکریہ کثرتِ کار اور دیگر اہم مشاغل کے باوجود پورے ذوق و شوق کو معارف کا مطالعہ جاری رکھتا ہوں،

"اسلام اور مستشرقین" کے عنوان پر جو بین اقوامی حالیہ سیمینار آنمحترم نے اپنے رفقاء کار کے تعاون سے منعقد کیا تھا، یقیناً ہر لحاظ سے کامیاب اور ایک بامقصد سیمینار رہا۔

بذاتِ خود شرکت سے تو میں محروم رہا، لیکن آپ نے روداد کے ذریعے ساری تفصیلات قاری کے سامنے کردی ہیں، میری دلی دعائیں آنحضرت کیساتھ ہیں، کارلائقہ سے مطلع فرمائیں، و دعواتِ صالحہ میں فراموش نہ فرمائیں۔

والسلام

(محمد فاروق میر واعظ کشمیر)

مقالاتِ شبلی جلد ششم

سلسلۂ مقالاتِ شبلی آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے، یہ اس سلسلہ کی تیسری جلد ہے، اس میں مولانا کے وہ تمام معرکۃ الآراء تاریخی مقالات آگئے ہیں، جو انھوں نے یورپ کے اسلام دشمن مستشرقین اور تنگ نظر ہندو مورخوں کے جواب میں الندوہ لکھنؤ اور اپنے دور کے دوسرے بلند پایہ رسالوں اور اخباروں میں لکھے تھے، ان میں سب سے اہم مضمون کتب خانہ اسکندریہ ہے جس میں مولانا نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس کے جلانے کا الزام مسلمانوں پر غلط ہے، یہ ان کے مصر میں داخل ہونے سے بہت پہلے جلادیا گیا تھا۔

قیمت :-   ۱۱ روپے

مطبوعاتِ جدیدہ

آنکھیں ترستیاں ہیں :- مرتبہ جناب جگن ناتھ آزاد صاحب متوسط تقطیع کاغذ کتابت عمدہ صفحات ۲۱۲ مجلد مع خوبصورت گرد پوش قیمت ۳۶ روپئے پتہ ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نمبر۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج نئی دہلی۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو بچپن ہی سے شعری، ادبی اور علمی ماحول ملا اور ان کی نشو و نما ادیبوں اور شاعروں کے درمیان میں ہوئی۔ ان کے والد تلوک چند محروم اساتذۂ سخن میں تھے۔ جن کے اکثر مشاہیر علم و ادب سے تعلقات تھے۔ اس کے علاوہ خود آزاد صاحب نے بھی اپنے علمی ادبی ذوق کی وجہ سے سرکاری ملازمت سے وابستہ رہنے کے باوجود ہمیشہ علم و ادب سے اشتغال اور ادیبوں اور شاعروں سے واسطہ رکھا۔ زیرِ نظر کتاب اُن بائیس علمی و ادبی شخصیتوں کا دلچسپ تذکرہ ہے جن سے مصنف احترام و عقیدت یا دوستی اور بے تکلفی سے ملتے جلتے رہے ہیں۔ ان میں ان کے بزرگ اور استاد بھی ہیں جیسے تاجور نجیب آبادی، صلاح الدین احمد، عبد المجید سالک، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، مولوی عبد الحق، سر شیخ عبد القادر، عبد القادر سروری، محمد دین تاثیر، حسرت موہانی، رشید احمد صدیقی اور ان کے والد محروم صاحب۔ بعض لوگ سن و سال کے فرق کے باوجود ان کے ہمراز و بے تکلف احباب ہیں مثلاً عرش ملسیانی، بھائی (سجاد ظہیر)، کرشن چندر، جاں نثار اختر اور کچھ خورد بھی ہیں یعنی مہندر ناتھ، سلیمان اریب، نریش کمار شاد اور پریم ناتھ در۔ بعض شخصیتیں اصلاً تو علمی و ادبی ہیں مگر انھوں نے سیاسی افق پر زیادہ چمک دمک دکھائی جیسے مولانا ابوالکلام آزاد، سروجنی نائیڈو اور درگا پرشاد دھر۔ مصنف نے ان سب سے اپنی ملاقات کی، سرگذشت، تعلقات کی روداد اور

ان کے بارے میں اپنے تاثرات و مشاہدات بہت دلچسپ اور موثر انداز میں بیان کر خود ان کے بقول
"ذوق حضوری" سے لکھے ہیں جس سے ان کے حالات و کمالات کا مرقع، علمی و ادبی سرگرمیاں، ان کے
و خیالات اور دوسرے مشاغل و معمولات کا حال معلوم ہو جاتا ہے، ایسی علمی و ادبی شخصیتوں کا
تذکرہ اور وہ بھی جگن ناتھ آزاد کے سلاست رقم اور شگفتہ نگار قلم سے جس نے کراس پری وش کا
اور پھر بیاں اپنا کے مصداق ہے، جن لوگوں کا اس کتاب میں تذکرہ ہے وہ وفات پا چکے ہیں اس لیے
ہر مضمون سوز و اثر میں ڈوبا ہوا ہے۔ مصنف کو شعر و ادب میں جو بصیرت حاصل ہے اس کی بنا پر
ان کے بعض خیالات دوسروں سے مختلف ہیں جو غور و فکر پر مبنی ہونے کی وجہ سے لائق توجہ ہیں،
چنانچہ شہرت عام کے برعکس فراق کے متعلق ان کا نقطۂ نظر ہے: "وہ متنوع موضوعات کا شاعر نہیں
... ان کی رباعیات ان کی غزل ہی کا ایک دوسرا روپ ہیں ... ان کی زیادہ تر نظمیں سپاٹ
اور شعریت سے معرا ہیں، غزل کی روایتی ... حدود کے باہر اول تو فراق نے کچھ کہا ہی نہیں، اور
جو کچھ کہا ہے، وہ درجۂ اول کی تخلیق نہیں، ... ہمارے نقاد فراق کی شاعری سے اتنا متاثر نہیں
جتنا ان کی مقبولیت سے متاثر ہیں، اور اس مقبولیت میں فراق کی شاعری کا اتنا ہاتھ نہیں جتنا
ان کی ذہانت اور عالمانہ گفتگو کا ... فراق کے ادب کو غیر ادبی پیمانے سے ناپنے کا طریقہ فراق کی
گفتگو اور محفل آرائی کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا" (ص ۱۶۱، ۱۶۲) وہ فیض کی شگفتگی اور تاثر کے معترف
ہونے کے باوجود یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کے یہاں زبان کی غلطیاں ہیں اور انداز بیان کہیں کہیں اتنا اکھڑا
ہوا ہے کہ پڑھتے ہوئے بہت کوفت ہوتی ہے" (ص ۱۵۱) کرشن چندر کے اس خیال "شاعری میں زبان کی
کوئی اہمیت نہیں ہے، اصل چیز خیالات ہیں" کی تردید میں لکھتے ہیں: خیالات کا ہونا تو ضروری ہے، لیکن زبان
و بیان کی اہمیت سے کیونکر انکار کیا جا سکتا ہے، اعلیٰ شاعری تو خیالات، زبان و بیان اور جذبے کے
امتزاج ہی سے ظہور میں آتی ہے، اگر خیالات کمزور ہیں یا زبان و بیان کمزور رہے تو شاعری بحیثیت

بھر بھی کمزوری رہے گی" (ص ۱۵۱) وہ ڈاکٹر اقبال کے عاشق و شیدائی ہیں مگر کوئی محفل ہو وہ ان کا ذکر ضرور چھیڑ دیتے ہیں، ڈاکٹر صاحب کے خلاف ترقی پسندوں کے مخالفانہ طلسم کو توڑنے کا سہرا انہی کے سر ہے، وہ بھلا ان کے معاملہ میں کوئی بدذوقی کب برداشت کر سکتے ہیں، لکھتے ہیں "کرشن چندر کو اقبال کے متعدد اشعار سنائے، .... انہیں یہ اشعار پسند نہ آئے، وہ بار بار فیض اور راشد کا ذکر کرتے تھے اور میں اقبال کے مقابلے میں فیض اور راشد کا ذکر سننے کو تیار ہی نہیں تھا، میں نے لفظوں میں تو اس بات کا اظہار نہ کیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اس بات چیت سے بڑی حد تک مایوس ہوا اور بے لطف بھی" (ص ۱۰۵) اصحاب علم و فن کا تذکرہ ہونے کی وجہ سے اس کتاب میں جا بجا ادبی نکتے، مفید معلومات اور لطائف و ظرائف بھی احاطۂ تحریر میں آگئے ہیں، جنھیں پڑھ کر لطف اندوز ہونا یقینی ہے اور اس سے خصوصیت کے ساتھ پنجاب کی گذشتہ نصف صدی کی علمی، ادبی اور سیاسی سرگرمیوں اور واقعات کی تصویر سامنے آجاتی ہے، خود مصنف کی پوری زندگی بھی شعر و ادب کی خدمت میں بسر ہوئی ہے، جس کا بہت کچھ حال انھوں نے قلمبند کیا ہے، اس طرح یہ جگ بیتی ہی نہیں، آپ بیتی بھی ہے، کتابت کی غلطی سے واقعہ کو واقع (ص ۱۳۶) نذر کو نظر (ص ۱۷۱) خزف چینوں کو حذف چینوں (ص ۲۴) اور جگہوں کو مذکر لکھا ہے، (ص ۱۴۳) مزاجی رجحان (ص ۱۴۱) کے بجائے طبعی رجحان لکھنا چاہئے تھا، مندرجۂ ذیل جملے میں طرز ادا کی خامی ہے "سروجنی نائیڈو کے ساتھ صرف ایک ہی بار ملاقات ہوئی" (ص ۷)

- **منار صدا**: مرتبہ ڈاکٹر عنوان چشتی، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۰۰
مع خوبصورت جلد قیمت ۵۰ روپے، پتہ: ندوۃ المصنفین، جامع مسجد، دہلی۔

مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کو علم کی دولت اور دین کی برکت وراثۃً بھی ملی ہے اور وہ خود بھی علمی و دینی وجاہت کے مالک اور مشہور قومی و ملی رہنما ہیں، ندوۃ المصنفین کے انتظامی امور کی دیکھ بھال کی وجہ سے انھیں تصنیف و تالیف کا موقع نہ مل سکا مگر ان کی نگرانی میں اس ادارہ نے بڑی مفید علمی و دینی خدمت انجام دی ہے، زیر نظر کتاب مفتی صاحب کی ان ریڈیائی تقریروں کا

ور جو گذشتہ چھبیس برسوں میں وقتاً فوقتاً مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہوتی رہی ہیں، اب ڈاکٹر ظہور احمد فاروقی چشتی ریڈر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے عام فائدہ کے لئے ان کا مجموعہ سلیقہ سے مرتب کرکے شائع کیا ہے، اور موضوع کے لحاظ سے ان کے چھ حصے کردیئے ہیں، پہلے حصہ میں سیرت پاک اور میلاد النبی پر آٹھ تقریریں ہیں، دوسرے میں حج، اس کے ارکان و مناسک اور آثار و مشاہد پر تیرہ تقریریں درج ہیں، اس کے بعد کے حصوں میں عید قرباں پر دو، عید الفطر پر چار، اور شب برأت پر تین تقریریں شامل ہیں، آخر میں مختلف موضوع پر پندرہ تقریریں ہیں، ان میں امام حسینؓ، عشرۂ محرم، شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی، مخدوم صابر کلیریؒ، درگاہ خواجہ معین الدین چشتیؒ، سلسلۂ نقشبندیہ، حضرت مجدد صاحبؒ کے مکتوبات، مسلم پرسنل لا، مذہبی رواداری، عرب و ہند کے تعلقات اور ہندوستان اور سیکلرزم کے علاوہ دار العلوم دیوبند، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل اور ندوۃ المصنفین دہلی جیسے بڑے اداروں پر مفتی صاحب نے مناسب انداز میں اظہار خیال کیا ہے، یہ سب تقریریں موثر، عام فہم اور دین و مذہب سے متعلق مفید باتوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے پڑھنے کے لائق ہیں، گو ریڈیو کے محدود و متعین وقت کی پابندی کی وجہ سے یہ مختصر ہیں، اور بعض بعض ایک ہی موضوع پر ہیں، اس لیے ان میں تکرار بھی ہے، مگر اس سے ان کی دلپذیری میں فرق نہیں آیا ہے۔

علامہ اقبال (مصلح قرن آخر) — مترجمہ جناب کبیر احمد جائسی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۴۰، قیمت بارہ روپیہ، شائع کردہ اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی، سری نگر ملا کشمیر۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی نے اقبال پر دوسرے ملکوں اور زبانوں میں ہونے والے مفید و منتخب کاموں کے ترجمہ و اشاعت کا پروگرام بنایا ہے، یہ کتاب اسی سلسلہ کی کڑی ہے جو فارسی سے ترجمہ کی گئی ہے، یہ دراصل ایک ایرانی فاضل ڈاکٹر علی شریعتی کی ایک تقریر ہے، شروع میں اہل ایران سبک ہندی کے معترف

اور ڈاکٹر اقبال کو ایک مقامی شاعر تصور کیا جاتا تھا ... اب وہاں اقبال شناسی کا رجحان بڑھ رہا ہے، اس لیے دور حاضر کے متعدد فضلا ان کی عظمت و آفاقیت کے قائل ہیں، ڈاکٹر علی شریعتی بھی اقبال کے افکار و خیالات سے کافی متاثر ہیں، انھیں پہلوی حکومت اور شاہ ایران کے خلاف بغاوت کے جرم میں بار بار قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں اور آخر میں وہ ملک بدر ہو کر لندن گئے جہاں ان کا انتقال ہو گیا، اس طرح انھیں جم کر پڑھنے لکھنے اور یکسوئی کے ساتھ تصنیف و تالیف کا موقع نہ ملا، ان کی علمی یادگار ان کی تقریریں ہیں جنکی تعداد سو سے متجاوز نہ ہوگی، زیر نظر تقریر میں اقبال کو ایک بڑا مصلح بتایا ہے، مقرر کے نزدیک ڈاکٹر صاحب کا دل مشرقی اور دماغ مغربی تھا، وہ انھیں کامل اور مکمل مسلمان اور فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا معمار سمجھتے تھے، ان کے نزدیک وہ عام صوفیہ، مصلحین اور انقلاب پسند مجاہدین کی طرح نہ تھے، بلکہ استعمار دشمن تھے، اس سلسلہ میں اقبال کی عظمت و جامعیت پر اچھی بحث کی ہے، گو اس تقریر میں بہت سی غیر متعلق باتیں اور بعض ضمنی مسائل کی غیر ضروری تفصیل بھی ہے اور بعض خیالات بھی محل نظر ہیں، تاہم اس سے مقرر کی دینی تڑپ اور اسلام کی سربلندی کے جذبہ کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انکے اور ڈاکٹر اقبال کے خیالات میں بڑی یکسانی ہے، اس کتاب کے مترجم جناب کبیر احمد جائسی کو فارسی کتابوں کے ترجمے کا اچھا سلیقہ ہے، ترجمہ کی پابندی اور موضوع کی خشکی کے باوجود اس میں رعنائی و دلکشی ہے، شروع میں انکے قلم سے ایک مقدمہ بھی ہے اس میں ڈاکٹر علی شریعتی مرحوم کے حالات و سوانح اور ان کے بارہ میں مفید اور ضروری معلومات درج ہیں۔

" ض "

....

مولانا سید سلیمان ندویؒ کی بعض کتابوں کے جدید ایڈیشن

نقوشِ سلیمانی

یہ مجموعہ ہے ہندوستانی اور اردو زبان و ادب سے متعلق مختلف ادبی کانفرنسوں کے خطبہ ہائے صدارت اور دوسری تقریروں، تحریروں، تبصروں اور مقدموں کا مجموعہ، جن کا انتخاب خود فاضل مصنف نے اپنی زندگی میں کیا تھا، اور نہایت اہتمام سے معارف پریس میں چھپوایا تھا، وہ اردو کو ہندوستان کی نسبت سے ہندوستانی کا نام دیکر ملک کی مشترکہ زبان بنانا چاہتے تھے، افسوس کہ ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا، اور ہندی ملک کی سرکاری زبان قرار پا گئی، طبع دوم عکسی،

قیمت:- ۲۵ روپیے،

خیّام

خیام کو فارسی کے ایک باکمال رُباعی گو شاعر کی حیثیت سے عالمی شہرت حاصل ہے، اور اس کی رباعیات کا یورپ اور ایشیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو گیا ہے لیکن اس کے علاوہ وہ اور بھی بہت کچھ تھا، وہ فلسفی تھا، منجم تھا، ریاضی داں تھا، ہیئت داں تھا، اور حکیم و طبیب تھا، جس کی طرف شعر العجم میں خیام کے تذکرہ میں مولانا شبلیؒ نے بھی اشارہ کیا ہے، اس کتاب میں پہلی مرتبہ اس کے سوانح و حالات کے ساتھ اس کی ان ہی حیثیات پر بہت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، آخر میں اس کے چند نایاب فارسی و عربی کے فلسفیانہ رسائل اور اس کی مستند رباعیات بھی شامل کر دی گئی ہیں، طبع دوم عکسی، قیمت: ۲۵ روپیے،

عرب و ہند کے تعلقات

سید صاحب نے عرب و ہند کے تعلقات پر ہندوستانی اکاڈمی الٰہ آباد میں چند خطبے دیے تھے، یہ انہی کا مجموعہ ہے، طبع دوم عکسی، قیمت ۳۰ روپیہ

"منیجر"

[illegible]

[illegible] ہندوستان کے [illegible] علم و ادب [illegible]

اور شعری کمالات اور اُن کے نثر و نظم کے بہترین انتخابات بھی شامل تھے، اس کے دوسرے اڈیشن
میں اس کو مزید ترمیم و تہذیب کے بعد کثرت سے اضافے ہونے کی وجہ سے [illegible]
قدرداں ذوق اور مستفید ہونے کی سہولت کے لئے اس کو تین جلدوں میں کر دیا گیا، اس میں بعض نئے ماخذ
کی مدد سے ان سلاطین، شہزادوں، شہزادیوں کے علمی ذوق اور علم پروری کی تفصیلات عجیب و غریب
اور مفید یادداشتیں [illegible] کی گئی ہیں کہ بانی سلطنت تیموریہ شہنشاہ بابر سے لیکر آخری مغل تاجدار بہادر
شاہ ظفر تک کے عہد کے علم و ادب اور شعر و سخن کا پورا مرقع نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے، پہلی جلد کا
پہلے تین مغل سلاطین یعنی بابر، ہمایوں اور اکبر کے علمی ذوق اور اُن کے دربار کے امراء، شعراء اور
فضلاء کے تذکرہ کے ساتھ ان کے علمی کمالات اور کارناموں پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے، دوسری جلد جہانگیر
شاہجہاں [illegible] کے دربار کا علمی [illegible]
کے تذکرے اور ان کے علمی کمالات پر مشتمل ہے، تیسری جلد [illegible]
کے علمی [illegible] شاہ [illegible]
بیگم [illegible] صاحب [illegible] بیگم [illegible]
کے حالات اور کارناموں پر مشتمل ہے، جلد اول قیمت [illegible]

مؤلفہ

سید صباح الدین عبد الرحمن [illegible]

[illegible]